حضرت معاویہؓ
کی
سیاسی زندگی

مؤلف ۔ سیّد علی احمد عباسی

اس کتاب میں قرونِ اُولیٰ کے اہم واقعات اور تاریخ کے پیچیدہ مسائل پر دعوتِ محمدیہ کے زاویہ نگاہ سے تعمیری انداز میں تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا، کہ سیاسیاتِ اسلامیہ میں امیرالمؤمنین حضرت معاویہؓ کی شخصیت کتنی عظیم تھی، آپ کا مقام کتنا بلند تھا۔ آپ کی حکمتِ عملی کیسی اصیل تھی، اور آپ کے فیوض کس قدر عالم گیر ہیں،

ناشر نور محمد، کارخانہ تجارتِ کتب، آرام باغ۔ کراچی

مجید ۶۳ء

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ؕ

حضرت معاویہؓ

کی

سیاسی زندگی

اِس کتاب میں قرنِ اوّل کے اہم واقعات اور تاریخ کے پیچیدہ مسائل پر دعوتِ محمدیہ کے زاویۂ نگاہ سے تعمیری انداز میں تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ سیاسیاتِ اسلامیہ میں امیرالمؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت کتنی عظیم تھی، آپ کا مقام کتنا بلند تھا، آپ کی حکمت عملی کیسی اصیل تھی اور آپ کے فیوض کس قدر عالمگیر ہیں۔

مؤلفہ: مولانا سید علی احمد عباسی

مقدمہ: حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی

مطبوعہ : ــــــــــــــ مشہور آفسٹ پریس، کراچی

طبع اول سنہ ۱۹۶۳ء ــــــــــــــ ایک ہزار

ناشر

نور محمد، اصح المطابع و کارخانہ تجارتِ کتب

آرام باغ۔ کراچی

قیمت مجلد دس روپے

ابّا میاں کے حضور!

شکراً اللہ ولہٗ

اپنی اس علمی بضاعت کو میں اپنے والد ماجد قبلہ حضرت مولٰنا المخدوم حکیم سید فرید احمد صاحب عباسی مجدّدی، امامِ طب، مدظلہم العالی کے حضور پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میری ظاہری اور باطنی تمام تربیت انھوں نے کی اور ہر قسم کی تعلیم کے وسائل من کلّ الوجوہ محض انھوں نے مہیّا کئے۔ بہت کم ہوں گے وہ باپ جنھوں نے اپنے بچوں کی صلاح و فلاح کو اس طرح اپنی زندگی کا مقصد بنا کر جذباتِ ربوبیت صرف کئے ہوں۔

میری یہ کوشش اگر علمی دنیا میں سندِ قبولیت حاصل کرے تو یہ سب انہی کی توجہاتِ دائمہ کا نتیجہ ہوگا۔

فکرِ من گردوں مسیر از فیض اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیض اوست

علی العبّاسی

یکم رمضان ۱۳۷۹ھ

افسوس کہ ابّا میاںؒ رحلت فرما گئے!

یکم ذی القعدہ ۱۳۸۱ھ کو یہ سایہ بظاہر ہمارے سر سے اٹھ گیا۔ اس ذات گرامی قدر کے محاسن و فضائل ہر اس شخص پر ہویدا ہیں جسے شرفِ معیت نصیب ہوئی۔

ابّا میاں جامع الطرق تھے۔ چاروں خاندانوں کی خلافت تھی، ان کے مرشد حضرت شاہ بہاؤ الدین علویؒ بھی جامع الطرق تھے۔ انھیں مجددی سلسلہ کی خلافت حضرت مولانا عبد الرحمٰن شاہجہانپوریؒ سے ملی تھی اور انھیں حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ سے۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ کی خلافت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تھی۔

ابّا میاں نے اپنے شیخ کے علاوہ متعدد اکابر طریقہ سے بھی فیض اٹھایا اور سب سے آخر میں حضرت شاہ ابو الخیر مجددیؒ کی خدمت بابرکت میں سالہا سال گذارے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ روایتِ حدیث کی اجازت انھیں حضرت مولانا سید احمد حسن رضویؒ سے تھی اور انھیں حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے۔ اس صدی کے مشہور محدّث حضرت شیخ حسینؒ عرب جو علوِ اسناد میں فخرِ اماثل تھے ان سے بھی ابّا میاں کو روایتِ حدیث کی اجازت تھی اور وہ آپ پر شفقت فرماتے تھے۔

علمِ طب میں آپ حضرت حاذق الملک حکیم عبد المجید خاںؒ کے شاگرد تھے ان کے دونوں بھائیوں سے بھی پڑھا تھا۔ حضرت مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ کے معتمد ترین رفیق کار تھے اور اُن کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔

برِکوچک کی تین عظیم الشان تحریکوں سے ان کا بلاواسطہ تعلق تھا، یعنی تحریک احیاء العلوم علیگڈھ، تحریک احیاء العلوم دیوبند اور تحریک احیاءِ طب۔ جب مُسنہ طبیہ سے سند لی ہے تو اس اجلاس میں سر سیدؒ بھی تشریف فرما تھے اور دوسرے اکابر ملت۔

طریقت کی طرح فقہ میں بھی آپ کا مذہب جمع بین المذاہب تھا شعر و ادب سے فطری لگاؤ رکھتے تھے اور اشعار پُر کیف ہیں۔ سیرۃ العباسؓ، مدارِ اعظم اور حقیقۃ السیادۃ ان کی مشہور تصانیف ہیں طبِّ نبی کا دستور العمل بھی مرتب کیا ہے غرض اس شعر کے مصداق تھے:

ولیس علی اللہ بمستنکر ؎ ان یجمع العالم فی الواحد

اب ایسی جامع الصفات ہستیاں کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ فروتنی اور خوش طبعی کے ساتھ بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔ بے تعصب اور فراخدل تھے۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ عنایت مجھ پر ہے۔ بچّوں کی اور شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں انہماک تھا ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح اپنا دل و دماغ ہمارے دل و دماغ میں منتقل کردیں۔ اس کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرما کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اللّٰھم ارض عنہ وارضہ عنا۔

فہرست مضامین (اجمالی)

فہرست مضامین (تفصیلی)

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

مقدمہ

تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں نے کسی غیر قوم سے نہیں سیکھا، بلکہ یہ خود ان کی اپنی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس فن کے لئے مبادیات قرآن حکیم سے اخذ کئے گئے، اور پھر اس فن کو سائنٹفک بنیادوں پر اس وقت مستحکم کیا گیا جب فن حدیث کے بنیادی اصول طے پا گئے۔

"روایت اور درایت" کے اصولوں نے جہاں "سنت" اور "حدیث" کے لئے کسوٹی فراہم کردی تھی وہاں تاریخ کے لئے بھی ایک معیار عطا کر دیا تھا۔

چنانچہ روایت اور درایت کے اصولوں کو ہی مدنظر رکھ کر تاریخ نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اس ضمن میں مسلمانوں نے سب سے پہلے "مغازی" لکھنے شروع کئے، اس کے بعد سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحریریں پیش ہوئیں۔ پھر کہیں جا کر صحیح معنوں میں تاریخ لکھنے کا کام شروع ہوا۔ مسلمان مورخوں نے تاریخی مواد کے لئے حسب ذیل چیزیں منتخب کی تھیں۔

(۱) قرآن کریم، (۲) حدیثِ رسولؐ، (۳) مغازی، (۴) اشعار، بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حسان بن ثابتؓ کے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کی تدوین کے لئے مواد جمع کرنے کا سب سے بڑا کام علامہ محمد ابن جریر طبریؒ نے کیا۔ بدقسمتی سے مسلمان اس کتاب کو بجائے کتاب مواد تاریخ کے تاریخ سمجھ بیٹھے۔ علامہ طبریؒ نے قوی سے قوی تاریخی روایات اور ضعیف سے ضعیف روایات کو بجنسہٖ نقل کر دیا۔ انھوں نے اپنی تاریخی مواد کی کتاب میں کوئی ایسا معیار مقرر نہیں کیا جس پر کسی روایت کے بارے میں ضعیف اور قوی کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دشمنانِ دین کے ہاتھ تو کوئی بات آنی چاہیئے، افترا پردازوں کی ..... ایک فوج کی فوج دوڑ پڑی اور انھوں نے ضعیف ترین روایتوں کا حوالہ دے کر تاریخ اسلام کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ اصولِ "درایت اور روایت" کو

بالائے طاق رکھ دیا گیا، اور طبری کو مستند قرار دے کر جھوٹی سچی تاریخیں لکھ ماریں۔ یہ انہی کذب و افتراء سے بھرپور تواریخ کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنے خلفاء، ائمہ اور اسلاف سے سوءِ ظن رکھتے ہیں۔

جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور کردار کا تعلق ہے اس پر سب سے زیادہ تنقید اور تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ ناقدین کئی قسم کے ہیں ایک گروہ تو وہ ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت، کتابتِ وحی، علم و ورع، زھد اور تقویٰ کا نہ صرف معترف ہے بلکہ ان خصوصیات کے پیش نظر انھیں بے حد قابلِ عزت اور لائقِ احترام بھی سمجھتا ہے مگر دوسرے ہی سانس میں معترض کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے کہ "حضرت اسلام ضرور لائے تھے مگر در اصل تھے اُن لوگوں میں سے جنھیں راضی اور سیدھا رکھنے کے لئے روپیہ پیسہ دیا جاتا تھا، اور مختلف النوع رعایتیں برتی جاتی تھیں"، ایسے لوگوں کو اصطلاح میں "مؤلفۃ القلوب" کہا جاتا ہے۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے بات نہیں بدلا کرتی۔ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ کے ایمان پر شبہ ہے۔ چنانچہ وہ ڈھکے چھپے الفاظ نہیں بلکہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ میں خاندانی عصبیت بدرجہ اتم موجود تھی، اور اسی لئے انھوں نے اسلامی نظامِ حکومت کی بجائے قیصر و کسریٰ کے طریقے کے مطابق اپنی حیات ہی میں اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا ڈالا، اور اس طرح اسلام میں بادشاہت کی بدعت جاری کر دی، تاکہ حکومت اور اقتدار اُن کے خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔" اس خیال کے حامی گروہ میں اکثریت اُن حضرات کی ہے جو اپنے آپ کو اہلِ سنّت والجماعت کہتے ہیں۔ اس گروہ کے لوگ انتخابِ امیر کے تو قائل ہیں، مگر منتخب کرنے کا حق عوام کو نہیں بلکہ خواص کو تفویض کرتے ہیں۔ ان خواص کو اس مسلک کے حامی اربابِ حل و عقد کہتے ہیں، جن کے لئے شرط اوّل یہ ہے کہ وہ دین کے عالم ہوں۔ علمائے دین کے اس اجماع کو یہ حضرات "اجماعِ امت" کا نام دیتے ہیں۔ اور اجماعِ عام کو اجماعِ خاص میں تبدیل کر دینے کو ضرورتِ دینی سمجھتے ہیں۔ یہ تصور افلاطون کی جمہوریت سے لیا گیا ہے۔ اسلام میں اس تصوّر کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد خود ہی کر سکیں گے۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو اجماع اور جمہوریت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں اس مسلک کے حامی "امام" کو خدا کی طرف سے "مامور" تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کی نظر میں امامت کا دار و مدار نسبی تعلّق پر مبنی ہے جو پیدائشی طور پر اولاد میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ مانتے اور منوانا چاہتے ہیں کہ امام کو حضورؐ کی صاحبزادی کے چھوٹے فرزند یعنی امام حسینؓ کی اولاد میں سے ہونا لازمی ہے۔ یہ لوگ امام کو معصوم، نبوّت میں شریک اور خدا کے ولی کی حیثیت سے نبی سے افضل کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ تو اس درجے غلو کرتے ہیں کہ وحی دراصل حضرت علیؓ کی طرف آنے والی تھی جبریل امینؑ غلطی سے (نعوذ باللہ) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا گئے۔ یہ لوگ صرف حضرت معاویہؓ ہی کو نہیں بلکہ تمام صحابۂ کبارؓ کو سوائے حضرت علیؓ اور اُن کے چند...... ساتھیوں کے گمراہ اور بے دین سمجھتے ہیں، حتّٰی کہ ان امہات المومنین کو بھی جن کی نیک نفسی کا ذکر قرآن الحکیم میں موجود ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضرت امام حسنؓ سے بھی یہ لوگ محض اس لئے "سوءِ ظن" رکھتے ہیں کہ حضرتؓ نے امیر معاویہؓ سے صلح کرلی تھی۔ امامت کا یہ تصوّر پاپائیت، برہمنیت، وحشی اور غیر متمدن قبائل کی رسوم اور کلیسائی نظام سے کس درجہ مشابہ ہے، اور اسلامی تصوّر کے کس قدر منافی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہو سکے گا۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو صوفیائے کرام کے القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت کا گمان یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کچھ رُوحانی علوم سکھا دیئے تھے، علاوہ ازیں تزکیۂ نفس اور طہارتِ باطنی کے لئے کچھ طور و طریق بھی بتا دیئے تھے۔ جو حضرت علیؓ کی حُسینی اولاد میں وراثتاً چلے آتے ہیں۔ یہ علوم روحانی حضرت امام جعفر صادقؓ سے مشائخینِ طریقت کو حاصل ہوئے ہیں۔ ان علوم کی روشنی میں اور ان طریقوں پر عمل پیرا ہو کر ہر مُرید رُوحانی بلندیاں حاصل کرتا ہے، اور معرفتِ اشیاء، اور معرفت باری تعالیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ اِن حضرات میں بھی ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ولایت نبوّت سے افضل ہوتی ہے۔ مگر اس مسلک کے حامی ذرا اُلٹ پھیر کر بات کرتے ہیں، اور یوں کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں، ایک نبی اللہ کی اور دوسری ولی اللہ کی حیثیت۔ چنانچہ جب ولی اللہ کی حیثیت آنحضرت صلعم پر طاری ہوتی تھی تو رسالت مآبؐ کی توجہ خلق سے ہٹ کر خالق کی طرف ہو جاتی تھی۔ اور نبی کی حیثیت میں حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خالق سے ہٹ جاتی تھی اور مخلوق کی رشد و ہدایت کی جانب مبذول ہو جاتی تھی آنحضرت صلعم کی یہ ولایتِ کبریٰ آنحضرت صلعم کی نبوّت سے افضل تھی۔ یہی وہ ولایتِ کبریٰ

تھی جو آنحضرت صلعم سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو حاصل ہوئی اور ان کی حُسینی اولاد کے ذریعہ اس کا فیضِ باطنی سلسلہ بسلسلہ آج تک صوفیاء کے مختلف خانوادوں میں موجود اور جاری ہے اس ولایت کے حصول کے لئے جو عقائد و اعمال اختیار کئے جاتے ہیں اسے "طریقت" کہتے ہیں اور طریقت شریعت کی جان و روح ہونے کی وجہ سے شریعت سے افضل سمجھی جانی ضروری ہے، ان ریاضتوں اور مجاھدوں کی وجہ سے نفس انسانی میں ایسی پاکی اور طہارت داخل ہو جاتی ہے کہ انسان نہ صرف کائنات پر متصرف ہو جاتا ہے بلکہ اسے خالقِ کائنات سے ایسا وصل حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی ایسی معیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوئی کا تصور یکسر مٹ جاتا ہے۔ صاحبِ طریقت جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مریدوں کے لئے اس کو سجدہ کرنا بھی ممنوع باقی نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس سجدے کو یہ لوگ "سجدۂ تعظیمی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان عقائد کے حامل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا پیر طریقت مانتے ہیں اور حضرت معاویہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہم کے متعلق گفتگو کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ مگر اپنے دل کی گہرائیوں میں ان حضرات سے راضی نہیں ہیں۔ یہ لوگ دینداری اور دنیاداری میں تفریق کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ اور اُن کی حسینی اولاد کو دین کے سردار اور سیاسی خلفشار اور بیرونی حملوں کے دفاع میں مسلسل جہاد کرنے والوں کو دنیادار سمجھتے ہیں۔ اس گروہ کے یہ خیالات کس حد تک اسلامی نظریات کے مطابق ہیں اس کا فیصلہ بھی آپ اس علمی اور تحقیقی کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی کریں گے۔

چوتھا گروہ "عقلیت" کے دعویدار مورخین کا ہے۔ ان میں عرب و عجم کے مسلمان، عیسائی اور یہودی مورخین ہندو مورخین اور مستشرقین شامل ہیں۔ مسلمان مورخین اپنے اپنے عقائد کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کے اختلافات اور مناقشات پر مختلف زاویوں سے تنقید اور تنقیص کرتے ہیں اور بیک وقت ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں ان صحابہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو صحابہ کو فوق الفطرت قوتوں کا حامل بتاتے ہیں اور دوسری طرف قبائلی اور خاندانی تعصّبات میں گرفتار، اقتدار کے خواہشمند قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کی بنیادی قدروں کو بدلنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کی عظیم المرتبت ہستیوں کو اپنے من گھڑت کرداروں کا حامل ثابت کرکے قارئین کو دریائے حیرت میں غرق کرنے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں۔

ان گروہوں کے علاوہ اور بھی انواع واقسام کے لوگ ہیں جو اپنی انفرادیت کے چکر میں تاریخ جیسے عظیم فن سے کھیلتے ہیں۔ اُن میں عوام کے جذبات سے کھیلنے والے واعظ، معترین اور ادبی اور علمی مجالس میں اپنے مزعومات میں مزید چاشنی پیدا کرنے کے لئے من گھڑت روایتیں بیان کرنے والے اور واہی تباہی بکنے والے شامل ہیں۔

اس کتاب کے مؤلف سید علی احمد صاحب عباسی نے ان تمام گروہوں سے الگ ہوکر صرف اُن حقائق کو رقم کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے جو فنِ تاریخ کی رُو سے صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل ہیں۔ اور پھر جس عالمانہ انداز میں مؤلف نے واقعات پر تبصرہ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔

(مولانا) **احتشامُ الحق تھانوی**
مہتمم دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الٰہ یار
و ممبر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان

قارئینِ کرام سے استدعاء

از پروفیسر بادشاہ زادہ سواتی الازہری [الشہادۃ العالیۃ من کلیۃ الشریعۃ (الازہر۔ مصر)]

ایک صاحبِ علم کے لئے کسی مؤلف کی تحریر پر محاکمہ کچھ مشکل نہیں۔ لیکن مشکل پڑتی ہے اس وقت جب صاحبِ تحریر اپنا دوست اور رفیقِ کار ہو یا پھر ہو مخالف۔ دوست کے کام کی ثناء کو لوگ رفاقت کے ایفاء پر محمول کرتے ہیں اور مخالفت کی جائے تو حق کوشی کے بجائے اسے رشک و حسد نام دیتے ہیں۔ اسی طرح مخالف کی تحریر کی کمزوریاں پکڑی جائیں تو اسے مخاصمت تصور کیا جائے گا اور حق میں لکھنے کو مجاملت کا نام دیں گے۔ اسی مشکل میں اس وقت میں ہوں۔

پروفیسر سید علی احمد عباسی ایم' ایس سی (علیگ) میرے دوست اور رفیقِ کار ہیں اور ان کی کاوشِ علمی کی تعریف کرکے میں جانبدار کہلانا نہیں چاہتا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے علمی حیثیت سے ان کی تحریر میں کمزوری بھی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا میرا صرف ایک کام رہ جاتا ہے کہ دلی خلوص کے ساتھ قارئین کرام سے اس کتاب کو از اوّل تا آخر توجہ سے پڑھنے کی درخواست کروں۔
اس کتاب میں انھیں بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں گی کہ چند علماء کے علاوہ اکثر حضرات ان سے نا آشنا ہیں بعض باتیں ایسی ملیں گی کہ لوگ حیرت زدہ ہو کر سوچیں گے کہ دشمنانِ صحابہ نے انھیں کس طرح گمراہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اموی خاندان کے خلاف تقریباً ایک ہزار برس سے ایک منظم گروہ بڑے شد و مد سے ہمہ گیر پیمانہ پر پروپگنڈا کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ گروہ اپنی سعی بلیغ میں اس درجہ کامیاب حاصل کرچکا ہے کہ ہمارے لٹریچر میں ہزاروں بے اصل روایات اس طرح شامل ہو گئیں کہ ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے عوام انھیں تاریخ اسلام کے ماٰخذ سمجھنے لگے ہیں۔

ایسی صورت میں حق کی تلاش مشکل ہے اور تحقیق کا میدان تنگ۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر عباسی نے اس کٹھن منزل کو طے کرکے امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کردار کو اصلی صورت میں کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرلی۔

اللہ تعالیٰ ان کو اجر دے اور مسلمانوں کو نسل پرستی اور فرقہ بندی کے بندھنوں سے نجات دے۔ تاکہ جماعت کا شیرازہ مضبوط ہو۔ اسلافِ کرام کی صحیح عظمت دلوں میں بیٹھے۔ مسلمانوں کو اپنی تاریخ کی درخشانی پر فخر ہو اور ان میں وہ ولولہ پیدا ہو جو تعمیرِ قومی میں ممد ہو سکے اور ملت کی نشأۃ ثانیہ کا سبب بنے۔ آمین

بادشاہ زادہ الازہری

(ڈین آف جہاں زیب کالج۔ سیدو شریف۔ سوات)

خطاب باہلِ ایمان

اس کتاب کے مخاطب محض اہلِ ایمان ہیں، اور مقصد صرف اتنا ہی کہ جو لوگ سنت کے پابند ہیں، اور جماعت سے وابستہ، انھیں غور و فکر کی دعوت دی جائے۔ ملّتِ اسلامیہ اس وقت نشأۃ ثانیہ کے دور میں ہے اور یہ نشأۃ ناممکن ہے جب تک تاریخ کی تنقیح نہ ہو اور قرونِ اُولیٰ کے واقعات صحیح اور تعمیری صورت میں امت کے سامنے نہ رکھے جائیں۔

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا
تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

فرمانِ الٰہی

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ، فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (الروم: ۳۰-۳۲)

(ترجمہ) "جو ظلم کیش ہیں وہ بغیر علم کے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، پھر اسے ہدایت کون دے جسے اللہ ہی نے گمراہ کر دیا ہو، اور ان کا کوئی مددگار بھی نہ ہو۔ لہٰذا تم سب طرف سے مُنہ موڑ کر دین پر قائم ہو جاؤ۔ یہی ہے اللہ کی فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی ہے باقی رہنے والا دین۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں، اسی کی طرف جھکو، اسی کے فرمان کا لحاظ رکھو اور نماز قائم کرو۔ اور ان مشرکوں میں سے مت ہو جانا جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے کہ ہر فرقہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔"

اعتراف

مجھے اس کتاب کی ترتیب میں کتاب اللہ، صحاح اور دوسرے معتبر مآخذ سے استفادہ کے علاوہ گراں قدر فائدہ حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ کی تحریروں سے پہنچا ہے۔ آپ کی کتاب منہاج السنۃ کا مطالعہ کئے ہوئے سالہا سال گذر چکے تھے۔ بعض باتیں ذہن سے اتر گئی تھیں۔ لیکن حال میں مصر سے علامہ ذہبی کی کتاب المنتقیٰ شائع ہوئی ہے اس سے بہت سا مواد مل گیا۔ امام ذہبیؒ نے ایک جلد میں منہاج السنۃ کی چار جلدوں کا اختصار کر کے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔

اس کے بعد ہے امام ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ کی کتاب العواصم من القواصم۔ یہ کتاب بھی بہت سے امور میں نہایت کارآمد ثابت ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں اہل عدل کے لئے نعمتِ بازیافتہ کی حیثیت رکھتی ہیں، کیونکہ صدیوں سے گم تھیں۔

امت کو مصر کی باہمت جماعت "لجنۃ الشباب المسلم" (انجمن نوجوانانِ اسلام) کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ یہ بے نظیر اور گرانمایہ کتابیں اب ہماری دسترس میں ہیں۔ فاضلِ اجل علامہ محب الدین الخطیب نے ان دونوں کو شائع کر کے اور پھر اپنے بیش بہا تعلیقات سے مزین فرما کر اہل علم پر وہ احسان عظیم کیا ہے کہ باید و شاید۔ اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے انھیں جزائے خیر دے، اور ان کے درجات بلند سے بلند تر کرے۔ آمین۔

مؤلف

پیش لفظ

بسم اللہ والسلام علیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وخلفائہ ، اما بعد!

ایک قوم کی بقاء اور ترقی کا انحصار جہاں اس امر پر ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کی حامل ہو، علوم و فنون میں دستگاہ رکھتی ہو، اور اپنی قوت قائم رکھنے کے لئے مادی وسائل اسے میسر ہوں، وہاں سب سے اہم ہے اس کی تاریخ کی تدوین۔ یہ تاریخ واقعات پر مبنی ہونی چاہئے اور خرافات سے مبرا۔ مدوّن تاریخ کی سب سے زیادہ اہمیت اس قوم کے لئے ہے جس کی تشکیل کسی نظریۂ حیات کے تحت کی گئی ہو، اسے سامنا رہا ہو مخالف نظریات کا اور اس کا ماضی گذرا ہو جہد مسلسل میں۔

امت مسلمہ آخر الامم ہے، اور اقوام عالم میں اپنے وجود کے اعتبار سے ممتاز ترین۔ اس کے سپرد اہلِ عالم کی امامت کی گئی ہے۔ یہ فرائض اس امت نے باحسن وجوہ ادا کئے۔ ابتداءِ آفرینش سے آج تک جتنے ارتقائی مآثر، اطراف و اکنافِ عالم میں اس نے موجود پائے اُن کے تحفظ کا انتظام کیا، اور مزید ترقی کے ذرائع مہیا کئے۔ حیاتِ اجتماعیہ کے تمام وسائل کی آبیاری کی اور بلا تعصب و تنگدلی حق و میزان کے ساتھ عدل بین الاقوام کے اصول بروئے کار لائی۔

صرف یہ اُمت ہے جس نے اقوامِ عالم کو اس منہاج قویم پر ڈالدیا کہ آج سب اسی کے نظریات و اصول کی روشنی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنے کے درپے ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں کامیابی بھی ہو رہی ہے۔

لیکن افسوس کہ خود یہ امت اندرونی فتنوں کا شکار ہو گئی اور اس کے اپنے عملی قویٰ میں اضمحلال آ گیا، محض اس لئے کہ اس کے اندرونی دشمنوں نے اس کی تاریخ کو داغدار اور اُس کے قائدوں کو فرض ناشناس ثابت کر کے اس کی وحدت کو پاش پاش کر دیا۔ اب یہ اللہ کا فضل ہے کہ مسلسل و پیہم تخریبی کارروائیوں کے باوجود یہ امت زندہ ہے اور زمانے کے موجودہ دَور میں اندازہ ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر کروٹ لے گی، اگرچہ اس وقت قسم قسم کی مشکلات موجود ہیں،

اور ہر اسلامی ملک ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔

اس بیسویں صدی کی مادہ پرست اور جغرافیائی قومیت کی متوالی قوموں کی دنیا میں قائدِ اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ والرضوان نے نعرہ بلند کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں، ان کی قومیت کی بنیاد اُن کا دین ہے، جس کی بنا پر وہ مکلف ہیں کہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق اپنی زندگی اور حکومت کی تشکیل کریں۔ اس دعوت کو اقوامِ عالم سے تسلیم کرا کے مملکتِ پاکستان قائم کر لینا اس کی عملی دلیل ہے، کہ دنیا کا مستقبل پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہے تاکہ امامتِ عالم کا جو منصب انھوں نے اپنی کوتاہ عملی اور بے راہ روی سے کھو دیا تھا اور اب بھی اس طرف آنے سے ہچکچا رہے ہیں وہ ایک بار انھیں پھر تفویض کیا جائے گا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ چند مخلص لوگ امتِ مسلمہ کی صحیح تاریخ مدوّن کرنے کے درپے ہوں اور واقعات کی تلاش کر کے روایاتِ واہیہ سے اُمت کو نجات دلائیں، تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، تاریخ کے نام سے خرافات کو لے کر گمراہ نہ کر سکیں۔ اور اس طرح اُمت کو اس روحانی عذاب سے نجات ملے جس میں آج ہر تعلیمیافتہ شخص مبتلا ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو گیا ہے۔

ہر پڑھا لکھا آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں اگر کسی قوم کی تاریخ مایوس کن ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ مرتب ہو رہا ہے کہ اب خود نفسِ دین میں انھیں خامیاں نظر آنے لگیں۔ ان پریشان کن حالات میں جہاں اس کی ضرورت ہے کہ مخلص لوگ تبلیغ و انذار کے لئے کھڑے ہوں، وہاں ایسے لوگ بھی ہونے چاہئیں جو دلجمعی کے ساتھ بلا خوفِ لومۃ لائم... مسلمانوں کی صحیح تاریخ مدوّن کرنے کے درپے ہوں۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کی ہدایت کے لئے اس کام کا انجام کا دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسے نفسِ دین کی حفاظت کے لئے جدّ وجہد۔

یہ جو گم کردہ راہ لوگ عوام اور بچوں کے لئے تاریخ کے نام سے خرافات شائع کر رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنا اہم ترین فرض ہے، اُن کی زبانیں صحیح تاریخ سے بند ہو جائیں گی، اور انھیں یارا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی سے بیزار اور مستقبل سے مایوس کر کے اُن کے دل میں یہ جذبہ اُبھاریں کہ اب انھیں دین کی راہ چھوڑ کر کوئی اور سبیل اختیار کرنی چاہیے۔

واقعی اگر دین برپا کرنے اور کلمۂ حق کا نعرہ لگانے والے لوگ منافق تھے اور انھوں نے جو کچھ کیا وہ محض جوع الارض کے تحت کیا تو کوئی سنجیدہ اور باوقار شخص اُن کے ساتھ انتساب

میں فخر محسوس نہیں کر سکتا۔ اللہ اور ملت کے دشمنوں نے خلفاء، امراء، اور سلاطینِ اسلام کے بارے میں یہی تصور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ فقہاء، وصوفیہ وعلماء کے متعلق بھی۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض سے تشریف لائے تھے وہ کسی درجے میں پوری نہیں ہوئی۔ مسلمان اس پروپگنڈے سے ایسے متاثر ہوگئے ہیں کہ پناہ بخدا۔ راقم الحروف نے ایک معمر دیندار شخص کو ایسی باتیں کرتے سُنا ہے۔

یہ محض اس لئے ہے کہ سلف صالحین کی جناب میں گستاخ وبے ادب کردینے کا پورا مسالہ تیار کردیا گیا ہے، اور واقعات کو روایات کے ایسے دبیز پردوں میں دبادیا گیا ہے کہ تاریخ کی صحیح تدوین اب ایک آدمی کا کام نہیں رہا۔ ایک جماعت کو اس طرف متوجہ ہونا ہوگا، بشرطیکہ وہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ساتھ وفاداری کو اپنا نصب العین بنا چکے ہوں اور جنھیں یہ احساس ہو کہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور انھیں اپنے قول اور عمل کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ تاریخ سے مراد سیاسی سوانح کی تدوین ہے۔ حالانکہ یہ محض ایک شعبہ ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے حیاتِ ملیہ کے تمام شعبوں کی تدوین وارتقاء کی روداد کا۔ یعنی سیاسی، ثقافتی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی ترقیوں کے مکمل احصار کا۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ جو دعوتِ محمدیہ کے اولین علمبردار تھے اور پھر بعد میں امت کی زمامِ قیادت جن حضرات کے ہاتھ میں آئی وہ ان ترقیوں سے الگ رہے اور صرف سیاست سے کام رکھا یا ان امور میں بھی انھوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتیں صرف کیں۔

اس کے بعد دیکھنا ہے کہ دعوت کی ترویج میں جو اُلجھنیں پیدا ہوئیں اور نئے نئے احوال پیش آئے، اُن کی گتھیاں کس طرح سُلجھائی گئیں۔ کاروانِ ملت کو رواں دواں رکھنے کے لئے ان قائدوں نے کوششیں کیں یا جان بُوجھ کر اس راہ میں رُکاوٹ بنے۔ اس انداز میں جب تاریخ مرتب ہوگی اور صرف واقعات سے بحث کی جائے گی نہ کہ خرافات سے تب اُسے تاریخ کہا جاسکے گا۔

سب سے اہم بات ہے ان روایات پر تنقید اور ان کی تنقیح جو تاریخ کے نام سے جمع کردی گئی ہیں، اللہ کے بندے اگر اس طرف متوجہ ہوں اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دیکھیں کہ وہ کس زاویہ نگاہ سے کام کریں گے تو بہت تھوڑی مدت میں معتد بہ کام ہوسکتا ہے، شرط ہے اخلاص اور ایمان۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (عنقریب ظلم کرنے والے لوگ جان لیں گے کہ لوٹ کر جب جائیں گے تو اُن کا ٹھکانا کہاں ہوگا)۔

مآخذ

اقوامِ عالم میں جس تحریک کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے مراد انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ منہاج ہے جو ہدایتِ ربّانیہ کے تحت ابتداءِ آفرینش سے چار دانگِ عالم میں چلا آرہا ہے اور جس کی تکمیل سرورِ عالم وعالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔

اس تحریک کی جیتی جاگتی روئداد قرآن حکیم ہے۔ اس کے بعد ہیں احادیث وآثار کے وہ مجموعے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء واصحاب کے فرمودات، افکار اور اعمال پر مشتمل ہیں۔ پھر آتی ہیں سیرتِ پاک پر وہ کتابیں جو قریب ترین عہد میں مرتّب ہوئیں۔ پھر کہیں اُن کتابوں کی باری آتی ہے جنھیں عرفِ عام میں کتب تاریخ کہا جاتا ہے۔

جب تک دعوتِ محمدیہ اور امتِ مسلمہ کے بارے میں معلومات کے حصول کے لئے درجہ بدرجہ ان مآخذ کی ترتیب کا خیال نہیں کیا جائے گا صحیح تاریخ مرتّب نہیں ہو سکے گی۔ اس ترتیب سے جائزہ لیتے وقت اس کا بھی اہتمام رکھنا ہوگا کہ فروتر درجے کی معلومات کو اعلیٰ درجے پر حجت نہیں بنایا جاسکتا۔ مثلاً طبری کی بیان کردہ کسی بات کے خلاف ہمیں احادیث سے کوئی بات ملے گی تو اس وقت طبری کی تاریخ ساقط عن الاعتبار ہوگی۔

لوگ عموماً یہی غلطی کرتے ہیں کہ احادیث پر غور کرنے کے بجائے سیاسی سوانح کے متعلق بلاذری اور طبری ہی کو نہیں بلکہ مسعودی اور یعقوبی تک کو حجت سمجھ لیتے ہیں۔ اس لئے تاریخ میں الجھنیں ہیں اور مسائل کو لاینحل بنا دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم

قرآن پاک میں محض دعوت کے اصول واحکام ہی نہیں ہیں اس میں تاریخی لحاظ سے بھی اہم امور کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) سلسلۂ نبوت کی تاریخ اور اس کے ارتقائی درجات پر تبصرہ۔ ادیانِ عالم کے مشترک خصائص اور اُن کی امتیازی کیفیات۔

(۲) دعوتِ محمدیہ کے وہ اصول جن کے تحت عملاً امت کی تشکیل کی گئی، اور اقوام ملل کے

کے مابین اتحادِ فکر و عمل پیدا کرنے کے وہ طریقے جن کی عملی افادیت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے کر کے دکھا دی۔

۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کا وہ طریقہ جو نظامِ محمدی برپا کرنے کے لئے کام میں لایا گیا۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ذہنی رجحانات، قلبی کوائف، اُن کے کمالات اور ان میں سے بعض کی ابتدائی خامیاں اور ان سے نجات پانے کی ہدایات، صحابہ کے طبقات اور ہر طبقے کی خصوصیات۔

۵۔ وہ احوال جو امّت کو آپؐ کے زمانے میں پیش آئے، نیز مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارات اور حفاظتی تدبیروں کے متعلق واضح ہدایات۔ بے احتیاطی کے نتائج پر تنبیہیں۔

۶۔ دعوتِ محمدیہ کا تفصیلی پسِ منظر:

(ا) دعوت کے وقت عرب کی حالت، اُن کی افتادِ طبع، رجحانات اور رسم و رواج کی تفصیلات۔

(ب) یہود و نصاریٰ اور مجوس نے اس دعوت کی پذیرائی کس طرح کی، خود ان کی حالت کیا تھی، اور اُن کی طرف سے مسلمانوں کو کن کن مشکلات کا خطرہ تھا۔

۷۔ اندرونی اور بیرونی مشکلات کو حل کرنے کے عملی طریقے۔

۸۔ اقوامِ عالم کی ثقافت کی حفاظت، ارتقاء، تنقیح اور انھیں اپنانے کے اصول۔

غرض یہ ہے کہ تاریخ عصری کے اعتبار سے اہم ترین مقام کتاب اللہ کا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ عموماً امّت کی تاریخ مرتب کرتے وقت کتاب مبین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور عوام کے سامنے انہی فرض ناشناس لوگوں کی تحریریں پہنچتی ہیں جنھوں نے تاریخ کو مسخ کر دیا ہے۔

احادیث قرآن حکیم کے بعد درجہ ہے کتبِ احادیث و آثار کا۔ ان میں تبع تابعین تک کے احوال اور وقائع درج ہیں۔ ان کے علمی مآثر اور سیاسی مواقف سب کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں صحیح ترین مواد صحاح کا ہے۔ یعنی موطأ امام مالک (م ۱۹۹ھ)، صحیح بخاری (م ۲۵۶ھ)، صحیح مسلم (م ۲۶۱ھ)، جامع ترمذی (م ۲۷۹ھ)، سنن ابی داؤد (م ۲۷۵ھ)، سنن نسائی (م ۲۷۵ھ) اور پھر ہے سنن ابن ماجہ (م ۲۷۳ھ)۔ اگرچہ راقم الحروف

کو سنن ابن ماجہ کی یہ حیثیت تسلیم نہیں۔ اِس سے بہتر تو سنن دارمی ہے۔ چنانچہ بعض ائمہ اس طرف گئے ہیں۔ حافظ صلاح الدین خلیل علائیؒ فرماتے ہیں "مناسب یہ ہے کہ اس کی (یعنی سنن ابن ماجہ کی) جگہ دارمیؒ کی کتاب کو پانچوں کے بعد چھٹا بنایا جائے۔ اس لئے کہ اس میں ضعیف لوگوں کی روایتیں کم ہیں اور مُنکر و شاذ حدیثیں بہت ہی کم، اگرچہ مُرسَل اور موقوف حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ اس سے (یعنی سنن ابن ماجہ سے، صحاح میں شامل ہونے کی، زیادہ حقدار ہے" (ملاحظہ ہو مولانا عبدالرشید نعمانی کی تالیف امام ابن ماجہ اور علمِ حدیث: ص ۲۳۵ : طبع نور محمدؒ اصح المطابع، آرام باغ کراچی)

جامع ترمذی بڑی لذیذ کتاب ہے اور نہایت شاندار۔ مگر راقم الحروف کے نزدیک سب سے زیادہ اشکال بھی اسی میں ہے۔ حضرت امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی روایات کے درجات خود ہی متعین فرما دیئے ہیں، اور اس تعیین میں انہی کی رائے اکثر (بیشتر) صائب بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کو سب سے آسان ہونا چاہئے تھا، لیکن من وجوہٍ یہ آسانی ہی مشکلات کا اصل سبب ہے۔ مزید کچھ لکھنا خارج از موضوع ہوگا۔

صحاح کے بعد ہیں احادیث کے دوسرے مجموعے مثلاً مُصنّفؔ ابن ابی شیبہ، مُستدرک حاکم، طبرانیؒ کے تینوں مجموعے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں وہ سب روایتیں آگئی ہیں جن پر تنقید کے مواقع میسر ہیں، اور جن پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔

علمائے حدیث رضی اللہ عنہم کا وجود اللہ کی رحمت ہے اور ایسی فضیلت جس نے اُمتِ محمدیہ کو اقوامِ عالم میں ممتاز ترین درجہ دیدیا ہے۔ کسی قوم کے پاس اپنے نبی اور اس کی دعوت کے بارے میں نہ ایسی تفصیلات موجود ہیں، اور نہ تفصیلات میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے ایسے اصول۔

مُسنَد احمد کا ذکر میں نے صحاح میں قصداً نہیں کیا۔ اگرچہ صحت کے اعتبار سے وہ سنن نسائی اور سنن ابی داؤد سے اقدم ہی نہیں، افضل بھی ہے۔ یعنی قطیعیؒ اور عبداللہ بن احمدؒ کے زوائد کو چھوڑ کر۔ مگر یہ کتاب استخراجِ مسائل کے لئے چنداں مفید نہیں۔ اس کی افادیت حفّاظ کے لئے زیادہ ہے، کیونکہ اس میں طرقِ حدیث کا استحضار کیا گیا ہے۔ برخلاف صحاح کے کہ ان کی ترتیب مضامین کے اعتبار سے ہے۔ البتہ جسے مُسند احمد پر عبور ہوگا وہ جہاں کہیں کوئی حدیث دیکھے گا اس کے طُرق اس کے سامنے آجائیں گے۔ گِبؔ (Gibb) نے مُسند کی ترتیب پر اعتراض کیا ہے، لیکن وہ سمجھا نہیں کہ اس ترتیب کی بنیاد کیسی اصیل ہے۔ اسے فقہاء کے لئے مرتب نہیں کیا گیا، اُس کی تدوین حُفّاظِ حدیث کے لئے کی گئی ہے کہ ایک روایت کی جتنی سندیں ہیں، اور الفاظ میں جو کمی بیشی

ہے وہ اُن کے سامنے رہیں۔

مگر یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ایک حدیث اس لئے صحیح ہے کہ اسے امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ نے قبول کر لیا ہے۔ حدیث کی صحت اور بطور ماخذ اس کا درجہ متعین کرنے کے اصول ہیں، جو قرآن حکیم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور فقہائے صحابہ کی ہدایت کے تحت ائمہ حدیث نے مرتب کئے ہیں۔ ان علمائے کرام کی شان یہ ہے، اور برکاتِ نبوت سے مستفیض ہونے کی بنا پر ان کا یہ مرتبہ ہے کہ ان کی تنقید سے کوئی بھی بالا نہیں، اگرچہ صحیح بخاری ہی کیوں نہ ہو۔ احادیث کو ردّ و قبول کرنے کے اگر وسائل موجود و معتبر نہ ہوتے تو فقہائے اسلام کے اتنے مذاہب کیسے پیدا ہو جاتے۔ جب صحیح احادیث سے مسائل لینے کے طریقے ہیں تو حدیث کے الفاظ اور اسناد سے بحث پر کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا۔

حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا ہے: (منہاج السنۃ: ج ۴، ص ۵۸ - ۵۹):

ان قولنا رواہ البخاری ومسلم علامۃ لنا علی صحتہ لا انہ کان صحیحاً بمجرد روایۃ البخاری ومسلم، رواھا غیرھما من العلماء والمحدثین من لا یحصی عددھم الا اللہ، ولم ینفرد واحد منھما بحدیث۔ بل ما من حدیث الا قد رواہ قبل زمانہ وفی زمانہ وبعد زمانہ طوائف۔ ولو لم یخلق البخاری ومسلم لم ینقص من الدین شئ۔ وکانت تلک الاحادیث موجودۃ بأسانید یحصل بھا المقصود وفوق المقصود۔

وانما قولنا رواہ البخاری ومسلم، کقولنا فی القرآن رواہ القراء السبعۃ۔ والقرآن منقول بالتواتر لم یختص ھؤلاء السبعۃ بنقل شئ منہ۔

ہم جب کہتے ہیں کہ یہ روایت بخاری اور مسلم کی ہے تو ہمارے نزدیک یہ اس کی صحت کی علامت ہوتی ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ اسے بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے بلکہ بخاریؒ و مسلمؒ کی جو حدیثیں ہیں وہ ان دونوں کے علاوہ بھی علماء اور محدثوں کے اتنے افراد سے مروی ہیں کہ ان کی تعداد بس اللہ ہی جانتا ہے۔ ان احادیث میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے بکثرت لوگوں نے ان کے زمانے سے پہلے، خود ان کے زمانے میں اور ان کے زمانے کے بعد کے دور میں بیان نہ کی ہو۔ اگر بخاریؒ و مسلمؒ پیدا نہ ہوتے تب بھی دین میں کوئی کمی نہ رہتی۔ یہ احادیث اپنی سندوں کے ساتھ اسی طرح موجود ہوتیں اور ان سے مقصود حاصل ہو جاتا بلکہ مقصود سے بھی کچھ زیادہ۔

وکذلک التصحیح لم یقلد ائمۃ الحدیث فیہ البخاری ومسلماً۔ بل جمہور ما صححاہ کان قبلہما عند ائمۃ الحدیث صحیحاً ملتقی بالقبول، وکذلک فی عصرہما وکذلک بعدہما۔ وقد نظر ائمۃ ھٰذا الفن فی کتابیہما، ووافقوہما علی صحۃ ما صححاہ الا مواضع یسیرۃ نحو عشرین حدیثاً غالبھا فی مسلم انتقدہا علیہما طائفۃ من الحفاظ .... الخ

ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاریؒ ومسلمؒ نے روایت کیا ہے، ایسا ہی ہے جیسے ہم قرآن کو کہتے ہیں کہ اسے ساتوں قاریوں نے روایت کیا، حالانکہ قرآن تواتر کے ساتھ منقول ہو اور اس کے کسی حصّے کی روایت میں ان ساتوں قاریوں کی کچھ خصوصیت نہیں۔

اسی طرح احادیث کی تصحیح ہے۔ اس بارے میں بھی ائمہ حدیث، بخاریؒ ومسلمؒ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ بخاریؒ ومسلمؒ نے جن احادیث کو صحیح کہا ہے وہ ائمہ حدیث کے نزدیک پہلے سے صحیح ومقبول تھیں۔ یہ بات اُن کے زمانے میں بھی رہی اور اُن کے بعد بھی۔

بلکہ فن حدیث کے علماء نے ان دونوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور جن روایتوں کو صحیح پایا اس میں اُن کی تصدیق کی، سوائے بیس[۲۰] کے قریب احادیث کے، جن میں زیادہ ترصحیح مسلم میں ہیں بعض حفاظ نے اُن پر تنقید کی ہے..... الخ

گویا کتبِ حدیث میں جو سب سے بہتر اور صحیح ترین مجموعہ ہے، اس میں بھی ماہرینِ علم حدیث کے نزدیک بعض مرویات محلِ نظر ہیں۔ اور اس تنقید میں انھوں نے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ تک کی رعایت نہیں کی، پھر دوسری کتبِ حدیث پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں اور جن کا سب مواد موجود ہے اس کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ یہ حال ہے سب سے بہتر اور معتبر ترین ماخذ کا جو درجے میں کتاب اللہ کے بعد دوسرا ہے۔

انتقاد کی وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات محض روایت کی سند اور الفاظ سے بحث کرتے ہیں، اور بعض حضرات مسائل نکالنے کے لئے اس کے مضمون سے۔ لیکن جن کے سامنے دین اپنی کلّی حیثیت سے موجود ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ فلاں اعتبار سے خامی رہی اور فلاں حد تک حدیث قابلِ قبول ہے۔ یہ باتیں کتبِ فقہ کے مطالعے سے واضح ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذاہب مرتّب ہوئے، اور اسی کو استحسان کہتے ہیں۔

پھر یہ ہے کہ عموماً احادیث کی تنقید کی جاتی رہی ہے، احکام کے استخراج کے سلسلے میں، اور جو سندیں معتبر سمجھ لی گئیں اُن کی مرویات کو دوسرے اعتبارات سے بھی قبول کرلیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ طرقِ حدیث اور مسائلِ فقہی کے علاوہ فکر کی جو دوسری راہیں ہیں مثلاً تاریخ تو ممکن ہے ایک مؤرخ کو تاریخ کا احصاء کرتے وقت بعض احادیث کے قبول کرنے میں تأمل ہو اب سوچنا چاہئے کہ جن مآخذ کا درجہ احادیث کے بعد ہے ان سے اخذ میں کتنی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

کتبِ سیر

پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجے کی کتبِ حدیث کے بعد سیرتِ پاک کی ان کتابوں کا درجہ ہے جو تبع تابعین کے زمانے تک مدوّن ہوگئیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحاق۔ لیکن علماء نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اس کتاب کو بغیر تنقیح کے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ابن ہشامؒ نے یہ تنقیح کی اور وہ سیرت مدوّن کرلی جو امت میں متداول اور مقبول ہے۔ یا مثلاً مغازی ابن عقبہ ہے، جس کے متعلق علماء نے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سیرت کی ان کتابوں سے استشہاد کے وقت صحاح کی احادیث سے مدد لی جائے گی۔

کتبِ تاریخ

پھر آتی ہیں وہ کتابیں جو تاریخ کے نام سے رائج ہیں اور انہی پر لوگ تکیہ کئے ہوتے ہیں، مثلاً محمد بن جریر طبریؒ کی تاریخ۔ دراصل یہ کتاب تاریخ کی نہیں ہے بلکہ مواد تاریخی کا مجموعہ ہے اور اُن روایتوں پر مشتمل، جو اصحابِ حدیث کے معیار پر پوری نہیں اُتریں اور ان کے نزدیک تحقیق طلب تھیں۔ لیکن چونکہ تاریخی حیثیت سے ان میں کچھ جان تھی، اور یہ درجہ رکھتی تھیں کہ معلوماتِ حاصلہ کی روشنی میں اُن پر غور کرلیا جائے، اس سے طبری کا مقام پیدا ہوگیا۔ انھوں نے تمام روایتیں اسناد کے ساتھ جمع کی ہیں۔ اور اس طرح محض مضمون ہی کی نہیں بلکہ روایتً بھی اُن پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ تاریخ طبری میں بعض روایتیں بغیر اسناد کے بھی مذکور ہیں جو محض شہرت پاجانے کی بناپر انھوں نے "قِیلَ" یا "یُقَالُ" کہہ کر لکھ دیا ہے۔

لیکن ایک بات قطعی اور حتمی ہے کہ طبری نے اپنی کسی روایت کو روایت کے اعتبار سے کوئی درجہ نہیں دیا اور نہ اپنی بیان کردہ متضاد روایتوں پر کوئی تنقید کی ہے۔ انھوں نے کسی جگہ یہ بھی اشارہ نہیں کیا کہ روایت قبول کرنے کے لئے ان کے ہاں معیار کیا ہے بلکہ مجموعی طور پر بھی ان کی کتاب کا درجہ خود اُن کے اپنے کسی بیان سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ گویا طبری نے بس اتنا کیا ہے کہ جو روایت انھیں جس طرح پہنچی اُسے سلسلہ وار اپنی کتاب میں جگہ دیدی۔ یعنی انھوں نے مواد حاصلہ پیش کر دیا ہے، جس پر غور کرتے وقت

صحیح وسقیم کا امتیاز قائم کرنے کے لئے دوسرے ذرائع کام میں لانے ضروری ہیں۔

راقم الحروف کو گہرے مطالعے کے بعد ایک اندازہ البتہ ہوسکا ہے کہ کسی واقعے کے متعلق جو بات طبری کو زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے اسے سب سے پہلے لکھتے ہیں، اور پھر اسی ترتیب سے لکھتے لکھتے آخر میں وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے نزدیک حد درجہ ضعیف یا مردود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں وہ عموماً سند بیان نہیں کرتے۔

لیکن یہ ادراک بھی مفید نہیں۔ محمد بن جریر طبریؒ اپنے سیاسی رجحانات کی بناء پر اس قابل نہیں کہ دوسری شہادتوں کے بغیر ان کی بات کو حجت بنایا جاسکے۔ وہ اپنے تمام فضل وکمال کے باوجود تشیّع میں مبتلا تھے، اور بعض جگہ غلو بھی کر گئے ہیں۔ یہ تشیّع محض اُن کی تاریخ ہی میں نہیں تفسیر میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

راقم الحروف کو اُن کی تفسیر کی افادیت سے انکار نہیں لیکن استفادے کے لئے احتیاط شرط ہے۔ یہی احتیاط اُن کی تاریخ کے مطالعے کے وقت ضروری ہے بلکہ تفسیر سے بھی زیادہ، کیونکہ اُن کی تاریخ میں تمام دنیا اور تمام گذشتہ زمانوں کے احوال درج ہیں۔ گویا ان کی گنی چنی سندوں میں جو چند راوی ہیں اُن کا علم ایسا ہمہ گیر تھا کہ ساری دنیا پر اور تمام زمانوں پر محیط ہوگیا۔ یہ وہ بات ہے جس نے طبریؒ کو اس قابل نہیں رکھا کہ ماخذ میں ان کی تاریخ کو کچھ بہت بلند درجہ دیا جاسکے۔

طبری ہی کی صف میں بلاذری کی کتابیں ہیں۔ انھیں ایک شرف البتہ حاصل ہے کہ وہ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہؒ اور دوسرے عباسی خلفاء کے مقرّبین میں تھے۔ اس طرح اُن کی کتاب کو نیم سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی۔ پھر بھی ان سے بات اسی وقت لینی چاہئے جب دوسری طرف سے قوی شہادتیں ملیں۔

ابن خلدونؒ

علامہ ابن خلدونؒ علمِ تاریخ کے علماء میں عظیم ترین شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا مقدمہ عجوبۂ روزگار ہے۔ مگر انہی کے لئے جنھوں نے قرآن حکیم اور ارشاداتِ نبوی کے مطالعے کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔ علامہ ابن خلدونؒ نے روایت کے اخذ کے طریقوں پر بھی اچھی بحث کی ہے مگر بعض جگہ وہ غلطیاں کر گئے۔ مثلاً انھوں نے عبیدیوں کے دعوائے فاطمیت کو قبول کرلیا، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور ان کے نسب کی صحت کا ادنیٰ ترین ثبوت بھی نہیں دیا جاسکتا۔ نسب کے فیصلے کا اختیار

ابن خلدونؒ کو نہیں تھا، اور نہ اس بارے میں ان کی رائے کوئی قیمت رکھتی ہے۔ نسب کا فیصلہ ہمعصر اہل خاندان کیا کرتے ہیں اور انہی کا قول حجت ہوتا ہے۔

عبیدیوں کی فاطمیت کا انکار محض عباسی خلفاء ہی نے نہیں کیا، تمام بنو ہاشم بلکہ سب بنو عبد مناف ان کے مجہول النسب ہونے کے بارے میں متفق ہیں۔ معمولی عقل کی بات ہے کہ فَیْ اور خُمس کی تقسیم کے سلسلے میں خلفائے عباسیہ کے دفاتر میں ہر ہاشمی اور مُطلبی خاندان کے ایک ایک فرد کا نام محفوظ تھا۔ ہر گھرانے میں سرکاری نقیب مقرر ہوتے تھے جو ایک ایک فرد کا حصہ پہنچاتے تھے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خانوادۂ رسالتؐ کے کسی فرد کا نام غیر معروف رہے۔ بعد میں بھی ہاشمی خاندان کچھ گم نام نہیں ہوگیا۔

حضرت قاضی ابوبکر الباقلانیؒ خاص مستقر خلافت میں موجود تھے۔ خلفائے اسلام کے ہاں ان کی علمی اور سیاسی حیثیت مسلم تھی، وہ مقربینِ بارگاہِ خلافت میں تھے۔ اُن کے پاس علم الانساب کا جتنا مواد تھا وہ ابن خلدونؒ کو ان کے زمانے میں کیسے میسّر آسکتا تھا۔ امام باقلانیؒ نے جب عبیدیوں کا مجہول النسب ہونا بدلائلِ قاطعہ ثابت کردیا تو پھر گفتگو کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس عصری حجت کے بعد ابن خلدونؒ کی رائے خود بخود بے قیمت ہوجاتی ہے۔

اگر کہا جائے، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عباسی خلفاء نے چونکہ ان عبیدیوں کو اپنا سیاسی حریف قرار دیا تھا جنھوں نے اتنی شوکت حاصل کرلی تھی کہ عباسی خلفاء اُن کے مقابلے سے عاجز تھے، اس لئے عوام میں ان کی اہمیت کم کرنے کے لئے اُن کے نسب پر طعن کیا، تو یہ قول سراسر باطل ہے۔ کتنے دوسرے فاطمی سادات تھے جنھوں نے آزاد حکومتیں قائم کرلی تھیں اور ذی شوکت و اقتدار تھے بلکہ خلافت کے دعویدار بھی، مگر ان میں سے کسی کا نسب زیر بحث نہیں آیا۔ نسب کی بحث تو ادعائے باطل کی صورت میں ہوتی ہے۔

طبریؒ نے ۳۰۲ھ کے احوال کے تحت بتایا ہے کہ امیر المؤمنین المقتدر باللہؒ کے زمانے میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ محمد بن حسن بن علی بن موسیٰ بن جعفر ہے۔ خلیفہ نے آلِ ابی طالب کے بزرگوں کو جمع کیا، اور ان کے نقیب احمد بن عبد الصمد کو بھی طلب فرمایا جو ابن طومار کے نام سے مشہور تھے۔ وہاں ابن طومار نے بیان دیا کہ حسن (عسکری) بن علی (رضا) بن موسیٰ

(الکاظم) بن جعفر الصادقؒ لاولد فوت ہوئے تھے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ چنانچہ اس شخص کو سخت سزا دی گئی۔ اور حج کے موقع پر اُسے اونٹ پر بٹھا کر اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ اس زمانے میں اس کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا کہ کوئی شخص ہاشمی بن سکے۔ آلِ عبد مناف جہاں اس بات کو جانتے تھے کہ حضرت حسن عسکریؒ کے ہاں کوئی بیٹا پیدا ہی نہیں ہوا، اسی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ علبیدیوں کا مورث عبید اللہ جو اپنے آپ کو مہدی کہتا تھا وہ فاطمی نہیں ہے، بلکہ مجہول النسب ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے "تاریخ الخلفاء" میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ عزیز عبیدی بن معز نے امیر اندلس کو ایک خط بھیجا جو سبّ و شتم وطعن سے مملو تھا۔ اموی امیر نے یہ جامع و مانع جواب دیا جو عربی ادب کا شہ پارہ ہے:

"اما بعد فانک قد عرفتنا فہجوتنا و لو عرفناک لاجبناک"۔	تم ہمیں پہچانتے ہو اس لئے ہماری ہجو کرسکے ہم بھی تمھیں جانتے ہوتے تو جواب دیتے۔

اسی طرح علامہ ابن خلدونؒ نے حادثۂ کربلا، اور سیدنا حسینؓ کے موقف کا صحیح استقصاء نہ کیا، اور نہ مواقفِ اہلِ بیت کو دیکھا۔ ان کا تبصرہ (مقدمہ ص ۱۲۵) اُن کے ذہنی الجھن کی دلیل ہے۔ اسی لئے وہ مسئلہ صاف کرنے کی بجائے اور اُلجھا گئے۔

جامعین پھر ان کے علاوہ ہیں "اسد الغابۃ" یا "طبقات ابن سعد"۔ ان کا احوال جمع کرنے کا طریقہ بھی ایسا ہے کہ محدّثینِ کرام کے اصول پر اُن کی روایتیں پرکھی جا سکتی ہیں۔ ابن سعدؒ کے سلسلے میں خامی صرف ایک ہے کہ وہ خود تو معتبر و ثقہ ہیں لیکن ان کے استاذ محمد بن عمر واقدی مردود الروایت ہیں۔ لہٰذا ان کی وہی روایتیں قابلِ غور ہیں جو واقدی کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے مروی ہیں۔ بہر حال اس کتاب میں قیمتی مواد ہے، اگرچہ بعض نہایت لغو اور بے اصل روایتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورۂ والنجم کی تلاوت کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بتوں کی تعریف نکل گئی تھی، جس کی وجہ سے کفار نے بھی مسلمانوں کے ساتھ آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا تھا۔ حالانکہ صحاح میں ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں، اور نہ کفار کے سجدے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح ابن سعدؒ کی یہ روایت بھی مردود اور بے اصل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دفن کیا گیا جب جسم اطہر پر عام انسانوں کی طرح موت کی علامات طاری ہو گئی تھیں، اور جسم میں تغیّر ہونے لگا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ کے جسد پاک میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں

ہوا تھا اور آخر وقت تک زندگی کی سی تازگی موجود تھی۔

اس قسم کی کتابوں میں سے زیادہ بہتر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ہے۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہے کہ چوتھے درجے تک کے اصحاب کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں یعنی اُن کے بھی جن کا صحابی ہونا مشتبہ ہے لیکن زمانہ انھوں نے ایسا پایا کہ صحبتِ نبوی کا شرف انھیں مل سکتا تھا، وہاں آپ نے ساتھ ساتھ محدثانہ تنقید بھی کی ہے۔ اس طرح اس کتاب کی افادیت بہت زیادہ ہو گئی۔ اسی ذیل میں حافظ ابن عساکرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ جیسے ائمہ کی کتابیں ہیں۔ اور ان سے صحیح معنی میں بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن بات کسی کی صحیح نہیں، روایت کسی کی حجت نہیں جب تک درایتاً قابلِ قبول نہ ہو، اور بحث و تمحیص کے بعد اسے دلائل کے ساتھ اختیار نہ کیا گیا ہو۔ علامہ ابن عبد البرؒ کی کتاب "الاستیعاب" بھی بہت مفید ہے۔ اگرچہ اُن کے بعض ایرادات پر ائمہ نے اعتراض کئے ہیں اور تنقیح فرمائی ہے (ملاحظہ ہو علامہ سبکیؒ: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ج ۶ ص ۱۳۴ - ۱۴۰، زیر عنوان عبد المومن بن خلف حافظ شرف الدین دمیاطیؒ)

اھلِ کذب

اب آتے ہیں وہ اصحابِ کذب و افترا، جنھوں نے خاص مقاصد کے تحت تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کیا۔ مثلاً مسعودی، کہ اس شخص کو نہ روایت سے بحث ہے نہ درایت سے۔ بلکہ عدل کے ساتھ وہ کوئی بات خوش دلی سے نہیں کہہ سکتا۔ جن چیزوں کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں انھیں تو بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس کا مقصد تصنیف و تالیف سے محض یہ نظر آتا ہے کہ کسی طرح اَخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کر کے امت کی تاریخ میں ہر ممکن خلاء پیدا کر دے۔ پھر بھی عجیب بات ہے کہ اسے کذاب و مفتری سمجھنے کی بجائے لوگوں نے محقق و مؤرخ سمجھ لیا۔ اور اس کی کتابوں سے استناد کر کے معتبر بننے کی کوشش کی۔

اصحابِ تالیف

پھر وہ حضرات ہیں جنھوں نے خاص خاص موضوع مقرر کر کے کتابیں لکھیں۔ جیسے خطیب بغدادیؒ کی "تاریخ بغداد"۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابوں کی حیثیت بھی مواد تاریخی ہی کی ہے۔ ان کی مستند باتیں وہی سمجھی جائیں گی جو اُن کے موضوع پر دوسری جگہ سے حاصل نہ کی جا سکیں۔ خطیب بغدادیؒ

بڑے وسیع العلم شخص تھے، مگر انھوں نے تاریخ بغداد میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور ایسی لغو و فضول باتیں لکھ گئے ہیں جنھیں اہلِ علم نے پسند نہیں کیا، اور نہ ان جیسے صاحبِ نظر شخص کے لئے وہ زیبا تھیں۔ مثلاً حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کو امیر المؤمنین عبداللہ المنصورؒ کی طرف سے محکمۂ قضاء کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش اور قبول نہ کرنے پر انھیں سزائے قید و تازیانہ اور افتاء کی ممانعت۔

امت کے ان دونوں پیشواؤں کی وفات سے تین سو برس کے بعد یہ باتیں پہلی مرتبہ خطیب بغدادیؒ کے قلم سے نکلی ہیں۔ اطراف و اکنافِ عالم میں حنفی علماء پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے ان سے پہلے اس قسم کی باتیں نہیں کہیں۔ شاگردوں سے زیادہ اپنے استاذ کا حال اور کون جان سکتا ہے۔ لیکن خطیب بغدادیؒ نے خوف نہیں کیا کہ افتراء کی کچھ سزا بھی ملنی ہے۔ انھوں نے بغیر تحقیق کے یا عمداً ایسی باتیں لکھ دیں جسے مطلب پرست لوگ لے اُڑے اور آج دنیا میں اس بے اصل بات کی کتنی شہرت ہے! علامہ ابن خلکانؒ نے وفیات الاعیان میں حضرت امام اعظمؒ کے احوال کے تحت خطیب کی اس حرکت پر نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ اُن جیسے شخص کے لئے ایسی باتیں لکھنی موزوں نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہو کہ سلطان ابوبکر الملک المظفر بن ایوب رحمہ اللہ کا رسالہ السہم المصیب فی الرد علی الخطیب کا مطالعہ کیا جائے جو مصر و ہند سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ تالیف ۶۲۱ھ کی ہے۔ یعنی خطیب کے تین سو برس بعد کی۔ اس وقت سلطانؒ نے نابلس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور نصاریٰ سے برسرِ پیکار تھے۔ ان کی عظمتِ نفس اور استحضارِ علمی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جہاد میں مشغولیت کے باوجود کتابوں کی عدم موجودگی میں یہ رسالہ مرتب فرمایا۔ خود لکھتے ہیں کہ افسوس اس وقت میری کتابیں میرے پاس نہیں۔

حضرت امام اعظمؒ کے متعلق طبریؒ نے بھی یہ محکمۂ قضاء کی پیشکش کا قضیہ لکھا ہے مگر ان کی روایتوں میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں قید و بند یا طرفین کی طرف سے باہمی ہتک حرمت کا شائبہ بھی نظر آئے۔ لیکن خطیبؒ نے ایک طومار باندھ دیا۔

حضرت امام اعظمؒ کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ انھیں کسی جگہ کا قاضی یا قاضی القضاۃ بنا کر ان کی صلاحیتوں کو ضائع کیا جاتا۔ امیر المؤمنین منصورؒ جیسے قدر شناس اور علم پرور خلیفہ نے ان کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ آثار و احادیث کی روشنی میں امت کے لئے ایک

دستور فقہی مرتب کریں جو خلافتِ اسلامیہ کا معمول ہو اور سلف کا علم محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ اسلام کا سب سے پہلا فقہی نظام اس طرح مدوّن ہو گیا۔ اسی کو عرف میں ہم حنفی مذہب کہتے ہیں، ملّتِ اسلامیہ کی اس عجوبۂ روزگار خدمت کے سبب حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہؒ کو امام اعظم کہا جاتا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اور اسی سبب سے حضرت امام اعظمؓ کے شاگردوں کو کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے اہم مناصب تفویض ہوئے جس کے نتیجے میں تین چوتھائی عالمِ اسلام فقہ حنفی کا متبع ہے۔ صدر الائمہؒ نے مناقب الامام الاعظمؓ میں ایک واقعہ مَرْو کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہاں عرصہ دراز سے فقہِ حنفی رائج تھی۔ علّامہ نضر بن شمیلؒ جب بصرہ سے مَرْو تشریف لائے تو چونکہ آپ علماء ظواہر میں تھے، اس لئے فقہِ حنفی کا یہ رواج انھیں ناگوار ہوا اور بعض نوعمر محدّثوں کو اپنے ساتھ ملا کر انھوں نے مخالفت شروع کر دی۔ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ حضرت امام اعظمؒ کی کتابوں کے اوراق کو دھونا شروع کر دیا۔ خالد بن صبیحؒ نے جو مَرْو کے قاضی تھے ان لوگوں کی شکایت وزیر فضل بن سہل تک پہنچائی جو امیر المؤمنین عبداللہ المامونؒ کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے تمام صورتِ حال سے امیر المؤمنین کو مطلع کیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ دونوں فریق کل صبح حاضر ہوں تاکہ فیصلہ کر دوں۔ امیر المؤمنین جیسے یگانۂ روزگار عالم و فقیہ کے سامنے بولنے کی صلاحیت نضر بن شمیلؒ میں نہیں تھی، اس لئے احمد بن زہیرؒ کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا۔ اگلے دن جب فریقین اپنے اپنے گروہ کے ساتھ حاضر ہو گئے، تو امیر المؤمنین برآمد ہوئے۔ اور سب کو سلام کیا۔ پھر دریافت کیا کہ آپ حضرات نے امام ابو حنیفہؒ کی کتابوں کے ساتھ یہ کیا رویّہ اختیار کیا ہے؟ نضر تو خاموش رہے لیکن احمد بن زہیرؒ نے عرض کیا "امیر المؤمنین! اگر اجازت ہو تو میں بولوں؟" فرمایا "اگر آپ بہتر طریق پر گفتگو کر سکتے ہیں تو آپ ہی بولیں۔" وہ کہنے لگے "ہم نے یہ رویّہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ہم ابو حنیفہ کی کتابوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کے خلاف پاتے ہیں۔" امیر المؤمنین نے فرمایا "کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ کے خلاف کس طرح؟" اور اتنا کہہ کر خالد بن صبیح سے پوچھا "فلاں مسئلے میں امام ابو حنیفہ کیا فرماتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا تو احمد بن زہیرؒ نے حنفی فتوی کے خلاف حدیث پڑھنی شروع کی۔ مگر امیر المؤمنین نے اس کی تائید میں متعدد احادیث اپنی سندوں کے ساتھ سُنائیں۔ ان حدیثوں کا احمد بن زہیر کو علم بھی نہ تھا۔ غرض یوں ہی علمی بحث چلتی رہی اور غلبہ امیر المؤمنین ہی کو ہوا۔ پھر آخر میں فرمایا:

لو وجدناه مخالفًا لکتاب اللّٰہ و سُنّۃ رسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما استعملناہ ۔	اگر ہم انھیں کتاب اللّٰہ اور سنتِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے خلاف پاتے تو ھر گز (فقہ مرتب کرنے کا) منصب انھیں سپرد نہ کرتے

[ملاحظہ ہو مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی تالیف امام ابن ماجہ اور علمِ حدیث اص: طبع نور محمد اصح المطابع ، کراچی]

کہاں امیر المؤمنین المامون رح کا یہ ارشاد اور کہاں خطیب بغدادی کی بیان کردہ خرافات جو عقلاً و نقلاً لغو محض ہیں ۔ لیکن ان کی سمیت ایسی ہے کہ ہمارے زمانے میں ایک بسیار نویس نے حضرت امام اعظم رح کے "سیاسی مذہب" پر ایک کتاب لکھ ماری اور بے محابا صحابہ و خلفائے اسلام و ائمۂ کبار پر بہتان و افتراء کو اپنا علمی کارنامہ سمجھ بیٹھے ۔

خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ہی کی صف میں وہ کتابیں آتی ہیں جو مثلاً اصنافِ ادب پر لکھی گئیں ۔ جیسے جاحظ کی کتاب البیان والتبیین یا اختیار المنظوم والمنثور یا عقد الفرید وغیرہ ۔ ان کتابوں سے تاریخی امور میں استشہاد نہیں کیا جا سکتا ۔ ادبی امور میں کیا جائے گا ۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی ادبی لطیفہ لکھا ہو ، اور کسی معروف شخص کا نام بھی لیا ہو ، یا کچھ اشعار درج کئے ہوں ، یا خطبہ نقل کیا ہو ۔ ان چیزوں کو اس وقت تک مستند نہیں سمجھا جا سکتا جب تک دوسری طرف سے بھی توثیق نہ ہو ۔ کتاب جب تاریخ کی نہیں بلکہ ادب کی ہے تو پھر صحتِ تاریخی کا ثبوت کیونکر ہو سکتی ہے ۔

اسی طرح طبقاتِ علماء کی کتابیں ہیں ، مثلاً الجواھر المضیئۃ (مؤلفہ علامہ عبدالقادر قرشی رح) جو حنفی علماء کے احوال میں ہے ۔ اور طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جو شافعی علماء و فقہاء کے حالات پر مشتمل ہے ۔ ان کتابوں میں تاریخی باتیں بھی ہیں اور بعض دوسری قسم کی مرویات بھی ۔ ان تمام امور کو محض ان کتابوں میں مرقوم ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ جو بات جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے اُسی موضوع کے اصول پر اُسے جانچا جائے گا ۔ حکایت حکایت ہے ، روایت روایت اور واقعہ واقعہ ۔ خلطِ مبحث کرنے سے مطلب فوت ہوتا ہے ۔

اگر اخذِ مواد میں بے احتیاطی کی جائے گی تو وہی حشر ہوگا جو امام غزالی رح کی احیاء علوم الدین کی احادیث کو واقعی حدیث سمجھ لینے سے ہو گئی ہے ، اور صوفیاء کا طبقہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر اس کتاب کی بکثرت احادیث خالص موضوعات ہیں ۔ علامہ سبکی رح نے ان تمام احادیث پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔

طبقاتِ علما کی تمام کتابوں میں سب سے افضل و اعلیٰ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ہے۔ اس کے مصنف علامہ عبدالوہاب سبکیؒ فخرِ انام ہیں۔ نہایت مجتہدانہ طرزِ تحریر ہے اور امور پر اس روانی سے بحث فرماتے ہیں کہ باید و شاید۔ اور سب سے خشک طبقات الحنابلہ ہے جس کی روایتیں عموماً محلِ نظر ہیں۔ الجواھر المضیئہ کا میں بالاستیعاب مطالعہ نہ کر سکا اگرچہ اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

دیگر علماء

اسی ذیل میں درجہ بدرجہ وہ لوگ آتے ہیں جنھیں تصنیف و تالیف کا شوق تو تھا مگر بس اتنا کہ فلاں کتاب کے حوالے سے ایک بات لکھدی، اور فلاں کے حوالے سے دوسری۔ تحقیق و تنقیح سے کچھ مطلب نہیں۔ یہ مرض متاخرین میں بہت زیادہ تھا۔ ایسے لوگ عموماً اس دَور کی پیداوار ہیں جب امت ذہنی انحطاط میں مبتلا ہو چکی تھی اور اپنی مستقل تصنیف کی بجائے لوگ دوسروں کی کتابوں پر حاشیہ لکھا کرتے تھے اور پھر حاشیے پر حاشیہ۔

ان لوگوں میں سب سے ممتاز ہیں علامہ جلال الدین سیوطیؒ۔ بڑے عالم تھے، بڑے محدث تھے، فقیہ تھے، ادب کا ذوق تھا، اور تقریباً ہر علم و فن سے مَس تھا۔ مگر ان میں یہ کمزوری پیدا ہو گئی تھی کہ کسی طرح تالیفات کی تعداد دوسروں سے بڑھ جائے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ کسی کتاب کے حوالے سے بزرگانِ پیشین کے خلاف کوئی جھوٹی بات لکھ دینے کا یہ مطلب نہیں کہ کاتب کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ افسوس ہے کہ علامہ سیوطیؒ کی کسی کتاب میں تحقیق کی جھلک نہیں۔ ہر تصنیف خشک و بے جان ہے۔ موضوعات پر کتاب لکھی اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ۔ کتاب دیکھ کر آدمی سمجھے گا کہ شاید اس سے پتہ چل جائے گا کہ کونسی حدیث موضوع ہے اور کونسی نہیں۔ لیکن سیوطی صاحب نے یہ کتاب ایسے لکھی ہے کہ اشتباہ کسی طرح رفع نہیں ہوتا۔ اور آدمی کے سامنے کوئی محققانہ بات نہیں آتی۔ ان کی تحریروں میں اگر اتفاقاً کہیں چاشنی نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ عموماً بزرگانِ سلف کی تحریروں کی برکت ہوتی ہے۔ اُن کی تالیفات میں بدترین کتاب ہے تاریخ الخلفاء۔ لیکن افسوس ہے کہ مدارس میں تفسیرِ جلالین جیسی جامد و یابس کتاب پڑھانے والے لوگ غالباً تحقیق سے مناسبت نہ رکھنے کے سبب تاریخ الخلفاء ہی پر تکیہ کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے امت کی تاریخ پر عبور حاصل کر لیا۔ حالانکہ موجودہ دورِ تحقیق ہی میں نہیں بلکہ محدثینِ کرام کے اصول پر بھی

اس کا اکثر حصہ سوختنی ہے۔ البتہ ہمیں تسلیم ہے کہ وہ جامع اچھے ہیں، اور ان کی تالیفات سے پتہ چلتا ہے کہ کون کونسی کتابیں انھوں نے مطالعہ کیں۔ کاش اس کثرتِ مطالعہ سے کوئی مفید تر نتیجہ مرتب ہوتا، اور کسی ایک ہی موضوع پر وہ کوئی بلند پایہ تحقیقی کتاب چھوڑ جاتے۔

ابن قتیبہؒ علامہ ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ رحمہ اللہ عالم و بزرگ و فقیہ شخص تھے۔ ان کی متعدد کتابیں ان کے علم و فضل پر گواہ ہیں لیکن ان کے نام سے ایک کتاب رائج ہے الامامۃ والسیاسۃ۔ کتاب کیا ہے خرافات کا مجموعہ ہے۔ گمان ہے کہ علامہ ابن قتیبہؒ نے الامامۃ والسیاسۃ کے عنوان کے تحت کچھ یادداشتیں مرتب کی ہوں گی، لیکن کوئی دوسرا شخص انھیں لے اُڑا، یا اس نے اس کتاب کا نام چرالیا۔ یا خود علامہ ابن قتیبہؒ کا نام اختیار کر کے اس کتاب کو معتبر بنانا چاہا۔ بہرحال وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر کوئی شخص اپنا وقت ضائع کر کے اس کی بیان کردہ روایات کی تنقیح کرنی شروع کرے تو اس سے دس گُنی کتاب ہو جائے۔ لہٰذا اہلِ علم کو اس کے حوالے سے کوئی بات کہنی درست نہیں۔ اسے وقت گذاری کے لئے بھی پڑھنا موجبِ خسران ہوگا چہ جائیکہ اسے کوئی علمی حیثیت دی جائے۔

واقدی محمد بن عمر واقدی ایک مشہور داستان گو ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ تاریخی افسانے لکھنے کے موجد وہ ہیں۔ فتوحِ شام اس کا نمونہ ہے۔ اگرچہ اہلِ تحقیق کو آج باور نہیں کہ فتوحِ شام کے نام سے جو کتاب متداول ہے وہ انہی محمد بن عمر واقدی کی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی نام کے کسی دوسرے شخص کی ہو۔ یا کسی ایسے مجہول الاسم کی جس نے واقدی کا نام اختیار کر لیا ہو۔

بہرحال محمد بن عمر کو یہ سلیقہ ہو اور اسے عیب نہیں کہا جا سکتا، کہ تاریخی واقعات میں افسانوی تسلسل پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی طرف سے کچھ تفصیلات کا اضافہ کر دیا۔ یہ ایک فن ہے۔ اور اس میں گنجائش ہے کہ اپنی طرف سے وضع کر کے یا کہیں کا واقعہ کہیں چسپاں کر کے داستان مرتب کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں تاریخی واقعات معلوم کئے جاتے ہیں، اور افسانے کے کردار جاندار بنانے کے لئے تاریخی ہستیوں کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ لوگوں نے محمد بن عمر واقدی کو مؤرخ باور کر لیا۔ مستشرقین اپنے مطلب کے تحت اس نام کو خصوصیت کے ساتھ اعتبار کا درجہ دیتے ہیں۔

محدثینِ کرام کے ہاں چونکہ روایت کے صدق و کذب اور مرویات کی قوت وضعف سے بحث ہوتی ہے، پھر فنِ افسانہ نگاری سے انھیں کوئی تعلق نہیں اس لئے لامحالہ انھیں واقدی پر توجّہ کی ضرورت ہوئی۔ اگر اس غریب کو داستان گو ہی رہنے دیا جاتا جو کہ واقعی وہ ہے اور لوگ اسے مؤرخ نہ سمجھتے تو اس کی یہ فضیحت نہ ہوتی۔

علامہ سیوطیؒ نے اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعہ میں امام نسائی کا ایک قول لکھاہے جس کی تائید دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :

قال النسائی الکذابون المعروفون بوضع الحدیث اربعۃ ابن ابی یحییٰ بالمدینۃ والواقدی ببغداد ومقاتل بن سلیمان بخراسان ومحمد بن سعید المصلوب بالشام۔

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ جھوٹے لوگ جو اپنی طرف سے باتیں بنانے میں مشہور ہوئے چار ہیں ابن ابی یحییٰ مدینہ میں، واقدی بغداد میں، مقاتل بن سلیمان خراسان میں اور محمد بن سعید جسے سولی دی گئی تھی شام میں۔

مستشرقین اس سلسلے میں سب سے اہم مقام ان یہودی، نصرانی اور بے دین لوگوں کا ہی جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی "تحقیقی" کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ مستشرق کہلائے، اور انھوں نے حسبِ دعویٰ خود اقوامِ مشرق کے علوم وفنون اور ادیان کے مطالعے کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس گروہ کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم اسلام اور مسلمانوں کی حد تک ان کی اکثریت کی نیت تحقیق کی نہیں، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے استخفاف کی ہے۔ لہٰذا انھوں نے عمداً یا مسلمانوں کی بے شعوری کے سبب واقدی اور مسعودی جیسے لوگوں کو معیار بنایا، بلکہ الف لیلۃ ولیلۃ اور بعد کے افسانوں تک کو۔ اور اسی زاویۂ نگاہ سے انھوں نے مسلمانوں کو سمجھانا چاہا، بلکہ اسی آئینے میں اخلاف کو ان کی اور ان کے اسلاف کی صورت دکھانے کی کوشش کی۔ اور ہماری سادگی بھی دیدنی ہے کہ جو شکل انھوں نے دکھائی اسی کو ہم نے اپنی صورت باور کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کی تصانیف سے زیادہ مہلک چیز مسلم تعلیمیافتہ لوگوں کے لئے اور کوئی نہیں۔

افسوس ہے کہ امت کی موجودہ بیداری کے دَور میں بھی، نشاۃ ثانیہ کی تڑپ رکھنے کے باوجود "نئی روشنی" کے اہلِ علم نے یہ کوشش نہیں کی کہ اصل مآخذ پر متوجہ ہوں، اور دوسروں کی آنکھوں کے بجائے خود اپنی نگاہ سے اپنا سراپا دیکھیں۔ انھوں نے فرض کرلیا

کہ علم وہی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف آئے۔ ان کا تکیہ میور، اسمتھ اور وآلہاسن پر رہا ہے، اور اب ہتی اور گبن ان کے استاد ہیں۔ بڑی حمیت پیدا ہوئی تو مسعودی کو لے بیٹھے۔ یہ نہیں جانا کہ جس قوم کی بابت یہ روایتیں ہیں انھیں قبول کرنے یا نہ کرنے کے کچھ آداب بھی ہیں۔ محدثینِ کرام کے اصول تک اگر ان کی رسائی نہ تھی تو کم از کم اہلِ مغرب ہی کے اصولِ جرح و تعدیل کا لحاظ رکھا ہوتا۔

ان لوگوں کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ جس امت کا دستورِ اساسی کتاب و سنت ہو، اور جس کے اکابر نے اسلام کا نور چار دانگِ عالم میں پھیلایا، وہ خود کتاب و سنت کے محافظ اور پیرو ہونے چاہئیں، یا اُسے رَد کرنے اور اس کی فعالیت کم کرنے والے۔ اگر خلفائے اسلام دین کی برکات سے بہرہ ور نہ ہوتے تو دنیا کی ہدایت کا سبب کیسے بنتے۔

اس وقت پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بلادِ عربیہ میں بھی جو کتابیں تاریخ کے نام سے لکھی اور پڑھائی جاتی ہیں ان سے صرف ایک امر مترشح ہوتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں بالکل فضول تشریف لائے۔ آپؐ میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ اپنے گھر کے لوگوں کی اور اپنے قریب رہنے والوں کی کچھ اصلاح فرما سکیں۔ آپؐ نے دعویٰ تو کیا کہ آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کے ذریعہ دین کی تکمیل کی گئی، اور آپنے ایسی امّت برپا کی جو خیر الامم اور مصطفےٰ ہو۔ لیکن عالم یہ ہے کہ آپؐ کی امت آپ کا لایا ہوا نظام تیس۳۰ برس بھی امن و عافیت کے ساتھ نہ چلا سکی۔ آپؐ کے اصحاب یا اُن کے متبع جو ایک ہزار برس تک آپؐ کی دعوت کے علمبردار بنے رہے اور آپؐ کا کلمہ بلند کرنے میں کامیاب بھی ہوئے وہ سب معمولی انسانی اخلاق سے بھی عاری تھے چہ جائیکہ کمالاتِ ایمانیہ کے آئینہ دار سمجھے جائیں۔

یہ سب جذبات و تصورات ہمیں ان کی کتابوں میں ملتے ہیں جو اپنے آپ کو تاریخِ اسلام کا عالم باور کراتے ہیں، اور اس بات کے حقدار، کہ تاریخ کے نام سے خرافات لکھ کر قوم کے بچوں کے ہاتھ میں دیدیں، اور بچپن ہی سے اُن کے دماغوں میں وہ زہر بھر دیں کہ سلف صالحین کی طرف سے کبھی ان کے دل صاف ہی نہ ہوں، اور دعوتِ محمدیہ کی عظمت کبھی اُن کے دلوں میں جگہ ہی نہ پا سکے۔ ان لوگوں میں ایسے ایسے بھی ہیں جن کے ناموں کے ساتھ بڑی بڑی ڈگریاں لکھی جاتی ہیں۔ اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے نفیس اور شستہ انگریزی زبان میں کتابیں لکھیں اور ایسی کہ انگریز بھی انھیں لسانی حیثیت سے شہ پارہ کہیں۔

لیکن یہ تمام طلاقتِ لسانی اور روانیِ قلم صرف ہوئی محض اس بات پر کہ امت کی پوری تاریخ ان کے ہاتھوں مسخ ہوگئی۔ ان میں سب سے اہم مقام ہے جسٹس امیر علی کا جنھیں تاریخ کا امام کہا جاتا ہے، اور جن کی تصانیف کو حرفِ آخر کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان میں کذب و افترا، و تلبیس کے انبار جمع کر دیئے ہیں۔

پس چہ باید کرد؟ ان سب معائب و مصائب سے نجات کی واحد سبیل یہ ہے کہ سرکاری طور پر یا بطور خود ایک ایسی جماعت کی تشکیل جائے جس میں صحیح العقیدہ اور مخلص اہلِ علم ہوں۔ اہلِ بدعت و زندقہ کو نہایت قوت کے ساتھ اس کی رکنیت سے دور رکھا جائے۔ کسی شخص کو اگر سبائی خیالات سے متأثر پایا جائے تو اُسے فوراً جماعت سے نکال دیا جائے۔ جو لوگ عقیدتاً کتاب و سنت سے وفاداری نہیں برت سکتے انھیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ گفتگو کریں۔ ایسی جماعت کی اگر تشکیل کر لی گئی اور نہایت احتیاط سے اس کے ارکان کو چُنا گیا، اور اس کے سپرد یہ کیا گیا کہ تمام تاریخی مواد کی چھان بین کرے، اور اپنے اپنے شعبۂ تحقیق کے تحت لوگ کام کریں، اور پچیس تیس برس میں مسلمانوں کی مستند تاریخ پاکستان میں مرتب ہو جائے تو عالمِ اسلام کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ اسے پیش کیا جاسکے گا۔

اس وقت مصر میں ایک جماعت "لجنۃ الشبابِ المسلم" کام کر رہی ہے، اور فاضلِ اجل محب الدین الخطیب نے اس سلسلے میں بہت اصیل کام کیا ہے۔ موادِ تاریخی کی ہرگز کمی نہیں۔ تمام ماٰخذ تک موجودہ دَور کی متمدن دنیا میں رسائی کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔ کمی صرف اس کی ہے کہ اجتماعی طور پر کام نہیں ہوا۔ جن افراد نے بطور خود کام کیا ہے ان میں اکثریت یا تو ملّتِ اسلامیہ کے خفیہ دشمنوں کی ہے، یا ایسے لوگوں کی جنھیں تحقیق سے مناسبت نہیں، اور محض کتاب شائع کرنے سے مطلب رکھتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ ان کے ترکش کے تیروں کا ہدف کون ہے۔

قرآن حکیم نے نہایت بلیغ پیرایہ میں تاریخ کی تدوین کے اصول و قواعد پر متنبہ کیا ہے:

(۱) سب سے اہم ہے راوی کا پرکھنا تاکہ اس کی غلط بیانی یا تلبیس سے کسی کو بے وجہ نقصان نہ پہنچے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ	اے اہلِ ایمان! تمھارے پاس اگر کوئی بے قید

بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔ (الحجرات : ۶)	شخص کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ناواقفیت میں تم کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر تمھیں پچھتانا پڑے۔

(۲) واقعات کی ترتیب زمانی ہونی چاہئے۔ یہ درست نہیں کہ کہیں کا واقعہ کہیں، کبھی کا کبھی اور کسی کا کسی دوسرے کے نام چسپاں کر کے ربط کو خبط کر دیا جائے۔ قصص کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُلٹے پاؤں قدم بقدم چلا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے (الکہف : ۶۴) فَارْتَدَّا عَلٰى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (وہ قدم بقدم اپنے پاؤں کے نشانوں پر اُلٹے لوٹ پڑے)، اسی لئے احوالِ تاریخیہ کو قصص کہتے ہیں کہ زمانی اعتبار سے ترتیب وار واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

(۳) جو روایت بیان کی جائے اس کی تصدیق واقعات سے ہونی چاہئے اور درایت کی کسوٹی پر اسے پورا اترنا چاہئے۔

(۴) ماخذ قریب ترین عہد کا ہو جسے بے غل و غش معتبر تسلیم کیا جا سکے۔ اور ماحول کے مطابق قابلِ قبول ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ الصّلوٰۃ والتسلیمات کے احوال بیان کر کے مذکورۂ بالا تمام اصول کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ ارشادِ حق ہے:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔	بے شک ان واقعات کے ترتیب وار بیان میں عقلمندوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ یہ کوئی اپنی طرف سے بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ اس کی تصدیق ان ماخذ سے ہوتی ہے جو دسترس میں ہیں۔ اس میں ہر ضروری تفصیل ہے اور ایسی جو صاحب ایمان لوگوں کے لئے باعثِ ہدایت و رحمت ہے۔

اس آیت نے وضاحت کر دی کہ تاریخ کا مقصد عبرت و موعظت ہے تاکہ اخلاف ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جو اسلاف سے سرزد ہوئیں۔ لیکن عبرت و موعظت کے یہ معنی نہیں کہ بزرگوں پر سب و شتم اور طعن و تشنیع ہو۔ واقعات کا بیان ہدایت و رحمت کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ ضلالت و بغض و لعنت کے لئے۔

برادرانِ یوسف علیہم الصّلوٰۃ کی غلطیاں اللہ تعالیٰ نے سب بیان کر دیں۔ لیکن اس طرح کہ اُن کی محبّت و عزت دلوں میں قائم رہتی ہے۔ پیرایۂ بیان سراسر تعمیری نہ ہو،

جیسا کہ قرآن حکیم کا ہے تو نتیجہ تخریب نکلتا ہے اور تاریخ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کے مخالفوں کا ذکر کیا ہے لیکن انہی باتوں کا جن کا تعلق دعوت سے ہے۔ کسی کے ذاتی معائب اور نجی کمزوریاں بیان نہیں کیں اور نہ گالیاں دیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ فرعون و نمرود کی حیثیت عرفی کی ہتک نہ ہو لیکن اکابر امت محمدیہ کے خلاف کسی ہرزہ سرائی سے دریغ نہ کیا جائے، اور ان پر بہتان طرازی اور افترا کا نام تاریخ قرار دیا جائے۔ ان ملحدوں اور زندیقوں نے روایات کا جو پشتارہ امت کے لئے "ورثہ" میں چھوڑا ہے اگر اس کی تنقیح نہ کی گئی اور واقعات ثابتہ کی روشنی میں انھیں نہ پرکھا گیا تو ناممکن ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی تاریخ پر فخر اور اپنے اسلاف سے محبت پیدا ہو سکے، جو تعمیر و نشاۃ کے لئے اہم المہمات ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ اسلاف کرام کے ذکر کے وقت وہ اپنے آپ کو اس صفت سے متصف کریں جو اللہ تعالیٰ نے علم برداران دعوت محمدیہ کی بتائی ہے، اور وہی دعا وردِ زبان رکھا کریں جن کی خدائے بزرگ و برتر نے تلقین فرمائی ہے:۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ	خدایا ہماری بھی خطا پوشی فرما اور ہمارے ان بزرگوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر گئے۔ اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی

طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا تو ہی دلوں میں رافت و رحمت پیدا کرنے والا ہے۔

ہمارے بزرگ ہماری ہی طرح کے آدمی تھے۔ ان میں وہی بشریت تھی جو ہم میں ہے۔ ان کے اندر خوبیاں بھی تھیں اور ان سے غلطیاں بھی ہوئیں لیکن جب ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اپنے ذاتی بزرگوں کا تذکرہ گستاخی اور بے ادبی سے ہو اور ان پر جھوٹ بولا جائے تو ہم صحابہ کرام اور خلفائے اسلام کے متعلق یہ سب باتیں کس طرح برداشت کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے اور صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ اور اس خجالت سے محفوظ رکھے جو کل اپنے بزرگوں کے سامنے کھڑے ہونے پر ان لوگوں کو ہوگی جنھوں نے ان پر بہتان باندھے، ان کی نیتوں پر حملے کئے اور ان کی عزت و حرمت کو پامال کرنے کی کوششیں کیں۔ نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد خاتم النبیین و سید المرسلین و علی آلہ و اصحابہ و خلفائہ و من اتبعھم باحسان الی یوم الدین۔

علی احمد عباسی

یکم رمضان ۱۳۷۹ھ

نوٹ:۔ فاضل مؤلف کی جانب سے اس کتاب کا مسودہ کافی عرصہ قبل ہمیں موصول ہو چکا تھا، ادارہ کی دیگر مصروفیات کے باعث طباعت میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ ناشر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا، سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ، وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔

"وہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا، تاکہ وہ تمام دینوں پر غالب آجائے۔ اس دعوے کی گواہی کے لئے اللہ کافی ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسول، اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں نرم۔ تم دیکھوگے انھیں رکوع کرتے اور سجدہ ریز ہوتے۔ انھیں تلاش رہتی ہے اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی۔ سجدوں کے اثر سے اُن کے چہروں پر نشان ہیں۔ ان کی یہ صفت توراۃ میں مذکور ہے۔ اور انجیل میں اُن کی مثال دی گئی ہے اس کھیتی کی سی جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس میں طاقت آئی اور موٹی ہوئی تاآنکہ اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کھیتی والا اُسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے تاکہ کافر اسے دیکھ کر جلیں۔ اللہ نے ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں سے وعدہ کیا، کر بڑے اجر کا۔"

امابعد!

حضرت امیر المؤمنین امام المسلمین خلیفہ رسول رب العالمین سید الابدال سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ بھی اسی مبارک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کی صفت مذکورۂ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے، اس پر مستزاد ہے کہ آپ اسی پاک گروہ کے متفق علیہ امام اور نہایت ہی معتمد امیر بھی ہیں۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔

اموی خاندان کے اس چشم وچراغ، ملتِ بیضاء کے اس امام ہدیٰ اور راہلِ عالم

کے اس مثالی حکمران پر امتِ مسلمہ کو بجا طور پر ناز ہے اور اس پر فخر، کہ سرورِ دو عالم و عالمیان صلے اللہ علیہ وسلم نے جس خیر امت کی تشکیل کی اس کے پشتیبانوں میں سیدنا معاویہؓ جیسے مقتدائے جہاں امام پیدا ہوئے، اور چالیس برس تک اس خوبی سے امارت و امامت .... کے فرائض انجام دیتے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام نامی اور اسم گرامی صفحۂ دہر پر جلی حروف میں ثبت رہے گا۔

بچپن کے احوال مستند طریقے پر بیان نہیں کئے جا سکتے۔ لوگوں نے جو باتیں بیان کی ہیں ان اچھی بُری روایات کا کوئی حتمی ثبوت نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ اہلِ عرب میں جن امور کو کمالِ رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی شہ سواری، تیر اندازی، شمشیر زنی، خطابت، نسب دانی وغیرہ ان میں آپ کو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ جیسا کہ آپ کی تاریخی زندگی سے ہویدا ہے، سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جو اس وقت اہلِ عرب میں انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ قریش میں گنے چنے افراد ہی پڑھے لکھے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں آپ کا مقام ہم چشموں میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔ کتبِ سیر و ادب میں آپ کا شمار منجملہ ان چند ہستیوں کے کیا گیا ہے جن کی ادبی قابلیت اعلیٰ ترین سمجھی جاتی تھی۔ جاحظ نے البیان والتبیین میں حضرت سعید بن مسیبؒ کا ایک قول نقل کیا ہے، ان سے پوچھا گیا "سب سے زیادہ فصیح کون ہے؟" فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ لوگوں نے کہا "ہم یہ نہیں پوچھتے"۔ تو فرمایا "معاویہ اور اُن کے فرزند (یعنی امیر المؤمنین یزید اوّل)، سعید اور اُن کے فرزند (یعنی حضرت سعید بن العاصؓ اور ان کے فرزند حضرت عمرو الاشدق)۔ ابن الزبیرؓ بھی ان سے کم نہیں لیکن اُن کے کلام میں دلپسند شیرینی کم تھی"۔

ان کے علاوہ جو وہبی خصائص ہیں مثلاً شرفِ نسب اور اس کے مقتضیات یعنی شجاعت، سخاوت، حلم، متانت، اصابتِ رائے، عزیمت وغیرہ فضائل بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ صورتاً وجیہ اور بارعب تھے۔ رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور قد بالا۔ وضع قطع اور چال ڈھال پُر عظمت تھی۔ دبدبہ و وقار میں لاثانی تھے۔ لیکن انتہا، حلم کے سبب بسا اوقات لوگوں کی طرف سے گستاخانہ حرکتیں ہو جاتی تھیں، جو اگر آپ کی ذات تک محدود ہوتیں تو چشم پوشی فرماتے، اور ملت کے لئے خطرناک ہوتیں تو عبرتناک سزا دیتے۔

بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے۔ ہمعمروں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرتے، عمر رسیدہ لوگوں کی تعظیم کرتے، اور اہلِ علم کی قدر فرماتے۔ اہلِ کمال کی عزت افزائی آپ کا شعار تھا۔ ہر کہ ومہ کو آپ کے سامنے آزادانہ گفتگو کا حق تھا، اور آپ بڑی فراخ دلی سے لوگوں کے اس حق کی پاسداری فرماتے اور حفظِ مراتب کا لحاظ رکھتے تھے۔

سخت سے سخت ابتلاء کے وقت ثابت قدم رہتے، اور دیکھنے والا حیران ہوتا کہ اس عالم میں بھی ثباتِ قلب اپنی جگہ ہے۔ عدل کے ساتھ کرم گستری آپ کا شعار تھا۔ ناانصافی کسی کی برداشت نہ تھی۔ حق والے کو کبھی خدشہ نہ ہوتا کہ آپ کی عدالت میں اس کا حق مارا جائے گا۔

چھوٹے بڑے ہر مسئلے میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشِ نظر رکھتے۔ ہمعصر حضرات میں دین کی سمجھ کے اعتبار سے آپ کا درجہ بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ فقہ و حدیث میں پایہ بلند تھا۔ استخراجِ مسائل کا خوب ملکہ رکھتے تھے۔ خود صاحبِ مذہب اور مجتہد ہیں۔ کتبِ حدیث و فقہ میں آپ کی مروی احادیث اور آپ کے فتاویٰ موجود ہیں جن سے استشہاد کیا جاتا ہے۔

بظاہر نہایت شان و شوکت اور دبدبے کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن مزاج میں فروتنی تھی اور طبیعت زاہدانہ۔ فقیر کی تمکنت اور امیر کی مسکنت کا عجیب و غریب نمونہ تھے۔ کوہِ حلم تھے، اور دریائے سخاوت۔ دونوں صفتیں آپ کی ضرب المثل ہیں۔ بے ریا دوست تھے اور بے کینہ دشمن۔ حضرت قَبیصہ بن جابر اسدی فرماتے ہیں: [طبری ۶: ۱۸۸]

صحبت معاویۃ فمارأیت رجلاً احب رفیقاً ولا اشبہ سریرۃ بعلانیتہ منہ۔	میں معاویہ کے ساتھ رہا ہوں۔ ان سے زیادہ محبوب ساتھی کسی کو نہ پایا اور نہ ظاہر و باطن میں ایسی یکسانیت دیکھی۔

جن حضرات نے آپ کا زمانہ پایا وہ آپ کو ہادی و مہدی سمجھتے تھے۔ حضرت ابو بکر الاثرم اور ابن بطّہ وغیرہ ائمۂ اسلام نے حضرت قتادہ، حضرت اعمش، حضرت عبداللہ بن احمد بن حنبل وغیرہ سے روایت کی ہے کہ سیدنا معاویہؓ کا زمانہ اگر لوگ دیکھتے تو کہتے کہ مہدی یہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت حضرت عبداللہ بن احمد کی روایت کی ہے۔ انھوں نے ابوسعید الاَشجّ سے روایت کی، انھوں نے ابو اسامہ ثقفی سے اور انھوں نے ابو اسحاق سبیعی

کی بابت بتایا [العواصم من القواصم : ص ۲۰۵]

انہ ذکر معاویۃ فقال لو ادرکتموہ او ادرکتم ایامہ لقلتم کان المہدی۔	کہ انھوں نے حضرت معاویہ کا ذکر کیا اور فرمایا اگر تم لوگوں نے انھیں دیکھا ہوتا یا اُن کا زمانہ پاتے تو کہتے مہدی یہی ہیں۔

یہ ابو اسحٰقؒ سبیعی، امیرالمؤمنین سیدنا علیؓ کے عقیدتمندوں میں ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے سبائیہ سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا، کیونکہ وہ لوگ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی جناب میں بے ادب ہوگئے تھے، مگر خود ان میں آخر تک تشیّع کی رگ رہی۔ اس لئے ان کا بیان حجت ہے۔ یوں سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا۔ کی مقبولیت کا ظہور ہوا، جو آپ نے سیدنا معاویہؓ کے حق میں کی تھی:

اللّٰھم اجعلہ ہادیًا مہدیًا واھد بہ۔	خدایا اسے ہدایت دینے والا، ہدایت پر رہنے والا بنا۔ اور اس کے ذریعہ مخلوق کی رہنمائی فرما۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو تین برس رہے۔ پیشکارِ رسالت کی حیثیت سے جلوت و خلوت میں ساتھ تھا۔ آپ منجملہ ان چند بزرگواروں کے ہیں جنھیں وحیِ الٰہی کی کتابت کا شرف حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگواروں کو ذی مرتبہ اور پاکباز بتا کر ان پر طعن کرنے والوں کو سخت الفاظ سے یاد کیا ہے (سورۃ عبس)

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝	ہرگز نہیں! بلکہ یہ تو تذکرہ ہے، جو چاہے اس سے نصیحت پکڑے۔ ان صفحات میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے بلند رکھا جاتا ہے اور جو پاک ہیں۔ ان کاتبوں کے ہاتھوں میں جو

ذی مرتبہ اور پاکباز ہیں۔ ہلاک ہو یہ انسان اسے اس انکار کی کیسی جرأت ہے۔

بعض حضرات نے ان کاتبوں سے مراد فرشتے لیتے ہیں حالانکہ اس حصر کی کوئی دلیل نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب جو مستقل طور پر اس خدمت کے لئے چُنے گئے تھے وہ بھی اس صفت سے کیوں نہ متصف سمجھے جائیں۔ انہی کے توسینوں میں بھی یہ قرآن محفوظ تھا۔ (العنکبوت ۴۹) یہی تو زمین پر اللہ کے گواہ اور بہترین امت ہیں، ان کے نزدیک ایمان محبوب ہے، اور اسی سے ان کے قلوب کو آراستہ کیا گیا ہے۔ ان کے دلوں میں طبعًا کفر،

فسق اور نافرمانی سے نفرت ڈال دی گئی ہے۔ اس مبارک و مقدس گروہ میں حضرت صدیق اکبر، حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان ذی النورین، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت معاویہ، حضرت اُبَیّ بن کعب اور حضرت زید بن ثابت وغیرہم ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان برگزیدہ اور مقبولِ بارگاہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کا امین اور مبلّغ بنایا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرف کا انھیں اہل سمجھا، اور یہ خدمات اُن کے سپرد فرمائیں۔ تو پھر ان کی عظمت و جلالتِ قدر کے انکار کی جرأت کسی صاحبِ ایمان کو کیسے ہوسکتی ہے۔

اسلام اور ہجرت

عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یا انھیں بالقصد مبتلا کردیا گیا ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا، حالانکہ یہ خیال درست نہیں۔ آپ کا اسلام فتح سے پہلے کا ہے۔ غالباً صلح حدیبیہ کے بعد جو وقفہ ہوا، اس زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ اگرچہ ہجرت نہیں کی۔ اور اسی لئے فتح سے پہلے آپ کا اسلام مشہور نہ ہوسکا۔ کیونکہ ہجرت بہرحال فتح کے بعد کی تھی۔ امام ابن عساکرؒ نے اس کی تصریح کی ہے [تاریخ دمشق: بذیل مادہ معاویہ۔ منقول از المنتقیٰ تعلیقہ ص ۲۵۷] کہ سیدنا معاویہؓ نے صلح حدیبیہ اور عمرۂ قضاء کے درمیان اسلام قبول کیا تھا۔ البتہ وہ قریش کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اسے پوشیدہ رکھتے تھے۔ اپنے بزرگوں کے پاس خاطر سے اور حالات کے ناموافق ہونے کی بناء پر فتح مکہ سے پہلے اعلان نہ کرسکے۔ اکثر قریش کے سمجھدار نوجوانوں کا یہی وتیرہ تھا۔ قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ (الفتح: ۲۵)

چونکہ یہ امر مسلّم و متواتر ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ کا مستقل قیام مدینہ طیبہ میں رہتا تھا۔ اس لئے آپ کے اسلام کو فتح سے پہلے کا خودبخود تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک آپ فتحِ مکہ سے پہلے مسلمان نہ ہوگئے ہوتے تو مدینہ طیبہ میں آپ کے قیام کی کوئی سبیل نہ تھی۔ کیونکہ فتح کے بعد ہجرت کا سلسلہ قطعاً بند ہوچکا تھا۔ اعلان عام ہے لاھجرۃ بعد الفتح (فتح کے بعد ہجرت نہیں)۔ اس اعلان پر نہایت سختی کے ساتھ عمل ہوا۔ حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ نے بحالتِ کفر غزوہ حنین میں شرکت کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا عباسؓ کے مہمان کی حیثیت سے کچھ دن مدینہ طیبہ میں بھی رہے تھے۔ لیکن چونکہ اسلام لائے فتح کے بعد اس لئے انھیں ہجرت کی اجازت نہیں دی گئی۔ مدینہ طیبہ سے جاکر کچھ دن کے بعد انھوں نے اسلام کا اعلان کیا، اور تمام مال و متاع لے کر بہ نیتِ ہجرت

مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مکّہ کو واپس کردیا۔ صرف ایک صاحب کی مثال ہے کہ اُن کی ہجرت قبول کرنے پر سیدنا عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دی تھی، تو آپؐ نے فرمایا تھا: "میں محض اپنے چچا کی قسم پوری کر رہا ہوں ورنہ فتح کے بعد ہجرت نہیں۔"

ایسی صورت میں یہ امر ناگزیر ہے کہ سیدنا معاویہؓ اور ان کے والد ماجد سیدنا ابوسفیانؓ کو حقیقی معنی میں مہاجر تسلیم کیا جائے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں ان کا قیام مسلمات میں ہے۔ سیدنا ابوسفیانؓ تو یقیناً فتح سے ایک دن پہلے مسلمان ہوئے، اور اس طرح ان پر ہجرت واجب ہوگئی۔ اور سیدنا معاویہؓ کا اسلام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح سے پہلے کا تسلیم کیا۔ لہٰذا انھوں نے بھی ہجرت کی۔ اُن کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ قدیم الاسلام مہاجر ہیں۔ اب سیدنا ابوسفیانؓ اور سیدنا معاویہؓ محض یہی نہیں تھا کہ مدینے میں رہتے ہوں بلکہ مملکتِ اسلامیہ کے اہم ترین مناصب پر بھی فائز تھے۔ سیدنا معاویہؓ کو کتابتِ وحی کی خدمت سپرد تھی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو نجی یا سرکاری مہمان آتے تھے ان کی مہمانداری کی خدمت بھی آپ ہی کے ذمہ تھی۔ سیدنا ابوسفیانؓ کو نجران جیسے اہم علاقے کا والی بنایا گیا تھا۔ اور آپ وفاتِ نبوی تک اس منصبِ جلیل پر فائز رہے، جو صرف معتمد ترین کارکن ہی کے سپرد کیا جاسکتا تھا۔ نصاریٰ کے سیاسی اور دینی مرکز پر جو والی بنایا جائے گا اس سے زیادہ مخلص اور معتمد کون ہوگا۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ان کی مدنی زندگی کے یہ حقائق ہیں جنھیں مسلمات و متواترات کا درجہ حاصل ہے، اور دوسری طرف اس واہی غلط العام کو بھی لوگ کتابوں میں لکھ مارتے ہیں کہ سیدنا ابوسفیانؓ اور ان کے فرزند سیدنا معاویہؓ فتح مکّہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ پھر مزید حرکت یہ ہے کہ انھیں مؤلفۃ القلوب میں سمجھا جاتا ہے (یعنی ان لوگوں میں جنھیں اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے داد و دہش سے کام لیا گیا)۔ سیدنا معاویہؓ پر یہ نوازش علامہ سیوطیؒ جیسے اہلِ قلم نے کی ہے۔ فرماتے ہیں: [تاریخ الخلفاء، بذیل عنوان معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، ص ۷۵، طبع مصر]

اسلم هو و ابوه یوم فتح مکّة وشهد حنیناً و کان من المؤلّفة قلوبهم ثم حسن اسلامه۔	وہ اور ان کے والد فتح مکّہ کے دن مسلمان ہوئے غزوہ حُنین میں شرکت کی، مؤلفۃ القلوب میں تھے۔ پھر ان کا اسلام درست ہوگیا۔

اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مولفۃ القلوب میں ہوتے تب تو ان کے پاس دولت کی فراوانی ہونی چاہیے تھی۔ اور اگر مال ہی مطلوب ہوتا یا دکھاوے کو مسلمان ہوئے تھے تو انھیں کوشش کرکے مکہ ہی میں رہنا چاہیے تھا، جہاں کنبہ تھا، جائداد تھی، اور مال و متاع تھا۔ کاش یہ قلم چلانے والے لوگ سلفی کی طیوریات اور مسعودی کی خرافات دیکھنے کی بجائے صحاح کو مآخذ بناتے تو یوں ٹھوکریں نہ کھاتے۔

یہ امر مسلمات میں ہے جس کا انکار ایک جاہل ترین دشمنِ امانت ہی کرسکتا ہے کہ سادات امویہ کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حیثیت قریش میں بہت اونچی تھی۔ بنو مخزوم کے بعد کوئی خاندان ثروت، وجاہت اور عددی قوت میں ان کا سہیم نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجہل مخزومی کے مارے جانے کے بعد قریش کی قیادت سیدنا ابوسفیانؓ کے سپرد ہوئی، اور ان ہی کو شیخ قریش مانا جاتا تھا۔ غرض یہ ہے کہ جہاں تک دنیوی مال و متاع، عزت و حرمت اور شان و شوکت کا تعلق ہے وہ اس خانوادے کو پہلے سے حاصل تھی۔ اگر سیدنا ابوسفیانؓ اور سیدنا معاویہؓ مؤلفۃ القلوب میں ہوتے تو اُن کے مال و متاع میں معتد بہ اضافہ ہوگیا ہوتا۔

اگر بالفرض ہجرت کے معاملے میں انھیں بھی مستثنیٰ کردیا گیا تھا جیسے سیدنا عباسؓ کے اصرار پر ایک صاحب ہوگئے تھے، تب بھی ان کے مال میں کمی کا کوئی سوال نہ تھا، بلکہ مدینۂ طیبہ آجانے سے انھیں توقع ہوتی کہ تالیفِ قلب کے سلسلے میں کچھ اور روپیہ بارگاہِ رسالتؐ سے ملا کرے گا۔ انھیں اس امر سے بھی کوئی چیز مانع نہ تھی کہ مکہ کی جائداد فروخت کردیں اور اپنی سب دولت لے کر مدینہ آجائیں۔ یعنی یہاں بھی وہ اسی شان سے رہتے جیسے مکۂ معظمہ میں رہا کرتے تھے۔ لیکن صورتِ حال اس کے بالکل خلاف ہے۔

دونوں باپ بیٹے مدینۂ طیبہ میں باقی مہاجروں کی طرح عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بلکہ خَیبَر اور بنو قُرَیظَہ کے مال سے مہاجروں کی حالت تو کچھ درست ہوگئی تھی اور وہ انصار کے دست نگر نہیں رہے تھے۔ مگر ان کی عسرت بدستور رہی، کیونکہ ان دونوں نے ہجرت بعد میں کی تھی۔ لہٰذا سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ان دونوں نے جو ہجرت کی تو اللہ کے لئے تمام آبائی اور ذاتی مال و متاع سے دستبردار ہوکر مدینۂ طیبہ آرہے تھے۔ اور اپنی کفر کی پچھلی زندگی کا کفارہ ادا کر رہے تھے۔ حالانکہ کفر کی حالت میں بھی ان کی دشمنی کی وہ کیفیت نہ تھی جو ابوجہل وغیرہ کی بیان کی جاتی ہے۔ لوگوں نے امویوں

اور ہاشمیوں کے مابین ازلی ابدی دشمنی ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی روایتیں وضع کی ہیں لیکن صحاح کی روشنی میں اور واقعات ثابتہ کی موجودگی میں وہ سب بے اصل اور باطل نظر آتی ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے الاصابہ (۲: ۱۷۹) میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب قریش (کے غیر ذمہ دار لوگ) اذیت پہنچاتے تو آپ سیدنا ابو سفیانؓ ہی کے گھر میں پناہ لیا کرتے تھے۔ حضرت ابو سفیانؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز سیدنا عباسؓ کے مابین زمانہ جاہلیت میں برادرانہ تعلقات استوار رہے۔ تحائف بھی ایک دوسرے کے ہاں برابر بھیجے جاتے تھے۔ جنگِ بدر کے لئے جب قریش نکلے ہیں، اور مسلمانوں کی امن دوستی کی بناء پر شام سے آنے والا قافلہ بخیر و خوبی نکل جانے کے باوجود ابو جہل نے کہا تھا کہ ہم مدینہ پر ضرور حملہ کریں گے، تو ابو سفیانؓ نے اس کی مخالفت کی تھی کہ ایسا کرنا اب موزوں نہیں۔ لیکن ابو جہل اپنے اصرار پر قائم رہا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ مدینہ پر "رعب" ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ اس ضد کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے دن سیدنا ابو سفیانؓ کے گھر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دارالامان قرار دیا تھا۔ یہ گھر حرم شریف سے ملحق تھا۔ توسیعِ حرم کے سلسلے میں اسے مسجد حرام میں شامل کر دیا گیا۔ علامہ محب الدین الخطیب فرماتے ہیں (المنتقیٰ: ص ۲۵۳ تعلیقہ ۲) کہ "میں نے حرم شریف کا وہ حصہ دیکھا ہے جو پہلے دار ابی سفیانؓ تھا۔ وہاں ایک پتھر نصب تھا جس پر نہایت حسین خط میں کندہ تھا من دخل دار ابی سفیان فھو آمنؓ (جو بھی ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے گا اسے امان ہے)۔ اب تو وہ گھر ویسے ہی حرم ہو گیا ہے جس کے متعلق اعلان عام ہے من دخلہ کان آمناً (جو وہاں چلا جائے اُسے امان ہے)۔

اس عظیم شرف کو لوگ پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لئے سیدنا عباسؓ کی زبان سے یہ الفاظ بڑھا دیئے گئے "یارسول اللہ! ابو سفیان تفاخر پسند شخص ہیں اس لئے انھیں کوئی امتیاز بخش دیجئے" تو آپ نے مذکورۂ بالا الفاظ فرمائے۔ لیکن روایتوں سے کہیں حقیقتیں چھپائی جا سکتی ہیں۔ قریش اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو نزاع تھا وہ دین کا تھا، اور ایسا کہ درمیانی سمجھوتے کا امکان نہ تھا۔ اس لئے یہ مخالفت تھی۔ ورنہ قریش تو چاہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نرم پڑ جائیں تو وہ بھی اپنا رویّہ بدل دیں (القلم: ۹)۔ قریش کی مخالفت کو گھرانوں

اور خاندانوں کی چشمک بتانا یا ذاتی عناد باور کرانا، نہایت ظلم ہے۔ ان پر جب حقیقتیں کھل گئیں تو جس طرح ہاشمی کافر مخلص مومن بن گئے اسی طرح اموی کافر بھی دین کے بہترین علم بردار ثابت ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ہاشمی کافر بھی اموی کافروں سے کم نہ تھے۔ ویسے منافی عصبیت دونوں میں تھی۔ یعنی آلِ عبد مناف ہونے کی حیثیت سے محمدؐ بن عبداللہ کی پاسداری سب کرتے تھے، اگرچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بنیادی اختلاف تھا جو حرارتِ دینی کے تحت شدت بھی اختیار کر جاتا تھا۔ چنانچہ ابولہب ہاشمی کے علاوہ سیدنا ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی بھی آپ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ وہ بھی فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ سیوطیؒ جیسے لوگ انھیں نہ مسلمی الفتح اور طلقاء میں ہونے کو شہرت دیتے ہیں اور نہ مؤلفۃ القلوب میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ ان خطابوں کے لئے امویوں ہی کو خاص کر دیا گیا ہے اور وہ بھی افتراءً۔

سیدنا ابوسفیانؓ اموی کا فتح سے ایک دن پہلے مسلمان ہونا مسلمات میں ہے۔ اور سیدنا معاویہؓ کا مہاجر ہونا بھی۔ گویا ان کا ایمان بھی فتح سے پہلے کا تسلیم کرنا ہوگا، اور یہ بھی کہ دونوں باپ بیٹوں نے نہایت رغبت اور خلوص کے ساتھ اسلام قبول کیا اور نہایت درجہ دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ لِلّٰہِ فِی اللہ ہجرت کی۔

صحیحین میں ہمیں ایک واقعہ ملتا ہے [مسلم: صحیح، ۶۳۸-۶۳۹، ج ۱، طبع مصر] کہ سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا جب طلاق کے بعد اپنی عدت پوری کر چکیں، تو دو صاحبوں نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا۔ ایک سیدنا معاویہؓ نے اور دوسرے سیدنا ابوجہمؓ نے۔ سیدہ فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا کہ دونوں میں سے کسے قبول کریں۔ آپؐ نے فرمایا "معاویہ صُعلوک ہیں اور بے زر، ابوجہم کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ سختی کا ہوتا ہے۔ تم اسامہ سے نکاح کر لو۔"

صُعلوک کہتے ہیں مفلس شخص کو۔ اب کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ جس کا گھرانا مالدار ہو اور اس پر کوئی تباہی بھی نہ آئی ہو، اور جسے مؤلفۃ القلوب میں بتایا جاتا ہو، وہ مدینہ میں عسرت کی زندگی بسر کرے، اور عسرت بھی ایسی کہ اس کی وجہ سے خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح نہ کرنے کا مشورہ دیں۔ اگر سیدنا معاویہؓ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے ہوتے تو مدینہ طیبہ ہرگز نہ رہ سکتے، اگر مؤلفۃ القلوب میں ہوتے تو مفلسی کا کوئی سوال نہ تھا، خوب مالدار ہوتے، اور اگر رعایتاً انھیں ہجرت کی اجازت دی گئی ہوتی

تب بھی مکہ سے اپنا سب مال و متاع منتقل کر لیتے۔

گویا اصل بات جو حقیقت الامر ہے، اور جسے ہر دیانت دار آدمی کو تسلیم کرنا چاہیئے وہ یہی ہے کہ سیدنا ابو سفیانؓ اور سیدنا معاویہؓ کا ایمان فتح مکہ سے پہلے کا ہے، وہ مؤلفۃ القلوب میں ہرگز نہیں بلکہ صحیح معنی میں مؤمن و مہاجر ہیں۔ صمیمِ قلب سے ایمان لائے اور خلوص کے ساتھ ہجرت کی۔ اس تبتّل الی اللہ کا انھوں نے عملی ثبوت یہ دیا کہ خاندانی جائداد اور مال و متاع سے ہاتھ دھوئے۔ اور محض اللہ کے لئے مدینہ طیبہ میں عسرت کی زندگی بسر کر کے مدارجِ روحانی طے کئے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں اپنے ان سچے بندوں میں شامل کر لیا جن کے متعلق وہ فرماتا ہے: اولٰئک ھم المؤمنون حقًّا (یہی ہیں سچے مؤمن)

ایک نام نہاد صوفی صاحب نے یہ سطحی بات کہی ہے کہ چونکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بہت کم عرصے نصیب رہا اس لئے ان کا سلوک پورا نہ ہو سکا، اور ان میں وہ کمالات پیدا نہیں ہوئے جو تکمیلِ نفس اور روحانی ریاضتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا آپ اتنے بڑے صاحبِ ادراک ہیں کہ اس بیسویں صدی کی رسمی گدی پر بیٹھ کر صحابۂ کرام کے سلوک و معارف پر حرف زن ہونے کی مجال رکھتے ہیں۔ حضرت غوث الاعظمؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ تو اپنی یہ حیثیت نہیں سمجھتے کہ صحابۂ کرامؓ کے معاملات میں محاکمہ کریں، لیکن ان صوفی صاحب کی یہ ہمت ہے۔ ان صاحب کا خیال قطعًا بے اصل اور بے دلیل ہے۔ وجدان اور ادراک بھی اس واہی خیال کا منکر ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بعد کے تمام اصحابِ جرح و تعدیل سے بلند ہیں اور قطعًا اس کے محتاج نہیں کہ کوئی صاحب ان کے احوالِ قلبی اور مدارجِ سلوک کی تکمیل کا صداقت نامہ انھیں عطا فرمائیں۔

ان صوفی صاحب نے جو یہ لغو اور سفیہانہ بات کہی ہے وہ اصولِ شرعیہ کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ منہاجِ اہلِ طریقت کے بھی خلاف ہے۔ تکمیلِ نفس اور کمالِ سلوک کے لئے مدّت کی شرط آج تک کسی نے نہیں لگائی۔ اس کی شرط صرف ایک ہے مربّی کی قوّتِ تصرف اور مربّٰی کی صلاحیت۔ تحصیلِ علم و فن میں بھی روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی سالہا سال ایک علم اور ایک فن حاصل کرتا ہے، بڑے بڑے اساتذہ سے فیض اٹھاتا ہے لیکن صلاحیت و مناسبت کی کمی کے سبب درجۂ اجتہاد تک نہیں پہنچتا۔ لیکن دوسرا شخص جودتِ فہم اور

سرعتِ ادراک کی بناء پر برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا دنوں میں پورا کر کے اس علم پر مجتہدانہ کلام کر سکتا ہے اور اس فن پر ماہرانہ عبور حاصل کر لیتا ہے۔ اربابِ طریقت کے ہاں بھی یہ امر مشہود ہے۔ مثلاً حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانیؒ نے چند ہفتوں میں سلوک طے کر کے یہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ آپ کے شیخ حضرت خاتم الطریقۃ سیدنا محمد الباقی باللہؒ نے اپنے برسوں کے مریدوں کو بلکہ خلفاء کو آپ کے حلقے میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور اتنا ہی نہیں خود بھی کبھی کبھی تشریف رکھتے تھے۔ ایسی ہی سینکڑوں ہزاروں مثالیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوّتِ تصرف اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آپؐ کے اصحاب کا مصطفیٰ ہونا ایسی بات ہے کہ اس میں زمانے کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ ؎

منزلِ عشق بسے دور دراز است ولے ٭ طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی علمی و روحانی رفعت کے ادراک کا موقعہ صرف ہمعصر صحابہ کرام کو تھا۔ ان کے ارشادات آگے آرہے ہیں۔ کمال روحانی میں سب سے اونچا درجہ نماز کا ہے۔ جسے نماز پڑھنی آگئی اسے سب کچھ آگیا۔ کیونکہ نماز ہی معراج المؤمنین ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے قاضیِ دمشق اور جلیل القدر صحابی سیدنا ابو دَرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے (المنتقیٰ : ص ۳۸۹)

ما رأیت احدا اشبہ صلوٰۃ بصلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اما مکم ھٰذا یعنی معاویۃ۔	میں نے کسی شخص کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے ایسی مشابہت نہیں دیکھی جیسی تمہارے اس امام کی (نماز کی) ہوتی ہے آپ کی مراد سیدنا معاویہؓ سے تھی۔

یہ بر خود غلط صوفی صاحب محفلِ سماع میں ہاؤ ہو یا مراقبے میں کچھ ورودِ فیضان کے سبب اپنے آپ کو عارف سمجھ لیں، لیکن صحابۂ کرام کا سلوک اور ان کے معارف کا ادراک شئے دیگر ہے۔ اسے فیضانِ نبوّت کہتے ہیں جو صحابۂ کرام کے بعد شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اور جب ہوتا ہے اُسے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام کے نام آنے پر اس کی گردن جھک جاتی ہے، اور قلم کچھ کہتے لرزتا ہے۔ یہی معنی ہیں ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ کے (یعنی (سابقوں کی تعداد) پہلوں میں بہت ہوگی اور بعد کے لوگوں میں کم) [الواقعہ : ۱۳-۱۴]۔ سیدنا ابو درداءؓ کے اس ارشاد سے ممکن ہے یہ صوفی صاحب تعدیلِ ارکان مراد لیں

جو ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہے۔ جی نہیں! یہاں وہ نماز مراد ہے جو سنتِ نبویہ کے مطابق اور کیفیاتِ رسالت سے استفادے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سیدنا معاویہؓ بھی اسی طرح صاحبِ ارشاد ہیں جیسے حضرت صدیق اکبر، حضرت فاروق اعظم، حضرت عثمان ذو النورین، حضرت علی مرتضیٰ حضرت عباس، حضرت انس، حضرت جابر، حضرت ابو ذر اور حضرت ابو ہریرہ وغیرہم جن سے سلاسل چلے ہیں۔ رضوان اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔ صغار صحابہ اور اکابر تابعین نے آپ سے فیض لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کا یہ فیض امت میں جاری ہے، ان صوفی صاحب کو معلوم ہو یا نہ ہو۔

سیدنا معاویہؓ کی عظمت و جلالتِ قدر کا حال تو ان اوراق سے معلوم ہو ہی جائے گا۔ لیکن یہاں ہم سیدنا ابو سفیانؓ کی قوتِ ایمانیہ کا بھی ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ حضرت ابو سفیانؓ کی ذات اقدس داعلیٰ دشمنانِ صحابہ کے ہاں مطعون ہے۔ یہ اس علمی ثبوت کے علاوہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے مخلص و معتمد صحابی تھے کہ نجران جیسے علاقے کا انھیں مستقل والی بنا دیا گیا تھا۔ سیدنا ابو سفیانؓ کی آزمائش اسلام کے بعد ہی کی گئی اور وہ کامیاب آئے۔ مناۃ کا بت توڑنے کے لئے آپ کو بھیجا گیا تھا، جو قریش کا نہایت محترم بت تھا۔ سیدنا ابو سفیانؓ نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑا۔ پھر غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں شریک ہوئے۔ طائف کے معرکے میں آپ کی ایک آنکھ میں تیر لگا اور وہ ضائع ہو گئی۔ اس کرب کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا "کہو تو میں دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ تمھاری آنکھ صحیح و سالم بنا دے، اور چاہو تو صبر کرو جس کے بدلے میں جنت ملے گی"۔ سیدنا ابو سفیانؓ نے جنت اختیار کی۔ پھر جنگِ یرموک میں آپ نے جس جوش اور مجاہدانہ روح کا ثبوت دیا اس کا حال سیدنا مسیّبؒ سے سنئے جو اصحابِ شجرہ میں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یرموک کے دن میں صرف ایک ہی نعرہ سن رہا تھا باقی لوگ خاموش تھے وہ نعرہ تھا یَا نَصرَ اللّٰہِ اِقتَرِب (اے اللہ کی مدد جلد پہنچ)۔ میں نے جو مڑ کر دیکھا تو وہ آواز (سیدنا) ابو سفیانؓ کی تھی جو اپنے فرزند (سیدنا) یزیدؓ کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہے تھے"۔ [المنتقیٰ: ص ۲۵۴ تعلیقہ]

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ امام مسلمؒ نے اسے کس طرح قبول کر لیا۔ کیونکہ اس کا موضوع ہونا بدیہی ہے [صحیح مسلم: مناقب ابی سفیان رضی اللہ عنہ]

حدثنی عباس بن عبد العظیم العنبری	مجھ سے عباس بن عبد العظیم عنبری اور احمد بن

واحمد بن جعفر المعقری قالا حدثنا النضر (وہو ابن محمد الیمامی) حدثنا عکرمۃ حدثنا ابو زمیل حدثنی ابن عباس قال کان المسلمون لاینظرون الی ابی سفیان ولایقاعدونہ فقال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث اعطنیہن، قال نعم، قال عندی احسن العرب واجملہ ام حبیبۃ بنت ابی سفیان ازوجکہا، قال نعم۔ قال ومعاویۃ تجعلہ کاتباً بین یدیک۔ قال نعم۔ قال وتؤمرنی حتی اقاتل الکفار کما کنت اقاتل المسلمین۔ قال نعم۔

قال ابوزمیل ولولا انہ طلب ذٰلک من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما اعطاہ ذٰلک لانہ لم یکن یُسأَلُ شَیئاً الا قال نعم۔

جعفر معقری نے بیان کیا۔ دونوں کہتے ہیں ہم سے نضر نے کہا (یعنی محمد یمامی کے فرزند) کہ ہم سے عکرمہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابوزمیل نے کہا اور وہ کہتے ہیں مجھ سے حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ مسلمان ابوسفیان رض کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے اور نہ انھیں اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ میری تین درخواستیں منظور فرمالیں۔ آپ نے فرمایا "بہتر"۔ انھوں نے عرض کیا "میرے ہاں عرب کی حسین ترین اور جمیل ترین خاتون ہیں یعنی ام حبیبہ رض بنت ابی سفیان رض، میں اُن کا نکاح آپ کے ساتھ کردوں"۔ فرمایا "بہتر"۔ پھر عرض کیا "اور معاویہ رض کو آپ اپنا پیش کار بنالیں"۔ آپ نے فرمایا "بہتر"۔ پھر عرض کیا "اور مجھے کسی فوج کی کمان دیں، تاکہ میں کفار سے اُسی طرح لڑوں جیسے مسلمانوں سے لڑا کرتا تھا"۔

آپ نے فرمایا "بہتر"۔ —— ابوزمیل کہتے ہیں کہ اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ استدعا نہ کرتے تو انھیں یہ تینوں عزتیں نہ بخشتے۔ کیونکہ آپ کا طریقہ تھا کہ جو بھی آپ سے سوال کیا جاتا آپ جواب میں "اچھا" ہی فرماتے۔

یہ بیان یا تو ابوزمیل کا ہے یا ان سے نیچے کے کسی راوی کا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ خلاف واقعہ بیان کبھی نہیں دے سکتے تھے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ حضرت ام المومنین ام حبیبہ صلوات اللہ علیہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ میں ہوا تھا۔ جب آپ وہاں ہجرت کر گئی تھیں۔ اور آپ کا خاوند عبیداللہ بن جحش وہاں جا کر مرتد ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق خود حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے آپ کا پیغام

حضرت ام المؤمنینؓ کے پاس بھیجا، نکاح کر دیا اور اپنی ہی طرف سے مہر ادا کیا۔ سیدنا ابو سفیان رضی اللہ عنہ اس وقت مسلمان بھی نہیں تھے چہ جائیکہ ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہوں۔ اور اپنی ذلت کی تلافی کی یہ ترکیب سوچیں۔

پھر سوال ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سیدنا ابو سفیانؓ کو حقارت و بغض کی نگاہ سے کیسے دیکھ سکتے تھے جب کہ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق اسلام لانے سے تمام پچھلی باتیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ سیدنا ابو سفیانؓ کی اسلام دشمنی سیدنا ابو سفیانؓ بن حارث بن عبد المطلب ہاشمی اور سیدنا خالدؓ بن ولید اور سیدنا عکرمہؓ اور دوسرے کفار قریش سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان سب حضرات کے اسلام پر تو مسلمان ناراض نہ ہوئے، اور ان سے عزت و محبت کا برتاؤ کیا، تو پھر سیدنا ابو سفیانؓ کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کی پچھلی باتیں اسلام اور ہجرت کے باوجود نہ دُھل سکیں۔ یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ سیدنا ابو سفیانؓ کو نجران کا والی بنایا گیا، اور آخر عہد نبوی تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ کیا صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ اس خانوادے کے ساتھ نہیں دیکھتے تھے؟

لہٰذا یہ حدیث کسی طرح قابلِ قبول نہیں، اور ہم اسے کسی درجے میں بھی سیدنا ابن عباسؓ کا بیان نہیں سمجھ سکتے۔ امام مسلمؒ اگر ذرا اور گہری نگاہ ڈالتے تو اسے کبھی کتاب میں جگہ نہ دیتے۔ اسی قسم کی احادیث ہیں جن کے سبب صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری سے کم سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ان کے ہاں روایت قبول کرنے کی شرطیں کافی سخت ہیں۔ لیکن آدمی ظاہر ہی تو دیکھ سکتا ہے، دل میں چھپی ہوئی بیماری کا علم آسانی سے نہیں ہوتا۔ اسی لئے صحاح میں بھی ان لوگوں کا داؤں چل گیا ہے، جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر باتیں بنایا کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور

سیدنا معاویہؓ کو نسبی، سیاسی اور معاشرتی تفوق کے ساتھ ذاتی خصائص بھی اس درجے کے حاصل تھے کہ ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنی پیشی میں لے لیا۔ اور کتابتِ وحی کی خدمت آپ کے سپرد کی جو اخصّ خواص ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس کا تو یارا نہ ہوا کہ سیدنا معاویہؓ کی اس اہمیت اور بارگاہِ رسالت میں اس مقبولیت پر حرف رکھ سکیں، کیونکہ متواترات کا انکار ممکن نہیں، لہٰذا یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ قرآن کے علاوہ باقی چیزوں کی کتابت آپ کے سپرد تھی۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکاری تحریروں اور

فرمانوں کی حیثیت ان لوگوں کے نزدیک ثانوی ہے۔ اور جو شخص اس خدمت پر مامور ہو وہ اس کا اہل نہیں کہ قرآن حکیم کی کتابت بھی اس کے سپرد کی جائے۔ حالانکہ وحی خفی ہو یا جلی ہر حال میں وحی ہے۔

پھر ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس قرآنی اور نبوی تحریروں میں یہ باریک فرق نکالنے کی گنجائش کن نصوص سے اور شریعتِ اسلامیہ کے کن اصول سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم جو قرآن و حدیث میں فرق کرتے ہیں تو اس لئے کہ قرآن تواتر سے پہنچا ہے۔ اور اس کی روایت باللفظ ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں۔ برخلاف حدیث کے، کہ اول تو اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے اور دوسرے اس لئے کہ متواتر احادیث بہت کم ہیں۔ صحابۂ کرام کے سامنے یہ دِقت نہیں تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات براہِ راست سنتے تھے، ان کے نزدیک یہ ارشادات بھی ایسے ہی یقینی تھے جیسے قرآنی الفاظ۔ اسی لئے وہ تصریح کروا لیا کرتے تھے کہ ارشاد مبارک حکم ہے یا مشورہ، یا اجتہادی رائے، اور حکم کی تعمیل بے چون وچرا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اللہ اور رسول کے فرمان میں کوئی فرق نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کافر قرار دیا ہے جو حکمِ الٰہی اور حکمِ نبوی میں فرق کرتے ہیں (النساء: ۱۵۰-۱۵۲) نبی کا قول جب صحت کو پہنچ جائے تو وہ قرآن ہی کی طرح واجب العمل ہے، کیونکہ وہ قرآن ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ مزید گفتگو خارج از مبحث ہے۔

ہمیں یہاں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ سوائے صحابۂ کرام کی توہین کے اور کوئی جذبہ نہیں جو اس قسم کی باتیں کہنے پر آدمی کو ابھارے کہ سیدنا معاویہؓ کاتبِ نبوی تو تھے مگر قرآن کی کتابت ان کے سپرد نہ تھی۔ بعض سمجھدار لوگ بھی ان واہی خیالات سے متأثر ہو جاتے ہیں، تعجب اس پر ہے۔

صحاح کی ایک روایت ہے [صحیح مسلم: ص ۴۳۷ طبع مصر] کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانے کے لئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا، معلوم ہوا آپ کھانا کھا رہے ہیں۔ پھر بلوایا، معلوم ہوا کھانا کھا رہے ہیں۔ غرض دو تین دفعہ ایسا ہوا تو فرمایا لا اشبع اللہ بطنہ (خدا کرے اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے)۔ اس روایت کو سیدنا معاویہؓ پر طعن کی حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بد دعاء دی۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ آپؐ نے یہ کام کسی دوسرے سے کیوں نہ لے لیا، اور کیوں بار بار سیدنا معاویہؓ ہی کو طلب کیا۔

گویا یہ حدیث منقصت میں نہیں ہے بلکہ منقبت میں ہے کہ پیشگاہِ نبوی میں سیدنا معاویہؓ کو یہ مقام حاصل تھا کہ جس حسن کے ساتھ آپ اپنی خدمت بجالیتے تھے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ رہے کلماتِ نبویہ تو یہ بددعا، نہ تھی بلکہ پیار کی بات تھی۔ اگر بددعا، ہوتی تو اس کا ظہور ہوتا اور سیدنا معاویہؓ بارگاہِ خداوندی میں معتوب ہو جاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت تو یہ ہے کہ جو مؤمن آپ کی آواز کو اپنی آواز سے دبانے کی کوشش کرے گا اس کے سب اعمال برباد ہو جائیں گے۔ (الحجرات : ۱۔ ۲) اور اہلِ ایمان پر یہ فرض ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرمائیں تو فوراً حاضر ہوں حتیٰ کہ فرض نماز پڑھ رہے ہوں تو توڑ دیں اور چلے آئیں۔ صحاح میں صحابہ کرام کے ایسے واقعات موجود ہیں۔ سیدنا معاویہؓ کا کھانا کھاتے رہنا مرضیِ نبوی کے موافق تھا، اگر نہ ہوتا تو آپ گناہ کبیرہ کے مرتکب سمجھے جاتے۔ لوگ بات کہہ دیتے ہیں لیکن مآل نہیں دیکھتے۔

عہدِ صدیقی و فاروقی

حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک تھی کہ ادنیٰ ترین امور میں بھی آپ منہاجِ نبوی کو نہیں چھوڑتے تھے۔ اور بلا خوف لومۃ لائم ہر اس کام پر مُصر ہوتے تھے جو آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزائم میں نظر آتا تھا۔

ایسی حکومت چلانے کے لئے کارکن بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں جن کے قلوب انہی جذبات سے معمور ہوں۔ اسی لئے حضرت صدیق اکبرؓ نے چُن چُن کر ایسے ہی اصحاب کو حکومت کے مناصب عطا فرمائے جن کے متعلق آپ کو اعتماد تھا کہ روحِ صدیقی کے ساتھ کام کریں گے۔ چنانچہ مرتدینِ عرب سے قتال کرنے کے لئے آپ نے جو فوجیں روانہ فرمائیں ان میں جہاں قدیم الاسلام اموی بزرگ سیدنا خالدؓ بن سعید بن العاص اور سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ تھے وہاں سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کو بھی شامل کیا۔

دعوتِ محمدیہ کے یہ عظیم ترین علم بردار جن میں امین الامت سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ تھے، انھوں نے ملّت کے نازک ترین موقعہ پر جہاد فی سبیل اللہ کیا، اور نہایت بے جگری کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کر کے دین کی کشتی منجھدار سے نکال لائے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے اس گروہ میں ہے۔

آپ کو جو شرف عہدِ نبوی میں حاصل تھا، وہی عظمت و مقبولیت انھیں عہدِ صدیقی و فاروقی میں بھی حاصل رہی۔ حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی حکومت

سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ کے سپرد کی، اور سیدنا معاویہؓ کو ان کے ساتھ کر دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے بھی اپنے دَور میں شام کی حکومت پر سیدنا یزیدؓ ہی کو فائز رکھا۔ سیدنا یزیدؓ نے جب وفات پائی تو اپنے بعد سیدنا معاویہؓ کو وہاں کا والی بنا دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس تقرر کی توثیق فرما دی۔ اور مزید کچھ علاقے کا اضافہ کر کے اس عظیم تر شام کو سیدنا معاویہؓ کے تحت کر دیا اور اپنی زندگی بھر انہی کو وہاں رکھا۔

جن حضرات کو امیر المؤمنین عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کا طریقہ کار مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ والیوں اور کارکنوں کے ساتھ آپ کا رویہ کس قدر متشدّدانہ ہوتا تھا۔ ادنیٰ سی بات پر گرفت ہوتی تھی۔ اور نہایت معمولی فروگذاشت پر آپ والیوں کو معزول کر دیتے تھے۔ کسی والی کو آپ نے مدت معینہ سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہنے دیا۔ برابر تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ واحد شخصیت ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا اعتماد آپ پر روز بروز بڑھتا گیا، اور وقتاً فوقتاً آپ اُن کے اختیارات وسیع تر کرتے چلے گئے۔ تنخواہ بھی انہی کی سب والیوں سے زیادہ تھی، یعنی پانچ ہزار دینار سالانہ۔

یہ شان بہت ہی کم حضرات کو نصیب ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی طرح حضرت فاروق اعظمؓ پر تو خویش پروری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نسباً وہ حضرت معاویہؓ سے بہت دور ہیں اور نسبتی رشتہ بھی کوئی نہیں۔ تو پھر سوچنا چاہئے کہ عہدِ فاروقی میں سیدنا معاویہؓ نے اتنی اہمیت کیوں حاصل کر لی کہ اجلّہ صحابہ بھی اُن کے مقابلہ میں یہ اعزاز حاصل نہ کر سکے۔

وجہ صاف ہے کہ شام کے والی کو بازنطینی حکومت کا ہر وقت مقابلہ تھا، اور ایسی جگہ کا والی وہی ہو سکتا تھا جس کی قابلیت غیر معمولی ہو، جس پر اعتماد سب سے زیادہ کیا جا سکے۔ اور جس سے امورِ جہاں بانی میں کسی کمزوری کا خطرہ نہ ہو۔ سیدنا معاویہؓ کا اس طرح مستقلاً شام کا والی رہنا، کسی طرف سے آپ کی شکایت بارگاہِ فاروقی میں نہ پہنچنا، اور روزمرہ آپ کے اختیارات میں اضافہ ہونا، ایسی بڑی صفت ہے جس کا نتیجہ خود بخود یہ مرتّب ہونا تھا کہ ایک دن پوری اُمت کی زمام کار آپ کے ہاتھ میں چلی جائے۔

حضرت فاروق اعظمؓ جب کسی صاحب کو والی مقرر فرماتے، تو سب فرائض اچھی طرح سمجھا دیا کرتے تھے۔ ان فرائض کو آپ نے عام مجمعوں میں بھی بیان کیا ہے،

تاکہ سب لوگ جان لیں کہ انھیں اپنے والیوں سے کیا توقعات رکھنی چاہئیں۔ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

اللّٰہم اشہدک علیٰ امراء الامصار انی انما بعثتہم لیعلموا الناس دینہم وسنۃ نبیہم وان یقسموا بینہم فیئہم وان یعدلوا فان اشکل علیہم شئی رفعوہ الیّ۔
[محمد الخضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ ج ۲: ص ۹]

خدایا میں تجھے تمام شہروں کے والیوں کے بارے میں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انھیں اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت سکھائیں، فَیْ کا مال ان پر تقسیم کریں اور انصاف کو کام میں لائیں۔ کوئی مشکل اگر درپیش ہو تو مجھ سے مشورہ کریں۔

یہ فرائض سیدنا معاویہؓ نے اس خوبی سے ادا کئے کہ حضرت فاروق اعظمؓ ان کی طرف سے ہمیشہ مطمئن رہے۔ وقائع تاریخی میں ایسی کسی بات کا سراغ نہیں ملتا کہ سیدنا معاویہؓ کی کسی حرکت پر بارگاہِ فاروقی میں کوئی شکایت پہنچی ہو۔ گویا آپ نے عملاً ثابت کر دیا کہ آپ ایک مثالی حکمران تھے اور کتاب وسنّۃ کے بہت بڑے عالم و پیرو۔

اس زمانے کی تاریخ وجغرافیہ پر نگاہ ڈالی جائے، تو سیاسی اعتبار سے شام کا علاقہ نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ ایک بڑی طاقتور غیر مسلم حکومت کی سرحد ملتی تھی جس کی حریفانہ کارروائیاں عہدِ نبوی سے جاری تھیں، اس لئے وہاں کے نظم ونسق اور خارجی حکمت عملی کے لئے غیر معمولی دل ودماغ کی ضرورت تھی جیسا کہ مذکور ہوا۔ سیدنا معاویہؓ نے اپنے دورِ حکومت میں وہاں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ کسی قسم کا داخلی یا خارجی فتنہ اٹھنے کا امکان نہ چھوڑا۔ رعایا خوشحال اور خوش دل تھی۔ اور وہاں آپ کی مقبولیت ومحبوبیت وعزّت و احترام کا وہ عالم تھا کہ باید وشاید۔ اس پر مستزاد تھا وہ مستقل رعب جو بازنطینی حکومت پر طاری رہتا تھا۔

حضرت فاروق اعظمؓ جب بیت المقدس حاضر ہوئے ہیں، تو سیدنا معاویہؓ نے آپ کا استقبال بڑی شان وشوکت سے کیا تھا۔ حضرت امیر المومنینؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ سادہ روی کیوں چھوڑ دی؟ سیدنا معاویہؓ نے یہ حکیمانہ جواب دیا کہ "شام کی سرحد پر قیصر کی فوجوں کا اجتماع رہتا ہے، اور اس کے جاسوس ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے

قیصر ونصاریٰ کو مرعوب رکھنے کے لئے شان وشوکت کی ضرورت ہے۔" یہ سُن کر سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا" امیر المؤمنین! دیکھئے کس خوب صورتی سے یہ اپنے آپ کو الزام سے بچالے گئے۔" حضرت فاروق رضؓ نے فرمایا "جب ہی تو یہ بارِ گراں ہم نے اُن پر ڈالا ہے۔" [البدایہ والنہایہ: ۸ : ۱۲۴-۱۲۵؛ منقول از العواصم من القواصم]۔

حضرت فاروق اعظم رضؓ جیسے امام برحق اور سرخیل اربابِ ہدیٰ تو سیدنا معاویہؓ کے اس جواب سے مطمئن ہو گئے، لیکن لوگ ہیں کہ پھر بھی ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا مزاج شاہانہ تھا، اور کافر بادشاہوں کی سی شان وشوکت انھوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ حالانکہ ان سے پہلے خلفاء پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے اور فقر ومسکنت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کی بابت اس قسم کی لغو باتیں لوگوں کی خود ساختہ ہیں، اور کتاب وسنۃ کی روح کے منافی۔ لیکن ان بیان کردہ امور میں سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرنے کے جو سچے واقعات مذکور ہیں، تو ان سے یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ جب فراخی دے، اور عام خوش حالی کا دور دورہ ہو، تب بھی شان وشوکت اور مرفہ حالی کی زندگی سے گریز کر کے کفرانِ نعمت کیا جائے۔ کوئی ایک آیت نہیں ہی متعدد ہیں، دو چار حدیثیں نہیں ہیں بیسیوں ہیں جن سے لوگوں کے بیان کردہ اس تصوّر کی مخالفت ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے بے دلیل قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (الاعراف: ۳۲)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔	کہدو! کس نے حرام قرار دیا زینت کی ان چیزوں کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی پاکیزہ نعمتوں کو۔ کہدو: یہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے ہیں جو ایمان لائے اور محض ان کے لئے ہوں گی

قیامت کے دن، ہم اپنی آیتیں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اربعہؓ رہا کرتے تھے قلبِ اسلام میں، اپنے ساتھیوں اور کنبوں کے درمیان۔ قرب وجوار کی عربی دنیا بھی اسی سادہ روی کی عادی تھی۔ لیکن جب اسلام کی برکتیں ظاہر ہوئیں، اور متوازن معاشی نظام برپا ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے بھی اپنی زندگی میں فراخی اور بود و باش میں بلند معیار

اختیار کیا، اگرچہ عربی سادگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ لیکن سیدنا معاویہؓ رہتے تھے دوسرے ماحول میں، اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو متاعِ دنیوی ہی کو اصل حیات سمجھتے تھے۔ اس لئے غیرتِ دینیہ کے تحت بالکل جائز اور طیّب طریقے پر روحِ قرآنی اور اصل سنت کی پیروی میں آپ نے وہ شان و شوکت اور تمکنت اختیار کی جس میں سطحیت نہ تھی اور جو ہر طرح ولی امر المؤمنین کو زیب دیتی ہے۔

یہ شان و شوکت معیوب اس وقت ہوتی جب اُن کی رعایا مفلوک الحال ہوتی، اور خداداد نعمتوں تک ہر کس و ناکس کو دسترس نہ ہو سکتی، جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے۔ اسلامی نظام جو معاشی عدل اور عمرانی مساوات پر مبنی ہے، وہاں ایک مباح اور طیّب طرزِ عمل پر اعتراض کرنا، قرآن مجید کی رُوح کچلنے کے مرادف ہے۔ پھر یہ اعتراض اکیلے سیدنا معاویہؓ پر نہیں ہوگا۔ بلکہ جمہور صحابہ اس کی لپیٹ میں آئیں گے، حتّٰی کہ خود سیدنا علی امیر المؤمنین کرم اللہ وجہہ بھی جو خلیفہ ہونے کے بعد دنیا کے مالدار ترین امام تھے۔ اور جن کی محض زکوٰۃ کا روپیہ ہزاروں دینار ہوتا تھا۔ (المنتقیٰ: ص ۴۹۱)

الاعتصام

صحابہ کرامؓ کے احوال کے متعلق بطور نمونہ ملاحظہ ہو (صحیح بخاری: ج ۴، کتاب [illegible] ص ۶۲۵، طبع مصر):

عن ایوب عن محمد قال کنا عند ابی ہریرۃ وعلیہ ثوبان مُمَشَّقان من کتانٍ فتمخَّطَ، فقال بَخٍ بَخٍ! ابو ہریرۃ یتمخَّطُ فی الکتان۔ لقد رأیتنی وانی لاخرُّ فیما بین منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی حجرۃ عائشۃ مغشیًا علی فیجیئ الجائی فیضع رجلہ علی عنقی ویریٰ انی مجنون ومابی من جنون مابی الا الجوع۔

ایوبؒ سے روایت ہے انھوں نے محمدؒ کا حوالہ دیا، وہ فرماتے ہیں ہم (سیدنا) ابو ھریرہؓ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ آپ اس وقت کتان کے دو نقشین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اتنے میں آپ نے ناک صاف کی اور فرمایا کیا کہنے ہیں اب تو ابو ہریرہ کتان سے ناک صاف کرتا ہے مجھے وہ وقت یاد ہے جب میں منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حجرۂ (ام المؤمنین) عائشہؓ کے درمیان بیہوش پڑا ہوتا تھا۔ آنے والا آتا اور میری گردن پر پاؤں رکھتا۔ کیوں کہ اسے ایسا لگتا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا۔ صرف بھوک نے بے حال کر رکھا ہوتا تھا۔"

یہ صرف ایک مثال ہی اور ادنیٰ ترین۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام نے اپنا معیارِ زندگی اپنے وسائل کے مطابق بلند کیا اور وہ اسی طرزِ عمل کو شکر گذار بندے کے شایانِ شان سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں نے خیال قائم کیا ہے کہ دولت کی یہ فراوانی صرف مجاہد صحابہ ہیں تھی، ویسے امت میں غربا، اور مساکین کا طبقہ موجود تھا۔ اور اس طرح دولت کی تقسیم نامنصفانہ ہوگئی تھی کہ کچھ لوگ تو بہت مالدار تھے اور کچھ بہت غریب۔ اسی تصور کو قائم کر کے انھوں نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کے موقف کو اپنے مطلب کی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہو۔ دراصل ان لوگوں نے اپنے زمانے کے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام پر قیاس کر کے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا نام اُچھالنے کی کوشش کی ہے۔ اوّل تو سوچنا چاہئے کہ جس قوم کا ہر بالغ مرد مجاہد ہو، اور چاروں طرف مہمیں جاری ہوں وہاں یہ خیال خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ دولت کی فراوانی صرف محدود طبقے میں تھی۔ دوسرے انھوں نے وظائف کے دیوان کا خیال نہیں کیا، جہاں حکومت کی طرف سے ایک ایک فردِ مملکت کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جاتا تھا اور پیدا ہوتے ہی ہر بچے کی پرورش کی ذمہ دار حکومتِ اسلامیہ ہوتی تھی۔ یہ دیوان حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں قائم ہوا تھا۔ اور اس کی مدات میں برابر توسیع ہوتی چلی گئی جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ تیسری بات ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھی کہ نظامِ اسلامی میں زکوٰۃ کا محکمہ نہایت جاندار اور فعّال ہوتا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ مالدار ہوگا اتنی ہی زیادہ زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اور جس قوم میں زکوٰۃ کا رکن ہماری طرح مردہ اور جامد نہ ہو، وہاں کوئی شخص مفلس اور حاجتمند رہ ہی نہیں سکتا۔ زکوٰۃ ہے ہی اس لئے کہ ملک میں کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ ہم نے خیرات کھانے والا ایک مستقل طبقہ ہندوؤں کی طرح قائم کر رکھا ہے اور سالانہ دو دو روپیہ ہر شخص کو دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے پانچ ہزار روپیہ زکوٰۃ میں دیدیا۔ صحابہؓ کے ہاں یہ دستور نہیں تھا۔ وہاں سب زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہوتی تھی، اور اسے منظم طریقے پر خرچ کیا جاتا تھا۔

بیشک ہمیں بعض بزرگوں کے احوال میں ملتا ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن یہ فقر اختیاری تھا، اور اب بھی اصحابِ ترک و تجرید اسی طرح مجاہدہ کرتے ہیں۔ یہ انفرادی چیز ہے۔ اس سے پورے معاشرے کے متعلق کوئی غلط قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ معاشرہ تو بہت دُور کی بات ہے، موجودہ مشینی دَور سے پہلے سوائے عالمسگیر قحط کے اور کوئی

شخص بھوک سے نہیں مرتا تھا۔ ہم چونکہ اس عہد کے مسلمانوں کی عام خوش حالی کا اس زمانے میں کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ اس لئے اپنے احوال پر قیاس کر کے خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔

ویسے سیدنا معاویہ رضؓ اپنی طبیعت سے زاہد و عابد شخص تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حضور لے کر آپ کی جو تربیت کی تھی، اسی کے مطابق آخر وقت تک زندگی بسر کی۔ وہ سادگی جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی شان تھی وہ آپ میں بھی برابر جلوہ گر رہی، اور آپ بسا اوقات اپنے عمل سے بتا دیتے تھے کہ انسان کا اصل شرف ایمان اور عمل صالح سے ہے نہ کہ صورت، نسب اور ظاہری شان و شوکت اور فاخرانہ لباس سے۔ چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے کتاب الزہد (ص ۱۷۲ طبع مکہ) میں قوی سند سے حضرت ابی حَمْلہؒ کا بیان نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں "میں نے (حضرت) معاویہؓ کو دمشق کے منبر پر خطبہ دیتے دیکھا ہے۔ آپ کی قمیص اس وقت دریدہ تھی"۔ (العواصم من القواصم: ص ۲۰۹)۔

اسی طرح امام ابن کثیرؒ نے (البدایہ والنہایہ: ۸: ص ۳۴) حضرت امام اوزاعیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں "میں نے (حضرت) معاویہؓ کو دمشق کے بازار میں اس طرح سوار جاتے دیکھا ہے کہ آپ کے پیچھے آپ کا ایک غلام بیٹھا ہوا تھا اور آپ کی قمیص کا گریبان دریدہ تھا۔ اسی حالت میں آپ بازار میں پھر رہے تھے"۔ (العواصم: ص ۲۰۹)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ کے عسکری افسر آپ کے کپڑوں کو بطور تبرک لیجایا کرتے تھے۔ اور ایسا شخص یہ متبرک کپڑے پہنے ہوئے جب مدینہ طیبہ حاضر ہوتا تو لوگ بیش قرار رقوم دے کر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ جو آپ کے ایک بڑے سپہ سالار اور صحابیِ رسولؐ تھے۔ وہ ایسی ہی ایک بوسیدہ چادر اوڑھے ہوئے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، اور قبر شریف و منبر کے درمیان نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں نے چادر کو پہچان لیا کہ حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ کی ہے۔ ایک صاحب ابو الحسن البرّادؒ نے سمجھا کوئی گنوار آدمی ہیں ان سے معاملہ بآسانی طے ہو جائے گا۔ لیکن تین سو دینار تک انھوں نے لگا دیئے اور کام نہیں بنا۔ مگر سیدنا ضحاکؓ نے حضرت حُوَیْطِبؓ بن عبد العزّٰیؓ کے ہاں جا کر دوسری چادر اوڑھ لی۔ اور حضرت ابو الحسن البرّاد کو ویسے ہی ہدیۃً دیدی اور فرمایا "وہ آدمی بہت ہی بُرا ہے جو تبرک میں ملی ہوئی چیز کو فروخت کرے، لو اسے پہنو"۔

یہ تھی سیدنا معاویہؓ کی عظمت و محبت ان کے ہمعصروں کے دل میں، اور اس عقیدت

کے ساتھ وہ اپنے اس جلیل القدر اور معیاری امام کو دیکھتے تھے۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

عہدِ عثمانی

امیر المؤمنین سیدنا عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدستور شام کی ولایت پر فائز رکھا۔ اور آپ کی بے نظیر کارگزاریوں کو دیکھ کر اختیارات میں مزید توسیع کر دی۔ زیر نگرانی علاقے کا رقبہ بھی بڑھا دیا۔ بڑا تعجب ہوتا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت امیر المؤمنین عمر الفاروق رضی اللہ عنہ تک سب کا طرزِ عمل سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سامنے ہے، پھر بھی لوگ امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ نے شام کا علاقہ ان کے زیر نگین کیوں رکھا۔ وجہ محض یہ ہے کہ چونکہ ان صدیقی، فاروقی اور عثمانی عمال کے ہاتھوں جن میں اموی سادات نمایاں تھے، اہل کفر مغلوب ہوئے، عجمی ممالک پر اسلام کا پرچم لہرایا، اور منافقوں کی ریشہ دوانیوں کی روک تھام ہوئی، اس لئے بعض لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اموی سادات میں جتنے عیب نکال سکتے ہوں نکالیں۔ اور چونکہ یہ کام تلبیس و افتراء کے ذریعہ کیا جاتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ بھی ان کے فریب کا پردہ چاک کرتا رہتا ہے۔

یہودیوں اور مجوسیوں نے اسلام کا جامہ پہن کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بہت سی باتیں تراشیں، اور نہایت سادہ و بے ضرر امور کو کج کر کے دکھانے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں کچھ لوگ متاثر ہوئے۔ اور بعض صالح حضرات بھی دھوکے میں آگئے۔ لیکن کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ کرام میں سے کوئی صاحب کسی مفسد و فرقہ باز کی کوشش سے جماعت کو چھوڑ بیٹھے ہوں۔ بے شک بعض صحابہ فتنوں میں مبتلا ہوئے لیکن بالآخر اپنے آپ کو صاف نکال لے گئے۔ فرقہ بازوں نے اپنی اہمیت جتانے کے لئے بعض صحابہ مثلاً سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق جھوٹی باتیں وضع کر کے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی ہے، مگر واقعات سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی۔ بعض غیر صحابہ مثلاً حُجر بن عدی کو صحابیت کا صداقت نامہ دے کر کام چلانا چاہا ہے مگر چلا نہیں۔ حقیقی واقعات کی روشنی میں سب باتیں ہوائی ثابت ہوتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ جماعت میں فرقہ بازی کا کیا کام۔ جماعت جو پہلے دن سے جماعت تھی، وہی آج تک جماعت چلی آرہی ہے۔

طبری رحمہ اللہ نے ۱۹۳ھ کے احوال کے تحت (۱۰ : ۱۱۷) حضرت مُصعب بن عبد اللہ زبیری رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کیا، اور انھوں نے اپنے والد حضرت عبد اللہ بن مصعب رحمہ اللہ سے سُنا وہ فرماتے ہیں کہ ان سے امیر المؤمنین ہارون الرشید نے دریافت فرمایا "آپ کی رائے ان لوگوں

کے متعلق کیا ہے۔ جو سیدنا عثمانؓ پر طعن کرتے ہیں؟" فرمایا" میں نے عرض کیا یا امیر المومنین! کچھ لوگوں نے اُن پر طعن کیا، اور کچھ لوگ ان کے ساتھ رہے۔ جنھوں نے طعن کیا وہ ان سے الگ ہوگئے۔ ان میں شیعوں کے مختلف گروہ ہیں، اہلِ بدعت ہیں اور مختلف قسم کے خوارج ہیں، لیکن جو اُن کے ساتھ تھے وہ وہی ہیں جو آج تک جماعت چلے آتے ہیں" اس پر (امیر المومنینؓ نے) فرمایا "آپ کے اس جواب کے بعد اس مسئلے پر مجھے اب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی"

حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ اموی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد ہیں، خلص اصحاب میں ہیں، قریش کے محبوب ہیں، صحابہ کرام کے مقبول امام ہیں، اور پھر درفش کاویانی آپ ہی کے ہاتھوں سرنگوں ہوا، ساسانی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا، اور اس کے دوبارہ احیاء کے تمام مواقع ہمیشہ کے لئے نسیاً منسیاً کر دیئے گئے، اس لئے مجوسیوں کو سب سے زیادہ عداوت سیدنا عثمانؓ سے ہے۔ یعنی حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی زیادہ۔

حضرت فاروقؓ سے بدلہ لینے کی تو انھیں آسان صورت مل گئی کہ دو تین آدمیوں نے سازش کر کے آپ کو چپکے سے شہید کر دیا۔ سامنے اکیلا ابو لؤلؤۃ فیروز آیا جسے بابا شجاع کا لقب دے کر ہیرو بنا دیا گیا ہے، حتٰی کہ اس کا سالانہ "عرس" ہونے لگا۔ "عید بابا شجاع الدین" کے نام سے اس میلے کی ایجاد قسّم ہیں کی گئی۔ اور چونکہ فیروزہ نام کے ایک پتھر کو اس کے نام سے مشابہت ہے اس لئے اُسے بڑا مبارک پتھر سمجھ لیا گیا ہے۔ کہ لوگوں کے نزدیک اسے انگوٹھی میں پہننا ایک شعار سا ہے۔ جنھیں یہ پس منظر معلوم نہیں وہ ناواقفیت میں اسے پہنتے ہیں۔

ابو لؤلؤۃ کے علاوہ جو دوسرا مجرم تھا ہرمزان[1] وہ بھی بچ نہ سکا۔ مگر صحابہ کرامؓ پر یہ بات

---

[1] ہرمزان ایک ایرانی مرزبان تھا، اور جب گرفتار ہو کر آیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کے قتل کا حکم دیدیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا اور برتن ہاتھ میں لے کر حضرت فاروقؓ سے کہا "آپ اقرار کیجئے کہ جب تک میں یہ پانی نہ پی لوں آپ مجھے قتل نہیں کریں گے" آپ نے فرمایا "ہاں جب تک تم یہ پانی نہ پی لو گے تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا" یہ سُن کر اس نے پانی پھینک دیا۔ اور کہا "اب آپ مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ پانی نہیں پیا" اس طرح اس حیلہ ساز مجوسی نے امام المسلمینؓ کے ایفائے عہد پر بھروسہ کر کے الفاظ سے کھیلنے کی جرأت کی اور اپنی جان بچالی۔ پھر اس نے اسلام کا اعلان کیا۔ (باقی برص ۶۱)

نہیں کھلی کہ سازش کتنی گہری تھی۔ یہ گہرائی کھلی امیرالمؤمنین سیدنا عثمانؓ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے چھ برس بعد۔ حضرت امیرالمؤمنینؓ کی مقبولیت و محبوبیت، اور آپ کے والیوں کی کارگذاریوں کے نتیجے میں چھ برس تک ان مجوسی دشمنانِ دینِ محمدؐ کو کچھ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ پھر عبداللہ بن سبا۔ (ابن سودا)، ایک یہودی نے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰) لیکن اس کے ایمان کی نوعیت یہ تھی کہ جو بھی ایرانی گرفتار ہو کر آتا یہ اس سے گلے مل کر روتا۔

اسی جذبے کے تحت اس نے ابو لؤلؤۃ فیروز اور ایک نصرانی غلام جُفَینہ سے حضرت فاروقؓ کو شہید کروینے کی سازش کی۔ اور یوں فیروز کے ہاتھوں اس عدل مجسّم کے وجود سے امت کو محروم کر دیا جس کی خلافت پرتوِ نبوت تھی [ملاحظہ ہو خضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ ج ۲: ص ۲۵]

سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے گواہی دی کہ "کل شب میں ابو لؤلؤۃ کے پاس سے گزرا تھا، اس وقت وہ اور ہرمزان اور جفینہ تینوں سرگوشی میں مشغول تھے۔ میرے اچانک پہنچ جانے سے گھبرا گئے، اور ان کے پاس سے ایک خنجر گرا جس کے دو پھل تھے۔ ذرا دیکھو کہ امیرالمؤمنین پر قاتلانہ حملہ کس ہتھیار سے کیا گیا ہے۔"

جس وقت فیروز آپ کو زخمی کر کے بھاگا تھا تو ایک تیمی بزرگ اس کے پیچھے ہو لئے تھے، تا آنکہ اسے گرفتار کر لائے۔ اس کے پاس ویسا ہی خنجر موجود تھا۔ حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے یہ سب باتیں سنیں اور دیکھیں۔ اس وقت تو خاموش رہے لیکن جب حضرت امیرالمؤمنینؓ کی وفات ہو گئی، تو آپ نے جا کر ہرمزان کو قتل کر دیا اور جُفَینہ کو قتل کرنے چلے۔ اُن کے جانے کی اطلاع سیدنا صُہَیبؓ رضی اللہ عنہ کو ہو گئی جو حضرت فاروق اعظمؓ کی وصیت کے مطابق انتخابِ خلیفہ تک کے لئے نماز کے متولی تھے۔ آپ نے حضرت عبید اللہؓ کو واپس لانے کے لئے لوگوں کو بھیجا۔ اور وہ عین اس وقت گرفتار کر لئے گئے جب جُفَینہ پر ہاتھ اُٹھانے والے تھے۔ ان سے تلوار لے لی گئی اور انتخابِ خلیفہ تک کے لئے قید کر دیا گیا۔

حضرت امیرالمؤمنین عثمانؓ کی بیعت کی تکمیل پر پہلا مقدمہ آپ کے سامنے یہی پیش ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا علیؓ نے حضرت عبید اللہؓ کو قصاصاً قتل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن جمہور صحابۂ کرام پر یہ امر شاق تھا۔ وہ کہتے تھے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل عمرؓ قتل ہوئے اور آج ان کے فرزند کو قتل کر دیا جائے۔"

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مسلمانوں کا کوئی امام نہ تھا اور سیدنا عبدالرحمٰنؓ کی گواہی سے حضرت عبید اللہؓ کا مشتعل ہو جانا قدرتی بات تھی۔ البتہ یہ ان کا تقویٰ تھا کہ زخم کاری اور مہلک ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے والد ماجد صلوات اللہ علیہ کی وفات تک ان قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ (باقی بر صفحہ ۶۲)

تمام مجوسی ان کے ساتھ ہو گئے۔ سرحدی علاقوں کے بعض جاہل عربوں کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ ظاہر ہے کہ عربی عجمی اختلاف پیدا کر کے عربوں کو نہیں ملایا جا سکتا تھا، اس لئے یہ محاذ کھولا گیا۔ قریش کے خلاف کہ یہ لوگ تمام امت پر مسلط ہو گئے ہیں۔ یوں امیر المؤمنین اور ان کے والیوں کے بارے میں مستقلاً خفیہ خفیہ زہر اگلنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) اسی لئے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر المؤمنین سے عرض کیا کہ یہ واقعہ آپ کے ہاتھ میں اختیارات آنے سے پہلے کا ہے اور آپ کی حکومت پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس لئے عبیداللہ کو قتل نہیں کرنا چاہئے۔ اس پر سیدنا عثمان رضؓ نے فرمایا "بحیثیت امام کے اس خون کا ولی میں ہوں۔ اور میں اپنی جیب سے اس مقتول کی دیت ادا کئے دیتا ہوں"۔ چنانچہ یہی فیصلہ رہا۔

اس واقعہ کی تفصیلات کے بارے میں روایات کا سخت اختلاف ہے۔ ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین رضؓ نے ہرمزان کے بیٹے کو قصاص لینے کی اجازت دیدی تھی اور وہ اس پر بظاہر تیار بھی ہو گئے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر اُن کے ساتھ تھا جو حضرت عبیداللہ رضؓ کے فعل کی مذمت کرتا تھا لیکن ساتھ ہی عفو و درگذر کی بھی استدعا کر رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش تھے تا آنکہ حضرت عبیداللہ رضؓ کو قتل کرنے کے لئے تلوار انھیں دیدی گئی۔ انھوں نے اس وقت مجمع سے کہا "اگر میں انھیں قتل کر دوں تو آپ لوگ حارج تو نہیں ہوں گے"؟ لوگوں نے کہا "ہرگز نہیں۔ یہ تمھارا حق ہے البتہ تم چاہو تو معاف کر دو جس کی ہم درخواست کرتے ہیں"۔ اس پر انھوں نے کہا "میں نے معاف کر دیا"۔ لوگوں نے خوشی سے بے قابو ہو کر انھیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور اسی طرح اُن کے گھر تک پہنچایا۔

بہر حال جو بھی صورتِ حال ہو یہ امر مسلّم ہے کہ سیدنا عبیداللہ رضؓ کی جان بخشی حضرت امیر المؤمنین عثمان رضؓ کے ایسے فیصلے سے ہوئی تھی جس سے مقتول کے وارث بھی مطمئن تھے اور جمہور صحابہ بھی رضی اللہ عنہم۔

چونکہ ہرمزان ایرانی تھا اور اپنے علاقے میں صاحبِ نمود۔ اس لئے سبائی لوگوں کو اسے صاحبِ ایمان بنا کر مقتدائے ملت باور کرانے پر اصرار ہے۔ اور وہ اس کے قتل کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المؤمنین عثمان رضؓ پر منجملہ اور اعتراضات کے یہ بھی ایک زبردست اعتراض ہے کہ آپ نے ہرمزان کے قصاص میں حضرت فاروق اعظم رضؓ کے فرزند کو قتل نہیں کیا۔

اپنے اس موقف کی مضبوطی ثابت کرنے کے لئے یہ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ سیدنا علی رضؓ کو بھی ہرمزان کے قتل کا سخت ملال تھا، اور آپ بضد تھے کہ عبیداللہ بن عمر رضؓ کو ضرور قتل

(باقی بر صفحہ ۶۳)

سیدنا سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہما جو فاتح طبرستان ہیں اور امیر کوفہ تھے وہاں ایک واقعہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں اس جتھے کے کچھ لوگ سامنے آگئے۔ یعنی مالک بن الحارث الاشتر اور عمرو بن ضابیٔ وغیرہ۔ ان سے یہ گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی کہ حضرت امیرؓ کی موجودگی میں انھوں نے ایک نوجوان کو زدوکوب کیا۔ اشرافِ کوفہ نے سیدنا عثمانؓ کے پاس درخواست گذاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) کیا جائے۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کا دعویٰ ہے کہ خلیفہ ہوتے ہی آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت عبید اللہؓ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے اور اسی لئے وہ مدینے سے فرار ہو کر حضرت معاویہؓ کے پاس شام چلے گئے۔

اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت فاروق اعظم صلوات اللہ علیہ کی شہادت کو ایک شخص واحد کا قتل سمجھا جائے، اور ایسے شخص کے قتل کو اہمیت دی جائے جس کا ایمان مشتبہ تھا اور جو امام المسلمین کے قتل میں بداہتاً شریک رہا۔ اور کیا یہ امر بھی سخت تعجب انگیز نہیں کہ حضرت امیر المومنین عثمان صلوات اللہ علیہ کے قاتلوں سے قصاص کو ٹالا جائے، اور ہرمزان کے قصاص کو قیامِ خلافت کا پہلا کارنامہ بنانے کی سوجھے، اور خلافت کی ابتداء کی جائے فرزندِ عمرؓ کو قتل کرنے کے منصوبے سے۔

یہ لغو اور لچر روایتیں محض اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ اپنے آپ کو حضرت امیر المومنین علیؓ کا پیرو باور کرائیں، اور آپ کو آلِ عمرؓ کا دشمن۔ حالانکہ بات اتنی ہی ہے جتنی اُن کے ایک شاعر نے خود کہدی ؎

بشکست عمر پشت ہزبرانِ عجم را ؛ برباد فنا داد رگ و ریشۂ جم را

ایں عربدہ از غصب خلافت ز علی نیست ؛ باآلِ عمر کینہ قدیم است عجم را

"عمر نے عجم کے شیروں کی پشت توڑ دی، اور ایران کا رگ و ریشہ مٹا کر رکھ دیا۔ یہ جھگڑا کچھ اس لئے نہیں کہ علیؓ کی خلافت انھوں نے غصب کر لی تھی بلکہ عجم کا کینہ آلِ عمرؓ کے ساتھ بہت پرانا ہے۔"

ممکن ہے سیدنا علیؓ نے ہاشمی موقف کے مطابق محض اقرارِ اسلام کی بناء پر ہرمزان کو مؤمن باور کر کے ابتداءً اس کا قصاص لینے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن ان جیسے امام الفقہاء سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ امام سابق نے جو قضیہ جمہور صحابہ کے مشورے سے طے کر دیا تھا اور مقتول کے وارث بھی اس سے راضی ہو گئے تھے، پھر اس قضیئے کو اپنی حکومت میں دوبارہ اٹھائیں، اور وہ بھی سیدنا عثمانؓ کی شہادت کے

(باقی برص ۶۴)

کہ ان مفسدوں کو کوفے سے نکال دیا جائے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان سب کو جمع کر کے معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے، تاکہ وہ ان کی اصلاح کر دیں۔ سیدنا معاویہؓ نے انھیں عزت و مدارات کے ساتھ رکھا اور ہر طرح استمالت کی کوشش کی۔ پھر ایک موقعہ پر فرمایا:

(بقیہ حاشیہ صد ۶۳) اہم ترین قضیئے کی موجودگی ہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ چونکہ خلافتِ مرتضوی کا قیام قاتلانِ عثمانؓ کے ہاتھوں ہنگامی حالات میں ہوا تھا اس لئے اکابرِ امت نے قوانینِ شرعیہ کے مطابق اس بیعت کی آئینی حیثیت تسلیم نہیں کی۔ اگرچہ آپ کی شخصیت و اہلیت کا لحاظ کر کے آپ کو بالفعل خلیفہ مان لیا۔

جس طرح سیدنا طلحہ اور سیدنا زبیر وغیرہما رضی اللہ عنہم حادثۂ شہادت کے بعد مدینے سے باہر چلے گئے تھے اسی طرح حضرت عبیداللہؓ بھی چلے گئے۔ یہ تصور لغو ہے کہ وہ سیدھے شام گئے تھے کیونکہ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ اہلِ شام کا موقف کیا ہوگا۔ البتہ یہ درست ہے کہ بعد کے احوال کے تحت سیدنا عقیلؓ کی طرح آپ بھی سیدنا معاویہؓ کی حمایت پر تھے۔ اور انھیں کی طرف سے لڑتے ہوئے صفین میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اس سلسلے میں مسعودی کا بیان بھی ناقابلِ قبول ہے کہ صفین میں جب سیدنا عبیداللہؓ مبارز طلب ہوئے تو ان کے مقابلے کے لئے خود حضرت امیر المومنینؓ نکلے تھے، اور باہمی مقابلے میں آپ نے عبیداللہؓ کو دے پٹکا تھا، یہ خیالی باتیں ہیں۔ اور آلِ عمرؓ سے دلوں میں جو کینہ ہے اسی کی ان روایتوں میں نمود ہے۔

امام اگر میدانِ کارزار میں موجود ہو تب بھی وہ خود نہیں لڑتا۔ اس کا کام فوجوں کو لڑانا ہے۔ صفین کے معرکوں میں سیدنا علیؓ کی شمشیر زنی کی تمام روایتیں اور رجز خوانیاں فرضی ہیں۔ نہ حضرت امیر المومنینؓ ان معرکوں میں مبارز طلب ہوئے اور نہ حضرت معاویہؓ۔ نہ حضرت عبیداللہؓ اور حضرت علیؓ کا مقابلہ ہوا اور نہ حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت علی کا۔ رضی اللہ عنہم۔ یہ حضرات سنّت کے خلاف کس طرح عمل کر سکتے تھے۔

اسلام کا جانباز سپاہی ہونے کی حیثیت سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے کارنامے صفحۂ دہر پر ثبت ہیں۔ پھر امام بن جانے کے بعد آپ اس کے مکلّف نہ تھے کہ خود تیغ و سنان لے کر نکلیں۔ یہ امر منصبِ امامت کی عظمت اور وقار کے خلاف ہے۔ آپ پر قربان ہونے والوں کی کوئی کمی تھی جو آپ خود لڑنے نکلتے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تینوں خلفاء کا عمل اس بارے میں واضح ہے

(باقی بر صفحہ ۶۵)

"آپ لوگ پختہ عمر ہیں، فصاحتِ لسانی سے متصف ہیں، پھر اسلام کا شرف آپ کو حاصل ہے، جس کے نتیجے میں اقوامِ عالم کی سرزمین اور ان کا ثقافتی و معاشی ورثہ آپ کو مل گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ قریش سے ناراض ہیں، حالانکہ قریش اگر نہ ہوتے تو آپ پہلے ہی کی طرح ذلیل رہتے۔ آج آپ کے ائمہ آپ کی پشت پناہ ہیں۔ یہ ڈھال اپنے سے جدا مت کیجیے۔ اس وقت تو آپ کے امراء آپ کی گستاخیاں برداشت کر لیتے ہیں لیکن بخدا اگر آپ نے اپنی ذہنیت نہ بدلی تو خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کی حکومت میں آپ کو مبتلا کر دے گا جو آپ پر سختی کریں گے، اور اگر آپ نے برداشت کر لیا تو اسے آپ کی خوبی نہیں جانیں گے۔۔۔"

اس مناسب و ملائم تنبیہ کا جواب ان لوگوں نے سختی سے دیا۔ سیدنا معاویہؓ نے بھی سختی کا لہجہ اختیار کیا، کیونکہ آپ نے سمجھ لیا کہ ان کی اصلاح ناممکن ہے، یہ تو شام میں بھی اسی طرزِ عمل پر اتر آئے جو عراق میں تھا۔ آپ نے فرمایا:

"یہ کوفہ نہیں ہے۔ بخدا اگر اہلِ شام نے تمھاری حرکتیں دیکھ لیں تو میں اگرچہ ان کا امام ہوں لیکن تمھارے قتل سے انھیں باز نہیں رکھ سکوں گا۔ اپنی جان کی قسم مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمھاری باہمی کوئی سازش ہے۔"

پھر آپ نے حضرت امیر المومنینؓ کو مطلع کر دیا کہ میں ان کی اصلاح نہیں کر سکا، اور ان کا شام میں رہنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ سیدنا عثمانؓ نے فرمان بھیجا کہ انھیں حمص بھیج دیا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٤) تو پھر کس طرح ممکن ہو کہ آپ اپنی حیثیت سے گر کر میدان میں اُترتے، اور کس صاحبِ ایمان میں یہ جرأت تھی کہ آپ سے دوبدو جنگ کرتا۔

اجتہادی اختلاف یا سیاسی اصول کے تحت فوج کشی کی نوبت آجاتی ہے لیکن اس کا ہرگز امکان نہیں کہ باہمی حرمت اور ذاتی تعلقات کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔ جنگِ جمل کے بعد جب سیدنا علیؓ نے سیدنا طلحہؓ اور ان کے فرزند سیدنا محمدؒ کی نعشیں دیکھی ہیں تو آپ کو کس قدر سخت صدمہ ہوا تھا، اور اپنے زانو پر اُن کے سر رکھ کر آپ نے کیسے حسرتناک کلمات کہے تھے۔

یہ ممکن نہ تھا کہ علی مرتضیٰؓ سا چچا سامنے آئے اور سیدنا عبیداللہؓ سا بھتیجا مقابلے کی جرأت کر سکے۔ گھمسان کی جنگ میں بھی ان سے اس گستاخی کا امکان نہ تھا۔ جمل و صفین کے واقعات کی جتنی تفصیلات لوگوں نے مرتب کی ہیں[۲]

[۲] ان میں صرف اپنی طینت کی دنائت کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے کہ ایک طرف تو امام کا مقام نبوت سے بھی افضل سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف اُن کے نزدیک امام کی حیثیت یہ ہو کہ میدانِ کارزار میں اکھاڑ پچھاڑ کرتا پھرے۔

جہاں کا انتظام حضرت معاویہؓ کی طرف سے سیدنا عبدالرحمان بن خالدؓ بن ولید کیا کرتے تھے رضی اللہ عنہما۔

لہ سیدنا عبدالرحمان بن خالدؓ، امیرالمومنین عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے نائب کی حیثیت سے حمص کے والی تھے۔ دورِ فتن میں آپ نے سیدنا معاویہؓ کا ساتھ دیا تھا اور آپ کے بھائی حضرت مہاجر بن خالدؓ نے سیدنا علیؓ امیرالمومنین کا۔

حضرت عبدالرحمانؓ میں اپنے والد ماجد کی سی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں اور امت میں ویسی ہی مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا شمار اَبطالِ اسلام میں ہے۔ لیکن راویوں کو اُن کی اس مقبولیت میں بھی زہر نظر آتا ہے۔

المعارف لابن قتیبہؒ میں مذکور ہے کہ آخر عمر میں سیدنا معاویہؓ نے جب ولایت عہد کے بارے میں تقریر کی اور فرمایا: "میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کر جاؤں۔ آپ حضرات کسی کا نام تجویز کیجیے"۔ تو لوگوں نے سیدنا عبدالرحمان بن خالدؓ ہی کا نام پیش کیا تھا جس پر سیدنا معاویہؓ ناراض ہو گئے اور ایک یہودی طبیب کے ذریعہ انھیں زہر دلوا دیا۔ کہتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمانؓ کے فرزند خالدؓ نے یا اُن کے بھتیجے خالد بن مہاجر بن خالدؓ نے اس یہودی طبیب کو قصاص میں قتل کر دیا تھا۔

یہ روایت اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ قطعی بے اصل ہے۔ یہ مسئلہ جس طرح طے ہوا تھا اس کے احوال زیرِ نظر کتاب میں ولایت عہد کے تحت ملیں گے۔ سیدنا معاویہؓ نے اس قسم کی کوئی تقریر نہیں کی تھی جو اُن کے سامنے حضرت عبدالرحمانؓ کا نام لیا جاتا، اور انھیں یوں خفیہ طریقے پر راہ سے ہٹانے کی ضرورت پڑتی۔ پھر جب زہر خورانی کا واقعہ خفیہ تھا تو اس کا پتہ ان راویوں کو کیسے چل گیا۔ اور اگر اس یہودی طبیب کو کسی نے بطور خود قصاصاً قتل کر دیا تھا تو حکومت نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ خلافتِ اسلامیہ میں ایک ذمی کا قتل معمولی بات نہیں۔ خالد بن عبدالرحمانؓ ہوں یا خالد بن مہاجر رضی اللہ عنہم ان حضرات کے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ محض شبہ کی بناء پر وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، اور قتل بھی اُسے کریں گے جو محض آلۂ کار تھا۔ ہمت تھی تو یہ قاتلانہ حملہ امیرالمومنین پر کرتے۔ اور اگر یہ قتل بھی خفیہ تھا یعنی حکومت کو پتہ نہ چلا کہ یہودی طبیب کا قاتل کون ہے تو ان راویوں کو کیونکر معلوم ہو گیا کہ یہ قتل خالد بن عبدالرحمان یا خالد بن مہاجر نے کیا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ اُس عہد کے مسلمانوں کو خصوصاً صحابہ اور ان کی اولاد کو، لوگوں نے بے آئینی اور لاقانونی کا پیرو کیوں سمجھ رکھا ہے۔ اور یہ کیوں باور کر لیا ہے کہ احکامِ الٰہی اور شعارِ اسلامی کی طرف سے وہ بالکل بے پروا تھے۔ پھر حکومت کو اور وہ بھی امیرالمومنین معاویہؓ کی حکومت کو انھوں نے ایسا کیوں خیال کر لیا کہ وہاں نظم و نسق میں اختلال تھا۔ اور آدمی آزاد تھا کہ جسے جب چاہے قتل کر دے اور اسے بازپرس کا خطرہ نہ ہو۔

انھوں نے ان لوگوں کی اچھی طرح گوشمالی کی، تاآنکہ ایک سال کے بعد انھوں نے اپنی حرکتوں سے باز رہنے کا عہد کیا۔ اور اپنے طرزِ عمل پر پشیمانی ظاہر کی۔ حضرت امیر المؤمنینؓ نے فرمان بھیجا کہ انھیں کوفہ واپس جانے کی اجازت دیدی جائے (طبری: ۵ : ۸۷)۔ سیدنا عبد الرحمانؓ نے اشتر کو حکم دیا کہ مدینہ طیبہ حاضر ہو کر حضرت امیر المؤمنینؓ کی خدمت میں بالمشافہ سب کی توبہ پیش کرے۔ باقی لوگوں کی قلبی حالت کچھ بدل گئی تھی اس لئے انھوں نے کوفہ نہ جانے ہی میں عافیت سمجھی، البتہ اشتر مدینہ حاضر ہوا۔ یہاں اس نے ایسے عجز کا مظاہرہ کیا کہ سیدنا عثمانؓ نے اسے بھی کوفہ جانے کی اجازت دیدی۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا۔ یہاں کوفہ سے ایک خط آیا ہوا رکھا تھا، جس میں ان لوگوں کو فوراً کوفہ پہنچنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان سب کی رائے تھی کہ اس خط کو نظر انداز کردیا جائے لیکن اشتر کو یہ رائے پسند نہیں آئی، اور وہ تمام عہد و پیمان اور توبہ کو بالائے طاق رکھ کر کوفہ پہنچ گیا۔ اور پے بہ پے وہاں قسم قسم کے فتنے بپا کئے، اور علانیہ حضرت امیر المؤمنینؓ کے مقابلے پر آگیا، تاآنکہ آپ کی شہادت کا دلگداز واقعہ ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ع

آسماں راحق بود گر خون ببارد بر زمین

اس جگہ مزید تفصیل کا موقعہ نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ سبائی تحریک کا جو اندازہ سیدنا معاویہؓ نے لگایا تھا کہ یہ ایک منظم ہمہ گیر سازش ہے وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ آج تک امت میں جتنے فساد ہوئے اور مصائب ٹوٹے اُن کی تمام ذمہ داری سبائیہ پر ہے۔ اس گروہ کے بعض افراد کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں، اور یہاں ان کا یاد کرلینا ضروری ہے، تاکہ آئندہ کے واقعات میں ان کا کردار سمجھ میں آجائے۔ نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

۱۔ مالک بن الحارث الاشتر النخعی ، ۲۔ ثابت بن قیس نخعی ، ۳۔ کُمیل بن زیاد نخعی ؛ ۴۔ زید بن صوحان عبدی ، ۵۔ جندب بن زُہیر غامدی ، ۶۔ جندب بن کعب ازدی ، ۷۔ عروہ بن جعد کوفی ، ۸۔ عمرو بن ضابئ ، ۹۔ حکیم بن جبلہ۔

مصر میں سبائی گروہ کے لوگ حسب ذیل تھے: ۱۔ عبد اللہ بن سبا۔ جو تحریک کا روحِ رواں تھا۔ اور عراق و شام میں کام کر کے مصر چلا گیا تھا، کیونکہ شام میں اس کی دال نہ گل سکی۔ ۲۔ غافقی بن حرب ، ۳۔ خالد بن ملجم ، ۴۔ سودان بن حمران ، ۵۔ کنانہ بن بِشر ، ۶۔ محمد بن ابی حذیفہؓ بن عُتبہ اموی: یہ صاحب حضرت امیر المؤمنینؓ کے سوتیلے بیٹے تھے، اور آپ ہی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ انھیں ہوس تھی کہ کہیں کے حاکم بن جائیں، لیکن چونکہ اہل نہ تھے اس لئے نہ

بن سکے۔ ہر طرح ناکام رہے تو عرض کیا میں کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔ حضرت امیر المؤمنینؓ نے سب انتظام کر دیا، تو مصر چلے گئے اور وہاں سبائی گروہ میں شرکت کر کے حضرت امیر المؤمنینؓ کے سخت ترین دشمن بن گئے۔ ان کی نا اہلی کا ثبوت یہ ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی جب مصر میں بیعت ہو گئی تو زمام کار انہی محمد نے سنبھال لی۔ لیکن امیر المومنین علیؓ نے مصر کا والی بنا کر سیدنا قیس بن سعدؓ بن عبادہ کو بھیج دیا۔ اور یوں محمد بن ابی حذیفہ اب بھی محروم رہے۔ صحابۂ کرامؓ کی اولاد میں دو شخص ہیں جن کا ذکر مسلمانوں کے لئے موجبِ ندامت و عبرت ہے۔ ایک سیدنا ابو حذیفہؓ اموی کے فرزند یہ محمد اور ایک سیدنا ابو عبید ثقفی کا بیٹا مختار، کہ دنیا و آخرت کی رسوائی انھوں نے مول لے کر ملّتِ اسلامیہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ حسرت کا مقام یہ ہے کہ دونوں کے باپ نہایت مخلص مجاہد اور ذی رُتبہ صحابی تھے۔ البتہ اس کا ثبوت نہ مل سکا کہ مختار کی طرح محمد بن ابی حذیفہ کے عقائد بھی خراب ہو گئے تھے یا نہیں۔ گمان غالب ہی کہ محمد کی تمام حرکتیں محض ذاتی اور سیاسی تھیں، ان کے عقائد سبائی نہ تھے۔ لیکن نفس پروری اور ملت کشی میں ان کی حرکتیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں جن کی تفصیل مسلمانوں کے لئے موجبِ ندامت ہو گی۔

۷۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما۔ آپ حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ کے مخالف نہ تھے، اور نہ سبائی گروہ سے ظاہراً یا باطناً کچھ تعلق تھا۔ اپنے سوتیلے باپ سیدنا علیؓ کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن جب سیدنا عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرح کی بجائے ان محمد بن ابی بکرؓ کو مصر بھیجا گیا اور انھیں راستہ میں حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ کی طرف سے امیرِ مصر کے نام وہ جعلی خط ملا کہ یہ لوگ جب مصر پہنچیں تو انھیں قتل کر دیا جائے، اس وقت سے یہ سیدنا عثمانؓ کے مخالف ہو گئے تھے۔ بلکہ آپ کے قتل کے درپے بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس ظلمِ عظیم سے بچا لیا اور استغفار کرتے ہوئے یہ سیدنا عثمانؓ کے سامنے سے ہٹ گئے۔ لہٰذا انھیں سبائی گروہ میں سمجھنا درست نہیں، اور نہ اُن کی مخالفت کی سازش میں یہ کسی طرح شریک تھے۔ محض ایک وقتی جذبہ کے سبب ناشائستہ حرکات سرزد ہو گئی تھیں جن سے انھوں نے توبہ کر لی اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ان کی بعد کی حرکات محض سیاسی ہیں اور موجبِ طعن نہیں۔ بہر حال یہ تمام ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ اب ہم پھر سیدنا معاویہؓ کے احوال پر آتے ہیں۔

دَورِ امارت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سیدنا معاویہؓ کی خدمات

عسکری تھیں۔ لیکن جب عہدِ فاروقی میں آپ اپنے برادرِ بزرگ سیدنا یزیدؓ کے بعد شام کے والی بن گئے تو آپ کی قابلیت کے حقیقی جوہر کھلے۔ داخلی انتظام کے علاوہ جس کے مجمل احوال اوپر گذرے، آپ کو بڑی فکر یہ تھی کہ برّی فوج کے ساتھ ساتھ بحری بیڑا تیار کیا جائے جو بازنطینی فوجوں کا مقابلہ سمندر میں کرسکے۔ دفاعی انتظامات میں بحریہ کا نہ ہونا آپ کے نزدیک ایک بڑی کمی تھی۔ اس لئے کہ رومیوں کی فوجیں جہازوں کے ذریعہ آیا کرتی تھیں، اور وہ اطمینان سے ساحل پر اُتر سکتے تھے۔ لیکن حضرت فاروق اعظمؓ نے بحریہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔ خشکی پر اسلامی فوجیں چاروں طرف مشغول تھیں، اس لئے وسائل کی کمی کے سبب آپ بحری محاذ کھولنا نہیں چاہتے تھے۔

عہدِ عثمانی میں جب اسلام کے بطلِ جلیل سیدنا عبداللہ بن عامرؓ بن کُرَیزؓ کے ہاتھوں ایران کا آخری فیصلہ ہوتا نظر آنے لگا تو سیدنا عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کی دیرینہ خواہش پوری کردی، اور بحری بیڑے کی تیاری کا حکم دیدیا۔ چنانچہ سیدنا معاویہؓ نے جہاز سازی کے کارخانے قائم کردیے اور فوجیوں کی بحری تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام کردیا۔ یہ سب اہتمام اس سرعت سے ہوا کہ ۲۷ھ ہی میں جزیرۂ قبرص پر بحری حملہ ممکن ہوگیا، اور ۲۸ھ میں اہلِ قبرص نے جزیہ پر صلح کرلی۔ اُن کی پیش کش یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کو سات ہزار دینار سالانہ ادا کیا کریں گے مگر ساتھ ہی اجازت مانگی تھی کہ اتنی ہی رقم شاہ روم کو بھی دیدیا کریں۔ حضرت معاویہؓ نے امیرالمؤمنین کی اجازت سے یہ درخواست منظور کرلی۔ مگر شرط لگائی کہ اگر پشت کی طرف سے اُن پر حملہ ہو تو مسلمانوں پر ان کی امداد ضروری نہ ہوگی۔ لیکن اگر شاہ روم کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی بحری پیش قدمی ہو تو اس کی اطلاع مسلمانوں کو یہ لوگ پہنچا دیا کریں گے اور جب مسلم بحری بیڑہ ادھر سے گذرے گا تو اسے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائیں گے۔ اور اس کا خیال رکھیں گے کہ اس بیڑے کو اہلِ قبرص کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہونے پائے۔ مسلمانوں کے اس پہلے بیڑے کی کمان سیدنا عبداللہ بن قیس حارثی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ گویا آپ کو مسلمانوں کا سب سے پہلا امیرالبحر ہونے کا شرف حاصل ہے اور جنتی مجاہدوں کا امیر ہونے کی عزت مستزاد۔

سیاسی اور عسکری اعتبار سے یہ نہایت اہم ابتدائی کارروائی ہوگئی۔ یعنی قبرص کو ایک نیم آزاد حکومت بنادیا گیا۔ رومی حکومت کے تسلّط سے بہرحال وہ آزاد ہوگیا۔ اگرچہ اسلامی مملکت کا جزو نہ بن سکا۔ لیکن مسلمانوں کو سمندر میں ایک اہم فوجی مرکز مل گیا۔ جن اہلِ تصنیف نے

قبرص کو مفتوحہ علاقہ قرار دیا ہے انھوں نے اس اوّلین بحری جہاد کی تفصیلات پر غور نہیں کیا۔ درحقیقت اس جزیرے پر باہمی سمجھوتے سے مسلمانوں کی بالادستی قائم ہوئی تھی۔ وہ مملکتِ اسلامیہ کا جزء اس وقت نہیں بنا تھا۔ قبرص کی یہ مہم ذیلی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن بحری مہموں کے لئے اس اقدام نے راہ کھول دی۔ اہلِ روم سے اب سمندر میں باقاعدہ جھڑپیں ہونے لگیں۔ اور ان کے لئے سب سے سخت بات یہ تھی کہ عموماً مسلمان ان کے جنگی جہاز چھین لیا کرتے تھے۔

تاریخ کا طالب علم جب اسلامی بحریہ کے ان ابتدائی کارناموں کو دیکھتا ہے کہ کس طرح وہ دنیا کی متمدن ترین حکومت کی بحریہ کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا تو اسے حیرت ہوتی ہے۔ مختصر مدّت، بالکل نیا تجربہ جس سے عربوں کو چنداں مناسبت نہ تھی، وہ اس خوبی سے پہلے ہی امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ایک عجوبہ تھا۔ اور اس سے جہاں اس عہد کے مسلمانوں کی عزیمت معلوم ہوتی ہے وہاں سیدنا معاویہؓ کی عظمت کا بھی گہرا نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے، کہ امورِ جہانبانی کا کوئی گوشہ ان کی فکر کے لئے اجنبی نہ تھا۔ ہر تعمیری شعبے میں وہ اپنی قائدانہ صلاحیتیں اس طرح بروئے کار لاتے تھے کہ گویا بس اسی کام کے لئے بنے ہوں۔

بحری جہاد کے لئے خلافتِ اسلامیہ کو اس وقت تیار کرنا مشکل تھا۔ سیوطی جیسے مؤرخوں کی عنایت سے (تاریخ الخلفاء: ص ۶۰، طبع مصر) لطیفہ مشہور ہے اور بالکل غلط کہ سیدنا معاویہؓ نے جب حضرت فاروق اعظمؓ سے بحریہ مرتب کرنے کی اجازت مانگی، تو انھوں نے والیِ مصر سیدنا عمروؓ بن العاص کو خط لکھا کہ سمندر کی کیفیت لکھ کر بھیجیں۔ ان کا جو جواب بیان کیا جاتا ہے وہ ادبِ عربی کا شہ پارہ ہے۔ فرماتے ہیں:

انی رأیت خلقاً کبیراً یرکبہ خلق صغیرٌ ان رکن خرق القلوب وان تحرک ازاغ العقول۔ یزداد فیہ الیقین قلۃً والشک کثرۃً۔ ہم فیہ کدود علیٰ عود۔ ان مال غرق وان نجا برق۔	میں نے ایک بڑی مخلوق دیکھی (یعنی سمندر) جس پر ایک چھوٹی مخلوق سوار ہوتی ہے (یعنی جہاز)، اگر لنگر ڈالے ہو تب بھی دل خوف زدہ رہیں اور اگر حرکت کرے تو عقلیں زائل ہو جائیں۔ یقین ہر آن کم ہوتا جاتا ہے اور شک ہر گھڑی بڑھتا ہے۔ ان کا عالم یہ ہوتا ہے جیسے لکڑی پر کیڑا چمٹا ہو۔ (لکڑی) جھکے تو (کیڑا) ڈوب جائے، اور نجات پالے تب بھی دہشت زدہ رہے۔"

علامہ سیوطیؒ کے نزدیک یہ خط پڑھ کر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات

کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا، میں کبھی کسی مسلمان کو سمندر میں اترنے نہیں دوں گا" ہمارے نزدیک یہ محض ایک لطیفہ ہے، جس میں صداقت کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید جس قوم کے ہاتھ میں ہو وہ سمندر اور جہاز کی کیفیت سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ پھر مدینہ طیبہ سے سمندر کچھ اتنی دور نہ تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ اس کے احوال سے اجنبی ہوں۔ شام کے قافلے بسا اوقات ساحلِ بحر ہی کی راہ مدینہ سے گذرتے تھے۔ اس کے علاوہ عربوں کو جاہلیت کے زمانے میں بھی بحری سفر کا تجربہ تھا۔ خود پہلی ہجرت حبش کو ہوئی تھی۔

پھر یہ بات غور طلب ہو کہ بحریہ بنانے کی اجازت طلب کرتے ہیں والیِ شام سیدنا معاویہؓ اور سمندر کی کیفیت پوچھی جاتی ہے والیِ مصر سیدنا عمروؓ سے۔ حالانکہ تاریخِ اسلام میں خود آپ کی شخصیت وہ ہے کہ آپ نے بحیرۂ رُوم اور بحرِ قلزم کو ملانے کے لئے نہر بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا، اور اس سے پہلے دریائے نیل اور بحر قلزم کو ایک نہر کے ذریعہ ملا کر تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کا انتظام کر چکے تھے۔ (الفاروق: ص ۳۸۲، طبع ملتان) پھر اُن پر سمندر کا کیا خوف ہوتا؟ اس لئے جس سیاسی مصلحت سے حضرت فاروقِ اعظمؓ نے سیدنا معاویہؓ کو بحریہ کا محکمہ کھولنے کی اجازت نہیں دی اسی مصلحت کے تحت نہر بنانا بھی ملتوی کرا دیا۔ موجودہ نہر سویز اسی ابتدار کی انتہا ہے۔ ان دونوں منصوبوں پر عملدرآمد کی اجازت نہ دینے کی وجہ صرف سیاسی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو بحری جنگ کا تجربہ نہیں تھا۔ اور خشکی پر اُن کی مہیں اتنے وسیع پیمانے پر ہو رہی تھیں کہ نیا بحری محکمہ کھولنا موجودہ وسائل کے تحت مشکل نظر آرہا تھا۔ ورنہ مسلمانوں کی سی صاحبِ عزیمت قوم کے لئے جو اللہ کے واسطے جان ہتھیلی پر لئے پھرتی تھی، یہ تجربہ اتنا ہولناک نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے عظیم ترین فرماں روا اور کوہِ استقامت، ایسی زبردست قسم کھا کر جہاد فی سبیل اللہ کی ایک اہم راہ مسلمانوں پر بند کر دیتے۔

بات صرف وہی ہے جو ہم بیان کر چکے کہ اس وقت خشکی کی مہمات جاری تھیں، اور نیا محاذ کھولنا مشکل تھا۔ کیونکہ اس کے لئے بالکل دوسری قسم کے انتظامات کرنے پڑتے اور تربیت کا طریقہ بھی نیا ہوتا۔ ویسے سب مسلمان جانتے تھے کہ انھیں وقت آنے پر بحری جہاد شروع کرنا ہو۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

حضرت امیر المومنین سیدنا عثمانؓ کے مبارک عہد میں مال و دولت کی فراوانی ہوئی تو مسلمان اس قابل ہو گئے کہ بحری جہاد کی مستقل مد قائم کریں۔ لوگ کہتے ہیں اور غالباً ان کا بھی مقصد

یہ ہے کہ سیدنا عثمانؓ کے قلب پر سمندر کا ہول دکھائیں کہ آپ نے بحریہ کی اجازت اس شرط پر دی تھی کہ کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ صرف وہی لوگ بھرتی ہوں جو اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کریں۔ یہ خیال اور اس کے تحت جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ بھی غلط ہے۔ جنگی ضروریات کے لئے مسلمانوں پر جبر کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ امیر المؤمنین کا ایک اعلان کافی ہوتا تھا۔ کہ فلاں مہم پر فوج جانی ہے اور لوگ خود بخود حاضر ہو جاتے تھے۔ تمام فوجی خدمت رضا کارانہ تھی۔ لہٰذا بحریہ کے متعلق آپ کا یہ فرمان بھی محض دستور کے مطابق تھا۔ سمندر کے خوف کو اس میں مطلقاً کچھ دخل نہ تھا۔

اس ذیل میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جوں ہی سیدنا معاویہؓ نے بحریہ کے انتظامات مکمل کر کے قبرص کی طرف پیشقدمی کی تو والیٔ مصر سیدنا عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرح نے بھی پوری امداد دی، اور خود ایک فوجی دستے کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہوئے۔ حالانکہ آپ اس وقت افریقیہ کی فتوحات میں مشغول تھے۔ گویا بحری جنگ کا سلسلہ نہایت عزیمت کے ساتھ شروع کیا گیا، اور یوں قبرص کی پہلی مہم سر ہوئی۔

اسے اگر ایک طرف بحریہ کا عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے تو دوسری طرف سیاسی اور عسکری فکر کا بھی شاندار نمونہ ہے۔ جزیرے پر مکمل قبضے کے معنی ہوتے محاذِ جنگ کو قسطنطنیہ کے بہت قریب کر دینا، اور یہ بالکل نئے تجربے کے تحت اطمینان بخش بات نہ ہوتی۔ دوسرے قبرص کی رعایا پر تسلط کے لئے انتہائی انتظامات کی ضرورت پڑتی جو اس وقت کی مشغولیتوں کی بنا پر آسان کام نہ ہوتا۔ پاک ہے وہ ذات جس نے شام کی ولایت کے لئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جیسی عظیم اور صاحبِ تدبیر شخصیت کو منتخب فرمایا۔

اس بحری جہاد کا منظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا تھا، اور آپ نے اس پر فخر کیا تھا (صحیح بخاری: ج ۴ ص ۹۵، طبع مصر)۔ مسلمان اس غزوے کا ذوق شوق سے انتظار کر رہے تھے۔ کیوں کہ اس میں شریک ہونے والوں کو جنت اور رضائے الٰہی کی بشارت دی گئی تھی۔ اس حدیث کو ہم انشاء اللہ تعالیٰ غزوۂ قسطنطنیہ کے تحت نقل کریں گے۔ کیونکہ اس غزوے کے شرکاء پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے، اور ان سب کے لئے بھی مغفرت کی بشارت دی ہے۔ ان دونوں غزوات کا ایک ایک سپاہی جنتی ہے اور ان سب پر دوزخ حرام ہے۔ سیدنا معاویہؓ کے دورِ امارت میں بحری جہادوں کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس میں

سے ایک بہت بڑا معرکہ ۳۱ھ میں پیش آیا۔ قسطنطین شاہِ روم نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے ایک عظیم الشان بیڑہ تیار کیا۔ جس میں پانچ سو کے قریب بڑے بحری جہاز تھے، اور تمام آلاتِ حرب استعمال کے لئے لائے گئے تھے۔ چونکہ خود قسطنطین اس بیڑے کی قیادت کر رہا تھا لہٰذا سیدنا معاویہؓ بہ نفس نفیس اس کے مقابلے پر نکلے۔ بیڑے کی کمان سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب نصرانی اور مسلم بیڑے آمنے سامنے ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے پیغام دیا گیا کہ باہم امن رہے تاآنکہ دونوں فوجیں ساحل پر اتریں اور خشکی پر لڑیں اور وہ جنگ فیصلہ کن ہو۔ مگر نصرانیوں نے کہا کہ ہم سمندر میں لڑیں گے چنانچہ مسلمان اس پر راضی ہوگئے۔ اور اتنی سخت جنگ ہوئی کہ بقول راوی "رجعت الدماء الی الساحل (کشتوں کا خون ساحل تک بہتا ہوا نظر آیا)" مسلمانوں کو فتح ہوئی اور قسطنطین شکست کھا کر پسپا ہوا (عثمان بن عفان: طبع مصر، ص ۲۱۶-۲۱۷)۔

زمانۂ فتن

خلافتِ اسلامیہ اپنے عروج پر تھی۔ ایران جیسی بہت بڑی مخالف طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جو عہدِ نبوی ہی سے اسلام کے خلاف عملی کارروائیاں کر رہی تھی۔ مدعیانِ نبوت کا ان علاقوں میں کھڑا ہونا جو ایران کے زیرِ اثر تھے، ایسی بات نہیں جس سے آنکھ بند کی جا سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت و عزیمت کے ذریعہ اس اندرونی اختلال کا خاتمہ کر دیا۔ پھر سیدنا سعید بن العاصؓ اموی اور سیدنا عبداللہ بن عامرؓ بن کریز عبشمی جیسے قائدینِ کرام نے ایران کی قسمت پر آخری مہر لگا دی، اور یوں فاتحِ قادسیہ سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص نے جن کارناموں کی ابتداء کی تھی وہ عہدِ عثمانی میں اپنی انتہاء کو پہنچ گئے۔

ادھر بحری محاذ کھل جانے سے دوسری بڑی طاقت یعنی بازنطینی حکومت کے لئے اسلام دردِ سر بن گیا۔ رومیوں کے ساتھ بھی عہدِ نبوی ہی سے چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ اور ہر میدان میں مسلمان اسے شکست پر شکست دے رہے تھے۔ مثلاً عرب، مصر، اور شمالی افریقہ سے اس کا تسلط بالکل اٹھ گیا تھا۔ امیر المؤمنین عمر الفاروقؓ نے اسلام کی طاقت کو دنیا میں سب سے اونچا کر دیا تھا، اور امیر المؤمنین عثمانؓ نے ارتقاء کا یہ سلسلہ پوری قوت سے جاری رکھ کر اسلام

کی طاقت کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ سیدنا معاویہؓ کے زیر اہتمام بحری محاذ کھل جانے سے عالمِ کفر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، کفر و اہلِ کفر پر مادی اور روحانی، ذہنی اور علمی، سیاسی اور معاشی، انفرادی اور اجتماعی ہر اعتبار سے شکست خوردگی طاری تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے علاوہ اقوامِ عالم کے لئے کوئی موضوعِ سخن نہ تھا۔ لہٰذا اہلِ کفر و طغیان میں جو مواد پک رہا تھا وہ یہودیوں اور مجوسیوں کے باہم مل جانے سے پھوٹ پڑا۔

ان لوگوں پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ کھلے میدان میں وہ اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے، استدلال اور وجدان دونوں کا قلوب پر غلبہ ہو رہا ہے۔ انھیں نظر آ رہا تھا کہ بہت قلیل مدت میں اہلِ عالم کا دین، اسلام ہو جائے گا۔ نسل اور وطن اور قومیت کی داستانیں پارینہ ہو جائیں گی، ذہنی غلامی اور معاشی وسائل کی اجارہ داری کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ پیدائشی برتری کا تصور خواب و خیال ہو جائے گا۔ سوائے ایمان باللہ اور عمل صالح کے زندگی کا کوئی معیار ہی نہیں رہے گا۔ اس لئے ابلیس کے یہ کارندے چور دروازے سے داخل ہوئے اور اسلام کا جامہ پہن کر حضرت امیر المومنین عثمانؓ اور آپ کے بے نظیر عمّال کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ دعوتِ محمدیہ کے یہی مخلص علمبردار تو تھے جو اُن کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اہلِ کفر و شرک کو ناک چنے چبوا دیئے تھے۔

شام کے علاوہ باقی ہر جگہ سے سبائیوں کو نومسلموں میں سے اپنے مطلب کے آدمی مل گئے، حتیٰ کہ بعض صلحاء بھی ان کی تلبیس کا شکار ہو گئے۔ حضرت امیر المومنین عثمانؓ نے جب عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں کو اصلاح کے لئے شام بھیج دیا تھا، تو خود وہ بھی وہاں اپنی کارروائی کے لئے آن موجود ہوا۔ شام کے کسی شخص کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکا، تو اس نے ایک نئی چال چلی۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

یا اباذر! الا تعجب من معاویۃ یقول المال مال اللہ الا ان کل شئی للہ۔ کانہ یرید ان یحتجنہ دون المسلمین ویمحو اسم المسلمین۔	اے ابوذر! کیا آپ کو اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ معاویہ اس مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں۔ ویسے ہے تو ہر چیز اللہ ہی کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی بجائے خود اس پر قابض ہو کر مسلمانوں کا نام مٹا دینا چاہتے ہیں۔

سیدنا ابوذرؓ یہ سن کر سیدنا معاویہؓ کے پاس پہنچے، اور دریافت کیا "کیا بات ہے جو آپ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں۔" انھوں نے فرمایا "ابوذر! اللہ آپ پر رحم کرے۔ کیا ہم اللہ کے

بندے نہیں، کیا یہ مال اس کا نہیں، یہ مخلوق اس کی نہیں ! اور کیا حکم صرف اسی کا نہیں چلتا" ؟
فرمایا" بہر حال اب ایسا مت کہا کیجئے گا" حضرت معاویہؓ نے جواب دیا" میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مال اللہ کا نہیں، البتہ اسے مسلمانوں کا مال کہا کروں گا"

یہ قصہ ختم ہوا تو پھر ابن سبا، نے سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کو تاکا، اور یہی بات ان سے بھی کہی۔ یہ نہ سوچا کہ زاہد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عالم وفقیہ اور قاضی بھی تو ہیں جو بات کی تہ تک پہنچنا جانتے ہیں۔ انھوں نے سنتے ہی چھوٹتے ہی فرمایا" تو کون ہے؟ مجھے تو یہودی معلوم ہوتا ہو" وہاں سے ناامید ہو کر ایک تیسرے زاہد سیدنا عبادہؓ بن صامت کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے اسے پکڑ لیا۔ اور سیدنا معاویہؓ کے پاس لے جاکر فرمایا" بخدا یہی ہے وہ شخص جس نے ابو ذرؓ کو آپ کے پاس بھیجا تھا" تب اُسے شام سے نکالا گیا۔

اس شخص کی چال دیکھنی چاہئے کہ شام جیسے پُر امن، منظم اور خوش حال علاقے میں سیدنا معاویہؓ جیسے کامل حکمران کے خلاف کیا شوشہ چھوڑا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تین ایسے بزرگوں کو تاکا جو زہد میں ممتاز تھے۔ ان میں سے دو جو فقیہ تھے وہ اس کی چال سمجھ گئے۔ لیکن جن پر حال غالب تھا وہ اس کے کہنے میں آگئے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ ان پر اس کا جادو چل گیا، بلکہ اس اعتبار سے کہ جو اُن کا حال تھا اسی کے مطابق ان سے بات کی۔

لوگوں نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کا نام اچھالنے کی بہت کوشش کی ہے۔ کچھ نے مفتریات کے ذریعہ فتنوں کو ہوا دینے کے لئے، اور کچھ نے موجودہ دورِ اشتراکیت میں یہ کہہ کر کہ اسلام میں وہ سب سے پہلے اشتراکی تھے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ ان کے مذہب کو اشتراکیت سے کیا علاقہ۔ ان کا تو وہ طرزِ عمل تھا جو امتِ محمدیہ کے اصحابِ ترک وتجرید نے ہمیشہ اختیار کیا اور کرتے رہیں گے۔

بہر حال دکھانا یہ مقصود ہے کہ سبائیوں کی ریشہ دوانیاں کیسی ہمہ گیر تھیں۔ اب اصحابِ شعور کو سوچنا چاہئے کہ سیدنا معاویہؓ کوئی خلیفہ یا حاکمِ اعلیٰ تھے کہ جو چاہیں سو کریں۔ بیت المال کے متعلق جو طرزِ عمل آپ کا تھا وہ حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ اور آپ سے پہلے دونوں اماموں کے دستور کے مطابق تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے انفال وغنیمت کو اپنا مال بتایا ہے، اور اس کے متعلق احکام متعین فرمائے ہیں جن پر عہدِ نبوی سے عملدرآمد ہوتا چلا آرہا تھا، اور جن امور کے گواہ اور کارکن وہ سب حضرات تھے جو زمین پر اللہ کے گواہ ہیں۔

ابو ذرؓ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بھی منجملہ ان چند بزرگواروں کے ہیں جن پر قسم قسم کے جھوٹ

بولے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ہی افسانوی بنا دیا گیا ہے۔ مسعودی وغیرہ نے جو طومار باندھا ہے اور صحابۂ کرام اور ان کے درمیان اصولی مناقشات کا جو نقشہ کھینچا ہے، تو بالکل عقل کو خیرباد کہہ کر ان روایات پر تنقید کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔ اور اگر اس کی ضرورت ہوگی بھی تو امیر المومنین عثمان رضؓ کے احوال کے تحت۔ مناسب ہے کہ جو صاحب تحقیق کرنا چاہیں وہ العواصم من القواصم ملاحظہ فرمائیں کہ امام ابوبکر ابن العربیؒ اور فاضل محشی جناب محب الدین الخطیب نے شافی بحث کی ہے۔

البتہ یہاں ان کے اس مسلک سے بحث ضروری ہے جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سیدنا معاویہؓ اور ان کے درمیان اَن بن ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوذرؓ نے جب اپنے "مذہب" کی تبلیغ بے محابا شروع کر دی، اور سیدنا معاویہؓ نے ان کی شکایت بارگاہِ خلافت میں بھیجی تو انھیں شام سے بلا لیا گیا۔ مگر مدینہ آکر بھی انھوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ تا آنکہ یہاں کے باشندے ان سے ناراض ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیدنا عثمانؓ کے مشورے سے انھوں نے رَبذہ میں قیام اختیار کیا۔ جس کے لئے سرکاری طور پر سب انتظام کر دیا گیا۔ ان کی خدمت کے لئے غلام اور اونٹ بھی دیدیئے گئے۔

ان بیان کردہ باتوں میں کچھ جھوٹ ہے اور کچھ سچ۔ سچ بس اتنا ہے کہ سیدنا ابوذرؓ چونکہ صاحبِ ترک تھے لہٰذا رَبذہ چلے گئے اور سرکاری خرچ پر وہیں رہتے رہے۔ ویسے وہ مدینہ طیبہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جھوٹی باتیں وہ ہیں جو مال کے بارے میں اُن کے متعلق کہی جاتی ہیں، اور طرح طرح کی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ جیسے کوئی ناصح کھڑا ہوا اور بدراہ لوگ اس کی بات نہ سنیں۔ یہ سب مکروہ فضا محض شر انگیزی کے لئے پیدا کی گئی ہے، تاکہ صحابۂ کرام کی عظمت دلوں سے کم ہو اور اس عہد کے معاشی نظام کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بالکل خلافِ واقعہ تصورات جاگزین ہو جائیں۔

سیدنا ابوذرؓ کے متعلق مسعودی اور بعد کے لوگ جن میں خضری وغیرہ جیسے اصحابِ فہم بھی شامل ہیں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ اگر انھیں سب کو سچ باور کر لیا جائے تو آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ سیدنا ابوذرؓ کو مطلقاً قرآن فہمی کی صلاحیت نہیں تھی۔ اور یہ بات اس ذاتِ گرامی کی بابت کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب میں تھے، اور جنھیں لسانِ نبوت نے شبیہ عیسیٰؑ بن مریمؑ فرمایا ہے (یعنی عیسیٰ بن مریم کا سا)۔ بس اتنی بات ہے کہ آپ پر

حال کا غلبہ تھا، اور چاہتے تھے کہ آپ کی طرح سب صاحب ترک ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابو ذرؓ کے نزدیک تمام مالدار صحابہ دین کھو بیٹھے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ حضرات اپنے پاس کچھ نہ رکھیں، اور اپنی سب دولت تقسیم کر دیں۔ سیدنا معاویہؓ سے بھی اسی بات پر چلی تھی۔ ان کی حجت یہ آیت تھی (التوبۃ: ۳۴) اور کہتے ہیں کہ اسی کو وہ بار بار پڑھا کرتے تھے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔	"اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجیے۔"

حالانکہ قرآن حکیم موجود ہے، اور وہ آیت بھی جس کا یہ ٹکڑا ہے۔ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔	"اے ایمان والو! یہ جو یہود کے اکثر عالم اور پیر ہیں، یہ لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اب جو لوگ سونا چاندی جمع کریں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کریں، تو انھیں تم دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو۔"

آیت واضح ہے کہ جو لوگ اللہ کے نام پر لوگوں سے روپیہ اکٹھا کریں، اور جس غرض سے اہلِ خیر نے انھیں دیا، اس پر خرچ کرنے کی بجائے اسے اپنا ذاتی مال بنا لیتے ہیں، اور یوں مقاصدِ الٰہی بر لانے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، یعنی اللہ کی راہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے تو اُن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس آیت کو ان مسلمانوں پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے جو حلال طریقے پر کمائیں، اور حدودِ الٰہی کے مطابق خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (بنی اسرائیل ۲۶):

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا۔	"اپنے رشتہ داروں کو ان کا حق دیا کرو، مسکینوں اور مسافروں کو بھی، مگر اپنی دولت لٹایا مت کرو۔"

پھر فرماتا ہے: (بنی اسرائیل؛ ۲۹):

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ	اور اپنے ہاتھ اپنی گردن میں لپیٹے مت رکھنا،

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ۚ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا۔	(یعنی بخل مت کرنا، اور نہ انھیں پوری طرح کھلا رکھنا۔ اس طرح تم لوگوں کی ملامت کا نشانہ بنو گے اور مجبور بیٹھے رہا کرو گے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے خوب دیتا ہے، اور جانچ کر

اس کی حیثیت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے احوال اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے۔"
یعنی بخل کرو گے تو لوگ طعنہ زن ہوں گے، بُری طرح لُٹاؤ گے تو پھر حسرت سے لوگوں کا مُنہ تکا کرو گے لہٰذا جب کسی کی مدد کرو تو اس کا ظرف اور اپنی سکت دیکھ کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمھاری فراخ دلی سے بد راہ ہو جائے، یا تم اپنی کنجوسی کے سبب لوگوں کی نگاہ سے گر جاؤ۔

پھر فرماتا ہے: (الفرقان: ۶۷):

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔	"اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے محابا اور نہ تنگی کے ساتھ بلکہ مناسب درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں جو ثبات بخش ہو"

یہ احکام ہو گئے معمولی اور عام حالات کے۔ اگر ہنگامی اور غیر معمولی احوال ہوں تو اس کے احکام دوسرے ہیں۔ مثلاً (البقرۃ: ۲۱۹):

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ۔	"وہ تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کر ڈالیں۔ کہہ دو جو ضرورت سے زائد ہو، اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیات ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے جو غور و فکر کے اہل ہیں"

یہ آیت جہاد اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں ہے۔ یعنی احوال کے مطابق قومی ضرورت کا خیال کر کے جان و مال کی قربانی کی جائے۔ ضرورت کا تعیّن اعتباری چیز ہے اور اس کا انحصار ہے حالات پر۔ عام طور پر تو آدمی اپنے اخراجات و خیرات و صدقات و عطیات میں توازن قائم رکھے، لیکن بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کو بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اگر حکومتِ اسلامیہ کوئی معیار قائم کر دے، اور قومی ضروریات کے مطابق یہ تحدید کر دے کہ اس سے کم، اور اس سے زیادہ کسی کی آمدنی نہیں ہو سکتی، تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقررہ معیار سے جو کچھ زائد ہو وہ بحقِ سرکار لے لیا جائے۔

اور بھی احوال نازک ہوں تو زندگی خرچ کرنے میں ہے۔ جتنا بھی خرچ آدمی کے امکان میں ہو اس سے دریغ نہ کرے۔ بلکہ سب کچھ دیدینے کا موقعہ ہو تو اس وقت بھی نہ ہچکچائے۔ (البقرۃ ؛ ١٩٥) :

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔	"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں خود ہی ہلاکت مول نہ لو۔ اور احسان کرو، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

عام حالات میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا موجبِ ہلاکت ہے، اور بوقت ضرورت خرچ نہ کرنا بھی۔ اسی لئے احسان کی راہ اختیار کرنی چاہئے کہ فراستِ ایمانی کام میں لائی جائے کہ یہ وقت ہاتھ روکنے کا ہے یا کھولنے کا۔ اس طرح ہلاکت سے نجات ملے گی۔ احسان کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بطورِ خود آدمی رضاکارانہ اپنی دولت پیش کرے۔ حکومت کو جبراً ضبط کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ متفق علیہ بلکہ متواتر حدیث صحیح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی یہی تعریف کی ہے۔ اَنۡ تَعۡبُدَ رَبَّکَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُنۡ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، ورنہ کم از کم یہ تصور ضرور ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)۔

بندۂ مومن جب اپنے ضمیر کی آواز سنے گا، اور اپنی ملت کے احوال کا واقعی اندازہ لگائے گا تو خود بخود اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وقت کی ضرورت کیا ہے، اور اسے کس حکمِ خداوندی کی تعمیل کرنی چاہئے۔ ہر قوم پر ایسے ہنگامی حالات آتے ہیں جہاں افراد سے انتہائی قربانی طلب کی جاتی ہے۔ اس وقت جو شخص کترانے کی کوشش کرے گا وہ ملت کا غدار ہے۔ اور جبراً اس کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا جائے گا۔ ایسی صورت میں خدائے عزّ و جلّ سے اجر کی توقع حماقت ہوگی۔ اجر اسی پر ہے جو آدمی رضاکارانہ اپنی بندگی اور ایمان کا ثبوت دے کر اپنا سب کچھ اللہ کے لئے قربان کر دے۔

ان تمام آیات کی موجودگی میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا ابوذرؓ جیسے جلیل القدر عارف صحابی کے متعلق جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ کسی درجے میں سچی ہیں۔ ان کا غالب حصہ جھوٹا ہے، افترا محض ہے۔ اور باقی امور میں تلبیس ہے، اور کچھ کا کچھ کر کے دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنا باور کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی طور پر آپ اپنے احوالِ قلبی کے تحت اسے پسند کرتے تھے کہ کم سے کم ضرورت رکھیں۔ امتِ محمدیہ میں اصحابِ ترک کا یہی دستور رہا ہے۔ انھیں لذت ہی اس

میں ملتی ہے۔ اور ان کی روحانی ترقی کا مدار ہی اس پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ افراد کا ذاتی رجحان ہو۔ اسے شعارِ قومی نہیں بنایا جاسکتا۔ امت کی اقتصادی حالت درست ہو، اور دولت کی تقسیم متوازن، اور اس کے باوجود لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند نہ کریں، اور نعمائے الٰہی سے لطف اندوز نہ ہوں تو یہ کفرانِ نعمت ہے، اور قرآن کی برکتوں سے اپنے آپ کو جان بوجھ کر محروم کرنا ہے۔ چونکہ یہ امت مصطفویؐ ہے اس لئے اس کی اکثریت کو مرفہ حال ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو کمزور بتایا ہے جو فرار کی راہ اختیار کریں، اور اپنی ہستیوں کو مادی مشقتوں میں ڈالیں۔ چنانچہ صحیح حدیث کے مطابق خود سیدنا ابوذرؓ کو بھی آپؐ نے بتایا کہ تم ضعیف ہو، لہٰذا زاویہ نشینی اختیار کرلینا۔ دعوتِ محمدیہ کے پیرووں کو "کنجِ عافیت" میں بیٹھنے سے کیا مطلب، وہ تو اس دنیا میں امامت کے فرائض ادا کرنے کے لئے پیدا کیے گئے ہیں، انھیں تو ہر شعبۂ زندگی کی آبیاری کرنی ہے۔ اور ہر زاویۂ نگاہ سے اقوامِ عالم کو نمونہ بن کر دکھانا ہے کہ زندگی یوں بسر کی جاتی ہے، بلکہ جس طرح بعض کمزور طبائع کی ترقی گوشہ نشینی میں ہوتی ہے، اسی طرح بعض کی ترقی کا انحصار ہی اس پر ہوتا ہے کہ وہ خوب نازونعم میں پرورش پائیں، سیر کریں، اور سفر پر رہیں۔ غرض یہ ہے کہ زندگی اپنی اصل میں انفرادی ہے۔ اور ہر شخص تن تنہا اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہ ہے۔ کوئی ایک طریقہ سب کے لئے وضع نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰہِ (اللہ کے ہاں اُن کے مدارج ہیں)"۔

اللہ تعالیٰ نے آمد و خرچ کے حدود مقرر فرمائے ہیں۔ اُن حدود کے اندر رہ کر آدمی بالکل آزاد ہے کہ جتنی دولت چاہے کمائے اور جتنی مناسب سمجھے خرچ کرے۔ معیوب و مردود ہے حد سے تجاوز کرنا۔ یعنی حرام و مشتبہ طریقوں سے دولت کمانا اور حرام و مشتبہ طریقوں پر خرچ کرنا۔ فی سبیل اللہ کمائے اور فی سبیل اللہ خرچ کرے۔ ارشادِ حق ہے (طٰہٰ : ۱۱۲):

وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا ہَضۡمًا۔	"اور جس نے نیک عمل کئے اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہے تو اسے نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ اعمال کے ضائع ہونے کا۔"

یہ خوش خبری دنیا و آخرت دونوں کے لئے ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: (طٰہٰ : ۱۲۴):

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی۔	اور جس نے میری یاد سے منہ موڑا اُسے تنگی کی زندگی نصیب ہوگی، اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔"

چنانچہ مشاہدہ ہی کہ جو لوگ حرام کی دولت جمع کرتے ہیں ان کی زندگی ہمیشہ تلخ رہتی ہے، اور جو حرام پر خرچ کرتے ہیں ان کی بھی۔ آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جس کی آمدنی حرام کی ہے اور اس کی زندگی حرام بنی ہوئی نہ ہو۔ رات کی نیند اُڑ جانا، یا ہضم خراب رہنا تو ادنیٰ ترین عذاب ہے۔ پھر ہے اولاد اور اس کی طرف سے ہر وقت کی کوفت۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو حرام طریقے پر اپنی دولت لُٹاتے ہیں کہ چہرے مسخ ہو جاتے ہیں اور احوال دگرگوں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جتنی برائیاں پیدا ہوئی ہیں اس کی وجہ محض یہ ہے کہ دولت مالداروں ہی میں گشت کرتی رہتی ہے، اور اس طرح ایک مخصوص طبقے کے علاوہ باقی لوگ پریشان خاطر رہتے ہیں۔ اسی سے اخلاقی جرائم بڑھتے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی یاد کو دلوں سے بھلا دینے کا نتیجہ۔ اسی لئے اسلام میں وہ سب طریقے حرام ہیں جو دولت کو مالداروں ہی میں محصور کر دیں۔ نظامِ اسلامی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دولت کو دست گرداں رکھے۔ حلال کمانے کی آزادی کے ساتھ اس نے ایسے طریقے مقرر کر دیئے ہیں کہ آدمی کی دولت مفید مقاصد کے لئے تقسیم ہوتی رہے۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (الحشر: ۷)
"تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی میں گشت نہ کرتی رہے۔"

اشتراکی نظام کی خرابی یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک انفرادی آزادی ختم نہ کر دی جائے۔ اور افراد پر ہر وقت اسٹیٹ کا خوف غالب نہ رہے۔ اسٹیٹ عبارت ہوتی ہے چند آدمیوں سے۔ یہ سرمایہ داری سے بھی بدتر چیز ہے کہ وہاں معیشت اپنے ہاتھ میں نہیں رہتی، اور یہاں دل و دماغ اور زبان مفلوج ہو جاتی ہے۔

لیکن نظامِ اسلامی میں اسٹیٹ کی بجائے اللہ کا خوف ہے، جو ظاہر و باطن سب جانتا ہے اور جس کے سامنے آدمی ہر قول و عمل و فکر کے لئے جواب دہ ہے، اور جس کی پکڑ سے مرنے کے بعد بھی چھٹکارا نہیں۔ لیکن اللہ کا خوف وہ نہیں ہے جو اسٹالن اور خروشیف یا ہٹلر اور اس کے گسٹاپو کا سا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ خوف ہے جو بیٹا اپنے باپ سے رکھتا ہے کہ اسے ساتھ ساتھ محبت و مودت و رحمت و عفو کی امیدیں لگی رہتی ہیں جو توبہ

قبول کرتا ہے۔ اسی تصوّر کے تحت نصرانیت میں اللہ تعالیٰ کو "آب" کہا گیا ہے۔ اور قرآن کریم نے اس کے لئے زیادہ جامع لفظ "رَبّ" مقرر کیا ہے جس میں ابہام شرک نہیں۔ اور جو باپ کے مفہوم سے بلند تر ہے۔ باپ پیدا کرنے اور پرورش کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے، لیکن رب وہ ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور پرورش بھی (طٰہٰ : ۵۰)۔

اسی لئے حدودِ الٰہی کی جو کامیاب رعایت اسلامی نظام میں میسر ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسّر نہیں۔ دولت میں کبھی کسی غیر اسلامی نظام کے ذریعہ وہ توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو آدمی کو طبعاً شکر گذار بندہ بنائے۔ اللہ کا بندہ اور بندوں کا بھائی ہونے کا جذبہ ہی انسان کی زندگی میں زندہ و پائندہ توازن قائم رکھنے والی چیز ہے جو فرد کی ترقی و تحفظ کی ضامن ہے اور جو ہر مادی خوف سے نجات دلا کر دنیوی و اُخروی نعمتوں سے صحیح معنی میں لطف اندوزی کا موقعہ دیتی ہے، اور یہ موقعہ ہر مسلمان کو نصیب ہو سکتا ہے، بلکہ مملکتِ اسلامیہ میں رہنے والے ہر فرد کو بشرطیکہ حکومت کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو اور حدودِ الٰہی کی پاسداری کی جائے۔

صحابۂ کرام صلوات اللہ علیہم کا یہی مذہب تھا وہ معاویہؓ ہوں یا ابوذرؓ۔ گمراہ لوگ کچھ بھی کہتے پھریں، وہ اپنے عمل سے دنیا کو سنوار گئے اور امّت کا منہاج درست کر گئے۔ سیدنا معاویہؓ امامت فرما رہے تھے اجتماعی زندگی کی، اور سیدنا ابوذرؓ کی رہنمائی ان حضرات کے لئے تھی جو زندگی کی تگ و دَو میں سینہ سپر ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (کہہ دو ہر شخص اپنی افتادِ طبع کے مطابق عمل کرتا ہے)۔ اپنی اس افتادِ طبع کا حال سیدنا ابوذرؓ نے خود بیان کر دیا ہے۔ ادنیٰ توجہ سے مسئلہ خود حل ہو جائے گا کہ وہ اپنے حال سے مغلوب تھے اور اسی لئے چاہتے تھے کہ ساری دنیا انہی کی راہ اختیار کرے۔ اصحابِ حال جو اپنے احوالِ قلبیہ سے مغلوب ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ننگی تلوار بن جاتے ہیں۔ لیکن جن کی تربیت بطریق سلوک ہوتی ہے اور حُبِّ علمی کے ذریعہ ان کی تکمیل کی جاتی ہے اُن پر فیضانِ نبوّت ہوتا ہے، اور یہ ولایت سے بدرجہا بلند مقام ہے۔ اکابرِ صحابہ جن سے دین لیا جاتا ہے وہ کتاب اور سنّت اور منشاءِ نبوت و رسالت کی پیروی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے سپرد ہوتی ہے تربیتِ خلق۔

[ملاحظہ ہو صحیح بخاری: ج ۱، باب وجوب الزکوٰۃ، ص ۲۴۴، طبع مصر]

عن زید بن وھب قال مررت بالرّبذۃ فاذا انا بابی ذر رضی اللہ عنہ فقلت لہٗ	زید بن وہبؓ کہتے ہیں میں جو رَبذہ کی طرف گذرا تو دیکھتا کیا ہوں وہاں (سیدنا

ما انزلک منزلک ھذا۔ قال کنت بالشام
فاختلفت انا و معاویۃ فی الذین یکنزون
الذہب و الفضۃ ولا ینفقونہا فی سبیل اللّٰہ
قال معاویۃ نزلت فی اہل الکتاب
فقلت نزلت فینا و فیہم۔ فکان بینی و
بینہ فی ذاک، و کتب الی عثمان رضی اللہ
عنہ یشکونی فکتب الیّ عثمان ان
اقدم المدینۃ فقدمتہا۔ فکثر علیّ
الناس حتیٰ کانہم لم یرونی قبل ذلک فذکرت ذلک
لعثمان فقال لی ان شئت تنحیت
فکنت قریبا فذاک الذی انزلنی
ھذا المنزل ولو امّروا علیّ حبشیا
لسمعت و اطعت۔

ابوذر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا "یہاں آپ کے قیام کا سبب کیا ہوا"۔ فرمایا "میں شام میں تھا وہاں میرا اور (سیدنا) معاویہؓ کا اختلاف ان لوگوں کے بارے میں ہو گیا جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ (سیدنا) معاویہؓ نے فرمایا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا اس کا نزول ہمارے اور ان کے دونوں کے لئے ہوا ہے۔ میری اور ان کی ردّ و کد بس اسی مسئلے میں تھی انھوں نے (سیدنا) عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں میری شکایت لکھ بھیجی (سیدنا) عثمانؓ نے مجھے خط لکھا کہ مدینہ آجاؤ چنانچہ میں چلا آیا۔ یہاں لوگ مجھے ایسا ہجوم کر کے دیکھنے آتے تھے کہ جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے اس بات کا تذکرہ سیدنا عثمانؓ سے کیا۔ انھوں نے فرمایا "یہاں سے اگر آپ ہٹنا چاہیں تو کہیں قریب ہی جا رہئے"۔ یہ سبب ہوا جو میں یہاں مقیم ہوں۔ میرے اوپر اگر کسی حبشی کو بھی یہ لوگ حاکم بنا دیں گے تو میں اس کی بات سنوں گا اور اطاعت کروں گا"۔

لوگوں نے عجیب و غریب طریقے پر اس بات کو بیان کیا ہے، اور مسعودی نے خوب خوب اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ لیکن صحیح بخاری کی یہ حدیث وضاحت کر رہی ہے کہ سادہ سا معاملہ تھا۔ ایک صاحبِ حال شخص کے دل میں ایک بات اتر گئی تھی اور اسی پر انھیں اصرار تھا، اس لئے امامِ وقت نے انھیں مشورہ دیا کہ لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ اسی میں اُن کے لئے عافیت رہے گی۔ اہلِ مدینہ جو انھیں دیکھنے آتے تھے تو اس تعجب کی بنا پر کہ اہلِ کتاب کے ان علماء و رہبان کی کج روی اور بد دیانتی کے بارے میں جو آیت اتری ہے کہ مصارفِ خیر کے لئے لوگوں سے روپیہ لیتے اور خود کھا جاتے تھے، اس وعید کو انھوں نے مسلمانوں کے لئے

بھی سمجھ لیا جو اللہ و رسول کے حکم کے مطابق کماتے اور خرچ کرتے ہیں۔ اور اس پر انھیں اتنا غلو ہے اور ان نصوص پر نگاہ نہیں جن سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح سنت موجود ہے۔ چونکہ اصحابِ حال سے بحث کبھی مفید نہیں ہوتی اس لئے مرشدِ برحق نے انھیں انزوار کی تلقین کی۔ ویسے سیدنا ابو ذرؓ کا یہ ارشاد بھی حق ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے لئے بھی ہے جو چندے کا اور وقف کا مال کھا جاتے ہیں، اور ان مقاصد پر خرچ نہیں کرتے جن کے لئے یہ روپیہ انھیں دیا گیا ہوتا ہے۔

سیدنا ابو ذرؓ کے اس حال کو نہ اشتراکیت سے کچھ تعلق اور نہ اسلام کے معاشی نظام میں تبدیلی سے کچھ علاقہ، بلکہ ایک مغلوب الحال شخص کی بات تھی۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو زمین پر اللہ کے گواہ تھے، اور میزانِ عدل قائم کرنا جن کا کام تھا، انھوں نے سیدنا ابو ذرؓ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا، اور امت کو ایک ایسے اقتصادی نظام سے روشناس کیا جو دنیا کے ہر نظام سے بہتر ہے۔ کیونکہ نہ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں ہیں اور نہ اشتراکی نظام کی۔ لیکن خوبیاں دونوں کی موجود ہیں اور کامل توازن کے ساتھ۔

شہادت امیر المؤمنین رضؓ

سیدنا معاویہؓ نے پہلی نگاہ میں سبائیوں کو سمجھ لیا تھا اور جانتے تھے کہ یہ لوگ امت کو کن مصائب میں مبتلا کریں گے۔ صرف ان کا علاقہ تھا جہاں سبائیہ کو قطعاً ناکامی رہی۔ جب ان لوگوں کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو امیر المؤمنین عثمانؓ نے تمام عمال کو حج کے موقعہ پر طلب فرما کر ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ سیدنا معاویہؓ، سیدنا سعیدؓ بن العاصؓ اموی اور سیدنا عمروؓ بن العاص سہمی سب نے یہ مشورہ دیا کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن حضرت امیر المؤمنینؓ نے فرمایا "ان کے حقوق ادا کرو، ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرو۔ البتہ اللہ کا معاملہ آجائے تو بیشک سختی برتو" یہ فرما کر سب کو رخصت کر دیا۔

اگر ان مفسدوں کے دلوں میں ایمان واخلاص کا شائبہ بھی ہوتا تو اس رحیم وکریم امام کے پاؤں دھو کر پیتے، جو اپنے اخلاق کی رفعت اور پدرانہ شفقت میں انبیاء کا نمونہ تھا۔ علیہم الصلوات والتسلیمات۔ بہرحال اس فیصلے کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ سامنے آیا۔ حضرت معاویہؓ نے اس نتیجے کو بھی پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے آپ نے امیر المؤمنینؓ سے عرض کیا تھا کہ آپ شام چلیں اور دمشق ہی کو مستقرِ خلافت بنالیں۔ لیکن آپ نے پسند نہیں کیا کہ آخر عمر میں

جوارِ نبوی چھوڑیں۔ حضرت معاویہؓ نے دوسری تجویز پیش کی۔ کہ شامیوں کی فوج کا ایک دستہ حفاظت کے لئے مدینہ طیبہ بھیجدیں۔ آپ نے اسے بھی منظور نہیں کیا کہ اہلِ مدینہ پر تنگی ہو جائے گی۔ یوں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ چند شریر النفس دشمنانِ دین وملّت کے ہاتھوں امیر المومنین عثمانؓ جیسے مقدس ومحبوب ومحترم خلیفۂ برحق اپنے دار الخلافہ میں، احباء واصدقاء کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیئے گئے۔ اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کسی کو گمان نہ تھا کہ حالات اس درجہ تک پہنچ جائیں گے۔ انھیں توقع تھی کہ ایمان واسلام آڑے آئے گا۔ اور یہ لوگ کوئی حرکت ایسی نہ کریں گے جو دنیا وآخرت میں انھیں رُوسیاہ کر دے۔

مگر ان لوگوں کے سامنے آخرت کب تھی، دین کب تھا، اور امت کب تھی۔ یہ تو آئے ہی تھے اس لئے کہ مسلمانوں میں فتنے کا وہ دروازہ کھول دیں جو کبھی بند نہ ہو۔ ہم ان میں سے بعض کے نام اوپر دے چکے ہیں جو اس فتنۂ عمیاء کے بانی تھے۔ اس دلگداز حادثے سے تمام بستی غم واندوہ میں ڈوب گئی، اور ان مفسدوں کے خلاف عام نفرت پھیل گئی۔ لیکن شہر پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ کسی صحابی یا مدنی کی بجائے غافقی بن حرب اس وقت مدینہ کا والی بنا ہوا تھا۔ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو امیر المؤمنینؓ کے حکم سے آپ کے محصور ہو جانے کے بعد مسجد شریف میں نماز پڑھایا کرتے تھے، انھیں امامت سے روک دیا گیا۔ اور خود غافقی نماز پڑھانے لگا۔ مصر اور عراق کے ہزارہا آدمی شہر میں دندناتے پھرتے تھے۔ اس لئے فوری کارروائی نہ ہو سکی۔

حضرت امیر المؤمنینؓ کی حفاظت کا پورا انتظام تھا۔ لیکن آپ نے صراحتاً حکم دیدیا تھا کہ جو شخص آپ کی بیعت پر مستقیم رہنا چاہتا ہے وہ ہتھیار رکھ دے اور گھر میں بیٹھ رہے، اس لئے سوائے حفاظتی تدابیر کے اور کچھ نہ کیا جا سکا۔ ورنہ اہلِ مدینہ کے لئے کچھ دشوار نہ تھا کہ ان لوگوں کو مار بھگائیں۔ اطاعتِ امیر کا جو تصوّر اس عہد کے مسلمانوں میں تھا اس سے مجبور تھے۔ اور چونکہ خود صاحبِ ایمان وتقویٰ تھے اس لئے سمجھ رہے تھے کہ ان باغیوں کو بھی اتنے بڑے جرم کی جرأت نہ ہو گی۔ اور افہام وتفہیم سے کام بن جائے گا۔ یہ ہے حقیقی صورتِ حال جسے منافقوں اور بے دینوں نے یوں بیان کیا ہے کہ امیر المؤمنینؓ کو قتل کرنے پر سب اہلِ مدینہ متفق تھے، اور صحابہ کی خواہش تھی کہ باغی لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ امیر المؤمنینؓ کو شہید کرنے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا اس تک عربی دماغ نہیں پہنچ سکتا تھا عرب ذہنیت

تو یہ تھی کہ ہجرت کی رات قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کئے رہے، اور یہ پسند نہیں کیا کہ گھر میں گھس کر سوتے ہوئے آدمی کو قتل کر دیں، وہ لوگ صبح کو گھر میں داخل ہوئے۔ اس لئے وہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ مجوسیوں اور یہودیوں کی طرح ایک خالی مکان میں سے یہ قاتل داخل ہو کر حضرت امیر المؤمنینؓ کو قتل کر دیں گے۔ انھوں نے تو پہرہ دروازہ پر لگایا تھا۔

جو لوگ ان افترا پردازوں کے اس بیان سے کسی درجے میں متاثر ہو گئے ہوں انھیں سوچنا چاہئے کہ امیر المؤمنین سیدنا عثمانؓ اگر قریش اور صحابہ میں نامقبول ہوتے یا آپ سے ناگوار حرکات کا صدور ہوا ہوتا تو آپ کی شہادت سے یوں آگ لگ جاتی جیسی لگی۔ اور پانچ برس تک یہ اختلال ہوتا جو رہا، اور سیدنا علیؓ کی بیعت سے امت کی اکثریت اس طرح منحرف ہوتی جیسی ہوئی؟ سیدنا عثمانؓ کی محبوبیت تو ضرب المثل تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

اُحِبُّکِ وَالرَّحْمٰنِ حُبَّ قُرَیْشٍ عُثْمَانَ (بخدا مجھے تجھ سے اتنی محبت ہے جتنی قریش کو عثمان سے)

طلحہؓ و زبیرؓ

اس حادثہ فاجعہ سے مجروح تو سب دل تھے، لیکن جن کی یہ حیثیت تھی کہ ان کی آواز سنی جائے، انھوں نے مناسب سمجھا کہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بڑے پیمانے پر انتظام کئے بغیر کام نہیں بنے گا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب یہ حضرات باہر نکلیں۔ اور امت کو اس سانحے کی تفصیلات پر مطلع کر کے قومی محاذ قائم کریں۔ چنانچہ سیدنا طلحہ، سیدنا زبیر، سیدنا مروان بن الحکم اور حضرت عبداللہ بن زبیر وغیرہم وہاں سے چل دیئے اور مکہ کا رخ کیا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو حضرت امیر المؤمنینؓ کے حکم سے ازواج مطہراتؓ کو لے کر حج کے لئے گئے ہوئے تھے، اور آپ کے فرمان کے مطابق حجاج بیت اللہ کو تمام حالات سے باخبر کر چکے تھے، وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے کچھ دن بعد مدینہ پہنچے۔ آپ کو راستے میں اس واقعے کی اطلاع ہو چکی تھی۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ صلوات اللہ وسلامہ علیہا نے جب یہ سُنا تو چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا، اور فرمایا "واللہ جب تک عثمانؓ کا قصاص نہیں لیا جائے گا چین نہیں آئے گا۔" اس لئے آپ نے مدینہ کا خیال ترک کر کے مکہ کی راہ لی۔ باقی ازواج مطہراتؓ کو بھی سخت صدمہ تھا، زار و قطار رو رہی تھیں اور گو انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا مناسب نہیں سمجھا پھر بھی وہ سب مکہؓ واپس ہو گئیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ رضؓ کو حضرت ابن عباسؓ نے کس پر چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کے محرم نہ ہوتے تو وہ انھیں چھوڑ کر نہیں آسکتے تھے۔ یہ محرم تھے حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ حضرت ام المؤمنینؓ کے سگے بھائی، یہ محرم تھے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت ام المؤمنینؓ کے سگے بھانجے، جن کے نام پر آپ کی کنیت اُمِ عبداللہ تھی، یہ محرم تھے سیدنا زبیرؓ سگے بہنوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی کے بیٹے، یہ محرم تھے سیدنا طلحہؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف، یہ بزرگوار حضرت ام المؤمنینؓ کے ساتھ تھے، اس لئے حضرت ابن عباسؓ کو انھیں چھوڑ دینا غیر مناسب نہ تھا۔

عہدِ مرتضوی

حضرت ابن عباسؓ جب مدینہ پہنچے ہیں تو اس وقت تک سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت نہیں ہوئی تھی۔ یہ امر متفق علیہ ہے۔ البتہ لوگ آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ بیّن دلیل ہے کہ وہ تمام روایتیں قطعاً باطل و بے اصل ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ سیدنا طلحہؓ یا سیدنا زبیرؓ نے طوعاً یا کرھاً حضرت علیؓ سے بیعت کر لی تھی۔ سبائیہ کو فخر ہے کہ سب سے پہلے بیعت مالک بن الحارث الاشتر نے کی تھی، اور یہی صحیح ہے۔

بہر حال حضرت ام المؤمنینؓ کی قیادت میں رائے عامہ کی استواری کے لئے تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اس طرح امت کی غالب اکثریت اس امر پر مجتمع ہو گئی کہ جب تک قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص نہیں لیا جائے گا امت کی سیاست روز بروز گرتی چلی جائے گی۔ اور ہر خلیفہ پر یہ خوف مسلّط رہے گا کہ معلوم نہیں کس وقت اس کے گلے پر چھری پھیر دی جائے۔

دشمنانِ دین و ملت نے اس خالص تعمیری کام کو بغاوت کی صورت دے کر امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے پیش کیا اور حضرت ام المؤمنینؓ کے مقابلے کے لئے فوج کشی پر اُبھارا۔ آپ کے احبا، و اقربا، اور مخلص اصحاب اس اقدام کے خلاف تھے۔ لیکن چونکہ خلافتِ مرتضوی پر سبائیہ کا غلبہ تھا، امت انتشار میں مبتلا تھی، اس لئے ان لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔ اور آپ یلغار کرتے ہوئے بصرہ پہنچ گئے۔

یہاں آکر اصل حقیقت کھلی کہ مقصد تعمیر ہے تخریب نہیں۔ چنانچہ آپ بھی اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے مظلوم بھائی کا قصاص لینے کے لئے تیار ہو گئے (العواصم: ۱۱۱)۔ اور حکم دیدیا کہ جتنے لوگ قتلِ عثمانؓ میں شریک تھے وہ جماعت سے باہر ہو جائیں۔ طبری نے اپنی تاریخ میں (۵: ۱۹۹) اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ میں (۸: ۲۳۹) یہ تصریح کی

ہے کہ فریقین اس امر پر متفق ہو گئے تھے کہ سب مل کر قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیں۔ صبح کو عہدنامہ مرتب ہونا قرار پایا تھا۔ مجاہد کبیر سیدنا قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ نے طرفین کی غلط فہمیاں رفع کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

وعوّلوا جمیعًا علی الصلح وباتوا بخیر لیلۃٍ لم یبیتوا بمثلہا للعافیۃ وبات الذین اثاروا امر عثمان بِشرِّ لیلۃ باتوہا قطّ۔

سب کے سب صلح پر تیار ہو گئے، اور چین کی نیند سوئے۔ ایسے اطمینان کی نیند اب تک نہ لے سکے تھے۔ لیکن جنھوں نے سیدنا عثمانؓ کے خلاف ہنگامہ بپا کیا تھا ان کی نیند اس رات حرام ہو گئی۔

چنانچہ ان لوگوں نے سازش کر کے ایک دم جنگ چھیڑ دی۔ اور یوں دونوں اس غلط فہمی میں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے کہ فریق ثانی نے غدر کیا ہے۔ چونکہ یہ جنگ صبح اندھیرے مُنہ شروع کی گئی تھی۔ اس لئے فریقین کو غلط فہمی ہونا تعجب انگیز نہیں۔

بہرحال جنگِ جمل ہوئی اور خوں ریزی کے بعد پھر صلح پر ختم ہو گئی۔ بلکہ امیر المؤمنین علیؓ کی فتح پر۔ سیدنا طلحہؓ اور سیدنا زبیرؓ دونوں کو شہید کر دیا گیا۔ جنگ میں نہیں، بلکہ سبائیہ نے یہ حرکت دھوکہ سے کی تھی۔ یہ حادثۂ فاجعہ جمادی الآخرہ ۳۶ھ کا ہے۔

سبائی لوگوں نے امیر المؤمنین عثمانؓ کے خلاف جو ملحدانہ بلکہ کافرانہ حرکتیں کی تھیں، اسے یہ لوگ خالص بغاوت اور فساد کی بجائے اجتہادی مسئلہ بنانے کے درپے ہوئے۔ اور چونکہ امّت کی بدقسمتی سے انھیں امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ جیسے امام سے وابستہ ہونے کا موقعہ مل گیا۔ اس لئے سیدنا عمارؓ اور سیدنا علیؓ کی زبانی اس قسم کی باتیں انھوں نے بیان کی ہیں جن سے یا تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ سیدنا عثمانؓ کے خلاف جو کچھ کیا گیا وہ درست تھا، یا یہ کہ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کیں وہ چنداں قابلِ ملامت نہیں، یا یہ کہ جو ہو گیا وہ ہو گیا، اب قضیہ آگے نہیں بڑھانا چاہئے۔ یا یہ کہ ایک شخص واحد کا قتل تھا، اور اس کے قاتل حتمی طور پر پیش نہیں کئے گئے، اس لئے قصاص لینے کا امکان نہیں رہا۔

اس طرح سب طرف سے حصار کر کے ان لوگوں نے جو فضا قائم کی ہے اور مسعودی جیسے "مؤرخوں" نے صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں وہ محض اس لئے ہے کہ امّت کی نگاہیں خود اُن پر نہ پڑیں، بلکہ مسلمان نظری حیثیت سے آپس ہی میں اُلجھے رہیں، اور معاملہ ملت کے قتل کی بجائے ایک

فرد واحد کے قتل کا ہو جائے۔

لیکن جنگِ جمل کے موقعہ پر امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رض نے مادرِ امت کے ساتھ ہو کر ان قاتلوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ ان سب روایتوں کو باطل کر دیتا ہے۔ آپ کے نزدیک بھی سیدنا عثمان رض کا قتل ایک شخص کا نہیں تھا، بلکہ پوری اُمت کا تھا۔ آپ بھی ان قاتلوں سے قصاص کو واجب سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ ملّتِ اسلامیہ کے دشمن ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے جنگِ جمل کو شروع کر کے جس طرح صورتِ حال بدل دی، اور پھر سیدنا علی رض کی خلافت پر جس طرح حاوی ہو گئے اس سے احوال بگڑتے چلے گئے۔ جیسا کہ آئندہ واقعات سے معلوم ہو گا۔ اگر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اپنے فرزند اکبر سیدنا حسن رض اور اعزّہ و مخلص احباب کی رائے رَد کر کے مدینہ سے کوفہ نہ آتے جو سبائیوں کا مرکز اور ان کی جمعیت کا گڑھ تھا تب بھی شاید حالات پر قابو پا لیا جاتا۔

بہر حال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خاموشی اور ضبط کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپ کو توقع تھی کہ حضرت ام المؤمنین رض کی کوششوں سے معاملات درست ہو جائینگے۔ اسی لئے آپ نے کسی قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ سبائیہ نے چونکہ تمام فضا عمّالِ عثمانی کے خلاف پیدا کی تھی، اور جانتے تھے کہ یہ عمّال جب تک موجود ہیں، اسلام کا سَیلِ رواں روکا نہیں جا سکے گا۔ اس لئے انھیں سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ امت کے سر سے ان والیوں کا سایہ کسی طرح اٹھا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سیدنا علی رض کو اُبھارا کہ نئی خلافت کے نئے عمّال مقرّر ہوں۔ افسوس کہ آپ نے پھر تمام مخلص حضرات کی رائے ٹھکرا کر ان لوگوں کے مشورے پر عمل کیا۔ سب کے پاس برطرفی کے فرمان پہنچ گئے اور نئے عمّال روانہ کر دیئے گئے۔

ان میں سے بعض کو اپنے اپنے مستقر تک پہنچنے میں کامیابی ہو گئی، لیکن شام کا معاملہ دوسرا تھا۔ سیدنا معاویہ رض نے بیعت سے انکار کر دیا۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ اور یوں عاملِ مرتضوی کو شام کی سرحد میں داخلہ بھی نصیب نہ ہو سکا۔ عاملِ مصر سیدنا عبداللہ رض بن سعد رض بن ابی سرح، سیدنا عثمان رض کی زندگی ہی میں آپ سے کچھ مشورہ کرنے کے لئے آپ کی اجازت سے روانہ ہو چکے تھے اور وہ ابھی فلسطین ہی میں تھے کہ آپ کی شہادت کی خبر پہنچ گئی لہٰذا وہیں رُک گئے۔ آپ نے مصر واپس ہونا چاہا تھا لیکن وہاں کی حکومت پر محمد بن ابی حذیفہ رض قابض ہو چکے تھے، اور یہ ناممکن تھا کہ سیدنا عبداللہ رض بغیر خوں ریزی کے مصر میں داخل ہو سکیں، اس لئے آپ نے

صبر وضبط سے کام لیا اور مصر میں جارحانہ داخلے سے گریز فرمایا۔ ورنہ آپ کے پاس وسائل تھے، اور آپ داخل ہونا چاہتے تو ہو سکتے تھے، اور پھر وہاں بھی شام ہی کا سا حال ہوتا۔ جو تلوار اہلِ کفر سے جہاد کے لئے آپ نے ہاتھ میں لی تھی اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے سے آپ نے گریز کیا۔ لیکن امیر المؤمنین عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ ایسا نہ تھا کہ لوگوں کو اس کی خبر رفتہ رفتہ ہوتی۔ یہ خبر تو آگ کی طرح پھیل گئی، اور چاروں طرف سے ایک ہی آواز اٹھتی تھی، انتقام انتقام!

سیدنا عثمانؓ کی شہادت کے بعد اور پھر جنگِ جمل ختم ہونے پر اموی سادات سب شام چلے گئے۔ وہاں ان کے بیانات سن کر دمشق میں کہرام مچ گیا۔ اہلِ شام نے حلف اٹھالئے، کہ جب تک عثمانؓ مظلوم کا قصاص نہیں لیا جائے گا لذائذ دنیوی سے دُور رہیں گے۔ لیکن اس اندرونی تیاری کے باوجود سیدنا معاویہؓ نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ انھیں شروع سے توقع تھی کہ اجلّہ صحابہ اور حضرت ام المؤمنینؓ کی کوششیں رائگاں نہیں جائیں گی، اور کام ہو جائے گا۔ لیکن نہ ہو سکا اور مسلمانوں کا خون بے وجہ ضائع ہوا۔

البتہ جنگِ جمل سے پہلے بعض سبائیہ کو قتل کیا گیا تھا۔ منجملہ ان کے حُکیم بن جَبلہ بھی تھا۔ اسی کی شرارت سے کشت و خون کی نوبت آئی تھی۔ اس نے حضرت ام المؤمنینؓ کو گالی دی تھی، اس پر ایک مسلمہ نے اُسے ٹوکا، تو اس مردود نے اس عفیفہ کو شہید کر دیا۔ اس پر قتال شروع ہوا تھا۔ ورنہ اصحابِ جمل کی یہ رائے نہیں تھی کہ حضرت امیر المؤمنین علیؓ کو ساتھ ملائے بغیر یہ قدم اٹھائیں۔ خود والیِ بصرہ سیدنا عثمان بن حنیفؓ کا موقف بھی یہی تھا کہ حضرت امیر المؤمنینؓ کی تشریف آوری تک انتظار کیا جائے۔ لیکن اہلِ حق کی تمام تدبیریں سبائیہ نے برباد کر دیں۔

جنگِ جمل کے بعد سیدنا علیؓ امیر المؤمنین نے سیدنا جریرؓ بن عبد اللہ بجلی کو بیعت کا پیغام دے کر شام بھیجا۔ سبائیہ کو یہ امر ناگوار گذرا۔ اشتر کی خواہش تھی کہ اسے بھیجا جائے۔ ان لوگوں کو یہ امر گوارا نہ تھا کہ خلافتِ مرتضوی کی نمائندگی ان کے ہوتے ہوئے صحابہ کرامؓ کے سپرد ہو۔ سیدنا معاویہؓ نے حضرت جریرؓ کو روکے رکھا، اور کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے اچھی طرح شام کا حال دیکھ لیں، اور ان کا موقف پہچان لیں۔ چنانچہ آخر میں آپ نے صاف جواب دیدیا کہ حضرت علیؓ کی حکومت پر باغیوں کا قبضہ ہے۔ ان کی خلافت کی حیثیت آئینی نہیں ہماری گردنوں میں ہمارے خلیفہ کی بیعت ہے جو نہ خلافت سے دستبردار ہوئے، اور نہ طبعی حالات میں وفات پائی۔ بلکہ انھیں ظلماً اور بغیر حجت کے بے وجہ قتل کیا گیا ہے۔ ان کے قاتلوں سے

قصاص کا مطالبہ جب آپ کے امام کے سامنے رکھا گیا تو اس کی پذیرائی پر وہ تیار نہیں ہوئے۔ اس لئے ہم بیعت نہیں کریں گے۔ آپ کے امام کو ہم اپنے امام کے قتل میں شریک سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں ہیں تو ان مفسدوں سے علٰحدگی اختیار کریں۔ ہم خود انھیں کیفرِ کردار کو پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

سیدنا جریرؓ نے واپس آکر یہ صورتِ حال حضرت امیر المؤمنینؓ کے سامنے رکھ دی۔ اب بھی موقعہ تھا کہ جنگِ جمل سے سبق لے کر آپ اپنے لشکریوں کی ذہنیت کا اندازہ لگالیں۔ مگر پھر الاشتر اور ابن الکوا، وغیرہ ہی کی رائے غالب رہی۔ مخلص لوگ، فرزند اور اقربا، سمجھاتے ہی رہے مگر آپنے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کرلیا۔ اجلّہ صحابہ اس اقدام سے اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو جنگِ جمل تک ساتھ تھے اب الگ ہوگئے (الاصابہ فی تمیز الصحابہ، زیرِ عنوان خالد بن زید)۔ خود سیدنا جریرؓ کی سب باتیں آنکھوں دیکھی تھیں، اور مسئلہ انھوں نے سمجھ لیا تھا وہ بھی الگ ہوگئے، اور پھر شام چلے گئے۔ اشتر نے ان کے پیچھے ان کے خلاف مضبوط محاذ بنالیا تھا۔

معرکۂ صفّین

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ معاملہ گفت و شنید سے طے ہو۔ لیکن اس لشکر کشی سے وہ بھی فوجیں بڑھانے پر مجبور ہوئے۔ کوئی شخص ثابت نہیں کرسکتا کہ سیدنا معاویہؓ کی طرف سے جنگ کا کوئی عملی اقدام ہوا ہو۔ یا سیدنا علیؓ کی فوج کشی سے پہلے ان کی فوجوں نے حرکت کی ہو۔

یہاں ایک بات بیان کر دینا ضروری ہے۔ جو لوگ حیا اور غیرتِ ملیہ سے عاری ہیں، انھوں نے ایک روایت یہ وضع کی ہے کہ صفّین کی طرف روانہ ہونے سے پہلے سیدنا معاویہؓ نے شاہِ روم کو کچھ روپیہ دے کر صلح کرلی تھی۔ بعض نابکاروں نے یہاں تک لکھا ہے کہ جنگوں کے بعد بھی آپ شاہِ روم کو برابر یہ "خراج" ادا کرتے رہے۔ معلوم نہیں یہ مردود روایت جس کا وضعی ہونا عیاں ہے، ان لوگوں کو کہاں سے ملی۔ ملتی کہاں سے خود وضع کی ہے۔ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ صفّین کے موقعہ پر جب آپ کو اطلاع ملی کہ شاہِ روم کا عندیہ عالمِ اسلام پر حملہ کرنے کا

ہے، اوراس کی فوجیں اس غرض سے منظم ہو رہی ہیں، بلکہ وہ خود سرحد پر آگیا ہے تو آپ نے لکھا:
(البدایۃ والنہایۃ : ۸ : ۱۱۹) :

والله لئن لم تنتہ وترجع الی بلادک یالعین لاصطلحن انا وابن عمی ولاُخرجنّک من جمیع بلادک ولاضیقنّ علیک الارض بما رحبت۔

"قسم ہے اللہ کی اے لعین اگر تو فوراً نہ رُکا اور اپنے علاقے کو واپس نہ ہوا تو میں اپنے چچا کے بیٹے سے صلح کروں گا، اور تجھے تیرے سب ملک سے نکال دونگا اور زمین کو اس کی فراخی کے باوجود تجھ پر تنگ کر ڈالوں گا۔"

یہ خط دیکھ کر اس پر اتنا رعب طاری ہوا کہ اپنی سب فوجیں ہٹا کر پسپا ہو گیا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اللہ کے دشمنوں نے امت کو سلف صالحین سے بدظن کرنے کے لئے کس طرح قسم قسم کی شرانگیز روائتیں وضع کی ہیں۔ اور آنکھوں میں کیسے دھول ڈالنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔
صفین پر جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، تو آدابِ اسلامی کے تحت پھر گفت وشنید کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، جو سبائیہ کی شرارت سے ناکام رہا۔ محرم کے مہینے میں جنگ قطعاً بند رہی۔ یکم صفر کو سیدنا علیؓ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسعودی نے بڑی زوردار عبارت میں آپ کا اعلان نقل کیا ہے۔ عرب کے قاعدے کے مطابق دونوں طرف سے سپاہی نکل نکل کر دادِ شجاعت دینے لگے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے مبارز طلبی کے لئے اشتر نخعی نکلا تھا۔ اہلِ فکر کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ سات دن یہی حالت رہی۔ ۸ رصفر ۳۷ھ کو جنگ مغلوبہ ہو گئی۔ لڑائی کے ان احوال کی تفصیل کے لئے (جو سراسر اختراعی ہیں، اور بعد میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر تصنیف کی گئی ہیں)، ملاحظہ ہو مسعودی، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۸۷
سیدنا معاویہؓ کی فوج مدافعانہ جنگ کر رہی تھی، اور امیر المؤمنین علیؓ کی طرف سے اشتر نخعی وغیرہ کے حملے جارحانہ ہو رہے تھے۔ سبائی لوگ بڑے فخر سے اشتر کے کارنامے گناتے ہیں، اور ان کی مجلسوں میں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کی طرح عجیب وغریب تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ خود راقم الحروف کو ایک بڑے "ذاکر" کی بیان کردہ یہ روایت سننے کا اتفاق ہوا ہے کہ ایک دن اشتر کے ہاتھ سے قتل ہونے والوں کی تعداد حضرت امیر المؤمنین علیؓ کے ہاتھوں مقتول ہونے والوں سے زیادہ ہو گئی۔ اس پر اس نے فخر کا اظہار کیا، اور لوگوں نے اس کی "داد" دی۔ لیکن جب سیدنا علیؓ نے سُنا تو فرمایا "ہاں درست ہے مگر فرق اتنا ہے کہ

ہیں نے صرف ایسے ہی شخص کو مارا ہے جس کی پشت سے کوئی صاحبِ ایمان پیدا ہونے والا نہیں تھا، لیکن اشتر نے بے محابا قتل کیا ہے۔" ذاکر صاحب کے اس بیان پر جو واہ واہ ہوئی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گویا اشتر اتنا صاحبِ تصرّف تھا کہ مشیتِ الٰہی پر بھی غالب آگیا اور اس نے ایسے آدمی مار دیئے جن کی اولاد میں اہلِ ایمان پیدا ہونے والے تھے۔ اور سیدنا علیؓ کو غیب کا اتنا علم تھا کہ اگلی نسلوں کا ایمان و کفر بھی ان پر کھل گیا۔

اس قسم کی خرافات پر ان لوگوں کی زندگی کا دار و مدار رہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؓ خود نہیں لڑے، اور نہ امام المسلمین ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کے شایانِ شان تھا۔ اور نہ دوسری طرف سے سیدنا معاویہؓ لڑے جس کے ہاتھ میں فوج کی کمان ہو وہ لڑے گا یا لڑائے گا؟۔ پھر ان لوگوں کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ جو شخص مسلمانوں کے قتل پر دلیر ہو اس کا وجود قابلِ فخر ہوگا یا موجبِ ندامت۔ مؤمن کا کام مؤمن کے قتل سے گریز کرنا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے سیدنا عثمانؓ، سیدنا طلحہؓ اور سیدنا زبیرؓ جیسے ایمان و انسانیت کے نمونوں کو دھوکے سے قتل کر دیا، اور حضرت امّ المؤمنینؓ کے ہودج پر تیر برسائے انھیں کسی اور مسلمان کے قتل میں کیا باک ہوتا۔

صحابۂ کرام اور مخلص اہلِ ایمان کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ جنگ میں مبتلا تو ہوئے مگر رُک رُک کر بچ بچ کر۔ اُن پر یہ امر شاق تھا کہ مسلمانوں کی گردنیں مسلمانوں کے ہاتھ سے ماری جائیں۔ جنگِ جمل جس طرح برپا ہوئی اس کے احوال انھیں معلوم تھے، اور ویسے بھی اکثر اصحاب کے قلوب میں سبائیہ کی طرف سے کدورت و بدظنی تھی۔ اکابرِ صحابہ میں سے پچیس تیس حضرات کی شرکت جمل و صفّین میں دونوں طرف سے ثابت ہے۔ اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ دونوں موقعوں پر دونوں طرف سے سو سوا سو سے زیادہ نہ تھے۔ ان دونوں جنگوں میں صحابۂ کرام کی تعداد اس سے زیادہ ثابت نہیں کی جاسکتی۔ اور باقاعدہ ثبوت اگر فراہم کیا جائے تو یہ تعداد اس سے بھی کم نکلے گی۔ جمہورِ امّت کو یہ ہنگامے ناپسند تھے۔ اور سب کی دلی خواہش تھی کہ مسلمانوں میں خوں ریزی اور خانہ جنگی نہ ہو۔ اس لئے دونوں جنگوں میں اسلام کے وفادار اس جذبے سے نہیں لڑ رہے تھے جو دو حریفوں کے درمیان جنگ کا ہوتا ہے۔ سوائے سبائیہ کے کوئی نہ تھا جو حقیقی جوش سے لڑ رہا ہو۔

سیدنا معاویہؓ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی کہ جنگ مغلوبہ شروع ہوگئی تو آپ کی عقل

ایمانی اور فراستِ نورانی نے یہ سمجھایا کہ جنگ بہر حال بند کر دی جائے۔ چنانچہ سیدنا عمروؓ بن العاص کے مشورے سے نیزوں پر قرآن مجید کے نسخے بلند کر دیئے گئے کہ "دیکھو جنگ بند کرو، اور کتاب اللہ جو کہے اس پر عمل کرو"۔ مسلمانوں نے جنگ بند کر دی۔ کیونکہ ان کا دلی جذبہ یہی تھا۔ حضرت امیر المؤمنین علیؓ کا جذبہ بھی یہی تھا، اور آپ نے اس دعوت کی پذیرائی کی۔ بار بار اشتر کو حکم بھیجا کہ تلوار روک لے مگر وہ نہ رُکا۔ سیدنا علیؓ کی فوج میں اس سے ناراضگی پھیل گئی تب وہ ہاتھ روکنے پر مجبور ہوا۔ اشتر کی یہ حرکت متفق علیہ ہے۔ اسی سے ان لوگوں کی ذہنیت اور عزائم کا اندازہ لگانا چاہئے۔

لوگوں نے داستانیں وضع کی ہیں، اور سیدنا علیؓ کی زبان سے ادبی شہپارے ادا کرائے ہیں کہ آپ جنگ روکنے کے مخالف تھے اور آپ نے فرمایا تھا:

"یہ معاویہ اور عمرو بن العاص، یہ ابن ابی معیط اور حبیب بن مَسلمہ یہ ابن ابی سَرح اور ضحاک بن قیس، نہ اصحابِ دین ہیں اور نہ اصحابِ قرآن۔ میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، بچپن سے میرا ان کا ساتھ رہا ہے، یہ بدترین بچے تھے اور بدترین مرد ہیں۔ انھوں نے قرآن بلند کرنے کی یہ حرکت محض دھوکہ دینے کے لئے کی ہے۔ خود انھیں قرآن سے کچھ تعلق نہیں"

اس قسم کے لغو اور شر انگیز الفاظ، جو واقعات کے سراسر خلاف ہیں، سیدنا علی امیر المؤمنین کرم اللہ وجہہ جیسے امام الاتقیاء کی زبان سے ہرگز نہیں نکل سکتے۔ کیا آپ اور جمہور صحابہ کرام نہیں جانتے تھے کہ سیدنا معاویہؓ اور سیدنا عمروؓ بن العاص کی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آخر عہدِ عثمانی تک کیا رہی۔ اور سیدنا ولید بن عقبہؓ بن ابی معیط کو حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین کا اعتماد کس درجہ حاصل تھا۔ کیسی اہم ترین خدمات ان کے سپرد رہیں، اور دین کے لئے ان کے کارنامے کیسے عظیم اور اصیل تھے۔ مشرق و مغرب میں اُن کی تکبیروں کی گونج ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ ان کے نام سے اہلِ کفر لرزہ براندام تھے۔ یہی عالم سیدنا عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سَرح کا تھا۔ افریقیہ والوں سے پوچھنا چاہئے، کہ ابن ابی سَرح کا وجود کفر کے حق میں کیا تھا۔ اور یہی کیفیت سیدنا ضحاک بن قیسؓ، اور حبیب بن مَسلمہؓ کی تھی۔ یہ بزرگوار جو ملّتِ اسلامیہ کے عظیم ترین افراد میں ہیں، اور جن کی زندگیاں جہاد فی سبیل اللہ میں گذریں، اور جن کے رُوح پرور کارنامے الم نشرح ہیں،

ان کے متعلق سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ایسی بات کیسے فرما سکتے تھے جسے جھٹلانے کے لئے ہر قریشی اور ہر صحابی کھڑا ہو جاتا۔ یہ سب داستانیں ان لوگوں نے وضع کی ہیں جو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابطالِ اسلام کی توہین وتذلیل کو اپنی زندگانی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارے سامنے جو تاریخی حقیقت ہے وہ اتنی ہے کہ سیدنا معاویہؓ کے لشکر میں قرآن بلند کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں جنگ بند ہو گئی۔ اس جنگ کا بند ہونا اُمت کی عین خواہش' اور فریقین کے حقیقی جذبے کے مطابق ہوا۔ البتہ سبائیوں کو یہ امر ناگوار تھا۔ اور اشتر نخعی جیسے لوگ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں خوں ریزی کا سلسلہ بند نہ ہو۔

لوگوں نے جمل و صفّین کے واقعات بیان کرنے میں انتہائی مبالغے سے کام لیا ہے، اور ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ گویا یہ بھی کوئی مہابھارت کی جنگ تھی، جس میں بقول ہندوؤں کے لاکھوں آدمی مبتلا ہوئے۔ حالانکہ ان کے اہلِ فکر بھی اس جنگ کی تفصیلات کو خیال آرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

واقعاتِ ثابتہ کی روشنی میں جمل و صفّین کی بابت لوگوں کے پیدا کردہ تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ دونوں دفعہ جنگ کا وقوع سبائیہ کی چالاکی سے ہوا۔ دونوں موقعوں پر صلح کی فضا پیدا ہو گئی تھی، اور دونوں دفعہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخلص متبعین نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں تلوار چلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت ماند نہیں پڑی تھی۔ دونوں جنگوں کی تمام تر ذمہ داری سبائیوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ مقتولوں کی تعداد ہمارے لئے قابلِ قبول ہے اور نہ ہم فوجوں کی یہ قوت مانتے ہیں جو بیان کی جاتی ہے۔ اور نہ ہم ان افسانوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اُن جنگوں کی تفصیلات کے بارے میں وضع کئے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں بعد کی مخترعات ہیں، اور ان رجز خوانیوں میں ان مصنفوں نے محض خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں۔

جب جمہور صحابہ اور تمام امت کو خوں ریزی ناگوار ہو، جب ہر دفعہ کوشش یہی ہو کہ صلح ہو جائے، اور اس کے مواقع بھی پیدا ہو جائیں، اور جب قلیل عرصے میں یعنی چند گھنٹوں کے اندر جنگ ختم ہو جائے تو ہزاروں آدمی کیسے مارے جا سکتے تھے؛ صفّین کی لڑائی سات دن اس طرح رہی کہ فریقین میں سے ایک ایک آدمی نکلتا تھا۔ دونوں ماہرِ حرب وضرب

ہوتے تھے۔ آٹھویں دن گھمسان کا رَن پڑا۔ اور کہتے ہیں کہ رات کو بھی لڑائی رہی، اور پوری شب ہوتی رہی۔ پھر بھی چونکہ اسی اثنا میں قرآن بلند کر دیا گیا، اور جنگ بند ہو گئی۔ اس لئے اتنے آدمی قتل نہیں ہو سکتے جتنے بیان کئے جاتے ہیں بلکہ ان کے عشر عشیر بھی نہیں۔ جمل کی لڑائی اس سے بھی کم مدّت رہی، تو پھر ستر ہزار ایک جنگ میں اور بے شمار دوسری جنگ میں کیسے مارے جا سکتے تھے۔ بعض لوگوں نے جنگِ صفین کے دنوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے۔ لیکن معتبر و مستند سندوں سے معرکوں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی ہم نے بیان کی۔ یہ جو ایک سو اُنتیس معرکے بتائے جاتے ہیں تو اس سے ایک سو اُنتیس دن مراد لینا درست نہیں۔ یہاں یہی مراد ہو سکتی ہے کہ دونوں طرف سے اتنے اتنے آدمیوں کی انفرادی جنگ ہوئی۔ افراد کی اس نبرد آزمائی کو فوجوں کے مابین تصادم بنا دیا گیا ہے۔

اہلِ فکر کو سوچنا چاہئے کہ پہلی جنگِ عظیم میں تمام دنیا شامل تھی، اور تباہ کن آلات کا استعمال تھا۔ یہ جنگ پورے چار برس تک خشکی اور تری میں لڑی گئی۔ اور ہزاروں میل کا رقبہ میدانِ جنگ تھا۔ پھر بھی صرف چند لاکھ آدمی کام آئے۔ تو پھر جنگِ جمل و صفین میں چند گھنٹوں کے اندر ہزارہا آدمی کیسے قتل کئے جا سکتے تھے جب کہ آلاتِ حرب ایسے تھے کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی مر سکتا تھا۔ نہ توپ کے گولے برس رہے تھے، اور نہ طیاروں سے بم باری ہو رہی تھی اور نہ سپاہیوں کے پاس برین گنیں یا مشین گنیں تھیں۔ خدا ان مؤرخوں کو سمجھے گا جنھوں نے اخلاف کے ساتھ غداری کر کے اسلاف کے کردار کا ایسا دلدوز اور مکروہ نقشہ کھینچا ہے، اور جنھوں نے اجتہادی اختلاف اور غلط فہمیوں کو کفر و اسلام کی جنگ بنا کر پیش کیا ہے کہ جیسے قوموں اور ملکوں کا تصادم ہو اور تہذیبوں اور تمدّنوں اور ثقافتوں کی ٹکر ہو۔

یہ جنگ بالکل باہمی غلط اندیشی کے تحت شروع ہوئی، اور بالکل صحیح اور خالص جذبۂ اخوّت کے مطابق بند کر دی گئی۔ اس کا حال ہم مسعودی کی کتاب مروج الذہب (ج ۲: ص ۴۰۰) سے پیش کرتے ہیں، اور بطورِ حجت اس لئے کہ یہ شخص یا تو بطور خود سیدنا معاویہؓ اور اموی خلفاء کا کھلا دشمن تھا، یا محض آلِ بُوَیہ کو خوش کرنے کے لئے اس نے یہ کتاب لکھی ہے۔ کہتا ہے:

فقال عمروُ ایہا الناس من کان معہٗ	حضرت عمروؓ نے فرمایا لوگو! جس کے پاس

مصحف فلیر فعہ علی رُمحِہٖ۔ فکثر فی الجیش رفع المصاحف وارتفعت الضجّۃ و نادَوا کتاب اللہ بیننا وبینکم۔ مَن لِثغور الشام بعد اہل الشام و مَن لِثغور العراق بعد اھل العراق ومن لجھاد الروم و من للتُّرک ومن للکفار؟ ورُفِعَ فے عسکر معاویۃ نحوٌ من خمسمأۃ مصحفٍ وفی ذٰلک یقول النجاشی بن الحارث:

فَاَصْبَحَ اَھْلُ الشَّامِ قَدرفَعُوْا الْقَنَا
عَلَیْہَا کِتَابُ اللّٰہِ خَیْرُ قُرْآنٖ
فَنَادَوْا عَلِیًّا یَا ابْنَ عَمِّ مُحَمَّدٍ
اَلَا تَتَّقِیْ اَنْ یَّہْلِکَ الثَّقَلَانِ

قرآن ہو، اسے وہ اپنے نیزے پر بلند کرلے" چنانچہ بکثرت مصاحف بلند کردیئے گئے۔ ایک شور مچ گیا اور لوگوں نے آوازیں لگائیں "یہ ہی اللہ کی کتاب ہمارے تمھارے درمیان! اہل شام نہ رہے تو شام کی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا، اور اہلِ عراق نہ رہے تو عراق کی سرحدیں کس کی نگرانی میں رہیں گی، رومیوں سے کون لڑے گا، ترکوں اور کافروں سے کون بھڑے گا؟"

اس دن (سیدنا) معاویہؓ کے لشکر میں پانچسو کے قریب مصاحف بلند کئے گئے۔ اسی مضمون کو نجاشی بن حارثؒ نے نظم کیا ہے:۔

"اہلِ شام نے اس دن نیزے بلند کردیئے جن پر اللہ کی کتاب تھی پڑھنے کی بہترین چیز۔"

"انھوں نے (سیدنا) علیؓ کو آواز دی اے محمدؐ کے چچا کے بیٹے کیا تمھیں خوفِ خدا نہیں کہ طرفین ھلاک ہوجائیں گے؟"

یہ تھا صحیح جذبہ جس کے تحت جنگ بند ہوئی، اور جسے مسعودی جیسا شخص بھی نہ چھپا سکا۔ یہ عبارت بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کو یہ لڑائیاں کس درجہ ناگوار تھیں، اور کس طرح وہ انھیں بند کرنے پر حریص تھے۔

تحکیم

جنگ ہونے کے بعد کتاب اللہ کا ایک ہی حکم ہے کہ مابہ النزاع مسئلہ کا فیصلہ ثالثی کے ذریعہ طے کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سیدنا معاویہؓ کی طرف سے سیدنا عمروؓ بن العاص کو ثالث بنایا گیا اور حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

ثالث بنے۔ کہتے ہیں کہ سیدنا علیؓ اپنی طرف سے سیدنا ابن عباسؓ کو ثالث بنانا چاہتے تھے۔ لیکن آپ کے لشکر کا اصرار ہوا کہ چونکہ سیدنا ابو موسیٰؓ غیر جانبدار رہے ہیں، اس لئے انہی کو ثالث بنایا جائے۔ چچا کے بیٹے کو ثالث بنانے کا کیا مطلب ہی۔ ہمارا خیال ہے کہ خود امیر المؤمنینؓ ہی نے سیدنا ابو موسیٰؓ کو ان کے فضائل و مکارم کی وجہ سے ثالث مقرر فرمایا ہوگا۔ ویسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اگر تقرر ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی غیر جانبدار ہو جاتے جیسے مقرر کردہ دونوں ثالث ہو گئے تھے۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

ثالثوں کے فیصلے پر عمل درآمد کے لئے فریقین کا حسب ذیل معاہدہ ہوا [الخضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ، طبع مصر، بزیر عنوان "التحکیم"]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ھٰذا ما تقاضیٰ علیہ علی بن ابی طالب و معاویۃ بن ابی سفیان۔ قاضیٰ علیؓ علیٰ اہل الکوفۃ ومن معہم من شیعتہم من المؤمنین والمسلمین۔ وقاضیٰ معاویۃ علیٰ اہل الشام ومن کان معہم من المؤمنین والمسلمین۔

انا ننزل عند حکم اللہ عزّ وجلّ وکتابہ ولا یجمع بیننا غیرہ وان کان اللہ عزّ وجلّ بیننا من فاتحتہ الےٰ خاتمتہ نُحیی ما اَحییٰ ونمیت ما امات۔ فما وجدا الحکمان فی کتاب اللہ عزّ وجلّ وہما ابو موسیٰ الاشعری عبد اللہ بن قیس وعمرو بن العاص القرشی عملا بہ۔ ومالم یجدا فی کتاب اللہ عزّ وجل فالسنۃ العادلۃ الجامعۃ غیر المفرقۃ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ تصفیہ ہے جو علی بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیان ہوا۔ علی کا یہ فیصلہ تمام اہل کوفہ اور ان کے سب ہوا خواہوں کی طرف سے ہوا جو اہل ایمان اور اہل اسلام ہیں۔ معاویہ کا یہ تصفیہ اہل شام اور ان کے سب ساتھیوں کی طرف سے ہوا جو اہل ایمان و اہل اسلام ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ سوائے اس کے اور ہم کسی بات پر متفق نہیں ہوں گے۔ اب شروع سے آخر تک جب خدائے عزّ وجل ہی ہمارے درمیان ہے تو ہم بھی اسی چیز کو زندہ رکھیں گے جسے اُس نے زندگی بخشی، اور اسی چیز کو مٹائیں گے جسے اس نے قابل فنا قرار دیا۔ لہٰذا یہ دونوں ثالث یعنی ابو موسیٰ اشعری عبد اللہ بن قیس اور عمرو بن العاص قرشی جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں، اور اگر کتاب اللہ میں کچھ نہ پائیں تو پھر اس

سنت کو دیکھیں جو عادلانہ ہو اور مجتمع کرنے والی نہ کہ ایسی جو تفرقہ ڈالے۔"

اس کے بعد دونوں ثالثوں نے سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ سے الگ الگ عہد لیا۔ دونوں نے حسب ذیل مضمون کی دستاویز دی:

انا علیٰ ما فی ہٰذہ الصحیفۃ وانّی قد اوجبتُ قضیتہما علی المؤمنین۔ فانّ الامن و الاستقامۃ ووضع السلاح بینہم اینما ساروا علیٰ انفسہم واھلیہم و اموالہم وشاہدہم وغائبہم وعلیٰ عبداللہ بن قیس وعمرو بن العاص عہداللہ ومیثاقہ ان یحکما بین ھٰذہ الامۃ ولا یردا ھا فی حرب ولا فرقۃ حتّٰی یعصیا واجلا القضاء الیٰ رمضانَ وان احبّا ان یؤخرا ذٰلکُ اَخّرَاہ علیٰ تراضٍ منہما۔

وان توفّی احد الحکمین فان امیر الشیعۃ یختار مکانہ ولا یألو من اھل المعدلۃ والقسط۔ وانّ مکان قضیتہما الذین یقضیان فیہ مکان عدل بین اھل الکوفۃ واھل الشّام وان رضیا واحبّا فلا یحضرہما فیہ اِلّا من ارادا، ویاخذا الحکمان من ارادا من الشہود ثم یکتبان شہادتہما علیٰ ما فی ھٰذہ الصحیفۃ۔ وھم انصار علی من ترک ہٰذہ الصحیفۃ واراد فیہ الحادًا اوظلماً۔۔۔۔۔"

میں اس دستاویز (یعنی ثالثی نامے) کے مضمون پر عملدرآمد کا عہد کرتا ہوں۔ اور ان کے فیصلے کی پابندی اہل ایمان پر لازمی قرار دیتا ہوں۔ یعنی وہ جہاں کہیں بھی جائیں، ان کی جانیں، ان کے اہل وعیال، ان کے مال ومتاع اور ان کے حاضر وغائب سب کے حق میں امن رہے گا، اس کی پوری طرح پاسداری کی جائے گی، اور کسی کے خلاف ہتھیار کا استعمال نہیں ہوگا۔

عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص پر عہد وپیمانِ الٰہی کے سبب یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس امّت کے بارے میں ثالثی کا فرض ادا کریں، دوبارہ اسے جنگ میں نہ دھکیلیں اور نہ اختلاف کی صورت پیدا کرکے گنہگار بنیں۔ فیصلے کے اعلان کے لئے رمضان کا مہینہ مقرر کریں۔ اور اگر چاہیں تو باہمی رضامندی سے اس مدّت میں مزید توسیع کردیں۔ اگر دونوں ثالثوں میں سے کسی کی وفات ہو جائے تو ہر گروہ کا جو امیر ہو وہ اس کی بجائے کسی دوسرے شخص کا تقرر کردے۔ مگر (نئے ثالث میں) عدل گستری اور انصاف پروری کی صفت کا خیال رکھے۔

ان دونوں کا فیصلہ سُنانے کی جگہ جہاں وہ اپنا محاکمہ مرتّب کریں گے اہل کوفہ اور اہل شام کی بستیوں کے وسط میں ہوگی۔ اُن دونوں کی رضامندی اور مرضی کے بغیر کوئی شخص ان کے پاس نہ جائے۔ یہ دونوں ثالث جس کی موجودگی کے خواہشمند ہوں اسے بلالیں۔ اور پھر اس ثالثی نامہ کے معاملے میں اپنا فیصلہ قلم بند کریں۔ تمام اہل ایمان اس شخص کے خلاف ان کی مدد کریں گے جو اس ثالثی نامے کو پس پشت ڈال دے اور اس بارے میں ہٹ دھرمی اور ظلم کا مرتکب ہو.....''

یہ معاہدہ ۱۳ر صفر ۳۷ھ کو لکھا گیا۔ اور اس کی غور طلب دفعات یہ ہیں :

۱۔ فریقین کے نزدیک دونوں ثالث اہلِ عدل وانصاف تھے، اور دونوں فریقوں کو ان پر کامل اعتماد تھا۔

۲۔ معاہدہ دو ایسے فریقوں میں ہوا تھا جو برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی کو کسی پر تفوق نہ تھا۔

۳۔ ثالثوں کے فیصلے کی بنیاد کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

۴۔ ثالثوں کو حق تھا کہ جتنے آدمیوں کو مناسب سمجھیں مشورے کے لئے طلب کریں لیکن ان کی مرضی کے بغیر اُن کے پاس کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔

۵۔ ثالثوں کو اختیار تھا کہ رمضان ۳۷ھ کی بجائے باہمی رضامندی سے اگلی کوئی مدت مقرر کردیں۔

۶۔ فیصلہ سُنانے تک طرفین کے آدمیوں کو ایک دوسرے کے علاقے میں آزادانہ آمد ورفت کی اجازت تھی۔ کسی پر کوئی قدغن نہ تھی۔ اور طرفین کے ہواخواہوں میں کامل امن رکھنے کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر تھی۔

۷۔ مشوروں کے بعد ثالثوں کا جو بھی فیصلہ ہو اسے قلمبند کیا جائے۔

اِن دفعات کی روشنی میں یہ باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ فریقین کی حیثیت مساویانہ کس بارے میں تھی؟ ظاہر ہے کہ منصب میں نہیں۔ کیونکہ سیدنا معاویہؓ مدعیِ خلافت نہیں تھے۔ اگر بالفرض اُن کے دل میں اس قسم کے خیالات سمجھ بھی لئے جائیں تو ان کا ظہور قطعاً نہیں ہوا تھا۔

برخلاف اس کے امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کئی ملکوں میں مسلّم تھی، بلکہ سوائے شام کے سب جگہ۔ لہٰذا ثالثوں اور دونوں فریقوں کو ایسا ناسمجھ نہیں باور کیا جاسکتا

کہ سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کی یہ مساویانہ حیثیت جو تسلیم کی گئی تو سیاسی اور منصبی اعتبار سے تھی۔ یہ خیال کہ سیدنا معاویہؓ مدعی خلافت تھے، بعد کی اختراع ہے۔ ہمعصر مسلمانوں نے انھیں اس حیثیت سے نہیں دیکھا۔ تو اب یہ تسلیم کرنا لابدی ہے کہ مساویانہ حیثیت مابہ النزاع مسئلے میں تھی۔ یعنی حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص اور اسی کے نتیجے میں سیدنا علیؓ کی خلافت کی آئینی حیثیت، کیونکہ یہی قاتل آپ کی خلافت پر حاوی تھے۔ اور مسلمانوں میں اسی وجہ سے بیزاری پھیلی ہوئی تھی۔ اور صرف اس طبقے کا وجود تھا جس کی وجہ سے امیر المؤمنین کی بیعت کی تکمیل نہ ہوسکی۔

۲۔ فیصلہ سنانے تک طرفین کے آدمیوں کی آزادانہ نقل و حرکت، اختلاف کے مظاہرے کی ممانعت، اور کامل امن پر استقامت سے دو باتیں خود بخود مسلّم ہوگئیں۔ ایک یہ کہ جو صاحب جس علاقے پر متصرف ہیں اس کے نظم و نسق کی ذمہ داری بدستور انہی پر ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ اپنی اصل میں تمام عالمِ اسلام پوری امت کا ہے۔ اور یہ فیصلہ امت کرے گی کہ آئندہ سیاسی صورتِ حال کیا ہو۔ یعنی دونوں فریق اپنے اپنے موقف اور اختیار پر قائم رہنے میں صرف تا فیصلہ آزاد ہیں۔ مگر فی الحال صلح و صفائی کا ماحول انھیں قائم رکھنا ہوگا۔

اللہ اور رسول کے نام پر ثالثی کا یہ اقدام اس قدر اطمینان بخش تھا کہ سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ دونوں اپنی اپنی فوجیں واپس لے گئے اور اپنے اپنے مستقر میں خاموش بیٹھ گئے۔ سیدنا علیؓ کوفہ میں رہے، اور سیدنا معاویہؓ دمشق میں۔ دونوں نے اپنی اپنی فوجیں منتشر کردیں، اور جو لوگ لڑنے آئے تھے وہ سب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوگئے، اور یوں تمام عالمِ اسلام میں مکمل امن قائم ہوگیا۔

مصر کا ہنگامہ

امیر المؤمنین سیدنا علیؓ کی بیعت ہونے پر مصر میں بھی آپ کی بیعت ہوگئی تھی۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرح حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ کے حکم سے بعض امور میں مشورہ کرنے مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوچکے تھے، انھیں راستے میں آپ کی شہادت کی اطلاع ملی۔ چنانچہ آپ فلسطین کے علاقہ میں رک گئے۔ (طبری: ۵ : ۱۲۷)۔

ادھر سبائیہ کا جو مرکز فسطاط میں تھا اور وہاں محمد بن ابی حذیفہؓ موجود تھے۔ انھوں نے والیِ مصر کی عدم موجودگی اور حالاتِ سیاست بدل جانے کے سبب وہاں بالادستی حاصل کرلی۔ لیکن حضرت امیرالمؤمنین علیؓ نے مصر کی ولایت پر سیدنا قیس بن سعدؓ بن عبادہ کو بھیج دیا۔ اور آپنے وہاں کا نظم ونسق سنبھال کر محمد بن ابی حذیفہؓ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حضرت علیؓ کی بیعت کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن مصر میں بھی باقی عالمِ اسلام کی طرح ایک گروہ نے سیدنا علیؓ کی بیعت سے انکار کردیا تھا۔ ان کا نظریہ بھی وہی تھا کہ امیرالمؤمنین عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے۔ اور انہی قاتلوں کا اس خلافت پر تسلط ہے، لہٰذا جب باقی عالمِ اسلام اس خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کرلے گا تو ہم بھی بیعت میں داخل ہوجائیں گے۔

مصر میں ایسی جماعت کا پیدا ہوجانا قدرتی بات تھی۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں سبائیہ کا قوی مرکز تھا۔ اور ان کے احوال سے یہ حضرات واقف تھے۔ پھر اس لئے کہ کنانہ بن بشر حضرت امیرالمؤمنینؓ کو قتل کرکے مصر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے آزاد پھرنے سے نیز محمد بن ابی حذیفہؓ کی حرکتوں سے ان بزرگواروں کی آنکھوں میں خون اترتا تھا۔ لیکن انھوں نے کوئی حرکت ایسی نہیں کی جو موجبِ اختلال ہو۔ باقی اکابرامت کی طرح محض بیعت سے کنارہ کش ہوگئے۔ سیدنا عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرح چاہتے تو اپنے ہواخواہوں کے اس طاقتور گروہ کی مدد سے مصر میں کشت وخون کے ذریعہ حکومت حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن محض امت کی خیرخواہی میں آپ گوشہ نشین ہوگئے۔ اور یوں محمد بن ابی حذیفہؓ کو وہاں بالادستی میسر آگئی اور سیدنا علیؓ کی بیعت ہوگئی۔

سیدنا قیسؓ نے نظم ونسق استوار کرکے اس غیر جانبدار گروہ سے فرمایا کہ اگر آپ لوگوں کی طرف سے نقضِ امن کا خطرہ نہ ہو تو ہم بھی آپ کے تمام حقوق کی پاسداری کریں گے اور ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو سیدنا علیؓ امیرالمؤمنین کا تمام غیر مبایعین کے ساتھ تھا کہ کسی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، اور سب کے حقوق ادا کئے جائیں۔

ان حضرات نے امن قائم رکھنے کا اپنی طرف سے اطمینان دلایا اور مناسب سمجھا کہ سب طرف سے سمٹ کر ایک بستی میں جمع ہوجائیں۔ چنانچہ خربتا میں پناہ لے کر بیٹھ گئے۔ سیدنا قیسؓ نے ہر طرح ان کی خبرگیری کی، اور وظائف وعطیات میں اُن کا بھی وہی حق رکھا جو بیعت کرنے والے باقی مسلمانوں کا تھا۔ یہ حضرات قطعاً خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کررہے تھے

تعداد میں یہ دس ہزار کے قریب بتائے جاتے ہیں۔ ان کی قیادت سیدنا مَسلمہ بن مُخلَد، سیدنا معاویہ بن خُدَیج اور سیدنا یزید بن الحارث جیسے اکابرِ امت کر رہے تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

سبائیوں کو یہ صورتِ حال ناگوار تھی، کہ ان کے ایک مرکز کی زمام ان کے ایک آدمی سے لے کر ایک صحابی کو دیدی گئی، اور صحابی بھی وہ جو ملت کے عظیم ترین فرزندوں میں تھا، رضوان اللہ علیہ۔ سیدنا قیسؓ پر ان لوگوں کو دو اعتراض تھے۔ ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ خفیہ اعتراض تھا کتاب و سنت کے مطابق عمل جو سبائیہ پر سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جن حضرات نے بیعت نہیں کی تھی، ان کے خلاف وہ کوئی کارروائی نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے آپ پر طعن شروع کر دیا، تا آنکہ حضرت امیر المؤمنینؓ کی طرف سے ان کے پاس فرمان پہنچا کہ اہلِ خربتا کے خلاف جنگ کی جائے۔ سیدنا قیسؓ نے جواب دیا کہ اس وقت کی صورتِ حال مصر کے حالات میں نہایت مناسب ہے۔ میں نے اس کا پورا انتظام کر دیا ہے کہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو کسی اور کو بھیج دیجئے۔ چنانچہ حضرت محمد بن سیدنا ابی بکرؓ کو بھیج دیا گیا۔ یوں سیدنا قیسؓ بددل ہو کر مدینہ جا بیٹھے۔

محمد بن ابی بکرؓ نے مصر پہنچ کر ایک مہینے کے اندر ہی اندر اہل خربتا کو کہلا بھیجا کہ یا بیعت کریں یا ملک کو چھوڑ دیں ورنہ ان کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے گی۔ سبائیوں کا سردار کِنانہ بن بِشر قاتل امیر المؤمنین عثمانؓ اس کارروائی میں پیش پیش تھا۔ ان حضرات نے کہا کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں ہمیں مت چھیڑو۔ مگر اس کا جواب حملے کی صورت میں دیا گیا۔ انھوں نے مدافعت کی اور ابن ابی بکرؓ کو ناکامی ہوئی۔ پھر سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ان حضرات پر مستقلاً حالت جنگ طاری ہو گئی۔ صفین کے معرکے کے بعد تمام محاذوں پر جنگ بند ہو جانی چاہیے تھی مگر مصر میں بند نہیں ہوئی۔

ثالثوں کو رمضان ۳۸ھ میں فیصلہ سنانا تھا۔ لیکن اہلِ خربتا سے جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور محمد بن ابی بکرؓ کو ہمیشہ شکست ہوئی۔ اہلِ خربتا کی جنگ کے مدافعانہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حریف کو بار بار شکست دینے کے باوجود انھوں نے اپنا رقبہ بڑھانے کی قطعاً کوشش نہیں کی، اور بدستور خربتا ہی میں پناہ گیر رہے۔ لوگوں نے بہت سی باتیں بنائی ہیں کہ حضرت امیر المؤمنینؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کی مدد کے لئے فوجیں بھیجنی چاہیں لیکن جانے پر

کوئی راضی نہ ہوا۔ بالآخر آپ نے اشتر نخعی کو بھیجا جو مصر نہ پہنچ سکا اور راستے ہی میں ہلاک ہو گیا۔

اشتر

مالک بن الحارث الاشتر نے پچھلے دور کے غزوات میں نمایاں معرکے سر کئے تھے، اور اس کے کارنامے شاندار ہیں۔ کاش یہ شجاعت اور بے جگری بعد میں بھی دین کے کام آتی۔ لیکن ملت کی اور اپنی بدقسمتی سے یہ شخص سبائی گروہ میں شامل ہو گیا۔ اور پھر قریش کی عداوت میں اتنا بڑھا کہ محض امیر المؤمنین عثمانؓ ہی کو شہید کر کے عالم اسلام کو متزلزل نہیں کیا بلکہ خود جس امام سے اپنے آپ کو وابستہ کہتا تھا انہی پر اعتراضات کرنا، ان کے احکام کو ٹھکرانا اور ہر مسئلے میں من مانی کرنا اس کا وتیرہ تھا۔

البتہ تعجب یہ ہے کہ ان تمام ذہنی کوائف کے باوجود یہ شخص خارجی نہ بنا۔ غالباً یہ بھی مصلحت تھی۔ خارجی ہو کر اسے جمہور اہلِ اسلام کے مقابلے پر شمشیر بکف ہونا پڑتا، اور یہ بات اس تحریک کے مقاصد کے خلاف ہوتی۔ ان کا تمام فائدہ مارِ آستین بننے میں ہے۔ چنانچہ اشتر نے حضرت امیر المؤمنین علیؓ کے دامن سے وابستگی ضروری سمجھی اور وہ سب حرکتیں کیں جو ادعائے وفاداری کے ساتھ ملت کشی کے لئے ممکن تھیں۔ اس کی خودسری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور اسی کے تحت مصر جا رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ سیدنا معاویہؓ نے اسے زہر دلوا دیا تھا جیسا کہ مسعودی وغیرہ نے کہا ہے، اور فقرے چست کئے ہیں۔ لیکن کیا ثبوت ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے اُسے زہر دلوایا۔ وہ قتل بھی تو کر سکتے تھے، کیونکہ وہ سبائیوں کا سرگروہ تھا، اور امیر المؤمنین عثمانؓ کے قاتلوں میں ہونے کی وجہ سے واجب القتل۔ دوسرے آپ کے علاقے میں سے ہو کر اس کا گذرنا موجبِ فساد تھا، اور اس عہد نامے کے خلاف جو ثالثوں نے فریقین سے لیا تھا۔ ثالثی نامے کے مطابق فریقین کو کامل امن کے ساتھ رہنا تھا جس شخص کی طرف سے نقضِ امن کا خطرہ ہو اس کے ساتھ رعایت کی گنجائش کہاں تھی۔ مگر سیدنا معاویہؓ نے انتہائی ضبط سے کام لے کر اسے گذر جانے دیا۔

لوگوں نے زہر کا سہارا اس لئے لیا ہے کہ کسی اور طرح وہ اس کی موت میں سیدنا معاویہؓ کا ہاتھ ثابت نہیں کر سکتے۔ بہرحال اتنا قطعی معلوم ہو گیا کہ متارکۂ جنگ کے معاہدے پر سیدنا معاویہؓ کی طرف سے پوری پابندی کی گئی، اور آپ نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جسے ثالثی نامے کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا سکے۔ زہر کا افسانہ تراشنے کی یہی وجہ ہے۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ امیر المؤمنین علیؓ مصر کو فوج بھیجنا چاہتے ہیں اور آدمی نہیں ملتے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ تنہا اشتر مصر جا رہا ہے، اور وہاں کی ولایت کا فرمان اسے حضرت امیر المؤمنین کی طرف سے ملا ہے۔ گویا وہ اتنا بڑا آدمی تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی سب اس کے مطیع ہو جاتے۔ لیکن جب ہم اس فرمان کو دیکھتے ہیں جو امامِ وقت کا بتایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علیؓ کا ہرگز نہیں، کیونکہ فضول اور لایعنی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اتنا طویل ہے کہ ہاشمی بلاغت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ صحابہ کرام کی تحریریں مختصر اور جامع ہوا کرتی تھیں۔ تمام احکام کا منبع قرآن حکیم ہے۔ اور وہ ہر مسلمان کے مطالعے میں رہتا تھا۔

یہ فرمان قطعی وضعی ہے۔ اور اس سے جہاں سیدنا علیؓ کا تعلق نہیں معلوم ہوتا، وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک فضولی ادیب تھا۔ اور اس فرمان میں اس نے محض خوب صورت فقرے لکھنے کی نمائش کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اشتر کو جاہل ترین شخص سمجھ لیا۔ جسے اسلام اور دعوتِ محمدیہ کے مبادیات بتانے کی بھی ضرورت تھی، جنھیں قرآن پڑھنے والا معمولی قابلیت کا آدمی بھی جانتا ہے۔

بہرحال امت کو اس پر غور کرنا ہے کہ امیر المؤمنینؓ نے مصر کو قطعاً کوئی فوج نہیں بھیجی۔ تاریخی حقیقت اور امر واقعہ یہ ہے کہ مصر کو کوئی فوج نہیں گئی۔ باقی سب باتیں ہیں جن کا علمی ثبوت کوئی نہیں اور جن کے راوی محض مسعودی جیسے نامعتبر لوگ ہیں۔ البتہ اشتر نخعی وہاں گیا، اور چونکہ اس کے لئے جو "فرمانِ ولایت" بتایا جاتا ہے وہ جعلی ہے۔ لہٰذا وہ یقیناً بطور خود گیا، محض اس لئے کہ مصر جیسا سبائی مرکز ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا، اور اس کے آدمی کثیر التعداد ہونے کے باوجود ناکام ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے پیشِ نظر نہ ملت تھی اور نہ خلافت کی مضبوطی۔ وہ محض اپنے گروہ کی تنظیم کے لئے جا رہا تھا۔

سیدنا علیؓ اگر کسی کو بھیجتے تو مخلص اصحاب میں اس اہلیت کے لوگ بہت تھے۔ خود سیدنا قیسؓ کو راضی کر کے بھیجا جا سکتا تھا۔ دوسرے اگر جنگ کرنی ہی ہوتی تو ضرورت فوج بھیجنے کی تھی، کیونکہ مقامی آبادی سے محمد بن ابی بکرؓ کو مدد نہیں مل رہی تھی، ورنہ ایک بستی کو فتح کر لینا کیا بڑی بات تھی۔

دراصل وجہ یہ تھی کہ متارکۂ جنگ کی شرائط کے تحت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اس کے

پابند تھے کہ اہل خربتی کے خلاف تمام کارروائیاں بند کردیں۔ اس لئے اپنی طرف سے آپ نے یقیناً اس کی پاسداری کی۔ یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے کہ خدا اور رسول کے نام پر جو عہد کیا جائے اسے علیؓ جیسا امام الاتقیا یوں بے محابا توڑ دے؟ مگر سرکشوں اور باغیوں کی ٹولی جو سیاست پر حاوی تھی اور آپ کی حکمت عملی کو نہیں چلنے دیتی تھی اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

کوئی شخص ثابت نہیں کرسکتا کہ بارگاہِ خلافت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی فوج مصر گئی ہو، یا کسی درجہ میں محمد بن ابی بکرؓ کی امداد کے لئے کوئی قدم اٹھایا گیا ہو، یا سیدنا معاویہؓ نے وہاں کے حالات میں کچھ مداخلت کی ہو۔ صرف باتیں ہیں، اور وہ بھی افتراء پردازوں کی' علمی ثبوت کچھ نہیں۔ ایک طرف اہلِ خربتی ہیں اور دوسری طرف محمد بن ابی بکرؓ بلکہ کنانہ بن بشر۔ یہی زمانہ ہے جب ثالث اپنا فیصلہ سُنانے جمع ہوتے ہیں۔ ثالثوں کا فیصلہ کیا ہوا اس پر بحث آگے آرہی ہے۔ یہاں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ثالثی نامہ مرتب ہوچکنے کے باوجود اور فریقین کے نمائندوں کے تحریری عہد کے باوجود، مصر میں امن نہیں، اور اہلِ خربتی کو ہر وقت اپنے فنا ہونے کا خطرہ ہے۔ بالآخر ان حضرات کی طرف سے امداد طلب کی جاتی ہے۔ اور سیدنا معاویہؓ ان کی مدد کے لئے سیدنا عمروؓ بن العاص کی قیادت میں پانچ ہزار فوج بھیج دیتے ہیں۔

سیدنا معاویہؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو سرکاری طور پر خط بھیجا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں خود سیدنا عمروؓ نے بھی موقع پر پہنچ کر اپنی طرف سے انھیں لکھا کہ "میدان سے ہٹ جاؤ، ہم نہیں چاہتے کہ کسی طرح تمھیں تکلیف پہنچے"۔ لیکن افسوس کہ وہ نہ مانے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی سی دیر میں مصر کا فیصلہ ہوگیا۔ محمد بن ابی بکرؓ کام آئے، اور کنانہ بن بِشر مارا گیا۔

سیدنا عمروؓ بن العاص ہی نے مصر کو فتح کرکے دارالاسلام بنایا تھا، اور وہاں ایسا عادلانہ اور کریمانہ نظامِ حکومت قائم کیا تھا جو اہلِ مصر کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ اس لئے مصر کی رعایا نے آپ کی تشریف آوری کو غنیمت جانا۔ اور سب لوگ خوش دلی کے ساتھ آپ کے ہمنوا ہوگئے۔

سیدنا قیسؓ کے چلے آنے کے بعد سے سبائیوں کی تخریبی حرکتیں اہل مصر کے لئے نفرت انگیز تھیں۔ اسی لئے محمد بن ابی بکرؓ کو اہلِ خربتی کے خلاف مصر سے امداد نہیں مل رہی تھی، اور اسی لئے سیدنا عمروؓ بن العاص کو وہاں نظم وضبط قائم کرنے میں کچھ دقت نہیں ہوئی۔

مصر میں اب سیدنا علیؓ کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔ اہلِ خربتی کے موقف سے سب کو ہمدردی تھی، سیدنا عمروؓ نے صورتِ حال سب کو سمجھا دی تھی، اس لئے مصر میں محض امن ہی قائم نہیں ہوا بلکہ اہلِ شام کے موقف کے تعمیری رنگ کے سبب، سب کی ہمدردیاں سیدنا معاویہؓ کے ساتھ ہو گئیں، اور یوں عملاً ہر طرف جنگ کے امکانات ختم کر دیئے گئے۔ جو ثالثوں کا مقصد اور دونوں فریقوں کا مدعا تھا۔

لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رمضان ۳۸ھ میں جب ثالثوں نے فیصلہ سنایا تو اس سے پہلے ہی حضرت محمد بن ابی بکرؓ قتل ہو چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سیدنا عمروؓ بن العاص اپنا فیصلہ سنانے مصر سے تشریف لائے تھے، اور یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اہلِ خربتا کو جو امداد بھیجی گئی وہ ثالثوں کے فیصلہ سنانے کے بعد کی بات ہے۔ اسی لئے لوگوں نے سیدنا عمروؓ بن العاص کے مصر جانے کو جارحانہ فوج کشی سے تعبیر کیا ہے، اور پس منظر یہ بنایا ہے کہ ثالثی کے فیصلے کو مسخ کر کے سیدنا عمروؓ بن العاص نے "مکر" سے حضرت معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور حضرت معاویہؓ کو توسیعِ ملک کی فکر کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال تھا کہ سیدنا علیؓ سے دوبارہ جنگ کی صورت میں انھیں اپنی پشت کی طرف سے اطمینان رہے۔ یہ سب تصور تلبیسِ محض ہے، اور واقعات کو بالکل غلط رنگ میں پیش کر کے صورتِ حال کو مکروہ بنا دیا گیا ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

تحکیم پر تبصرہ

ثالثوں کے تقرر کی تفصیل اوپر گذر چکی، اور دونوں فریقوں کے معاہدوں کی بھی۔ لیکن یہاں ہم اس کے ایک ایک مسئلے پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک نہایت اہم واقعہ اس بُری طرح مسخ کیا گیا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ ایک گھناؤنا کوڑا کرکٹ ہے جس کے ڈھیر میں اصل حقیقت کا ہیرا دبا پڑا ہے۔

صحیفہ

سب سے پہلے دیکھنا ہے ثالثوں کے تقرر کا عہد نامہ۔ دونوں فریق برابر کی اہمیت کے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ وہ ثالثوں کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ ثالث بھی اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی ذمہ داری پر عہد کرتے ہیں کہ وہ بالکل بے لاگ فیصلہ سنائیں گے بشرطیکہ امت

امن سوز حرکتوں سے محترز رہے۔ اس اہم ترین مقصد کے لئے کئی مہینے کی مدّت مقرر ہوتی ہے، جس میں ثالثوں کی باہمی رضامندی سے توسیع بھی کی جاسکتی ہے۔ ثالثوں کو یہ بھی آزادی ہو کہ اپنی مدد کے لئے جتنے آدمیوں کو چاہیں بلالیں۔ کسی شخص کو اختلاف نہیں کہ ایسا عہد نامہ مرتب ہوا تھا۔

اب اگر حیاء اور دیانت ہوتی تو صحابہ کرام کے ساتھ حسنِ ظن رکھا جاتا، اور داستانیں وضع کرتے وقت خدا کا خوف کیا جاتا کہ ہم اس بہترین امت کے رہنماؤں کی کیسی نفرت انگیز صورت پیش کررہے ہیں۔ یہ معاہدہ بھی کیا یورپ کے سیاستدانوں کا تھا جو عہد کرتے ہی اس لئے ہیں کہ جب موقعہ ملے توڑ ڈالیں۔ اور تمام اقدار اخلاقی کو خیر باد کہہ کر محض اپنے مفاد کے درپے ہوں۔ یہ معاہدہ کیا تھا قرشی عربوں نے، جو جاہلیت کے زمانے میں بھی عہد شکنی کو موجب ننگ وعار اور منافی شیوۂ مردانگی جانتے تھے، اور جنھیں عہد کی پاسداری میں جان ومال اور اقربا تک کو قربان کردینے میں باک نہ تھا۔ تو کیا خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایمان لاکر جاہلیت سے بھی گئے گذرے ہوگئے؟

یہ معاہدہ کیا تھا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب نے، جنھیں حکم ہے اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ (عہد کی پابندی کیا کرو)۔ اور جن کی صفت ہے وَالَّذِیْنَ ہُمْ لِعَھْدِہِمْ رَاعُوْنَ (وہ جو اپنے عہد کی پاسداری کیا کرتے ہیں)۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ ثالثوں نے یا سیدنا علیؓ نے یا سیدنا معاویہؓ نے کوئی حرکت ایسی کی ہو جسے عہد شکنی یا بد دیانتی سے تعبیر کیا جاسکے۔ اور حقیقت بھی یونہی ہے کہ سب نے پورے خلوص اور دیانت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا، لیکن یہ بات ہے اہلِ ایمان کی مفسدوں کا حال مسعودی کی زبان سے سنئے (مروج الذہب ج ۲، ص ۴۰۵):

ولمّا وقع التحکیم تباغض القوم جمیعا و اقبل بعضہم یتبرّأ من بعض یتبرّأ الاخ من اخیہ والابن من ابیہ۔ وامر علیٌّ الرحیل لعلمہ باختلاف الکلمۃ و تفاوت الرائی وعدم النظام لاامورہم، وما لحقہ من الخلاف بینہم وکثر

جب ثالثوں کا تقرر ہوگیا تو پوری قوم میں نفرت پھیل گئی۔ سب ایک دوسرے سے تبرّا کرنے لگے۔ بھائی نے بھائی سے بیزاری کا اعلان کیا اور بیٹے نے باپ سے۔ اس پر سیدنا علیؓ نے کوچ کا حکم دیدیا۔ کیونکہ آپ نے دیکھ لیا کہ کتنا اختلاف ہے، رائے میں تضاد ہے،

التحکیم فی جیش اھل العراق وتضارب القوم بالمقارع ونعال السیوف وتسابوا ولام کل فریق منھم الآخر۔ وسار علیؓ الی الکوفۃ ولحق معاویۃ بدمشق من ارض الشام وفرّق عساکرہ فلحق کل جند منھم ببلدہ۔

نظم میں اختلال ہے، اور باہمی مخالفت کا کیا عالم ہے۔

اہل عراق کے لشکر میں زیادہ تر گفتگو تحکیم ہی کے مسئلے میں تھی، آپس میں کوڑے اور تلواروں کے دستے چلنے لگے، گالم گلوچ شروع ہوگئی اور سب ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

(سیدنا، علیؓ نے کوفے کی طرف کوچ کیا، اور (سیدنا) معاویہؓ نے شام کے علاقے میں دمشق کی طرف۔ وہاں انھوں نے اپنی فوجیں منتشر کر دیں، اور سب لشکری اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔"

ثالثوں کے تقرر کے بعد کا یہ ہے وہ نقشہ جو مسعودی کو بھی پیش کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (الحجرات: ۹) وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا۔ (اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم اُن کے درمیان صلح کرا دیا کرو) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (الانفال: ۶۱) وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (اور اگر وہ صلح پر مائل ہوں تو تم بھی اس طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو)۔

لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ خود امتیوں کے مابین صلح ناگوار ہے، اور قرآن کی طرف دعوت دینے کو مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کفار حربی اگر جنگ بند کر دینے کی دعوت دیں تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو حکم ہے کہ اللہ پر بھروسہ کر کے ہاتھ روک لیں، لیکن اشتر نخعی اس حکم سے بے پرواہ ہے۔ وہ اپنے امام کا بھی حکم ٹھکرا کر لڑائی جاری رکھنا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جذبات انہی لوگوں کے تھے جو فتنے کے بانی ہیں، اور جو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں خوں ریزی بند ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر حالات پُر امن ہو گئے تو پھر ہمارے منصوبے بروئے کار نہیں آسکیں گے۔ اور امت کی توجہ آپس میں اُلجھنے کی بجائے ہماری طرف ہو جائے گی۔ لیکن دونوں فریقوں کو یہ بات پسند تھی، کیونکہ اس میں خود انہی کے جذبات جھلک رہے تھے۔ اسی لئے سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے مستقر پر پہنچ کر فوجیں منتشر کر دیں۔ مسعودی نے یہ بات صرف سیدنا معاویہؓ کے متعلق بتائی ہے کہ انھوں نے دمشق پہنچ کر لشکریوں کو اپنے اپنے گھر بھیج دیا۔ لیکن امیر المومنین سیدنا علیؓ کے متعلق بھی

یہی باور کرنا چاہئے، جیساکہ مصر وغیرہ کے معاملے میں ہمیں عملاً نظر آرہا ہے کہ آپؓ وہاں کسی قسم کی کوئی امدادی، فوج نہیں بھیجی۔ اگرچہ افتراء پرداز لوگ کہے جارہے ہیں کہ آپ فوج بھیجنا چاہتے تھے لیکن لوگ ہی جانے پر تیار نہیں ہوئے۔ ہم صرف واقعہ دیکھتے ہیں کہ فوج نہیں گئی۔ اور نہ ثالثوں کے فیصلے کے مطابق جاسکتی تھی۔

ثالث ثالثوں کے متعلق خبیث النفس لوگوں نے قسم قسم کی روایتیں وضع کی ہیں۔ بعض بے عقل دیندار بھی الفاظ کے ستعمال میں احتیاط نہیں برتتے، اور نہ معاملہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے ذکی وفطین عالم اور مدبّر شخص کو بے وقوف اور سادہ لوح بتایا ہے جنھیں بات سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی، اور عیاذاً باللہ ایک ابلہ شخص تھے۔ کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ۔ (اس کتّے کی طرح جس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے گا اور نہ لادو تب بھی ہانپتا رہے گا)۔ مسعودی کے نزدیک یہ الفاظ سیدنا عمرو بن العاص نے سیدنا ابو موسیٰؓ کے متعلق استعمال کئے (مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۰)۔

گویا نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء، اپنی مملکت کے انتظام کے لئے سادہ لوح اور بیوقوف لوگوں کو منتخب کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سیدنا ابو موسیٰؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا ہے (بخاری: صحیح: کتاب استتابۃ المرتدین، ج ۴، ب ۲، طبع مصر) کہ لوگوں کو دین سکھائیں، اور پھر ان کی ماتحتی میں سیدنا معاذؓ کو بھی مدد کے لئے بھیج دیا، یا حضرت فاروق اعظمؓ نے انھیں قاضی بنایا اور عدلیہ کے متعلق ان کے لئے رسالہ مرتب کیا جو بعد کے تمام قاضیوں کا دستور العمل ہے، یا حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ نے انھیں کوفہ کا والی بنایا تھا، تو انھیں خبر نہ تھی کہ یہ ایک بیوقوف اور سادہ لوح شخص ہیں، اور انھیں عملی سیاست میں حصّہ لینے کا سلیقہ نہیں؟ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں لکھا ہے:۔

ستۃ من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتذاکرون الفقہ بینھم علی بن ابی طالب و اُبَیٌّ و ابو موسیٰ علیحدۃ و عمر و زید و ابن مسعود علیحدۃ۔	"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں چھ حضرات تھے جو فقہی مسائل پر باہم تبادلہ خیال کیا کرتے تھے سیدنا علی بن ابی طالب، سیدنا اُبَیؓ اور سیدنا ابو موسیٰ باہمی، اور سیدنا عمر، سیدنا زید اور سیدنا ابن مسعود باہمی"۔

پھر امام ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں صفوان بن سلیم کا قول نقل کیا ہے :۔

لم یکن یفتی فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر عمر و علی و معاذ و ابی موسیٰ۔	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف چار حضرات فتویٰ دیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ (یعنی ان مسائل میں جہاں اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے)

ان دونوں روایتوں کے لئے ملاحظہ ہو [علامہ شبلیؒ : الفاروق، ص ۱۷۵، طبع ملتان]

فقہی مسائل پر صرف وہی شخص فتویٰ دے سکتا ہے جسے نصوص پر عبور ہو، مسائلِ معاشرت اس کی نگاہ میں ہوں، اور قانونِ اسلامی کی روح سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء کے عہد میں جس شخص کی عظمت کا یہ حال ہو اسے مؤرخوں نے ابلہ و احمق کہا ہے۔ نعوذ باللہ من شرورہم۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بس قصور اتنا ہے کہ آپ فتنہ و فساد سے رکتے تھے، اور آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمانوں میں خوں ریزی نہ ہو، بلکہ صلح و آشتی اور امن کے ماحول میں اپنے مسائل کا تصفیہ کریں۔ یہ ذہنیت احمقانہ ہے یا بغایت عاقلانہ اور مدبرانہ؟ آپ نے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا، اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

سیدنا عمروؓ بن العاص رضی اللہ عنہ کو نہایت چالاک، مکار، فتنہ پرداز، دنیادار، باطل پرست اور ہوا و ہوس کا بندہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض "اہلِ تحقیق" کے نزدیک تو وہ مسلمان ہی نہیں تھے۔ یا اسلام لاکر مرتد ہو گئے تھے۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بہترین اصحاب کے لشکر کی کمان ایک منافق کے سپرد کر دیتے تھے، اور شاہِ عمان کے پاس تبلیغ دین کے لئے سفیر بنا کر ایک چالاک ہوا پرست شخص کو بھیجا تھا جس نے اپنی دلنشین تقریر سے شاہ عمان جیسے شخص کو رام کر لیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے انھیں مصر کی مہم سپرد کر کے فتح کے بعد انہی کو وہاں کا والی بنا کر گویا امت پر ایک فتنہ پرداز شخص کو مسلط کر دیا تھا، اور امورِ مملکت میں ایسے شخص سے مشورے کیا کرتے تھے جس کا دین ہی مشتبہ تھا۔

اللہ اور دعوتِ محمدیہ کے دشمنوں نے ان دونوں بزرگ ترین ہستیوں کی جس طرح بے حرمتی کی ہے، وہ تو کرتے ہی کہ ان کا شعار ہے، اور ان کی محفلوں کی روح کہ جب تک اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فقرے چست نہ کریں، اور استہزاءً و استخفافاً ان کا ذکر نہ کرلیں

ان کے نزدیک محفل پھیکی رہتی ہے۔ لیکن افسوس ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مدعیِ علم ہیں، اور امام تسلیم کئے جانے کی ہوس میں مبتلا، کہ ان کے قلم سے کس قسم کی باتیں نکلتی ہیں۔ اللہ نے انھیں یہ قلم چلانا اس لئے سکھایا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب اور خلفاء پر جھوٹ بولیں، اتہام لگائیں، اور اس بات کا خوف نہ کریں کہ اپنے لکھے کی جواب دہی بھی کرنی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کو سبائیوں کی کتابوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان مقدس مصنفوں کی تحریروں سے پہنچا ہے، کبھی تو خضری جیسے لوگ امت کے خیالی ماضی پر افسوس کر کے صحابۂ کرام کو دیانت اور مکارمِ اخلاق کا سبق پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کبھی سیوطی جیسے حضرات اطمینان سے لکھ دیتے ہیں (تاریخ الخلفاء: ص ۸۷، طبع مصر) کہ:

فرفع اهل الشام المصاحف یدعون الی ما فیها مكيدة من عمرو بن العاص۔ فكره الناس الحرب وتداعوا الی الصلح۔

اہل شام نے مصاحف بلند کر دیئے، اور لوگوں کو احکامِ قرآنی کی طرف آنے کی دعوت دی۔ یہ چال عمرؓو بن العاص کی تھی۔ اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جنگ سے نفرت ہو گئی، اور سب طرف سے صلح کی آوازیں آنے لگیں۔

گویا ان صاحب کے نزدیک قرآن کی طرف دعوت دینا چالاکی اور مکر ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں جنگ سے نفرت ہونا اور صلح کی خواہش کرنا مذموم ہے۔ پھر ثالثی کے فیصلے کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

واجتمع الناس بِاَذْرُحٍ فی شعبان من هٰذه السنة (یعنی ۳۸ھ) وحضرها سعد بن ابی وقاص وابن عمر وغیرهما من الصحابة فقدّم عمرٌو اباموسیٰ الاشعری مكيدةً منه فتكلّم فخلع علیاً وتكلم عمرٌو فاقرّ معاویة، وبایع له، فتفرق الناس علیٰ هٰذا۔ وصار علیٌّ فی خلافٍ من اصحابه حتیٰ صار علیٌّ یعضّ علی اصبعه ویقول اُعْصیٰ ویُطَاعُ معاویة .... الخ

پھر لوگ اَذْرُح کے مقام پر اسی سال (۳۸ھ) شعبان میں جمع ہوئے (حالانکہ اجتماع رمضان میں [illegible] ہوا تھا۔ ع)، سعد بن ابی وقاص، اور ابن عمرؓ وغیرہ صحابہ بھی آ گئے تھے۔ عمرؓو نے چال چلی کہ ابو موسیٰؓ کو آگے کر دیا۔ انھوں نے تقریر کی اور علیؓ کو معزول کر دیا۔ پھر عمرؓو نے تقریر کی اور معاویہؓ کو (خلیفہ) تسلیم کر کے ان کی بیعت کر لی۔ اسی پر سب لوگ متفرق ہو گئے۔ علیؓ کے ساتھیوں میں اختلاف ہو گیا۔ حتیٰ کہ علیؓ دانتوں میں انگلی دیتے اور کہتے میری نافرمانی کی جاتی ہے اور معاویہ کی اطاعت! ......

ان صاحب نے جہاں سیدنا عمروؓ کی جناب میں گستاخی کی ہے، وہاں ایک پر نہیں دونوں ثالثوں پر اتہام رکھا ہے۔ اور پھر اس کی لپیٹ میں جمہور صحابہ کو لے لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر مکتب کا تعلیم یافتہ شخص جو اپنے آپ کو عالم کہتا ہے وہ ان مدعیِ امامت صاحب کے یہ الفاظ دُہرا کر اپنے آپ کو مواخذہ سے بَری سمجھ لیتا ہے۔ راقم الحروف نے دہلی کے ایک مشہور عالم کو تاریخ الخلفاء کے حوالے سے ایسی ہی واہی روایتیں بیان کرتے خود سُنا ہے۔

مسعودی کے نزدیک سیدنا ابو موسیٰؓ کی نگاہ میں سیدنا عمروؓ بن العاص کی حیثیت گدھے کی سی تھی۔ کَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (چار پائے بر و کتابے چند) [مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۰]

یہ ہے نقشہ جو اُن لوگوں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کا کھینچا ہے۔ یعنی جنھوں نے تمام عالم کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی، صدق و امانت کا سبق دیا اور تقویٰ کا شعور پیدا کیا وہ ایسے تھے!

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ	بڑی ہے بات جو اُن کے مُنہ سے نکلتی ہے
إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا (کہف : ۵)	اور یہ جو کہتے ہیں وہ سب جھوٹ ہے۔"

ثالثوں کا فیصلہ

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فیصلہ سُنانے سے پہلے ثالثوں میں کیا گفتگو ہوئی۔ کیونکہ بیان کردہ کسی ایک بات کا بھی حتمی ثبوت نہیں۔ تحکیم کو جو صورت دیدی گئی ہے، اسی کو سچ کر دکھانے کے لئے قسم قسم کی خیالی باتیں لوگوں نے وضع کی ہیں۔ اور سوائے کذب و افتراء کے انھیں کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

کئی مہینے کے غور و خوض کے بعد انھوں نے ایک عہد نامہ مرتب کیا تھا جس کا متن قطعاً مفقود ہے۔ ثالثی نامے میں خود اس کی تصریح موجود ہے کہ ثالث جو فیصلہ کریں اسے قلمبند کرلیں۔ مسعودی کو اعتراف ہو کہ فیصلے کے تحریری ہونے کی روایت اسے پہنچی ہے۔ اور اس کی بھی کہ زبانی کوئی تقریر نہیں ہوئی [مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۱]۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ثالثوں کا تقرر تحریر کے ذریعہ ہوا، گواہوں نے اپنی گواہیاں اس پر ثبت کیں، اور فریقین نے الگ الگ بھی اپنی رضامندی اور فیصلے کی پابندی کا

اظہار تحریری کیا، تو لازماً فیصلہ بھی تحریری ہوا ہوگا۔ اور دونوں ثالثوں اور گواہوں نے اس پر اپنے دستخط ثبت کئے ہوں گے، اور اس طرح سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا ہوگا کہ اس تحریری دستاویز کو پڑھ کر سنایا گیا ہو۔ اور اس کی ایک ایک نقل دونوں فریقوں کے نمائندوں کے سپرد کردی گئی ہو۔ گویا یہ سب افسانے ہیں کہ ثالثوں میں سے فلاں صاحب اٹھے انھوں نے یوں کہا اور فلاں صاحب کھڑے ہوئے اور وہ یہ بولے۔

مسعودی نے ایسا فیصلہ لکھے جانے کی تفصیلات بھی دی ہیں، اور پھر حسب عادت اس میں بے سروپا باتیں لکھ ماری ہیں۔ صحیح ہے کہ باہم جو گفت و شنید ہوئی ہوگی، اہل الرائے نے جو مشورے دیئے ہوں گے، ان سب کا نچوڑ اور آخری فیصلہ اس میں مندرج کیا ہوگا۔ کس قدر حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اس اہم ترین تحریر کا متن اس بری طرح مفقود ہوگیا۔ دراصل یہ مفقود نہیں ہوا ہے بلکہ قصداً و عمداً اسے ضائع کیا گیا ہے کہ اصل صورتِ حال لوگوں کے سامنے نہ آسکے۔ اس سے سبائی تحریک کی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسعودی کا بیان ہے، اور خضری وغیرہ نے بھی تقریباً انہی تفصیلات کو نقل کیا ہے [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ : ج ۲ : ص ۷۱ بعد] کہ جب رمضان ۳۸ھ میں اَذرُح (علاقہ دومۃ الجندل)، میں فیصلہ سنانے کے لئے یہ ثالث جمع ہوئے تو امیر المؤمنین علیؓ کی طرف سے چار سو نمائندے سیدنا ابو موسیٰؓ کی قیادت میں آئے تھے، جن میں سیدنا ابن عباسؓ بھی تھے، اور آپ ہی کے سپرد تمام امور کا انصرام تھا۔ نماز کی امامت بھی آپ ہی کرتے تھے۔ اتنے ہی نمائندے سیدنا معاویہؓ کی طرف سے سیدنا عمروؓ بن العاص کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ خود سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ تشریف نہیں لائے تھے۔ البتہ تمام کارروائیوں سے دونوں کو برابر باخبر رکھا جاتا تھا، اور دونوں کے مراسلات اپنے اپنے نمائندوں کے پاس آتے رہتے تھے۔ خضری کا بیان ہے:

وکان معاویۃؓ اذا کتب الی عمروؓ جاء الرسول وذھب لایدری بما جاء بہ ولا بما رجع بہ ولا یسألہ اھل الشام۔ واذا جاء رسول علیؓ جاء اھل العراق الی ابن عباسؓ فسألوہ ما کتب	سیدنا معاویہؓ جب سیدنا عمروؓ کے پاس کوئی مراسلہ بھیجتے تو پیغام رساں آتا اور جاتا کسی کو خبر نہ ہوتی کہ کیا پیغام لایا اور کیا مراسلہ لے گیا۔ اہل شام آپ سے کوئی بات دریافت نہیں کرتے تھے لیکن جب سیدنا علیؓ کا قاصد آتا تو اہل عراق

الیک امیرالمؤمنین فان کنتم ظنوا بہ الظنون وقالوا ماتراہ الاکتب بکذا وبکذا۔ فقال لھم ابن عباسؓ اما تعقلون اماترون رسول معاویہؓ یجئ ولایُعلم بماجاء بہ ویرجع ولایُعلم بمارجع بہ ولایسمع لھم صیاحٌ ولالغطٌ وانتم عندی کل یوم تظنّون الظنون!

سیدنا ابن عباسؓ کے پاس آکر دریافت کرتے امیرالمؤمنین نے آپ کو کیا لکھا ہے۔ اور آپ اگر ان سے بات پوشیدہ رکھتے تو پھر خود ہی تکے لڑایا کرتے کہ امیرالمؤمنینؓ نے ہماری رائے میں فلاں فلاں بات ہی لکھی ہوگی

اس پر حضرت ابن عباسؓ نے ان سے فرمایا "تم کبھی سمجھ سے بھی کام لوگے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ (حضرت) معاویہؓ کا قاصد آتا ہے تو نہ اس کی خبر ہوتی ہے کہ کیا پیغام لایا، اور نہ اس کی کہ کیا خبر لے گیا۔ نہ اُن کے ہاں آوازیں بلند ہوتی ہیں، اور نہ شور وغوغا ہوتا ہے مگر تم ہو کہ میرے بارے میں روز اٹکل پچّو باتیں اُڑایا کرتے ہو"

اہل عراق اور اہل شام کی ذہنیت، نظم، وفاداری، باہم اعتماد اور اطاعتِ امیر کی کیفیت کا موازنہ اس صورت حال سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً دونوں گروہوں کے ہاں روزانہ یہی منظر رہا کرتا ہوگا۔

اَذْرُحْ آجکل کے جغرافیہ کے مطابق یہ مقام شرق اردن اور سعودی عرب کے درمیان جنوب کی طرف شام کے علاقے میں تھا۔ ایک فرانسیسی مؤرخ کا بیان ہے کہ اس اجتماع کے تمام ارکان کے قیام وطعام کا انتظام سیدنا معاویہؓ کی طرف سے تھا۔ اس قول کی تائید مسعودی کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے (مروج الذہب: ج ۲: ص ۴۰۷)۔ وہ کہتا ہے کہ ایک موقعہ پر سیدنا عمروؓ نے سیدنا ابو موسیٰؓ سے عرض کیا تھا، کیونکہ آپ ہر موقعہ پر انہی کو مقدم رکھا کرتے تھے:

ولک حقوقٌ کلھا واجبۃ لسِنِّک وصحبتک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانت ضیفٌ۔

تمام حقوق آپ ہی کے ہیں۔ ایک تو عمر کے اعتبار سے بزرگی اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طویل مدت تک حاضری، اس کے علاوہ آپ ہمارے مہمان بھی ہیں۔

اَذْرُح چونکہ شام کی سرحد میں تھا، اس لئے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ طرفین کے نمائندوں کی مہمانداری سیدنا معاویہؓ کی طرف سے ہوئی ہو۔ اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا

ہے کہ متارکۂ جنگ کے بعد عالمِ اسلام میں کیسی پُر امن اور خوش آئند فضا قائم ہوگئی تھی، اور جو دونوں حریف گروہ تھے ان میں کیسی مودّت و اخوّت کا سماں بندھ گیا تھا۔

خرافات تحریری فیصلے کے متعلق مسعودی کے بیان کا تضاد اور خضری وغیرہ کی لغو تفصیلات اس قابل نہیں کہ ان پر قانونی حیثیت سے محاکمہ کیا جاسکے۔ کوئی بات باقاعدہ حوالے سے بیان نہیں کی گئی۔ اس مجموعۂ روایات پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو اتنا پتہ چلتا ہے کہ دونوں ثالث اس امر پر متفق تھے کہ امیر المؤمنین عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا، اور ان کے ولی کو قصاص کے مطالبے کا حق ہے۔ یہ بھی گفتگو ہوئی کہ اہلِ عراق کبھی سیدنا معاویہؓ کو پسند نہیں کریں گے، اور اہلِ شام کے ہاں سیدنا علیؓ مقبول نہ ہوں گے۔ لہٰذا دونوں کو معزول کر کے کسی تیسرے شخص کو منتخب کیا جائے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے مختلف نام پیش کئے مگر سیدنا ابو موسیٰؓ بضد رہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کے داماد تھے۔

چنانچہ سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص جیسی شخصیت پر بھی سیدنا ابو موسیٰؓ راضی نہیں ہوئے [حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ صحابی تھے، عشرۂ مبشرہ میں تھے، فاتح قادسیہ تھے، اور ان چھ بزرگواروں میں سے تھے جنھیں امیر المؤمنین عمرؓ نے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا، اور پھر سیدنا عثمانؓ کی شہادت کے بعد سیدنا ابو موسیٰؓ اور سیدنا ابن عمرؓ ہی کی طرح وہ غیر جانبدار بھی رہے۔ ان کی فتوحات شاندار تھیں، اور حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد میں انتظامِ مملکت کا تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے]۔ ان کا نام حضرت ابو موسیٰؓ نے محض اس لئے رَد کر دیا کہ اپنے داماد حضرت ابن عمرؓ کو خلیفہ بنائیں۔ [حالانکہ ادنیٰ ترین درجے میں بھی انھیں عملی سیاست میں حصہ لینے کا موقعہ کبھی نہیں ملا تھا]۔ اسی قسم کی اور بھی فضول ولایعنی اور خیالی باتیں بیان کی گئی ہیں، جن کی اندرونی تفصیلات انھیں ناقابلِ قبول بنا دیتی ہیں۔

ایک اور روایت سب سے زیادہ قوی روایت وہ ہے جو امام دارقطنیؒ کے حوالے سے حضرت امام ابو بکر بن العربیؒ نے العواصم من القواصم (ص ۱۷۸) میں نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں:

حضین بن منذر (جو سیدنا علیؓ کے ساتھیوں میں تھے، اور جمل وصفین میں آپ ہی کی طرف سے لڑے تھے) بیان کرتے ہیں کہ:-

"جب عمرؓ نے معاویہؓ کو معزول کر دیا تو میں گیا اور معاویہؓ کے خیمے کے قریب اپنا خیمہ لگایا، معاویہؓ کو خبر ہوئی تو مجھے بلایا، اور کہا "ان صاحب (یعنی سیدنا عمروؓ) کے متعلق مجھے اس اس قسم کی باتیں معلوم ہوئی ہیں، تم تحقیق کرو کہ صحیح ہیں یا نہیں"۔

کہتے ہیں کہ "میں نے جا کر پوچھا کہ آپ کے اور ابو موسیٰ کے سپرد جو کام ہوا تھا اس میں آپ نے کیا کیا؟"۔ فرمایا "لوگ بہت کچھ کہہ رہے ہیں، بخدا بات وہ نہیں جو انھوں نے بنائی ہے۔ بلکہ ہوا یہ کہ میں نے ابو موسیٰ سے کہا "اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"۔ انھوں نے کہا "میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جائے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی گئے"۔ میں نے کہا "پھر میرا اور معاویہ کا کیا ہوگا؟"۔ کہنے لگے "اگر تم سے مشورہ لیا گیا تو تم اس کے اہل ہو، اور اگر نہ لیا گیا تو بہت سی باتیں ہیں جہاں اللہ نے تمھاری مدد سے بے نیاز رکھا ہے"۔ بس یہ بات ہے جس سے معاویہ مرے جا رہے ہیں"۔

حضین کہتے ہیں "پھر میں معاویہ کے پاس گیا اور انھیں سب بات بتا دی۔ انھوں نے ابو الاعورؓ ذکوانی کو بلایا (جو صحابی ہیں اور سیدنا معاویہؓ کے بہت معتمد سپہ سالار تھے۔ ع) اور انھیں سواروں کا ایک دستہ دے کر عمروؓ کے پاس بھیجا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور چیختے ہوئے وہاں پہنچے "کہاں ہے وہ اللہ کا دشمن، کہاں ہے وہ فاسق!"

اس بات کے راوی ابو یوسف کہتے ہیں "غالباً وہ اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کرنے پر تُلے ہوئے تھے (یعنی سیدنا عمروؓ کے قتل کے گناہ پر۔ ع)۔ عمروؓ نے جو یہ دیکھا تو خیمے میں ایک گھوڑا کھڑا تھا، اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گئے، اور ایڑ لگاتے ہوئے معاویہؓ کے خیمے تک گئے اور کہا:

إِنَّ الضَّجُورَ قَدْ تَحْتَلِبُ الْعُلْبَةَ يَا مُعَاوِيَةَ إِنَّ الضَّجُورَ قَدْ تَحْتَلِبُ الْعُلْبَةَ۔	مرکھنی اونٹنی بھی دودھ دیدیتی ہے معاویہ! مرکھنی اونٹنی بھی دودھ دیدیتی ہے۔

(حضرت) معاویہؓ نے یہ سن کر فرمایا:

أَجَلْ! وَتَرْبُذُ الْحَالِبَ فَتَدُقُّ أَنْفَهُ وَتُكْفَأُ إِنَائَهُ۔	ہاں! مگر دوھنے والے کے منہ مار کر اس کی ناک توڑ دیتی ہو اور برتن گرا دیتی ہے۔

یہ ہے حال سب سے قوی روایت کا۔ اسے قبول کیا جا سکتا تھا کیونکہ دار قطنیؒ کی ہے، جو طبری وغیرہ سب سے بلند رتبہ اور عادل ہیں، جن کے سامنے مسعودی جیسے لوگ کسی قطار و شمار میں نہیں۔ پھر اس کے راوی ہیں ایک ایسے صاحب جو سیدنا علیؓ کے ساتھیوں میں، اور معارکہ جنگ سے پہلے سیدنا معاویہؓ کے مخالفوں میں تھے۔ لیکن اس کی تفصیلات میں کئی باتیں ہیں جو اسے محلِ نظر بنا دیتی ہیں۔

(۱) منجملہ ازاں یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق سیدنا معاویہؓ کو اَذْرُح میں ماننا پڑے گا، جو ثابت نہیں۔ وہاں نہ سیدنا علیؓ تھے اور نہ سیدنا معاویہؓ۔ اگر سمجھا جائے کہ حضین کی یہ آمد و رفت اَذْرُح اور دِمَشق کے درمیان تھی، تب بھی بات نہیں بنتی۔ سیدنا معاویہؓ کو دِمَشق کے قیام میں خیمے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ وہ سب روایتیں غلط ہیں جن سے سیدنا معاویہؓ کا اَذْرُح میں موجود نہ ہونا ثابت ہے، یعنی آپ یقیناً وہاں موجود تھے، تو ظاہر ہے کہ آپ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ فیصلہ سناتے وقت آپ کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جائے۔ آپ خود فریق تھے اور اپنے گروہ کے امام۔ لہٰذا اس اجتماع میں آپ کی جگہ صفِ اوّل میں ہوگی تو دیکھنا یہ ہے کہ جب مجمع میں ایک اعلان کیا جائے یا تحریر پڑھ کر سنائی جائے تو جو وہاں حاضر ہو اور سب سے ممتاز جگہ بھی بیٹھا ہو، اُسے اس اعلان کی تفصیلات کی تحقیق کی ضرورت اس طرح نہیں ہوتی جیسے حضین نے بیان کی ہے۔ اگر آپ مجمع میں تشریف نہ بھی لائے ہوں تو تمام تفصیلات آپ کے اپنے معتمد نمائندے آپ کی خدمت میں سرکاری حیثیت سے گوش گذار کرتے۔ آپ کی حیثیت یہ نہیں تھی کہ سنی سنائی باتیں آپ تک پہنچیں اور نہ ان باتوں کے پہنچانے والے عراقی مزاج کے لوگ تھے۔ یہ باتیں تو آپ کے وفادار اور معتمد کارکن گوش گذار کرتے۔

(۲) دوسری ناقابلِ قبول بات ہے دونوں کو معزول کر دینے کا ذکر، جس پر بحث آگے آ رہی ہے۔

(۳) تیسری ناقابلِ قبول بات ہے حضین کے ذریعہ تحقیق جو فریقِ مخالف سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر آپ نے اپنے آدمیوں پر اعتبار نہیں کیا تھا تو پھر تحقیق کے لئے ان میں سے کسی صاحب کا انتخاب کرتے جو غیر جانبدار تھے، مثلاً سیدنا سعدؓ یا سیدنا ابن عمرؓ۔ کیونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ دونوں فریقوں کے چار چار سو نمائندوں کے علاوہ وہاں ایک جماعت غیر جانبدار حضرات کی بھی تھی، مثلاً عشرہ مبشرہ میں سے سعدؓ بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زیدؓ، پھر تھے سیدنا ابن عمر، سیدنا مغیرہ بن شعبہ وغیرہم۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

یہ جتنی روایتیں ہیں، ان کے ڈرامائی انداز اور تضاد سے قطع نظر کرلیں، تب بھی معاہد تحریری ہو یا اس کے مطابق ثالثوں کی تقریر زبانی، سب میں یا ایک کو معزول کر دینے کا ذکر ہے، یا دونوں کو معزول کر کے کسی تیسرے صاحب کو منتخب کرنے کا۔ یہی وہ چیز ہے جو اس موضوع پر تمام روایتوں کو ساقط عن الاعتبار بنا دیتی ہے۔ یہ لوگوں کا اپنا اپنا بیان ہے، یا وہ تصور ہے جو اپنے خیال میں انھوں نے ثالثوں کے فیصلے کے بارے میں قائم کر رکھا ہے، یا ثالثوں کا بیان سننے کے بعد اسے قصداً مسخ کر دیا ہے، اس لئے ہمیں صرف واقعات کے استقصاء سے ثالثوں کا فیصلہ اور اس کا نتیجہ معلوم کرنا ہوگا۔ اُمت کی یہ بدقسمتی ہے اور دشمنانِ امت کی کامیابی کہ ایسی اہم دستاویز اور اس طرح غائب کر دی گئی۔

تجزیہ

(۱) سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت کے مدعی ہی کب تھے جو انھیں معزول کرنے یا مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بھی اصلاً موضوعِ بحث نہ تھی، بلکہ مسئلہ تھا سیدنا عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص کا۔ سیدنا علیؓ کی خلافت محض اس لئے ضمناً زیرِ بحث آئی تھی کہ یہی قاتل اور مفسد آپ کی حکومت پر مسلط تھے۔ اگر آپ ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے یا امّت کو ان کے خلاف منظم ہونے کی دعوت دیتے، یعنی وہی موقف رکھتے جو جنگِ جمل کے موقعہ پر طے ہو گیا تھا، تو کسی کو آپ کے خلیفہ تسلیم کرنے اور بیعت کر لینے پر اعتراض نہ تھا۔ لیکن جنگِ جمل جس طرح شروع اور ختم ہوئی، اس سے اصل مسئلہ جو وجہِ نزاع تھا "غت ربود" ہو گیا۔ غضب یہ ہوا کہ تمام مخلصوں کی رائے کے خلاف حضرت امیر المؤمنینؓ نے مستقل طور پر مدینہ چھوڑ دیا، اور آکر گھر گئے کوفیوں اور بصریوں میں۔ جن کے چنگل سے نکلنے کی سبیل پھر نہ نکل سکی۔ اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

خلافت تو اہلِ حل وعقد میں سے دو آدمیوں کے بیعت کر لینے سے بھی منعقد ہو جاتی ہے، بشرطیکہ امّت تسلیم کرلے۔ لہٰذا آپ کی خلافت پر اجماع ہو جانا لازمی تھا، کیونکہ آپ ہر طرح اس کے اہل تھے، اور کسی کو آپ کے مقام اور آپ کی عظمت کا انکار نہ تھا۔ جتنے حضرات نے بیعت سے احتراز کیا تھا، اس کا سبب محض قاتلانِ عثمانؓ تھے۔ یہ تھی اصل، اور انہی قاتلوں کے استیلاء کے سبب خلافت کا مسئلہ ضمناً اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ قطعاً کوئی اور مسئلہ زیرِ بحث نہ تھا۔

لہٰذا یہ تصوّر ناممکن ہے کہ ثالثوں نے اصل مسئلہ

نہیں سمجھا یا جان بوجھ کر اُسے خلافت کا مسئلہ بنادیا،
اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ گویا خلافت کے دو مدعی ہیں
جن کے مابین انھیں فیصلہ کرنا ہے۔

(۲) اگر کہا جائے کہ سیدنا عمروؓ نے عین وقت پر متفقہ فیصلے کے خلاف سیدنا معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا، اور اس کی پروا نہ کی کہ معاملہ کیا تھا اور وہ اُسے کیا بنا رہے ہیں، تو یہ تصور قطعاً باطل ہے۔ خود ان افترا پرداز مؤرخوں کو اعتراف ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کی بیعت اس وقت تک نہیں ہوئی تھی جب تک سیدنا عمروؓ نے ان کے خلیفہ بنانے کا اعلان نہ کر دیا۔ تو اب سوال ہے کہ جب یہ ثالث دونوں کو معزول کرنا چاہتے تھے، تو یہ عزل کس اعتبار سے ہوتا؟ سیدنا علیؓ کو خلافت سے معزول کیا جاتا، اور سیدنا معاویہؓ کو امارتِ شام سے؟ اگر ایسا کر بھی دیتے تو اس سے مسئلے کا حل کیا نکلتا؟

(۳) اگر کہا جائے کہ وہ کسی تیسرے صاحب کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، جیسا کہ مسعودی وغیرہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمرؓ کو خلیفہ بنانے پر سیدنا ابو موسیٰؓ کو اصرار تھا، تو کیا ان دونوں کے ہاتھ میں یہ طاقت تھی کہ حضرت امیر المؤمنینؓ کو اُن کے علاقے سے بے دخل کر دیں، اور حضرت معاویہؓ کو شام سے نکال دیں، اور یوں تمام اُمت کی مرکزی طاقت ایک تیسرے صاحب کے تحت کر دیں؟ اور کیا تیسرا شخص اپنی پشت پر اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق میں ثالثوں کا فیصلہ سننے کے بعد اپنی خلافت قائم کرلے؟ کیا رائے عامہ کی تربیت ہوگئی تھی؟ کیا اَذرُح کا مجمع تمام امت کا نمائندہ اجلاس تھا، یا کم از کم ایک لاکھ آدمی یہ عہد کر چکے تھے کہ ثالث جس کے نام پر اتفاق کریں گے ہم اس کی پشت پر ہیں، اور ہر اس شخص سے لڑیں گے جو اس فیصلہ سے سرتابی کرے؟

ٹھیک ہے کہ ثالثی نامہ میں امت کا یہ فرض بتایا گیا تھا "وہم انصار علی من ترک هٰذه الصحیفة وارا دفیہ الحادا وظلماً" (اور وہ سب یعنی تمام مسلمان اس شخص کے خلاف ان ثالثوں کا ساتھ دیں گے جو ثالثی نامے کی خلاف ورزی کرے یا ہٹ دھرمی اور ظلم سے اس کا مقصد فوت کرنا چاہے)

اب اگر بالفرض یہ سب باتیں ہو جائیں تب بھی ثالثوں نے اپنے ذمے یہ فرض عائد کیا تھا کہ وہ امت کو دوبارہ جنگ میں نہیں دھکیلیں گے اور ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو اللہ و رسول کے حکم کے خلاف ہو اور جس کا نتیجہ اختلال و اختلاف نکلے۔ لہٰذا ان کا فیصلہ

ایسا ہونا چاہئے تھا جو موجبِ امن ہو۔ لیکن اُن کے یہ دونوں فیصلے جو بیان کئے جاتے ہیں، ظاہراً و باطناً عہد نامے کے خلاف ہیں۔ اور امت کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دینے کے مرادف۔

دونوں کے عزل کی صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام امت کی رائے عامہ استوار ہو چکی تھی اور وہاں جتنے لوگ جمع ہوئے تھے وہ یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ ثالث جب اپنا فیصلہ سُنائیں تو بہرحال اسے نافذ کر دیا جائے۔ یعنی اس اجتماع کے علاوہ بھی ثالثوں کو اتنے بڑے مسلح اور مؤثر جمِ غفیر کی حمایت حاصل تھی کہ اگر کسی طرف سے اُن کے فیصلے پر احتجاج ہوتا تو اُسے قوت کے ساتھ دبا دیا جاتا۔

دوسری صورت میں یعنی سیدنا علیؓ کو معزول اور سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے اعلان سے دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو سیدنا معاویہؓ اپنے آپ کو خلیفہ برحق سمجھ کر سیدنا علیؓ سے مطالبہ کرتے کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں اور بیعت کر لیں، یا پھر سیدنا علی امیر المؤمنین صلوات اللہ علیہ کی طرف سے اعلان ہوتا کہ ثالثوں میں سے ایک نے یا دونوں نے غداری کی ہے۔ ایک کی حماقت اور دوسرے کی چالاکی سے پُرانا جھگڑا مٹنے کی بجائے نیا فتنہ کھڑا ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ سب کارروائی ناجائز ہوئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں دوبارہ جنگ چھیڑ کر شام پر حملہ کر دیتے۔

اہلِ باطل نے یہی باتیں ثابت کرنے کے لئے قسم قسم کی روایتیں وضع کی ہیں، اور باور کرانا چاہا ہے کہ واقعی سیدنا علیؓ امیر المؤمنین تو فوجوں کو شام پر حملہ کرنے کے لئے اُبھارتے تھے لیکن فوج آگے بڑھنے پر تیار نہیں ہوتی تھی اس لئے مجبور رہ گئے۔ یہ روایتیں قبول کی جا سکتی تھیں بشرطیکہ ان کا کوئی عملی ثبوت بھی ہوتا۔ کوئی شخص باور نہیں کر سکتا، اور کسی صاحبِ فہم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ جس شخص کے قبضے میں شام و مصر کے علاوہ باقی تمام عالمِ اسلام ہو، اسے ضرورت پڑنے پر فوج نہ مل سکے۔ اگر کوفہ اور بصرہ کے لوگ غدّار تھے تو کیا آپ کے والی اتنی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے کہ آپ کے طلب کرنے پر دو دو چار چار ہزار آدمی فوج کشی کے لئے بھیج دیں؟ صحیح روایت ہے جو سیدنا حسنؓ کی صلح کے تحت آگے بیان ہوگی کہ آپ (حضرت حسنؓ) کے جھنڈے کے نیچے انہی اہلِ عراق میں سے لڑنے کے لئے ایک طاقتور فوج جمع ہو گئی تھی، تو بڑا تعجب ہے کہ سیدنا علیؓ کو فوج میسّر نہ آسکی، حالانکہ سیدنا حسنؓ کے زیرِ تصرف بہت ہی کم اور محدود رقبہ تھا۔

اس کے بعد سوال ہے کہ دونوں ثالثوں کی یا ایک کی غدّاری سے جو شخص ناجائز طریقے

پر بد دیانتی سے خلیفہ بن بیٹھا تھا، اس کی فوجیں عراق کی کس سرحد پر تھیں؟ اور وہ خود کوفے سے کتنی دور پڑاؤ ڈالے پڑا تھا کہ عراق کی طرف سے حملہ ہو تو مدافعت کر سکے۔ ادنیٰ ترین عقل کا آدمی بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ایک ہوا پرست، مکار، بے دین شخص جس کی حکومت کا اعلان ہو چکا ہے، جس کی طاقت مجتمع ہے، جس کی فوج منظم ہے، اور وہ فوج ایسی ہے کہ بیس برس سے بازنطینی حکومت کے لئے وبالِ جان بنی ہوئی ہے، وہ حریف کے اندرونی اختلال سے فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ اگر عراق پر حملہ کرنے سے اس پر اشتر نخعی جیسے سورماؤں کا رعب طاری تھا تو اشتر مر چکا تھا، اور عراقی فوج میں ابتری پھیلی ہوئی تھی، "دشمن" کی طاقت کے متعلق تمام خطرات رفع ہو چکے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے عراق پر حملہ نہیں کیا؟

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ مستقلاً دمشق میں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کی فوج کا کوئی حصہ عراق کی سرحد پر نہیں۔ آپ نے تو ثالثوں کا فیصلہ سننے کے لئے بھی اَذرح آنا ضروری نہیں سمجھا۔ فیصلہ جب سنایا جاتا ہے تو دونوں فریقوں کے چار چار سو بڑے سردار اور ذی رتبہ اشخاص وہاں موجود ہیں، غیر جانبدار صحابۂ کرام کی بھی ایک جمعیت حاضر ہے، لیکن فیصلہ سننے کے بعد کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا، اور خوش اسلوبی کے ساتھ تمام حاضرینِ اجلاس اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو جاتے ہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو بیان کی جاتی ہے تو سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ میں باقاعدہ جنگ سے پہلے تو معرکۂ قتال یہاں گرم ہوتا۔ اور دونوں ثالثوں کو نہیں تو کم از کم ایک کو یقیناً قتل کر دیا جاتا۔

یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ فیصلہ اتنا امن پسندانہ، عاقلانہ اور مدبرانہ تھا کہ کسی فریق کے جذبات میں ہیجان پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ اس فیصلے کے بعد دونوں اماموں نے کوئی ایسی حرکت کی جسے حریفوں کے مابین نقضِ امن سے تعبیر کیا جا سکے۔ کسی محاذ پر سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کی فوجوں میں تصادم نہیں ہوا۔ کوئی شخص کسی ادنیٰ ترین اور مردود روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ صفین کے وقت جو ہتھیار اٹھائے گئے تھے اور متارکۂ جنگ کے وقت رکھ دیئے گئے، وہ کبھی دوبارہ ایک دوسرے کے خلاف اٹھائے گئے ہوں۔

یہ ثبوت ہے عملی، یقینی اور حتمی کہ تحکیم کے بارے میں یہ جتنی متضاد روایتیں دشمنانِ دین و ملتِ محمدیہ نے وضع کی ہیں، ان میں سے ایک بھی قابلِ استناد نہیں۔ سب نے واقعے کی صورت مسخ کر دی ہے۔ حتیٰ کہ دارقطنیؒ کی روایت بھی اس طرح قبول نہیں

کی جا سکتی، جس طرح العواصم من القواصم میں امام ابو بکر بن العربیؒ نے قبول کی ہے۔
البتہ یہ روایت سنداً قوی ہے۔ لیکن یقیناً بعد کے کسی راوی نے اس میں معنیً تصرف کر دیا ہے۔ پھر بھی اس میں ایک فقرہ ایسا موجود ہے جس سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یعنی معاملہ ان حضرات کے سپرد کر دیا جائے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی گئے۔

راوی کی یہ غلط فہمی تھی کہ انھوں نے ان اصحاب میں سے کسی کے خلیفہ منتخب کرنے کا خیال پیدا کر لیا۔ یا اس کا کہ ثالثوں نے سیدنا علیؓ یا سیدنا معاویہؓ کو یا دونوں کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ثالثوں کا عیاناً مقصد یہ تھا کہ ما بہ النزاع مسئلے کا تصفیہ ان بزرگواروں کے سپرد کر دیا جائے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی گئے۔ نہایت حماقت اور انتہائی گستاخی ہو گی اگر یہ سوچا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا علیؓ یا سیدنا معاویہؓ سے یا سیدنا ابو موسیٰؓ اور سیدنا عمروؓ بن العاص سے راضی نہیں گئے۔ نہ یہ بزرگوار ایسی رکیک اور خلاف واقعہ بات سوچ سکتے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں کو جو انتہائی دیدہ دلیری سے صحابہ کرام پر طعن کرتے ہیں، یہ طعن خود اپنی عقل پر کرنا چاہیے، اور ماتم اپنے ایمان پر کہ بات کیا تھی اور انھوں نے اسے کر کیا دکھایا۔

ثالثوں کا عندیہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ معاملہ خود ان دونوں کے ہاتھ میں رہنے کی بجائے جمہور کے ان عظیم المرتبت نمائندوں پر ڈال دیا جائے جو خدا اور رسولؐ کے ہاں مقبول ہیں، اور مسئلہ ما بہ النزاع میں فریق نہیں۔ اس طرح امت کے مسائل میں بات کرنے کا حق رکھنے سے وہ لوگ خود بخود نکل گئے جو جماعت سے خارج تھے، یا جنھیں صحبتِ نبوی کا شرف حاصل نہیں تھا۔

ثالثوں کی یہ للٰہیت خلوص اور عبدیت تھی کہ انھوں نے غور و خوض کے بعد محض اپنے آپ کو اس کا مجاز نہیں سمجھا کہ امت کے نمائندوں سے بالا ہو کر بطور خود کچھ فیصلہ سنا دیں، یا محض بڑے بڑے لوگوں کی رائے لینے ہی پر اکتفا کر لیں۔ اُن کے نزدیک ضروری تھا کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عام اجتماع میں اس قضیے کا فیصلہ ہو۔

چونکہ فیصلے کا اصل متن مدوّن شکل میں ہمارے سامنے نہیں، اور نہ کسی معتبر و مستند روایت سے اس کی تفصیلات متعین شکل میں معلوم ہو سکتی ہیں، اس لئے قانوناً اس کی تنقیح نہیں کی جا سکتی اور محاکمہ ناممکن ہے۔ لیکن بیان کردہ باتوں کے مشترک امور اور فیصلے

کے بعد کے واقعات ثابتہ سے جو اندازہ ہوتا ہے اور جو تاریخی حقائق کی روشنی میں بہت صائب اور اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے، جس سے لوگوں کی پیدا کردہ تمام الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے شایانِ شان ہے، جو حاضرینِ اجلاس کی طمانیتِ قلب کا سبب ہو سکتا تھا، اور جس کے نتیجے میں اجلاس پُرامن طریقے پر برخاست ہو گیا، وہ صرف یہ ہے:

۱۔ دونوں ثالث اس امر پر متفق تھے کہ اصولاً دونوں فریق حق پر ہیں۔ سیدنا عثمانؓ کا قصاص واجب ہے۔ اور سیدنا علیؓ کی خلافت بالفعل درست۔

۲۔ دونوں نے خطائے اجتہادی کی۔ ایک نے اپنی خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم کرانے کے لئے تلوار اٹھا کر، اور دوسرے نے قصاصِ عثمانؓ کو اپنے ہاتھ میں لے کر۔

لہٰذا دونوں کو اس موقف سے معزول کیا جاتا ہے۔ یعنی سیدنا علیؓ تلوار روکیں، اور سیدنا معاویہؓ قصاص لینے کا معاملہ اپنے ہاتھ میں نہ رکھیں۔

۳۔ دونوں باتوں کا فیصلہ صحابۂ کرام کے ایک عام اجتماع میں ہو جس میں وہی حضرات شریک ہوں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی گئے۔ یعنی سوائے صحابۂ کرام کے اس اجلاس میں اور کوئی نہ ہو۔ اور اس مقصد کے لئے رائے عامہ استوار کی جائے، تاکہ مقبول عام اربابِ حل و عقد جب فیصلہ کریں تو اُن کی پشت پر طاقت ہو۔

۴۔ جب تک عام اجتماع میں فیصلہ نہ ہو اس وقت تک دونوں فریق اپنے اپنے زیرِ نگیں علاقوں کا نظم و نسق بدستور چلاتے رہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا سلسلہ قطعاً مسدود رہے۔

گویا ثالثوں نے حکومت اور تصرف فی البلاد کے اعتبار سے نہ ایک کو معزول کیا اور نہ دوسرے کو۔ انھوں نے صرف اصولاً طے کیا کہ زیرِ بحث معاملات کے تصفیہ کے لئے ان اصحابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کریں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی گئے، اور جن کی شہادت اور فیصلہ عند اللہ والناس مقبول ہے۔ یہ عزل اس اعتبار سے تھا نہ کہ اس صورت سے جو لوگوں نے مسخ کر کے پیش کی ہے۔

اس فیصلے کے کارگر ہونے کی توقع دونوں ثالثوں کو اس بنا پر تھی کہ پچھلے چند ماہ میں جس طرح امن قائم رہا اور فریقین آپس میں نہیں اُلجھے اسی صورتِ حال کو کچھ دن اور قائم رکھا جائے۔

لہٰذا انھوں نے امن کی مدت میں بلا تعیینِ وقت توسیع کر دی، اس توسیع کا اختیار انھیں ثالثی نامے میں دیا گیا تھا۔ اور ثالثی نامے ہی میں انھیں اس کا بھی اختیار دیا گیا تھا کہ اپنے فیصلہ میں اگر چاہیں تو دوسرے حضرات کی رائے بھی شامل کر لیں۔

ثالثوں کی یہ فراستِ ایمانی تھی اور خلوص تھا کہ انھوں نے اتنے بڑے فیصلہ کی ذمہ داری محض اپنے سر نہیں رکھی، بلکہ اس کا حق پوری امت کو دیدیا۔ کہ امت کے صحیح رہنما اور تمام مستند نمائندے اس کا فیصلہ کریں۔ یہ دو آدمیوں کا، دو فریقوں کا یا دو خاندانوں کا معاملہ نہیں تھا، کہ دو صاحب باہمی سمجھوتے سے کوئی فیصلہ کر دیں۔ یہ مسئلہ تھا تمام امت کے حال و استقبال کا، اس لئے اسلم و احسن طریقہ یہی تھا کہ تمام امت کے بہترین افراد کے سر پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے۔ اس سے زیادہ عادلانہ اور حکیمانہ فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سوائے اس کے کسی ایسے تصفیہ کا امکان تھا کہ جس پر فریقین بھی راضی ہو جائیں اور غیر جانب دار طبقہ بھی جو اُس وقت امت کا سوادِ اعظم تھا، اور جذبات سے عاری ہو کر اطمینان سے مسائل کا احصا کر سکتا تھا۔

جمہور صحابۂ کرام جنگ کے خلاف تھے، سب نے سیدنا علیؓ امیر المؤمنین کی خلافت بالفعل تسلیم کر لی تھی، لیکن آئینی حیثیت سے بیعت نہیں کی تھی۔ سب چاہتے تھے کہ شہیدِ مظلوم امیر المؤمنین عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے، اور اس مردود گروہ سے امت کو نجات دلائی جائے جو سیاساتِ اسلامیہ پر بغیر حق مسلّط ہو گیا تھا۔

یہ لوگ جنھوں نے تاریخ کی کتابوں کے اوراق سیاہ کئے ہیں، انھوں نے امت کے سوادِ اعظم کو قطعاً نظر انداز کر دیا، اور یہ نہیں دیکھا کہ جمہور صحابۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو اُن جھگڑوں سے الگ رہے، وہ بھی نظریات و تصورات رکھتے تھے، انھیں بھی بولنے کا حق تھا، بلکہ اصل حق انہی کا تھا اور انہی کے ہاتھ میں میزانِ عدل تھی۔ ثالثوں نے ان کے جذبات کی پذیرائی کی، اور ان کا واجبی حق انھیں دیدیا۔ کیونکہ جماعت جسے کہتے ہیں وہ وہی تھے۔ اور انہی کا حق تھا کہ زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں آئے۔ اسی جماعت کا یہ عقیدہ تھا جو ثالثوں نے اپنے فیصلے میں پیش کیا۔

جماعت شروع سے کہتی چلی آرہی ہے کہ فریقین حق پر تھے، البتہ ان سے خطاءِ اجتہادی ہوئی۔ اختلاف صرف اتنا ہے کہ خطا دونوں سے ہوئی یا ایک سے، اور ایک سے ہوئی تو کس سے، یا دونوں سے نہیں ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں (۲: ۲۱۹-۲۲۰) صحابۂ کرامؓ سے لے کر حضرت امام احمدؒ تک ہر طبقے کے نظریات بیان کئے ہیں۔ یہ نظریات امت کے

اس سوادِ اعظم کے موقف سے مستفاد ہیں جو اس وقت فریقین کی اس کشمکش میں غیر جانبدار تھا، اور جس کی خواہش تھی کہ تمام معاملات کا تصفیہ پر امن ماحول میں ہو۔ دونوں ثالثوں نے خدا و رسولؐ اور اہلِ ایمان کی مرضی کے مطابق اسی سوادِ اعظم کے سپرد تمام امور کا تصفیہ کر دیا۔

اس سوادِ اعظم کے بڑے بڑے مقتدا حسبِ ذیل حضرات تھے:

سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا سعید بن زید (دونوں عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں) سیدنا قدامہ بن مظعون، حضرت عبداللہ بن عمر، سیدنا ابو برزۃ اسلمی، حضرت اسامہ بن زید، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی اور متبنّٰی کے فرزند)، سیدنا عبداللہ بن سلام، سیدنا ابو مسعود، سیدنا حسان بن ثابت (شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)، سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا فضالہ بن عُبید، سیدنا عمران بن حُصین، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا معاویہ بن خُدیج وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ جنھوں نے ثالثی کا فرض انجام دیا وہ بھی اسی جماعت میں تھے۔ پھر ہیں سیدنا مغیرہ بن شعبہ، سیدنا کعب بن عجرہ، سیدنا کعب بن مالک، سیدنا ابو سعید خدری، سیدنا نعمان بن بشیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ حضرات دس بیسؔ نہیں تھے، اکابرین سیکڑوں تھے، اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ ہزاروں تھے، پھر تابعینِ کرام تھے۔ گویا نصف کے قریب امت تھی۔

صحابۂ کرام میں سے جن حضرات نے ایک طرف یا دوسری طرف سے حصہ لیا، ان میں اکابر کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ ثابت نہیں کی جاسکتی، اور جن پر صحابیت کا اطلاق ہوتا ہے وہ سو ڈیڑھ سو بھی نہیں تھے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ یہ بات اس کا عملی ثبوت ہے کہ امت کا بڑا حصہ جسے سوادِ اعظم کہتے ہیں وہ غیر جانبدار تھا، اور اس غیر جانبدار طبقے کے متعدد حضرات اَذرُح کے اجتماع میں موجود تھے۔

اگر ثالثوں نے بددیانتی کی ہوتی (نعوذ باللہ من ذٰلک) تو اوّل تو دونوں طرف کے سرکاری نمائندے اُلجھ پڑتے، اور نہیں اُلجھے تھے تو کم از کم غیر جانبدار طبقے کے جو نمائندے تمام امور کے شاہد تھے وہ اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو کر تمام حالات سے امت کو واقف کر دیتے کہ کس طرح بددیانتی ہوئی ہے۔ یوں نہ سیدنا ابو موسیٰؓ اور سیدنا عمروؓ بن العاص کی حیثیت اُن کے ہاں مقبول و باوقار رہتی، اور نہ سیدنا معاویہؓ کو وہ کامیابی ہوتی جو ہوئی۔

غور طلب ہے یہ بات کہ جو حضرات سیدنا علیؓ امیر المؤمنین سے بیعت نہیں کرتے، محض اس لئے

کہ انھیں اُن کی خلافت کے آئینی ہونے میں شک ہو، اور ان کا اصرار ہے کہ جو کام ہو وہ امت کے عام اجماع سے ہو نہ کہ باغیوں کے تسلط سے، ایسے حضرات یہ کیونکر برداشت کر لیتے کہ فریقین کو برطرف کر کے نظام عالم کو درہم برہم کر دیا جائے یا یہ کہ حضرت معاویہؓ کو چالاکی سے خلیفہ بنا دیا جائے۔

فیصلے کے بعد

امن عام اپنی واہی روایتوں کے باوجود تمام اہل تاریخ متفق ہیں کہ فیصلہ سننے کے بعد دونوں فریقوں کے نمائندے اپنے اپنے مستقر کو چلے گئے، اور غیر جانبدار حضرات بھی۔ گویا اس اجتماع میں اشتعال کی قطعاً کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ لغو باتیں کہ فلاں نے فلاں کے لات ماری اور آپس میں ایک دوسرے کو گدھا اور کتا کہا، یا فلاں نے فلاں کے کوڑا مارا، اور تلوار ہاتھ میں نہ ہونے کی حسرت بیان کی، ان باتوں میں جان نہیں۔ یہ محض اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ فضا کے پُرامن ہونے کا انکار ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ اجتماع ہوا تھا امت کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے، اور طاقتور مقتدایانِ ملت کی موجودگی میں جن کے ساتھ چار چار سو مسلح افسر تھے۔ پھر ایسے مسئلہ میں جس پر امت کی فنا و بقا کا انحصار ہو، اگر بددیانتی کی جائے تو لاتیں اور کوڑے نہیں چلا کرتے، اور نہ زبانی طعن و تشنیع ہوا کرتی ہے۔ وہاں تو جان دینے اور لینے کا جذبہ اُبھرتا ہے۔

لہٰذا سوچنا چاہئے کہ اس طرح خاموشی سے یہ اجلاس کیسے برخاست ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ فیصلے کے عادلانہ اور مدبرانہ ہونے کی بنا پر اور ثالثوں کی دیانت، تقویٰ، احساس ذمہ داری اور دوربینی کا صحیح ادراک لے کر۔ کیونکہ ثالثوں کے اس فیصلے کے نتیجے میں حقیقتاً فریقین کے مابین جنگ بند ہو گئی۔ اور امت میں عام امن کی فضا کو فروغ ہوا۔

چونکہ ثالثوں کے فیصلے میں نمایاں کردار سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کا تھا، جیسا کہ دارقطنیؒ کی مذکورہ بالا روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس وقت کی امت میں اُن کی عظمت و محبت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی، اور سب نے عیاناً دیکھ لیا کہ یہ شخصؓ جس نے کشتیِ ملت کو گردابِ بلا سے نکالا ہے۔

سبائیہ کے زیرِ اثر بعد کے لوگوں نے انھیں احمق وابلہ اور سادہ لوح کہا ہے، مگر اُن کے عہد میں اور اس کے بھی کچھ بعد تک انھیں سب سے زیادہ عقلمند اور مخلص ترین افرادِ ملت میں

باور کیا جاتا تھا۔ جس کی کوششیں بارور ہوئیں اور سعی مشکور مسعودی جیسے لوگوں نے یہ فضا پیدا کی ہے کہ سیدنا ابو موسیٰؓ جب اپنی "کم عقلی" کی وجہ سے سیدنا عمروؓ بن العاص کی "چالاکی" کے سبب "مات" کھا گئے، تو ان پر ایسی انفعالی کیفیت طاری ہوئی کہ کوفہ واپس جانے کی بجائے مکہ چلے گئے، اور کہا "میں علیؓ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا"۔ اسے کہتے ہیں ایک جھوٹ کے لئے دس جھوٹ بولنا۔ بھلا سیدنا ابو موسیٰؓ کو منہ چھپانے کی کیا بات تھی، اُن کا تو سر بلند تھا اور قیامت تک رہے گا۔ اسلام کی جب صحیح تاریخ مرتب ہوگی، تو سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام نامی اور اسم گرامی سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ وہ اُمت کی کشتی کے کھیون ہار ہیں۔

شاعر ذو الرمہؒ نے سیدنا بلال بن برید بن ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں کہتے ہیں: [العواصم من القواصم: ص ۱۷۶، تعلیقہ ۱]۔

أَبُوكَ تَلَافَى الدِّينَ وَالنَّاسَ بَعْدَمَا ؛ تَشَاءُوا وَبَيْتُ الدِّينِ مُنْقَطِعُ الْكُسْرِ

وہ آپ ہی کے تو باپ تھے جنھوں نے دین اور اہل دین کی اس وقت شیرازہ بندی کی جب لوگوں میں پراگندگی تھی، اور قصر دین منہدم ہوا چاہتا تھا۔

فَشَدَّ إِصَارَ الدِّينِ أَيَّامَ أَذْرُحٍ ، ؛ وَرَدَّ حُرُوبًا قَدْ لَقِحْنَ إِلَى عَقْرِ

انھوں نے اَذرُح کے دنوں میں خیمہ دین کی طنابیں کس دیں، اور اُن جنگوں کو روک دیا جو اسلام کی نسل منقطع کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

واقعی حالات کا صحیح طور پر جائزہ لینے والا یہ کہہ اٹھے گا کہ یہ کتابیں جو بدقسمتی سے تاریخ کی کہلاتی ہیں، اور جو آلِ بُوَیہ کے زیر اثر لکھی گئیں، اگر سب کی سب سوخت کر دی جائیں تو امت کو اتنا نقصان نہیں پہنچے گا جتنا فائدہ ہوگا۔ خدا مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ سبائیہ کی ہمہ گیر تحریک کو سمجھیں جو دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لئے جاری کی گئی، اور جس کی روز افزوں سمیّت نے تنِ ملّت کو نیم جاں بنا دیا ہے۔

صحیح ہے کہ ثالثوں نے جس عام اجتماع میں زیر بحث مسئلے کے تصفیہ کا فیصلہ کیا تھا وہ اجتماع نہ ہوسکا۔ اس سے پہلے ہی حالات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا، لیکن نتیجہ بہرحال وہی نکلا جو جمہور صحابۂ کرام چاہتے تھے، کہ امت ایک جھنڈے کے نیچے آجائے اور مفسد عناصر کی سرکوبی ہو۔ اگر دونوں ثالث امن کی یہ فضا قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوتے تو یہ مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو ہوا۔

ہوا کا رُخ ۔ بعض اہم واقعات

مصر مصر کا قضیہ اوپر بیان ہوچکا، کہ کس طرح سبائیہ کی شرارت سے وہاں ثالثی نامہ کی بے حرمتی ہوئی، اور اہل خربتا کے خلاف محمد بن ابی بکرؓ اور کنانہ بن بِشر نے ایک مستقل مہم چلا رکھی تھی۔ فضا میں سوائے اس ایک اختلال کے اور کوئی تکدر نہ تھا۔ ثالثوں کا فیصلہ آچکنے کے بعد بھی جب یہ تخریبی کارروائی بند نہ ہوئی تو اہلِ خربتا کی فریاد پر سیدنا معاویہؓ نے سیدنا عمروؓ کی سرکردگی میں فوج بھیج کر یہ قصّہ پاک کر دیا، اور پورے مصر میں بہت جلد امن و عافیت کا دور دورہ ہوگیا۔

سیدنا معاویہؓ کی یہ امن کوشی تھی اور نہایت تقویٰ کہ آپ نے مصر کے معاملہ کو آگے نہیں بڑھایا۔ ورنہ ثالثی نامہ کی بے حرمتی کے سبب آپ عراق کے خلاف اعلانِ جنگ کرسکتے تھے لیکن صورتِ حال آپ کو معلوم تھی کہ یہ کارروائی حضرت امیر المؤمنینؓ کی طرف سے نہیں آپ دیکھ رہے تھے کہ بارگاہِ مرتضوی سے کسی قسم کی کمک مصر نہیں جارہی ہے، اس لئے آپنے بھی صرف مقامی مسئلہ کی حیثیت دی، اور سیدنا علیؓ پر عہد شکنی کا الزام رکھ کر جنگ کی آگ نہیں بھڑکائی۔

اشتر نخعی جو اپنے آپ کو حضرت امیر المؤمنینؓ کا فرستادہ بتاتا تھا، وہ بغیر فوج کے... جارہا تھا، اس کے پاس تقرر کی کوئی سرکاری دستاویز بھی نہیں تھی۔ جو فرمان سیدنا علیؓ کا بتایا جاتا ہے، وہ بعد کی اختراع ہے اور قطعاً وضعی، جیسا کہ ہم بیان کرچکے۔ اور جو دوسرے اہل فکر کے نزدیک بھی جعلی ہے۔ چنانچہ خضری نے بھی کہا ہے" والظاہر انّ ہٰذا العہد قد کتب بعد ذٰلک بازمان (ظاہر ہے کہ یہ پروانۂ تقرری بہت طویل عرصہ کے بعد کسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے)" [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۷۷]

یہی وجہ ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے مصر میں امن قائم کرنے کے علاوہ اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جسے سیدنا علیؓ کے خلاف فوجی کارروائی سے تعبیر کیا جاسکے۔ ورنہ ان کا حق تھا اور مؤرخ انھیں حق بجانب سمجھتا کہ وہ اہلِ خربتا کے خلاف فوجی اقدامات کو حضرت امیر المؤمنینؓ کے فرمان کے مطابق سمجھ کر متارکۂ جنگ کے فیصلہ کی بے حرمتی قرار دیتے اور اعلانِ جنگ کردیتے۔

امیرالمؤمنین علی صلوات اللہ علیہ کی یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ جو حضرات بیعت سے محترز ہو کر خاموش بیٹھ گئے تھے اُن کے خلاف جنگ کی جائے۔ اگر آپ کی یہ رائے ہوتی تو ایسی جنگوں کا سلسلہ خود مدینۂ طیّبہ سے شروع ہوتا اور پھر قریہ بہ قریہ لڑائی کی جاتی، کیونکہ صحابۂ کرام اور امّت کی اکثریت بیعتِ خلافت سے محترز تھی۔

اس لئے ہمارا یقین ہے کہ حضرت محمد بن ابی بکرؓ کو اہل خربتی سے جنگ کرنے کا حکم ممکن ہے محض ابتدائے صفین کے موقع پر بھیجا گیا ہو، لیکن تواتر کے ساتھ جنگ کے احکام حضرت امیرالمؤمنینؓ کی طرف سے ہرگز نہیں گئے، اور نہ ثالثی نامہ کے بعد ایسے احکام آپ کی طرف سے جا سکتے تھے۔ لوگوں نے جن فرامین کا بھیجا جانا بیان کیا ہے، اور مسعودی وغیرہ نے ان کے مضامین نقل کئے ہیں وہ سب وضعی ہیں۔ اشتر نخعی بھی آپ کے حکم سے نہیں گیا تھا، بلکہ بطور خود جا رہا تھا۔ سیدنا علیؓ اگر اسے بھیجتے تو فوج دے کر بھیجتے، کیونکہ محمد بن ابی بکرؓ کی پسپائیوں کا اور مقامی امداد سے محرومی کا یہی تقاضہ تھا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کے نام سے خط گئے ہوں لیکن وہ سب ایسے ہی تھے جیسے اس سے پہلے حضرت امیرالمؤمنین عثمانؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا طلحہؓ اور حضرت امّ المؤمنین عائشہؓ کے نام سے اُشتر اور حُکیم بن جبلہ نے ابتدائی ہنگاموں میں بھیجے تھے، اور جن کی وجہ سے تمام فساد بپا ہوا۔ جعلی خط بھیجنا سبائیہ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ گویا محمد بن ابی بکرؓ جس طرح حضرت امیرالمؤمنین عثمانؓ کی طرف سے عاملِ مصر کے نام ایک جعلی خط سے متاثر ہو کر آپ کے خلاف ہو گئے تھے، ایسے ہی حضرت امیرالمؤمنین علیؓ کی طرف سے جعلی فرمان وصول ہونے پر دھوکہ کھا گئے۔ عجیب بات ہے کہ جن ہستیوں کا نام سبائیہ نے اچھالا ہے وہی سب سے زیادہ اس ٹولی کی فتنہ پردازی کا شکار ہوئے۔ حضرت امّ المؤمنین عائشہؓ کو حضرت محمد بن ابی بکرؓ کی شہادت پر سخت صدمہ ہوا، اور آپ نے ان کی طرف سے صدقہ دیا اور خیرات کی۔ ایسا ہی صدمہ حضرت امیرالمؤمنین علیؓ کو بھی ہوا تھا۔

نہروان

اِدھر ثالثوں کے فیصلہ سُنانے کا وقت آ رہا تھا، اور اُدھر عراق میں ایک شوریدہ پشت گروہ خوارج کا پیدا ہو گیا۔ یہ سبائیوں کا ایک طبقہ تھا، اور مشہور سبائی سرغنہ ابن الکواء اس گروہ کا نمایاں فرد تھا۔ ان لوگوں نے اپنے ایک سرگرم کارکن عبداللہ بن وہب کو "امیرالمؤمنین" بنا لیا۔ کیونکہ اس وقت تک جنھیں یہ امیرالمؤمنین کہتے تھے، اور ان کی خلافت کے لئے شمشیر بکف پھرتے تھے اس امام برحق پر اب انھوں نے کفر کا "فتویٰ" صادر کر رکھا تھا،

اور آپ سے لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ بلکہ تمام مسلمان ان کے نزدیک واجب القتل قرار پائے۔ سیدنا علیؓ نے انھیں راہِ راست پر لانا چاہا مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ یہ ہنگامہ محض کوفی سبائیوں ہی کا نہ تھا، بصرہ وغیرہ سے بھی لوگ آآ کر اُن کے شریک ہو گئے تھے۔ کئی آدمیوں کو انھوں نے قتل کر ڈالا جن میں سیدنا عبداللہ بن خباب، ان کی زوجۂ محترمہ اور رفقاء تھے رضی اللہ عنہم۔ ان کا قصور بس اتنا تھا کہ انھوں نے سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ دونوں کو خدا کا راستباز بندہ، اور اسلام کے عظیم فرزند بتایا تھا۔ سیدنا ابن عباسؓ کے سمجھانے سے اُن کے بہت سے آدمی تائب ہو گئے تھے، مگر پھر بھی ان کا جتھا بہت مضبوط تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اِدھر ثالثوں کے فیصلہ کا اعلان ہوا، اور اُدھر حضرت امیر المؤمنینؓ کو ان خارجیوں سے الجھنا پڑا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی، اور چند کے سوا باقی خوارج جو میدان میں موجود تھے مارے گئے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ دراصل سیدنا علیؓ نے ثالثوں کے اس فیصلہ سے ناراض ہو کر (جو اُن لوگوں نے فرض کر رکھا ہے)، شام کے خلاف فوج کشی کرنی چاہی تھی، لیکن خوارج کا قضیہ پیش آجانے سے وہ مہم رُک گئی۔ اور اس کے بعد عراقیوں نے یہ بہانہ کیا کہ ہمارے ہتھیار کُند ہو گئے ہیں، کچھ دن آرام کر کے پوری تیاری کر لیں تو چلیں۔ لیکن تیاری کی بجائے یہ لوگ رفتہ رفتہ کھسک گئے، اور حضرت علیؓ کی زوردار تقریروں کے باوجود میدان میں جانے پر راضی نہ ہوئے۔ اس روایت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ثالثی کے متعلق اس روایت کی تصدیق ہو سکے کہ سیدنا عمروؓ نے "چالاکی" سے سیدنا معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ اور ایسی ہی تمام روایتیں یہ ثابت کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں کہ ثالثوں کی غداری سے حالتِ جنگ پیدا تو ہو گئی تھی، مگر اپنے آدمیوں کی سرکشی کی وجہ سے سیدنا علیؓ یہ جنگ جاری نہ رکھ سکے۔ حالانکہ بات وہی ہے کہ ثالثوں کا فیصلہ اتنا اطمینان بخش تھا کہ جنگ آزمائی کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ نہ سیدنا عمروؓ کی "چالاکی" تھی، نہ سیدنا ابو موسیٰؓ کی "ابلہی"، نہ سیدنا معاویہؓ کی خلافت کا اعلان ہوا تھا، نہ انھوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا، نہ سیدنا علیؓ نے فوج کشی کرنی چاہی تھی، اور نہ ان باتوں میں سے کسی بات کے ظہور پذیر ہونے کا کسی درجہ میں امکان تھا۔ بلکہ ہر طرح امن و امان کا دور دورہ تھا، اور سب مطمئن تھے کہ عام اجتماع تک رائے عامہ کو اپنے حق میں کر لیں گے۔

نہروان کی جنگ محض سبائیوں کی اس خو کا نتیجہ تھی کہ انھیں مسلمانوں کے ہاں امن ہونا کسی طرح گوارا نہیں۔ ایک نہ ایک قضیہ اٹھتا رہنا چاہیئے، اگرچہ خود اپنا ہی نقصان ہو۔ شاید ہی کسی باطل مقصد کے لئے اتنی قربانیاں کی گئی ہوں جتنی دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لئے سبائیہ نے کی ہیں۔

یہاں ہم پھر سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر ثالثوں کے فیصلہ سے دوبارہ اختلاف پیدا ہوگیا تھا، حالتِ جنگ واپس آگئی تھی، اور حضرت امیر المومنین علی صلوات اللہ علیہ کی بے دست وپائی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لڑنے کے لئے آپ کو سپاہی نہیں ملتے تھے، تو سیدنا معاویہؓ کے سامنے کیا رُکاوٹ تھی؟ انھیں اس اختلال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے تھا۔ کیسا اچھا موقع تھا کہ ایک ہی حملہ میں عراق پر قبضہ ہوجاتا۔ ایک حریف کے ہاں انتشار ہو، لڑنے کو فوج نہ ہو، اور دوسرے حریف کے پاس ایسی وفادار اور منظم افواج ہوں جو بڑی بڑی سلطنتوں سے اپنا لوہا منوا چکی ہوں، اور اسے یہ قدرت ہو کہ ایک ہی ہلّہ میں اپنا کام بنالے، تو اس نے یہ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا؟ خصوصاً جب بقول مؤرخوں کے اس کی خلافت کا اعلان ہوچکا تھا، اور وہ خود بھی ایک "دنیادار، باطل پرست، مکار اور منافق" شخص تھا۔ جسٹس امیر علی اب اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں جہاں وہ جج کی حیثیت سے فیصلے صادر نہیں فرمائیں گے، بلکہ ملزم ومجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انھیں یہ جواب دہی کرنی ہوگی کہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ جیسے مقبول بارگاہِ احدیت ورسالت کی جناب میں یہ گستاخانہ کلمات اپنی کتاب میں کیسے لکھے، اور وہ بھی اسے "روحِ اسلام" کا نام دے کر!

سیدنا معاویہؓ کی للّٰہیت اور حق کوشی کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے نہروان کے جھگڑے سے قطعاً فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ثالثوں نے متارکہ جنگ کی مدّت میں توسیع کردی تھی، اور فریقین اس کے پابند تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ اقدام نہ کریں۔ اور سیدنا معاویہؓ نے اس فیصلہ کا احترام کیا، اور ایسی کوئی حرکت نہ کی جو بے دین اور حریف حکمرانوں کا شعار ہے۔

حجاز و یمن

حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے زیرِ نگین علاقہ میں محض ایک خوارج ہی کا قضیہ نہیں تھا، اور بھی بڑے اہم حوادث ہوئے۔ مثلاً ایرانیوں کی بغاوت، جو ۳۹ھ میں ہوئی، اور جسے حضرت امیر المومنینؓ کے حکم سے امیر زیادؓ نے پوری قوت سے کچل دیا۔

البتہ عالمِ اسلام کے اس وقت کے نقشہ پر توجہ کی ضرورت ہے کہ ایک طرف وہ وسیع علاقہ ہے جس میں شام کے علاوہ باقی تمام عرب ہے، ایران ہے، اور جملہ ممالک محروسۂ اسلام ہیں، اور دوسری طرف صرف ۲ ملک ہیں ایک شام اور دوسرا مصر۔ ایک طرف ہزارہا آدمی ایسے ہیں جو خلافتِ مرتضوی کے زیرِ نگیں علاقوں میں رہتے ہیں، لیکن انھیں اس خلافت کی آئینی حیثیت تسلیم نہیں، اس لئے انھیں بیعت سے گریز ہے، اور علاقہ کے حاکمِ اعلیٰ کے تمام سیاسی اقدامات سے اختلاف۔ پھر وہ ہیں جو سیدنا علیؓ کے جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کے قتل پر دلیر تھے، جنھوں نے کوششیں کر کے جنگیں چھیڑی تھیں، لیکن جب جنگ بند ہو جانے کے امکانات قوی نظر آئے تو پھر اپنے اسی امام سے لڑنے کھڑے ہو گئے۔ کل تک جس امام کے مخالفوں کو کافر و بے دین کہتے تھے آج ان کے نزدیک ان کا وہی امام کافر و بے دین ہے بلکہ تمام وہ لوگ جو اس کے کفر میں شک کریں۔ امام کا جرم کیا ہے؟ یہی کہ اس نے ان "کافروں" کو اپنی ہی طرح کا مسلمان کیوں سمجھا، اور ان "بے دینوں" سے جنگ کیوں بند کی۔ قریہ بہ قریہ دلوں میں اختلاف ہے۔ اور اس سلسلہ کے ختم کرنے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں۔

خود مسعودی نے (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۱۴) سیدنا علیؓ ہی کی زبانی ان کی مملکت کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؓ نے ایک مرتبہ فرمایا:

وقد زعمت قریش ان ابن ابی طالب شجاع ولکن لاعلم لہ بالحروب۔ تربت ایدیھم، وھل فیھم اشدّ مراساً لھا منّی؟ لقد نھضت فیھا وما بلغت العشرین وھا انا ذا قد اربیت علی نیف وستین	قریش نے گمان کر رکھا ہے کہ ابو طالب کا فرزند بہادر تو ہے مگر فنونِ جنگ سے واقف نہیں۔ خاک پڑے اُن کے ہاتھوں پر! ان میں کوئی ہے جو مجھ سے زیادہ اس کا ماہر ہو؟ میں نے تو لڑنا اس وقت شروع کیا تھا جب میں بیس برس کا بھی نہ تھا

ولکن لارأی لمن لایطاع۔	لب میری مہارت ساٹھ برس سے زیادہ کی ہے۔ لیکن جس کی اطاعت نہ کی جائے اس کی رائے کی کوئی قیمت نہیں۔"

ممکن ہے حضرت امیر المؤمنین رضؓ نے یہ ارشاد فرمایا ہو کیونکہ واقعات کے مطابق ہے۔ جو بات آپ نے کرنی چاہی وہی نہ کرنے دی گئی۔ اور جو نہ کرنا چاہا اسی کے لئے ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ کرنا پڑے۔ یہ بات کچھ حضرت امیر المؤمنین علی رضؓ ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ اگر سیدنا معاویہ رضؓ اس ٹولی کے ہتھے چڑھ جاتے تو ان کا بھی یہی حشر ہوتا، بلکہ شاید حضرت فاروق اعظم رضؓ کا بھی۔ ہمیں عباسیوں کے دور میں ایسے خلفاء کے احوال ملتے ہیں جو اپنی قابلیت اور علوِ مرتبت میں ہر طرح واجب التنظیم ہیں، اور ان میں سے ہر شخص ذاتی طور پر یگانۂ روزگار معلوم ہوتا ہے، لیکن سبائیوں نے انھیں کہیں کا نہ رکھا خلافت کو ایک کھیل بنا دیا۔ اور خلفاء کی سیاسی زندگی مفلوج کر دی۔ کون ہے جو آل بویہ کے دور کی سیاہی میں نور کی کوئی کرن دیکھ سکے؟

ان حالات کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ سامنے آیا۔ امت کا سوادِ اعظم جو اختلال و افتراق و انتشار سے پراگندہ خاطر تھا، دیکھ رہا تھا کہ جس عزیمت کے ساتھ دین قائم کیا گیا، جن مقاصد کے تحت اقوامِ عالم سے جنگ مول لی گئی، اور جس بے جگری سے قربانیاں دی گئی ہیں وہ سب عزائم خواب و خیال ہو گئے۔ سبائیوں کی ایک نابکار چھوٹی سی ٹولی تھی، جس نے تمام عالمِ اسلام کو آماجگاہِ مصائب بنا رکھا تھا۔

امام کی کامیابی کا انحصار تدبّر اور فراست سے زیادہ اعوان و انصار پر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سا اولوالعزم رسول، جو قدم قدم پر معجزے دکھاتا تھا، اسے امتی ملے تھے اسرائیلی، اسی لئے ارضِ موعود میں داخلہ نصیب نہیں ہوا۔ اور ساری عمر پریشانیوں میں گذری، تا آنکہ پکار اٹھے:
رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (المائدہ: ۲۵) (پروردگارا سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر مجھے کچھ اختیار نہیں۔ لہٰذا ہمارے اور اس بے قید قوم کے درمیان جدائی ڈال دیجئے)
یہی حال حضرت علی رضؓ کا رہا۔ آپ بھی پکار اٹھے: اَللّٰھم سَئِمتُھم وَسَئِمُونی وَکَرِھتُھم وَکَرِھُونی، اللّٰھم ارحمنی منی و ارحنی منھم (خدایا یہ مجھ سے تنگ آگئے اور میں ان سے، انھیں مجھ سے نفرت ہے اور مجھے ان سے، خدایا انھیں مجھ سے نجات دے اور مجھے ان سے) (البدایۃ والنھایۃ: ۸، ۲۰)۔

حضرت امیر المؤمنین رضؓ کی خلافت کی مدت چار برس کے قریب رہی، لیکن ایک دن چین نصیب نہ ہوا۔ اگر سیدنا حسن رضؓ سا بیٹا، سیدنا ابن عباس رضؓ سا بھائی اور حضرت امیر زیاد رضؓ سا مددگار، اور

چند مخلص ساتھی نہ ہوتے تو شاید آپ کی خلافت چار مہینے بھی نہ رہتی۔ سبائی لوگ اور کسی مسلم حکومت کو پنپنے دیں؛ ناممکن ہے۔

غیر مبائعین

حضرت ابوبکر بن العربیؒ اور بعض بزرگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو صحابہ جنگ سے محترز تھے انھوں نے امیر المؤمنین علیؓ سے بیعت کر لی تھی۔ البتہ اپنے اجتہاد کے تحت جنگوں سے الگ رہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ صحابہ کرامؓ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب وہ بیعت کرلیں تو پھر اپنے امام کے اجتہاد سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ اجتہادی مسائل میں اگر امام کے اجتہاد کی عملاً مخالفت کی جائے تو پھر نظم قائم نہیں رکھ سکتا۔ بیعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ و رسول کی سنت کے مطابق امام کی اطاعت کی جائے۔ سوائے معصیتِ الٰہی کے اور کسی صورت میں امام کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ اَلْاِمَامُ جُنَّۃٌ ارشاد نبوی ہے۔ یعنی امام امت کی ڈھال ہوتا ہے۔ اگر اس ڈھال ہی پر گرز پڑنے لگیں تو حفاظت اور بچاؤ کی سبیل کیا رہے گی۔

مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں عموماً صحابہ کی رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے وہ خود بخود ٹھیک ہوجائیں گے۔ لیکن حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی عزیمت ظاہر کی، اور کتاب و سنّت سے اپنے موقف کی حقانیت پیش کی تو سب آپ کے ساتھ ہو گئے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے عرب لونڈیوں کے متعلق حکم دیا کہ انھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کیا جائے، اور جتنے عربی النسل غلام ہیں وہ سب آزاد کر دیئے جائیں، تو تمام صحابہ کرامؓ نے بے چون و چرا اس کی تعمیل کی، اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کی کس آیت اور نبیؐ کے کس ارشاد کے تحت یہ تحدید کی جارہی ہے۔ امیر المؤمنین عثمانؓ نے جب حج کے موقعہ پر نماز پوری پڑھی، اور اپنے لئے اس کی دلیل بھی بتادی، تو جن صحابہ کرام کے مذہب میں قصر ہی واجب تھا، انھوں نے بھی امام کے اتباع میں پوری نماز پڑھی، اگرچہ امام کی اقتدا میں نہ پڑھی ہو۔ سب کی رائے تھی کہ سبائیوں کے خلاف جہاد کیا جائے، لیکن حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ نے جب فرمادیا کہ جو شخص میری بیعت پر رہنا چاہتا ہے وہ ہتھیار ڈال دے اور گھر میں بیٹھ رہے، تو سب مجبور ہو گئے، ورنہ ان باغیوں کو مار بھگانا کیا بات تھی۔

اطاعتِ امیر کا جذبہ جس طرح صحابہ میں تھا وہ بعد کے لوگوں میں کیا ہوگا۔ انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اور معاشرتی تمام امور میں امام کے اجتہاد پر عمل کرنا ان کا شعار تھا، اگرچہ طالبانِ علم کو وہ اپنے مذہب اور اس کی حجت سے بھی باخبر رکھتے تھے۔ لیکن عمل امام ہی کے

اجتہاد پر ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن حضرات نے جنگوں سے احتراز کیا، انھوں نے بیعت نہیں کی تھی، اسی لئے وہ سیدنا معاویہؓ کو باغی بھی نہیں کہتے تھے۔ اور جنھوں نے بیعت کرلی تھی وہ بہرحال ان جنگوں میں شامل رہے۔

غیر مبائعین نے جہاں سیدنا معاویہؓ کو باغی نہیں سمجھا، اور ان سے جنگ کو واجب نہ جانا، وہاں انھوں نے سیدنا علیؓ کی خلافت بالفعل بھی تسلیم کی۔ یعنی رہتے تھے ان کے ملک میں مگر عمل کرتے تھے اپنے اجتہاد پر، اور ان جنگوں کو فتنہ کہتے تھے۔ اسی لئے ثالثوں نے مابہ النزاع مسئلہ کا فیصلہ ان غیر مبائعین کے سپرد کردیا تھا، کیونکہ وہ ہر اعتبار سے غیر جانبدار تھے، اور ان کا فیصلہ بے لاگ ہوتا۔ اس لئے یہ تصور درست نہیں کہ یہ حضرات سیدنا علیؓ سے خلافت کی بیعت کرچکے تھے۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کا حضرت علیؓ سے بیعت کرنا کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں۔ لیکن بعد کے خلفاء سے ان کی بیعت کا تذکرہ صحاح میں موجود ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ صحابہ کرام کا بیعت میں تأمل کرنا، یا جمل و صفین میں کسی طرف سے حصہ لینے سے گریز کرنا متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ منجملہ ازاں ملاحظہ ہو [صحیح بخاری: کتاب الفتن، ج ۴، طبع مصر]:

عن شقیق بن سلمۃ (یعنی ابو وائلؒ) قال کنتُ جالساً مع ابی مسعود و ابی موسیٰ و عمّار فقال ابو مسعود ما من اصحابک احدٌ الا لو شئتُ لقلت فیہ غیرَک۔ و ما رأیتُ منک شیئاً منذ صحبتَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَعیبَ عندی من استسراعک فی ھٰذا الامر، فقال عمّار یا ابا مسعود! ما رأیتُ منک ولا من صاحبک ھٰذا شیئاً منذ صحبتما النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَعیبَ عندی من ابطائکما فی ہٰذا الامر۔ فقال ابو مسعود و کان موسراً یا غلام ہات حُلّتین فاعطٰے احدہما ابا موسیٰ والاخریٰ عمّاراً فقال روحا فیہ الی الجمعۃ۔	حضرت شقیقؒ بن سلمہؒ (ابو وائل تابعی) فرماتے ہیں میں ابو مسعودؓ، ابو موسیٰؓ اور عمارؓ کے پاس بیٹھا تھا حضرت ابو مسعودؓ نے (حضرت عمارؓ سے) فرمایا۔ "آپکے ساتھیوں میں کوئی ایسا نہیں جس کے متعلق میں کچھ کہنا چاہوں اور نہ کہہ سکوں سوائے آپکے۔ لیکن جب سے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا اس وقت سے میں نے آج تک آپکے اس معاملہ میں جلدی کرنے سے زیادہ کوئی معیوب بات نہیں دیکھی۔ حضرت عمارؓ نے فرمایا "آپ اور آپ کے یہ ساتھی جس دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، میں نے آپ کی کوئی بات اتنی معیوب نہیں دیکھی جتنا اس معاملہ سے

آپ کا گریز ہے۔

اس پر حضرت ابو مسعودؓ جو بہت سخاوت پسند تھے بولے "لڑکے! دو حُلّے لے آؤ۔ ان میں سے ایک حُلّہ آپ نے ابو موسیٰؓ کو دیا اور دوسرا حضرت عمارؓ کو، اور فرمایا یہ پہن کر جمعہ کی نماز میں شرکت فرمائیے"

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس حُسن کے ساتھ اپنے اختلافی مسائل میں بات کیا کرتے تھے۔ یہی واقعہ اگر مسعودی بیان کرتا تو معلوم نہیں کیسے کیسے فقرے ایک دوسرے کی زبان سے چُست کراتا، اور ممکن ہے دست بدست جنگ اور سبّ وشتم بھی دکھا دیتا۔

اس حدیث سے اُن تمام امور کی بخوبی تردید ہو گئی جو سبائیوں نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی بابت مشہور کر رکھی ہیں کہ انھوں نے سیدنا عثمانؓ کے خلاف یہ کہا اور یہ کیا۔ ہمارے اکابر کو جو صحابۂ کرام کی طرف سے صفائی میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں، اور لاطائل توجیہات کی ضرورت پڑتی ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ اُن کے سامنے مؤرخوں کی مفتریات ہوتی ہیں۔ صحابہ کے احوالِ صحاح سے مرتّب کئے جائیں تو کوئی بھی اُلجھن نہ رہے۔

اب یہ حضرات جو جنگوں سے محترز تھے، اور سیدنا علیؓ ہی کے علاقوں میں رہتے تھے، ملک کے احوال پر کُڑھ رہے تھے۔ تحکیم کے نتیجہ میں انھیں توقع تھی کہ حالات رُو باصلاح ہو جائیں گے، اور پُرامن فضا میں معاملات کا تصفیہ ہو سکے گا۔ لیکن سبائیوں نے جو اندرونی اختلال پیدا کر رکھا تھا اس نے یہ خیال بھی ناپائیدار کر دیا۔

بے شک فریقین کے مابین جنگ بند تھی، لیکن حضرت امیر المؤمنین علیؓ کے ملک کے اندرونی احوال پریشان کن تھے۔ امت اپنی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ دوسری طرف کیسا امن وامان ہے، یکجہتی ہے، خوشحالی ہے، اور کس طرح اختلال کا خاتمہ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ کوئی شخص نہیں جو امیر کی رائے سے منحرف ہو، اور امیر بھی وہ ہے جو تمام صفاتِ عالیہ سے متصف ہونے کے علاوہ عظمت وشرف کی اس بلندی پر ہے کہ حریف کی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ پوری استقامت کے ساتھ عہد کو استوار رکھنے پر کمربستہ ہے۔ اس لئے قدرتاً لوگوں کے قلوب سیدنا معاویہؓ کی طرف مائل ہو گئے۔ اور انھوں نے سوچا کہ عام اجتماع تو معلوم نہیں کب ہو، اور ہو بھی تو فیصلہ کیا کرے، اس لئے اس روزافزوں اختلال کا کوئی فوری مداوا ہی ہونا چاہئے۔

ان کے سامنے ایک شخص موجود تھا جسے حکومت کی صلاحیت ورثہ میں ملی تھی، جو بیس برس

سے عملاً دکھا رہا تھا، کہ وہ ایک مثالی حکمران ہے، اور اسے اختلال و بدنظمی رفع کرنے کی ایسی مہارت ہے کہ اس نے چند گھنٹوں میں مصر کو دارالامان بنا دیا، لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اگر زمام کار اسی شخص کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ کشتیِ ملّت کو اس گرداب سے صحیح وسلامت نکال لے جائے گا۔ چنانچہ مختلف علاقوں کے وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور درخواست کی کہ مصر کی طرح ہمارے علاقوں کا انتظام بھی آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

چونکہ ثالثوں کے فیصلہ کے تحت سب طرف کے لوگوں کو سب طرف جانے کی مکمل آزادی تھی، اور فریقین کو اس کا کامل اختیار تھا کہ رائے عامہ اپنے حق میں استوار کریں، اس لئے سیدنا معاویہؓ نے ان وفود کی خواہش کی پذیرائی کی۔ اور اپنے چند افسروں کو مختلف اطراف میں روانہ کیا کہ اپنی آنکھوں سے ان علاقوں کی کیفیت دیکھیں اور معلوم کریں کہ ان نمائندوں کی خواہش کی پشت پر رائے عامہ ہے یا نہیں۔

چنانچہ حضرت بُسرؓ بن ارطاۃ کو یمن و حجاز کی طرف، حضرت ضحاک بن قیسؓ کو اور بعض کے نزدیک عبداللہؓ الحضرمی کو بصرہ کی طرف، حضرت عبداللہؓ بن مَسْعَدہ کو تیماء کی طرف، اور حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ انصاری کو عین التمر کی طرف روانہ کیا۔ تھوڑی تھوڑی فوج حفاظت کے لئے ساتھ کردی۔ کسی کے پاس تین ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ حضرت سفیانؓ بن عوفؓ کو انبار[ل] و مدائن بھیجا، اور چونکہ یہ علاقے عرب سے باہر تھے اس لئے ان کے ساتھ چھ ہزار فوج کردی۔

ظاہر ہے کہ یہ فوجیں لڑنے کے لئے نہیں گئی تھیں، اور نہ اتنے بڑے رقبہ کے فتح کرنے کے لئے اس طرح فوجیں حرکت میں لائی جاتی ہیں، اور نہ اتنی تھوڑی تھوڑی فوجوں سے بیک وقت اتنے بہت سے محاذ کھولے جاسکتے ہیں۔ ان کا مقصد محض یہ دیکھنا تھا کہ اہلِ ملک ان کی پذیرائی کس طرح کرتے ہیں۔ اور ان کے نمائندوں نے اپنے علاقوں کی صحیح خواہش پیش کی ہے یا نہیں۔ ان "فوجوں" کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی، اور ان کے ایک ہی دورہ میں یہ سب علاقے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمنوا بن گئے۔ مگر اس اقدام سے عالم اسلام کے سیاسی اور معاشرتی امور میں کوئی اختلال رونما نہیں ہوا۔

ل نقشہ کے مطابق دمشق سے انبار اور وہاں سے مدائن جانے کا راستہ سیدھا ہے۔ کوفہ کافی دور جنوب میں رہ جاتا ہے۔ اگر راویوں کی یہ روایتیں صحیح ہیں تو ممکن ہے اس زمانہ میں قافلوں کی راہ ایسی ہو کہ دمشق سے جنوب مشرق کی سمت کوفہ کے قریب سے ہو کر پھر شمال کی طرف مڑکر انبار پہنچے۔ فی زمانہ کوفہ کے مقابلہ میں انبار کا راستہ دمشق سے زیادہ سیدھا اور قریب کا معلوم ہوتا ہے۔ ع

لوگوں نے ان "فوجوں" کی روانگی کو جنگی مہمیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا طیاروں، ٹینکوں اور توپوں کے پرے کے پرے ایک لشکرِ جرار کے جلو میں آگ اگلتے اور بستیاں پھونکتے چلے جا رہے تھے، اور نہتی رعایا تھی کہ ہر جگہ سرِ اطاعت خم کرنے پر مجبور تھی۔

ان مؤرخوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کشی اور غارتگری کی فضا تو اپنی دانست میں قائم کر دی، مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عرب کی زندگی قبائلی تھی، جہاں معاملات اجتماعی طریقہ پر طے ہوتے ہیں۔ ہر بالغ شخص مسلّح اور ماہر حرب و ضرب تھا۔ اگر یہ فوجیں لڑنے گئی تھیں اور اہلِ ملک نے ان کی پیش قدمی کو دشمن کا جارحانہ حملہ سمجھا تھا، تو کہیں تو ان کا مقابلہ ہوتا، کبھی تو انھیں کمک کی ضرورت پڑتی، اور کسی جگہ تو گھٹنے ٹیک کر لڑنا ہوتا۔ لیکن یہ فوجیں تو ایسے گئیں جیسے کوئی سیر کرنے جائے۔ کہیں سے اس کا عملی ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ فلاں جگہ گھمسان کا رن پڑا۔؟

کبھی کہہ دیتے ہیں کہ سیدنا نعمان بن بشیرؓ جب عین التمر پہنچے تو وہاں کے والی مالک بن کعبؓ نے حضرت امیر المؤمنین علیؓ سے امداد طلب کی، لیکن وہاں سے وہ ایک آدمی بھی نہ بھیج سکے۔ خضری نے [ج ۲، ص ۷۸] سیدنا علیؓ کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے ان لوگوں سے مایوس ہو کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے حرکت نہ کی۔ یہ خطبہ بھی بعد کے کسی دماغ کی اختراع ہے، کیونکہ اس کی زبان میں آلِ نبوّت کی نورانیت کی جھلک نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت مالکؓ ایک علاقہ کے حاکم ہیں، اور ان کے پاس اتنے آدمی بھی نہیں کہ وہ تین ہزار "حملہ آوروں" کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے مدافعت کا پہلے سے کوئی انتظام نہ کیا، حالانکہ انھیں اختلال کا علم ہے، اور امداد اس وقت طلب کرتے ہیں جب "دشمن" سر پر آ پہنچا۔ ان مؤرخوں کی سمجھ میں سیدھی سی بات یہ نہیں آئی کہ جنگ نہیں ہوئی، اور چونکہ نہیں ہوئی اس لئے ایسی روایتیں وضع کرنے کی ضرورت پڑی، کیونکہ فوجوں کی نقل و حرکت اور باہمی آویزش کا اور کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔ سیدنا علیؓ کی حکومت کیا محض کوفہ ہی میں تھی، اور صرف وہیں کی فوج کے بَل بِر خلافت کر رہے تھے؟

کبھی کہہ دیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعدہؓ جب تیماء پہنچے تو ان کے مقابلہ کے لئے سیدنا علیؓ نے مُسیّبؓ کو روانہ کیا۔ وہاں سخت خونریز جنگ ہوئی، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسیّبؓ نے جو "حملہ آور" کو ختم کرنے گئے تھے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ سبحان اللہ! خود تیماء میں اتنے

آدمی نہ تھے جو مرکز سے فوج بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ اور یہ صاحب جو گئے تو انھوں نے فنِ حرب کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے علاقہ میں آئے ہوئے دشمن کو فرار کا موقع دیدیا۔ دشمن کے علاقہ میں لڑتے اور وہ فرار ہو جاتا تو ایک بات ہوتی۔ دشمن آچکا ہے، اس نے مورچہ بنالیا ہے، مرکز سے فوج آتی ہے، تو اس نے اپنا مورچہ ایسا کیوں نہیں بنایا کہ دشمن فرار نہ ہو سکے۔ پھر سوال ہے کہ مرکز سے تیماء کے لئے فوج مل گئی۔ لیکن عین التمر کے لئے کیوں نہ مل سکی، جو حضرت امیر المومنینؓ کو وہ خطبہ دینا پڑا، جس کا حوالہ خضری کی کتاب محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ سے ہم ابھی دے چکے ہیں۔

حضرت سفیان بن عوفؓ کے متعلق یہ ہے کہ وہ چھ ہزار فوج لے کر انبار و مدائن کی طرف گئے، وہاں سیدنا علیؓ کی فوج کو شکست دے کر مال و متاع لُوٹ لیا، اور خراج وغیرہ جمع کر کے کوفہ کے قریب سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ سیدنا علیؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ تعاقب کے لئے نکلے۔ مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ "دشمن" کی چھ ہزار فوج اپنے علاقہ میں قتل و غارت کر کے مال و متاع لُوٹ لے، اور رعایا سے خراج بھی وصول کر کے چل دے، اس وقت تو امیر المومنینؓ کو خبر نہ ہو، لیکن جب وہ واپس اپنے ملک کو جا رہی ہو تو تعاقب کے لئے نکلیں، مگر دشمن ہاتھ نہ آئے۔ گویا چھ ہزار فوج کا انبار آنا جانا کوئی پندرہ بیس منٹ یا گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی بات تھی کہ دشمن کا داؤں چل گیا، اور اکثر عالمِ اسلام کا حاکمِ اعلیٰ چُوک گیا۔

یہ سب خرافات محض اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ کسی طرح امت کے دل میں یہ خیال جاگزین کیا جا سکے کہ ثالثوں کے فیصلہ کے بعد حالتِ جنگ قائم ہو گئی تھی۔ تعجب ان "مؤرخوں" پر ہوتا ہے جو ایک طرف بخاری و مسلم کو بھی قابلِ استناد نہیں سمجھتے، اور کہتے ہیں ہمارے لئے قرآن کافی ہے ہم روایات میں پھنسنا نہیں چاہتے مگر دوسری طرف مسعودی اور طبری کی روایتیں بغیر تنقید کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ سب مردود روایتیں مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کی ہیں جو انھوں نے خضری سے نقل کیں، اور تاریخ الامت میں درج فرمائیں۔

اب اس حالتِ جنگ کی نوعیت مسعودی سے سنئے (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۲۱)

ولم یکن بین علیؓ و معاویۃ من الحرب الا ما وصفنا بصفین وکان معاویۃ فی بقیۃ ایام علیؓ یبعث سرایا تغیر وکذلک علیؓ کان یبعث من یمنع سرایا معاویۃ	علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی سوائے ایک صفین کے جس کا حال ہم بیان کر چکے۔ البتہ علیؓ کے باقی دنوں میں معاویہؓ اپنی فوجیں غارتگری کے لئے بھیجا کرتے تھے اور اسی طرح علیؓ

من اذیۃ الناس۔	بھی فوجیں بھیج دیا کرتے تھے، تاکہ معاویہؓ کے لشکریوں کے ہاتھوں لوگوں کو اذیت نہ پہنچے۔

بُسرؓ بن ارطاۃ

اس تمام "غارتگری" میں سیدنا بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی شقاوت کی داستانیں بڑے اہتمام سے بیان کی جاتی ہیں۔ اصل میں ان کا قصور بس اتنا تھا کہ وہ سیدنا معاویہؓ کے طرفداروں میں تھے، اور حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ سے بغایت عقیدت رکھتے تھے۔ اسی لئے ان میں دنیا جہان کے عیب جمع ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اسلام و ایمان کا بھی شائبہ نہ رہا۔

حضرت بُسرؓ کو بھیجا گیا تھا اس لئے کہ اوّل مدینہ طیبہ حاضر ہوں، پھر مکہ معظمہ اور وہاں سے یمن ہوتے ہوئے مستقر کو لوٹ آئیں۔ ان راویوں کو جغرافیہ سے بحث نہیں کہ دمشق سے چلنے والا شخص حجاز و یمن میں غارتگری کے بعد کس اطمینان سے دمشق کو واپس ہو سکتا تھا۔ البتہ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ تین ہزار فوج چلتی ہے، اور چونکہ مسعودی اور ان تمام مؤرخوں کے نزدیک گویا دمشق سے لے کر مدینہ طیبہ تک، مدینہ سے لے کر مکہ معظمہ تک، مکہ سے صنعاء تک پھر صنعاء سے واپس دمشق تک سب چٹیل میدان ہے، کہیں نام کو کوئی بستی نہیں، اور اگر بستیاں ہیں تو ان میں کوئی مرد نہیں رہتا،

اس لئے یہ تین ہزار فوج خون کی ندیاں بہاتی، مدینہ طیبہ پہنچتی ہے۔ وہاں عامل مدینہ ہیں سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ (مروج الذہب: ج ۳، ص ۲۰، ۲۱)۔ آپ سیدنا بُسرؓ کی اطلاع پاتے ہی وہاں سے ہٹ جاتے ہیں، اور پھر سارے اہلِ مدینہ حضرت بُسرؓ کی ایک ہی دھمکی میں حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لیتے ہیں۔ یہ وہی ابو ایوبؓ ہیں جو ابھی جنگِ جمل میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے ہیں، اور ابتداء سے لے کر فتح مکہ تک جن کی شجاعت کے جھنڈے گڑے ہوتے ہیں، اور جو دس برس بعد فتح قسطنطنیہ کے جہاد میں وصیت کر جاتے ہیں کہ دشمن کی سرزمین میں جتنی دور میرا جنازہ لے جا سکو وہاں مجھے دفن کرنا، اس عزیمت اور جلادت کا شخص بُسرؓ کی تین ہزار فوج کے خوف سے کہیں روپوش ہو سکتا تھا؟ اور وہی اہلِ مدینہ جو سبائی فوج کے مدینہ پر تسلط کے باوجود سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کرتے، اور چار برس تک اس انکار پر جمے رہتے ہیں، ان پر بُسرؓ کی اتنی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ جیسے شامیوں کی نہیں کوئی جنوں کی فوج آ گئی ہو، اور سب کے سب حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لیتے ہیں۔ البتہ مسعودی نے یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ ان "بے دین" شامیوں نے اہل مدینہ کے کتنے گھر لوٹے، اور کے ہزار خواتین کی بے حرمتی کی۔ معلوم نہیں یہ چوک کیوں ہو گئی۔

بہر حال سیدنا بُسرؓ جب مدینہ کے بعد مکہ میں اپنی "فاتحانہ" شان کا سکہ بٹھا کر، یمن کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو سیدنا عبیداللہ بن عباسؓ پر اُن کی یلغار سے اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ ملک سے تو فرار ہوئے ہی تھے، بیوی بچوں کو بھی بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ ادھر بُسرؓ نے جو دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا، تو ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ سیدنا عبیداللہؓ کے دو صغیرالسن بچوں کو شہید کر دیا۔ ان کی حسین و جمیل والدہ مُنہ کھولے بال بکھرائے ان کا نوحہ کرتی پھرتی تھیں، اور کوئی مسلمان نہ تھا جس میں حرارت و غیرت کا جذبہ بیدار ہو۔ بُسرؓ کی "سیاہ کاری" کا مکمل نقشہ یہ ہے (مروج الذہب: ج ۳، ص ۳۱):-

وکان بُسر بن ارطاۃ العامری — عامر بن لوی بن غالب — قتل بالمدینۃ وبین المسجدین خلقاً کثیراً من خزاعۃ وغیرہم وکذلک بالجرف قتل بہا خلقاً کثیراً من رجال ہمدان وقتل بصنعاء خلقاً کثیراً من الابناء۔ ولم یبلغہ من احد انہ یمالئ علیاً او یہواہ الا قتلہ۔ ونما الیہ خبر حارثۃ بن قدامۃ السعدی فہرب وظفر حارثۃ ابن اخی بُسرؓ مع اربعین من اہل بیتہ فقتلہم۔

یہ بُسرؓ بن ارطاۃ عامری، یعنی عامر بن لوی بن غالب کی نسل کے، ایسے شخص تھے کہ انھوں نے مدینہ میں اور حرمین شریفین کی درمیانی بستیوں میں خزاعہ وغیرہ میں سے بہت سی مخلوق کو قتل کر دیا۔ اسی طرح جرف میں بہت سے ھمدانیوں کو قتل کیا، اور اسی طرح صنعاء میں بہت سے مقامی باشندوں کو قتل کیا۔ انھیں کوئی ایسا نہ ملا جو علیؓ کی طرف مائل ہو، یا اس کے دل میں ان کی محبت ہو، اور انھوں نے اسے قتل نہ کیا ہو۔ لیکن جب انھیں حارثہ بن قدامہؓ سعدی کی آمد کی اطلاع ملی تو فرار ہو گئے۔ ادھر حارثہؓ بن قدامہ کو بُسرؓ کے بھتیجے ہاتھ لگ گئے تو انھوں نے انھیں اور ان کے گھرانے کے چالیس آدمیوں کو قتل کر ڈالا"۔

یہ ہے مسعودی صاحب کے نزدیک پہلی صدی کے وسط میں، ان عربوں کا حال جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ یہ سب لوگ ان تین ہزار آدمیوں سے اتنے مرعوب تھے کہ گاجر مولی کی طرح اُن کے ہاتھوں کٹتے چلے گئے۔ اور خود یہ بُسرؓ اتنے بہادر تھے کہ حارثہؓ کے دو ہزار آدمیوں کی خبر سُن کر بھاگ گئے۔ یہ حال اس امت کے اسلاف کا بیان کیا جا رہا ہے جو آج بھی جبر کی حکومت کو برداشت نہیں کرتی، اور غیر مسلّح ہونے کے باوجود توپوں، ٹینکوں اور بمبار طیاروں کے مقابلہ پر ڈٹ جاتی ہے۔

یہ حضرت حارثہؓ بن قدامہ وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیؓ نے انھیں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ حضرت بُسرؓ کے مقابلہ پر بھیجا تھا۔ مگر یہ ایسے پھرتیلے تھے کہ ہمیشہ بُسرؓ کے نکل چکنے کے بعد پہنچتے تھے، اور بہادری کا اُن کی یہ عالم تھا کہ دو ہزار آدمیوں نے وہ شانِ سپہ گری دکھائی اور ایسا پینترہ چلے کہ اکتالیس آدمیوں کو گھیر کر مار دینے میں کامیاب ہو گئے۔

چونکہ یہ بیچارے مؤرخ اپنے دل کی بیماری سے مجبور ہیں، اور انھیں گوارا نہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کردار کی رفعت کا کوئی نقش اخلاف کے دل میں باقی رہے، یا اُن کے متعلق یہ تصور کیا جاسکے کہ وہ امن سے رہنا بھی جانتے تھے، حرّیت کے نام سے آشنا تھے، اور تعلیماتِ اسلامیہ کی برکات کے حامل تھے، اس لئے ان میں بدامنی، شقاوت، اور بزدلی دکھانے کے لئے اس قسم کی روایتیں وضع کی گئی ہیں، یا دوسروں سے نقل کر کے اپنی حسرتیں نکالی گئی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکے کہ سیدنا ضحاک بن قیسؓ کی آمد کی خبر سُن کر وہ بھی اپنے بھائی کی طرح بصرہ سے فرار ہو گئے تھے، مگر اتنا ضرور کہہ دیا، کہ بیت المال کا روپیہ لے کر مکہ جا بیٹھے۔ تعجب خضری جیسے شخص پر ہے، جنھوں نے اگرچہ صراحت کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کی خیانت تو نہیں دکھائی، امیرالمؤمنین حضرت علیؓ کے متعلق یہ حکم لگا دیا کہ آپ نے حضرت ابن عباسؓ پر خیانت کا الزام لگایا تھا، جس سے برافروختہ ہو کر وہ مکہ چلے گئے (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۷۹)۔ اب یہ پتہ نہیں کہ حضرت ابن عباسؓ جو مکہ پہنچے تو بُسرؓ کے وہاں پہنچنے سے پہلے گئے تھے یا بعد میں۔ اور اگر پہلے گئے تھے تو بُسرؓ کی دھمکی میں آکر حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لی تھی یا نہیں۔ اور اگر بعد میں گئے تھے تو حضرت معاویہؓ کے نمائندوں نے ان کا استقبال کس طرح کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کی بیعت کے بغیر تو مکہ میں رہ نہیں سکتے تھے، تو پھر مکہ جانے کی بجائے سیدھے شام کیوں نہ چلے گئے جو زیادہ آؤ بھگت ہوتی، اور دنیا دیکھتی کہ حضرت معاویہؓ نے حریف کا ایک اور بھائی بھی توڑ لیا۔

افسوس ان اہلِ قلم پر ہے جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور امّت کی خیرسگالی میں وعظ و نصیحت کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ اس پر کیوں اتنے دلیر ہیں کہ صحابۂ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار کے متعلق جو مُنہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں، اور جو قلم سے نکلتا ہے گھسیٹ ڈالتے ہیں۔ یہی شان جو خضری صاحب کی ہے اسی وتیرہ پر مصر کے طٰہٰ حسین بھی ہیں جنھوں نے سیدنا ابن عباسؓ کے متعلق یہ خرافات نقل کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ بیت المال کا یہ روپیہ جو انھوں نے خرد برد کیا تھا، اس سے ناچنے والی

لڑکیاں خریدیں، اور مکہ میں بیٹھ کر دادِ عیش دینے لگے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت تک بصرہ ہی کے والی رہے۔ [ملاحظہ ہو الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ زیر عنوان عبد اللہ بن عباس] آپ اس عہد نامہ کے گواہوں میں ہیں جو سیدنا حسنؓ اور سیدنا معاویہؓ کے درمیان ہوا تھا۔

غرض یہ ہے کہ ان ملحدوں اور زندیقوں نے صحابۂ کرام کے متعلق حماقت، چالاکی، عہد شکنی، دروغ حلفی، سفاکی، فتنہ انگیزی اور بزدلی کی یہ جتنی داستانیں وضع کی ہیں ان میں خود اپنے خُبثِ نفس اور سرشتِ بد کی نمائش کی ہے، تاکہ کسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ بہترین امت کو بدترین جماعت ثابت کر کے دعوتِ محمدیہ کی حقانیت کا یقین دلوں سے اٹھا سکیں۔ ورنہ یہ بزرگوار جو آخری نبی کی برپا کردہ بہترین امت کے افراد تھے وہ واقعی ایسے تھے جیسے اللہ نے اُن کے متعلق فرمایا ہے كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے)

حضرت بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سیدنا عبید اللہؓ کے دو معصوم بچوں کا شہید ہونا محض افسانہ ہے، اور ایسا ہی وضعی اور خیالی، جیسے حضرت مسلم بن عقیلؓ کے دو فرزندوں کا کوفہ میں حسرتناک طریقہ پر شہید کیا جانا، یا میدانِ کربلا میں سیدنا حسینؓ کے ایک شیرخوار فرزند کے گلے میں خیالی تیر کا پیوست ہونا، یا عین میدان کارزار میں حضرت قاسمؓ کی شادی، اور ان کی دُلہن کے ہاتھوں میں مہندی کا لگایا جانا۔

اگر بالفرض حضرت بُسرؓ سے اس شقاوت کا صدور ہوا تھا، تو کیا سیدنا معاویہؓ اسے پی جاتے یا سیدنا حسنؓ معاہدۂ صلح کے وقت ان معصوم بھائیوں کو بھول جاتے، اور بُسرؓ سے قصاص کا مطالبہ نہ کرتے، یا سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ کو معاہدۂ صلح مرتب کرتے وقت بھتیجوں کی پیاری صورتیں یاد نہ آتیں، یا خود سیدنا عبید اللہ بن عباسؓ اس ظلمِ عظیم کے خلاف دادرسی کے لئے کوشاں نہ ہوتے۔ یہ کوئی سیاسی قتل نہیں تھا کہ خاموشی اختیار کر لی جاتی، اور نہ حدود الٰہی جاری کرنے میں سیدنا معاویہؓ کبھی مداہنت کو کام میں لاتے۔ سیدنا معاویہؓ نے سیدنا حسنؓ کے پاس سادہ کاغذ اپنی مہر کر کے بھیج دیا تھا کہ جو شرطیں چاہیں لکھ لیں، اور صحیح بخاری کی حدیث آگے آرہی ہے جس کے مطابق سیدنا معاویہؓ کے نمائندے سیدنا حسنؓ کی ہر بات پر کہتے تھے "ہم اس کے ذمہ دار ہیں"۔ تو کیا یہ تعجب انگیز نہیں کہ نہ انھوں نے ان معصوم بچوں کے قصاص کا مطالبہ کیا،

اور نہ باپ اور چچا نے۔ سیدنا معاویہؓ کا ایک بُسرؓ کو قتل کر دینا اس صلح کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اور نہ اُن کے قتل سے کسی ادنیٰ ترین سیاسی اختلال کا خطرہ تھا۔ اللہ کے دشمنوں نے سیدنا معاویہؓ کو دین سے بے پروا تو کہا ہے، لیکن سیاست سے بے خبر کہنے کی جرأت تو کسی کو نہیں ہو سکی۔ اس قصاص کا مطالبہ اگر کیا جاتا تو ضرور پورا ہوتا۔ لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بچوں کے قتل کا یہ افسانہ محض تخیل کی پرواز ہے۔ حضرت بُسرؓ کے متعلق ہم ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ انھوں نے احکامِ الٰہی اور شعارِ اسلامی کو پامال کر کے دو معصوم بچوں کا خون بلا وجہ اپنی گردن پر لیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ انھوں نے اس سفاکی کا مظاہرہ کیا جو مسعودی وغیرہ بیان کرتے ہیں، اور نہ اُن میں اس کی قدرت تھی، نہ انھیں علمِ غیب تھا کہ لوگوں کے دلوں میں سیدنا علیؓ کی چھپی ہوئی محبت معلوم کر کے انھیں قتل کر دیں۔ اور نہ اُن کے پاس کوئی جادو کی چھڑی تھی کہ اس کے ایک اشارہ پر ہر جگہ کے لوگ سیدنا علیؓ کا ساتھ چھوڑ کر سیدنا معاویہؓ کے ساتھ ہو جائیں، اور نہ اس عہد کے مسلمان ایسے بزدل، منتشر اور غیر مسلّح تھے کہ بُسرؓ بن ارطاۃ کے تین ہزار آدمی تو ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیں، اور سرزمینِ عرب کو مذبح بنا کر رکھ دیں لیکن خود ان کا ایک آدمی بھی کام نہ آئے۔

معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ کارروائیاں جارحانہ ہوئی ہوتیں، اور اُن کی "فوجوں" نے واقعی یہ قتل و غارت کیا ہوتا، تو تمام عالمِ اسلام میں اُن کے خلاف نفرت پھیل جاتی، ان کا موقف باطل ہو جاتا، ہر طرف سے اُن کے خلاف آوازیں بلند ہوتیں، اور سب طرف کے لوگ رغبتِ دلی کے ساتھ حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر اس ظلم و ستم اور امن سوزی کا بدلہ لیتے۔

اگر بالفرض سیدنا معاویہؓ کی ان فوجوں نے واقعی ہر جگہ کے لوگوں کو مغلوب کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا، تو ان مؤرخوں کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ جن علاقوں کو اس جبر و استبداد کے ساتھ وہ اپنے زیرِ نگین لائے تھے انھیں اپنے ہی تحت رکھنے کے لئے کیا اقدامات کئے، کتنے آدمیوں کو غیر مسلّح کیا، کس جگہ کونسا خونخوار اور جابر والی مقرر کیا، اور پھر ان والیوں کی حمایت کے لئے کہاں کہاں کتنی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ مستبد حکمرانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ آج کرنا پڑتا ہے اس سے ہزار گُنا زیادہ اس عہد کے مسلمانوں کے ساتھ کرنا پڑتا۔ پھر تاریخ اس بارے میں خاموش کیوں ہے؟

معلوم ہوا کہ یہ سب افسانے ہیں، اور مسعودی وغیرہ نے اپنے نامۂ اعمال سیاہ اور آخرت برباد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں لکھ کر امّتِ مسلمہ پر ظلمِ عظیم کیا ہے۔ افسوس ان سمجھدار لوگوں

پر ہے جو واقعات کا استقصاء کئے بغیر سلفِ صالحین پر طعن کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور اگرچہ مُنہ سے نہ کہیں لیکن تاریخ پر کتابیں لکھ کر عملاً یہ باور کرانے کے مجرم بنتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بدترین امت کو بہترین بتا کر محض شاعری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صِفّین کے بعد سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کے درمیان قطعاً کوئی جنگ نہیں ہوئی، صرف ایک مصر کا قضیہ تھا جس کی تفصیلات اوپر گذر چکیں۔ لیکن اس معاملہ کو نہ سیدنا معاویہؓ نے آگے بڑھایا، اور نہ سیدنا امیرالمؤمنین علیؓ نے۔ مصر جیسا ملک ہاتھ سے نکل جائے، محمد بن ابی بکرؓ جیسا بیٹا کام آئے اور سیدنا علی مرتضیٰؓ چپکے بیٹھے رہیں! آخر وقت میں دو ہزار فوج کا بھیجا جانا تو بیان کر دیا گیا، اور یہ بھی کہ حضرت ابن ابی بکرؓ کی شہادت کی خبر سن کر وہ فوج واپس بلالی گئی، لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا معاملہ خاموشی اختیار کرنے کا تھا یا جان لڑا دینے کا؟

سیّدنا ابن عبّاسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں اوپر مرقوم ہوا کہ سیدنا علیؓ کی شہادت تک آپ کا قیام بصرہ ہی میں رہا۔ اور آپ مکہ اس وقت گئے جب سیدنا حسنؓ اور سیدنا معاویہؓ کے مابین صلح ہوگئی تھی۔ مناسب ہے کہ یہاں اُس افسانہ کی تنقیح کر لی جائے جو آپ کے بصرہ چھوڑنے اور بیت المال پر ناجائز تصرف کرنے کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے۔

امام ابن حجر عسقلانیؒ نے الاصابہ میں بذیل عنوان عبداللہ بن العباس، اس کی تصریح کی ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیؓ کی شہادت تک سیدنا عبداللہؓ کا قیام برابر بصرہ ہی میں رہا، جیسا کہ مذکور ہوا۔ اب طبری کی ایک روایت ملاحظہ ہو (ج ۶ : ص ۸۲):-

ان ابن عباسؓ لم یبرح من البصرة حتی قُتِلَ علیؓ فشخص الی الحسن فشهد الصلح بینه وبین معاویة ثم رجع الی البصرة وثقله بها فحمله ومالاً قلیلاً۔	حضرت ابن عباسؓ برابر بصرہ ہی میں مقیم رہے تاآنکہ سیدنا علیؓ کو شہید کر دیا گیا، اس وقت آپ سیدنا حسنؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور اس صلح میں شرکت کی جو اُن کے اور حضرت معاویہؓ کے

مابین منعقد ہوئی تھی۔ پھر آپ بصرہ کو واپس ہوئے جہاں آپ کا مال و اسباب تھا۔ وہاں سے آپ نے اپنا سامان اور تھوڑا سا مال اٹھوالیا"

یعنی جب آپ بصرہ تشریف لے گئے ہیں تو اسباب کے علاوہ نقد روپیہ تھوڑا تھا۔ گویا مستند اور معتبر ماخذ کے مطابق اُس افسانہ کی کوئی اصل نہیں جو سبائیوں نے طرح طرح مشہور کیا ہے۔

سیدنا ابن عباسؓ نے سیدنا علیؓ کے زمانہ میں بصرہ نہیں چھوڑا تھا، بلکہ آپ کی نقلِ مکانی اس وقت کی ہے جب حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ کی خلافت پر اجماع ہو گیا تھا، اور حکومت بدل گئی تھی جس کے آپ اب عہدہ دار نہیں رہے تھے۔ ان احوال میں یہ ممکن نہ تھا کہ آپ اپنے حکم سے سرکاری خزانہ پر کچھ تصرف کر سکیں۔

اگر کہا جائے کہ عبوری دور تھا اور انھیں تغلب کا موقع مل گیا تب بھی بات نہیں بنتی۔ نئی حکومت کی طرف سے باز پرس لازماً ہوتی۔ آپ کا قیام مکہ ہی میں تو تھا، اور آپ حضرت معاویہؓ کی دسترس سے باہر نہیں ہو گئے تھے۔

اگر کہا جائے کہ حکومت کو اس تغلب کی اطلاع نہیں ہوئی تو سوال ہے کہ جب امیر المؤمنین معاویہؓ جیسے بیدار مغز حکمران کو اطلاع نہ ہو سکی تو ان راویوں کو کیسے ہو گئی۔ دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو حضرت ابن عباسؓ نے وہی روپیہ ساتھ لیا جو اُن کا اپنا تھا، یا خزانہ سے اتنا لیا جو اُن کی تنخواہ کا واجب نکلا۔ دونوں صورتوں میں مجالِ دم زدن نہیں۔ اور جو شخص بھی اس بہتان و افترا۔ کی جرأت کرتا ہے وہ جانے اور اس کا پروردگار۔ اس روایت کے وضع کرنے والوں کو یہ معلوم نہیں کہ بیت المال کا متولی دوسرا شخص ہوتا تھا، اور وہ براہِ راست امام کو جواب دہ تھا۔ والی کے لئے ممکن نہ تھا کہ امام سے استصواب کے بغیر اپنے حکم سے کچھ تصرف کر سکے۔ اب اگر وہ شخص جو خزانہ کا متولی تھا، اور حضرت ابن عباسؓ کے اس ناجائز تصرف میں شریک، اس کی بابت کسی روایت میں کیوں کچھ ذکر نہیں؟ حکومت کے سامنے صحیح معنی میں جواب دہ تو وہ تھا۔ بہر حال جو امر ثابت و محقق ہے وہ یہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا مکہ جا کر مقیم ہونا حضرت امیر المؤمنین علیؓ کے زمانہ کا واقعہ نہیں، اور وہ سب داستانیں قطعی فرضی ہیں جنھیں لوگوں نے اچھالا ہے۔

تعجب ہے کہ مآخذ کی موجودگی میں ادّعائے تحقیق کے باوجود خضری نے حسب ذیل کلمات لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۷۹]:-

ومن اغرب ما یروی ان ابن عباس وہو المساعد الاشد لعلیؓ فارقہ وترک البصرۃ التی کانت قد ولاہ علیہا وجاء مکۃ لان علیاً اتہمہ بمال اخذہ من مال المسلمین۔	سب سے عجیب روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جو حضرت علیؓ کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے وہ ان سے جدا ہو گئے، اور بصرہ سے چلے گئے۔ وہی (بصرہ) جس کی حکومت پر انھوں نے

انھیں فائز کیا تھا، پھر مکہ جا بیٹھے۔ کیونکہ حضرت علیؓ نے ان پر مسلمانوں کا مال خورد برد کرنے کا الزام لگایا تھا۔

اگر خضری کو یہ روایت ناقابلِ قبول ہونے کی وجہ سے عجیب نظر آتی، اور انھوں نے بغیر محاکمہ کے اس کو اس لئے نقل کر دیا ہوتا کہ لوگ خود اس کا باطل ہونا سمجھ لیں گے تب بھی ایک بات تھی لیکن وہ تو اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا علیؓ کی خلافت پر تبصرہ کرتے وقت آپ کے عدم تدبر کی مثالیں دے کر ان الفاظ میں ان دونوں بزرگوارانِ ملت کی تنقیص کرتے ہیں [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ : ج ۲، ص ۸۴]

وعلیؓ یحاسبھم علی النقیر والقطمیر فی وقت ھو محتاج الیھم حتی کان شئ من ذٰلک سبباً فی تغیر قلب ابن عباس علیہ وفرقتہ لہ فترک البصرۃ وذھب الیٰ مکۃ۔

اور حضرت علیؓ کا حال یہ تھا کہ وہ حقیر ترین امور میں بھی اپنے عمال سے باز پرس کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس وقت انھیں ان کی امداد کی سخت احتیاج تھی۔ ایسی ہی ایک بات تھی جو اُن کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ کا دل پھیر دینے اور ساتھ چھوڑ دینے کا سبب بنی۔ چنانچہ وہ بصرہ سے چلے گئے اور مکہ جا بیٹھے۔

تعجب ہے کہ معتبر ماخذ اور قوی اسناد کی موجودگی میں خضری نے ایک بے سر و پا بات پر یہ افسانہ کھڑا کر دیا جس کی لپیٹ میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں آ گئے۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا حضرت ابن عباسؓ کا بنو ہاشم اور امّت میں یہ مقام رہتا جو بڑے بڑوں کے لئے موجبِ غبطہ ہے؟

اگر سیدنا علیؓ کے زمانہ کا یہ واقعہ ہے تو اس وقت مکہ معظمہ انہی کی قلمرو میں تھا۔ محض الزام لگا کر سیدنا علیؓ چپکے کیوں ہو گئے، اور انھیں گرفتار کر کے باز پرس کیوں نہ کی؟ بیت المال کے روپیہ پر تصرف کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ "وہ حقیر ترین امور میں بھی عمال سے باز پرس کرنے کی" کمزوری میں مبتلا تھے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بلکہ انتہائی گستاخانہ اور اہلِ ایمان کے لئے موجبِ اشتعال ہے وہ بیان جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے الفتنۃ الکبریٰ میں دیا ہے۔ اور اس فرضی واقعہ کی تفصیلات میں مزید اضافہ کر کے امّت کے لئے دلسوزی کے ادّعاء کے ساتھ اسلافِ کرام کے کردار کی پستی کا ماتم کرنے بیٹھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ سیدنا ابن عباسؓ نے بصرہ کے

بیت المال سے جو رقم اڑائی تھی اس سے ناچنے گانے والی لونڈیاں خریدیں، اور مکہ میں بیٹھ کر دادِ عیش دینے لگے۔

واقعی مکہ مکرمہ ایسی ہی جگہ ہے جہاں اس زمانہ میں رامش و رنگ کی محفلیں جمتی تھیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا یہی کردار تھا، خصوصاً اس شخص کا جو نونہالانِ باغ امت میں تنہا اس شرف کا حامل ہے کہ رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اور جسے سینہ سے لگا کر آپ نے دعائیں کی ہیں کہ خدا تعالیٰ اسے دین کی سمجھ عطا فرمائے، اور قرآنِ حکیم کے معارف اس پر القاء کرے۔ اور جسے تمام امت امام المفسرین اور سید الفقہاء سمجھتی ہے۔ اِنّا للہ و انا الیہ راجعون۔

بصرہ چھوڑنے کا واقعہ سیدنا علیؓ کے زمانہ کا قرار دینا، پھر بصرہ کے بیت المال پر ناجائز تصرف کا بہتان باندھنا، اور تمام صحیح و معتبر مآخذ کو نظر انداز کر کے اس پر قسم قسم کی روایتوں کا انبار لگا دینا محض اس لئے ہے کہ جمہور صحابۂ کرام کی طرح اہل بیتِ نبوّت کے کردار کو بھی بے حیثیت بنا دیا جائے۔ ایسی ہی روایتیں سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ کے متعلق ان لوگوں نے وضع کی ہیں۔ افسوس ان پر ہے جو بغیر تحقیق و تدبر ان واہی روایات کو نقل کر کے امت کے قلوب مکدر کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قصور اتنا ہے کہ وہ خلفائے عباسیہ کے مورث ہیں۔ اور سیدنا عقیلؓ کا قصور یہ ہے کہ وہ حضرت امیر المومنین معاویہؓ کے ہمنوا تھے۔ اس لئے یہ دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں۔

سیدنا عقیلؓ

سیدنا عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امت کی فلاح اسی میں سمجھتے تھے کہ سیدنا عثمانؓ کا قصاص لیا جائے اور سیدنا معاویہؓ کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ چنانچہ آپ شام تشریف لے گئے۔ اور اپنی وفات تک سیدنا معاویہؓ ہی کے ساتھ رہے۔ سیدنا علیؓ سے آپ عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ یعنی جب اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر ان کے حریف سے جا ملے تو آپ کی عمر شریف اسّی برس کے قریب تھی، اور یہ وہ عمر ہے کہ مومن کی توجہ طبعاً آخرت کی طرف ہوتی ہے، اور دنیا کی طرف سے وہ بے رغبت ہو جاتا ہے۔ لیکن سیوطی صاحب کا قلم کچھ اور کہتا ہے [تاریخ الخلفاء: ص ۷۹ طبع مصر]

واخرج ابن عساکر عن حمید بن هلال ان عقیل بن ابی طالب سأل	ابن عساکر نے حمید بن ہلال کے حوالہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ عقیلؓ بن ابی طالب نے علیؓ سے سوال کیا

عِلیاً فقال انی محتاج وانی فقیر فاعطنی۔ فقال اصبر حتیٰ یخرج عطائی مع المسلمین فاعطیک معہم۔ فألحّ علیہ۔ فقال لرجلٍ خذ بیدہ وانطلق بہ الیٰ حوانیت السوق فقل دق ہٰذہ الاقفال وخذ مافی ھٰذہ الحوانیت۔ قال انرید ان تتخذنی سارقاً۔ قال وانت ترید ان تتخذنی سارقاً ان آخذ اموال المسلمین فاعطیکہا دونہم؟ قال لآتین معاویۃؓ۔ قال انت وذاک۔ فاتیٰ معاویۃ۔ فسألہ۔ فاعطاہ مأۃ الفٍ ثم قال اصعد علی المنبر فاذکر ما اولاک بہ علیٌّ وما اولیتک۔ فصعد فحمد اللہ واثنیٰ علیہ۔ ثم قال ایہا الناس! انی اخبرکم انی اردتُ علیاً علیٰ دینہ فاختار دینہ، وانی اردت معاویۃ علیٰ دینہ فاختارنی علیٰ دینہ۔

اور کہا میں محتاج ہوں اور میں فقیر ہوں ہٰذا مجھے کچھ دو۔ انھوں نے فرمایا ذرا صبر کیجئے، جب باقی مسلمانوں کے ساتھ میرا حصّہ الگ کیا جائے گا تو اور دوں کے ساتھ آپ کو بھی کچھ دیدوں گا۔ لیکن وہ سر ہوگئے، تو آپنے ایک شخص سے فرمایا ان کا ہاتھ پکڑو اور بازار والوں کی دُوکانوں پر لے جاؤ اور کہو کہ ان کے قفل توڑ کر جو کچھ گودام میں ہو وہ لے لیں۔ انھوں نے کہا تم مجھے چور بنانا چاہتے ہو؟ آپنے فرمایا اور آپ مجھے چور بنانا چاہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کا مال لے کر اُن کی بجائے آپ کو دیدوں؟ اس پر وہ بولے "تو پھر میں معاویہ کے پاس چلا جاؤں گا!" آپنے فرمایا "یہ آپ کا کام ہے آپ جانیں"۔ چنانچہ وہ معاویہؓ کے پاس چلے گئے، اور ان سے بھی سوال کیا۔ انھوں نے ایک لاکھ درہم دیئے، اور فرمایا کہ ذرا منبر پر چڑھ کر بتادیجئے کہ علیؓ نے آپ کی پذیرائی کس طرح کی اور میں نے آپ کے ساتھ کیا خصوصیت برتی۔

آپ منبر پر چڑھے، اوّل اللہ کی حمد وثنا کی اور پھر فرمایا "لوگو! میں تمھیں اصل بات بتاتا ہوں۔ میں نے اپنے لئے علیؓ کو دین سے برگشتہ کرنا چاہا تو انھوں نے میرے مقابلہ میں دین کو ترجیح دی، پھر میں نے اپنی خاطر معاویہؓ کو دین سے برگشتہ کرنا چاہا تو انھوں نے اپنے دین کی بجائے مجھے اختیار کیا"۔

یہ ہے ان راویوں کے نزدیک اہل بیت کی ذہنیت اور شیخ بنی ہاشم کا حال۔ سیدنا عقیلؓ محتاج اور فقیر کس طرح ہوگئے تھے یہ کوئی نہیں بتاتا۔ دیوان کا محکمہ کہاں گیا؟ بنو ہاشم کا وہ وظیفہ کیا ہوا جو عہدِ فاروقی سے جاری تھا، اور جس میں مال کی فراوانی کے سبب اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ پھر امام کو یہ حق کیوں نہیں کہ اگر ایک شخص پر افتاد پڑ گئی ہو تو بیت المال سے اس کی مدد کرے۔

ویسے اگر روپیہ نہ دیا جاتا تو قرض دیا جا سکتا تھا، یا پیشگی وظیفہ دیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس شخص کی زکوٰۃ کا ہزاروں روپیہ نکلتا ہو اس کا بھائی مفلس ہو جائے۔ سیدنا عقیلؓ کی اولاد موجود تھی، بلکہ اولاد کی اولاد، اور ان سب کو بیت المال سے وظیفہ ملتا تھا۔ گویا عرب کی معاشرت کے مطابق ان پر اپنی اولاد کا کچھ بوجھ نہ تھا، تو پھر ان کے افلاس کا سبب کیا ہوا؟ اور اگر بالفرض بقول مسعودی کے سیدنا علیؓ بھی مفلسی کی زندگی بسر کرتے تھے تو سیدنا حسنؓ اور سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ کی شہرۂ آفاق دولت اور سخاوت کا کیا فائدہ تھا جو وہ اپنے سگے بڑے چچا کے کام نہ آسکے۔

ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی دینداری اور حضرت معاویہؓ کی بے دینی بیان کر کے سیدنا عقیلؓ نے خود اپنے آپ کو کہاں رکھا، دینداروں میں یا دنیا پرستوں میں؟ ان کے پاس یہ روپیہ لے لینے کا فقہی جواز کیا تھا؟ پھر سیدنا معاویہؓ کی جو انھوں نے کھلی بے عزتی کی، اور خود ان کے اپنے مرکز میں منبر پر انھیں بے دین اور دنیا پرست بتایا، تو انھوں نے کس بنا پر انھیں اپنے ہاں احترام کے ساتھ رکھا؟ نعوذ باللہ من سوء الفکر۔

چونکہ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ سیدنا علیؓ کے سگے بڑے بھائی جو شیخ فانی کے درجہ کو پہنچ گئے تھے انھوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق اپنا سیاسی موقف متعین کرنے میں رشتہ کی پروا نہیں کی، اور وہی کیا جو اُن کے نزدیک امت کے حق میں مفید اور پیش آمدہ حالات کے تحت مناسب تھا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اُن پر قسم قسم کے فقرے چُست کر کے خانوادۂ رسالت کے اس اہم رکن کی بے حرمتی کی جائے۔ غرض یہ ہے کہ اسلاف کرام میں چھوٹا بڑا کوئی ایسا نہ رہنے پائے جس کی کچھ عزت دلوں میں رہ سکے۔ چنانچہ یہ لوگ کسی کی مدح بھی کرتے ہیں تو برنگِ ذم۔

یہاں یہ امر صاف کر دینا ضروری ہے جیسا کہ متعدد جگہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جتنے حضرات نے امرِ خلافت میں سیدنا علیؓ سے بے تعلقی یا مخالفت کا موقف بنایا وہ خود ان کے خلاف نہ تھا، ان کی خیر خواہی میں تھا، تاکہ وہ اس ناپاک گروہ سے نجات حاصل کر لیں جو سیاساتِ اسلامیہ پر حاوی ہو گیا تھا، اور ان کے وجود سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امت کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

سیدنا عقیل رضوان اللہ علیہ کا سیدنا معاویہؓ کے پاس چلا جانا اس امر کا نہایت اہم ثبوت ہے کہ اس وقت سبائیوں کی طرف سے اہل دین اور زعمائے ملت کے قلوب کس درجہ متنفر تھے۔

دورِ فتن میں سیدنا علیؓ کا موقف

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی زبان مبارک سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نہایت کریہ، حقارت آمیز اور تکلیف دہ کلمات نکلوائے گئے ہیں۔ شریف رضی اور شریف مرتضیٰ نے اپنے سفیہانہ کلمات کی ادائیگی کے لئے خانوادۂ رسالت کی اس عظیم ترین شخصیت کا نام لیتے وقت اس کا بھی تو خیال نہیں کیا کہ جب غیر مسلم لوگ، نہج البلاغہ پڑھیں گے تو اہل بیتِ نبوت کے متعلق ان کی رائے کیا ہوگی۔ شاید ہی دنیا میں کسی کی ایسی ناخلف اولاد پیدا ہوئی ہو جیسے یہ دونوں بھائی امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے لئے باعثِ ننگ و عار ہیں۔

لیکن جب ہم صحاح کی روشنی میں واقعات تاریخی دیکھتے ہیں تو سیدنا علیؓ کو ایسا ہی امام الاتقیاء اور سرخیلِ اولیاء پاتے ہیں اور اتنا ہی بلند محسوس کرتے ہیں جیسے ایک ہاشمی سردار کو ہونا چاہئے —— اُس بزرگوار کو، جو تیس برس کے قریب جلوت و خلوت میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا، اور جو آپ کا محض بھائی اور داماد ہی نہ تھا، بلکہ آپ نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

خودنگری اور انانیت، دوسروں کی تحقیر اور اپنے نسب پر غرور، اپنے سے بزرگتر ہستیوں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی، اپنی طہارت و تزکیہ کا اعلان، اور مخالفوں پر طعن و تشنیع بلکہ لعنت، یہ وہ باتیں ہیں جو دشمنانِ دین و ملت نے آپ کی طرف منسوب کی ہیں، اور خضری جیسے لوگوں نے اس افتراء کو صحیح باور کر کے سیدنا علیؓ کو مکارم اخلاق کی تعلیم دینے کی جرأت کی ہے ع

اصلاح می دہد خطِ پروردگار را

لیکن الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا دامن ان تمام لغویات و سیئات سے پاک ہے، اور آپ کو اس پست کردار سے دور کی بھی نسبت نہیں جو رضی و مرتضیٰ اور مسعودی نے آپ کا بیان کیا ہے۔ واقعہ ہے کہ سبائیہ جس کی مدح کرتے ہیں اس میں بھی نیست ذم ہی کی ہوتی ہے۔

حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حرمت و عظمت کا

پورا احساس تھا، اور آپ دل سے اُن کی قدر کرتے تھے۔ آپ نے اس سیاسی اور اجتہادی اختلاف کو کبھی ذاتی اور خاندانی نہیں بنایا، جیسا کہ دنی النفس لوگ ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ ثالثی نامہ میں آپ نے اپنا اور سیدنا معاویہؓ کا نام مساویانہ لکھا جانا منظور کیا، متارکۂ جنگ کے دوران برابر اُن کی اور ان کے ساتھیوں کی بلندی اور مکارمِ اخلاق کی مدح کی، اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت وصیت فرما گئے کہ "معاویہؓ کی خلافت سے کراہت محسوس نہ کرنا، وہ نہ ہوں گے تو تم دیکھو گے کہ امت میں کتنی خونریزی ہوتی ہے"۔ (سیوطی کی تاریخ الخلفاء: ص ۷۵، طبع مصر)۔ سیدنا حسنؓ نے جس طرح سیدنا معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو کر آپ سے بیعت کر لی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا علیؓ نے یقیناً انہیں سیدنا معاویہؓ کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی۔

ثالثی نامہ کے بعد سیدنا علیؓ کی طرف سے بالکل خاموشی ہو گئی۔ اور سوائے مصر کے واقعہ کے جس میں خود آپ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، اور کسی قسم کا کوئی واقعہ ایسا رونما نہیں ہوا جو طرفین میں سے کسی کی ناراضگی کا سبب بنتا۔ سیدنا معاویہؓ نے جب مصر میں امن قائم کر دیا، اور ادھر سے امت مطمئن ہو گئی تو سیدنا علیؓ نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ پھر یمن و حجاز بھی جب وہاں کے باشندوں کی منظوری سے سیدنا معاویہؓ کے تحت چلے گئے، تو اسے بھی آپ نے برداشت کر لیا۔

لیکن جب خوارج نے بغاوت کی اور امتِ مسلمہ سے اپنا تعلق منقطع کر کے سب کو کافر اور واجب القتل کہا، تو آپ نے پوری قوت سے ان کے خلاف جہاد کیا۔ پھر جب ایران کے لوگوں نے بغاوت کی اور اپنی حکومت الگ قائم کر کے عالمِ اسلام سے نکل جانا چاہا، تو اس پر بھی آپ نے سخت اقدام کیا۔ سیدنا زیاد رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر بھیجا، جنھوں نے پوری قوت اور اعلیٰ سیاست سے اس بغاوت کو کچل کر امن قائم کر دیا۔ مسعودی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ایران کی بغاوت کو فرو کرنا امیر زیاد ہی کا کارنامہ تھا (مروج الذہب: ج ۳، ص ۱۵)۔

اب تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو غور کرنا چاہئے کہ آپ نے یہ مختلف طریقہائے کار کیوں اختیار کئے۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ چونکہ خوارج سے جنگ کے وقت آپ کے پاس قوت تھی، اس لئے آپ اُن سے لڑے، اور بعد میں وہ قوت نہ رہی تو چپکے ہو گئے۔ یہ تصور لغو اور شر انگیز ہے۔ اسے کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کوفیوں اور بصریوں کے علاوہ بقیہ زیرِ نگیں علاقوں سے آپ کو یقیناً لڑنے والے سپاہی میسر آ سکتے تھے۔ اور اگر آپ چاہتے تو بڑی آسانی سے ایک لشکر جرار فراہم ہو سکتا تھا۔ ایران کی بغاوت فرو کرنے کا واقعہ ۳۹ھ کا ہے۔

یعنی نہروان کی جنگ سے ایک سال بعد کا۔ تو پھر یمن و حجاز کے بارے میں آپ نے سپر کیوں ڈال دی؟
بات یہ ہے کہ آپ نے اہلِ یمن و حجاز کے اقدام کو بغاوت سے تعبیر نہیں کیا۔ اور نہ سیدنا بُسرؓ وغیرہ کے دورہ کو جارحانہ کارروائی سمجھا، بلکہ اس سب کو رائے کی آزادی جانا، جو ثالثی نامہ نے پوری امت کو دی تھی۔ ثالثوں کے فیصلہ نے فریقین کو حق دیا تھا کہ آنے والے اجتماع کے لئے اپنا موقف جس طرح چاہیں رائے عامّہ کو استوار کر کے مضبوط بنائیں۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ امت کا مستقبل کیا ہونے والا ہے، اور سیاساتِ اسلامیہ کا رُخ کدھر ہے۔

امام ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے البدایۃ والنہایۃ میں (۸ : ۲۰، منقول از العواصم من القواصم ص ۱۸۳) نہایت قوی سند کے ساتھ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے، جو آپ نے اس وقت دیا جب یمن وغیرہ علاقے سیدنا معاویہؓ کے تحت چلے گئے۔ اس خطبہ کی توثیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ اور چونکہ واقعات کے عین مطابق ہے اس لئے اس پر نقطہ رکھنے کی گنجائش نہیں:۔

عن زُہَیر بن الارقم قال خطبنا علیؓ یوم الجمعۃ فقال نُبِّئتُ اَنَّ بُسراً قد طلع الیمن وانی واللہ لَاَحسبُ انّ ہٰؤلاء سیظہرون علیکم۔ وما یظہرون علیکم الا بعصیانکم امامکم وطاعتہم امامہم۔ و بخیانتکُم وامانتِہِم، وافسادکم فی ارضکم واصلاحہم۔

قد بعثتُ فلاناً فخان وغدر، وبعثتُ فلاناً فخان وغدر وبعث المال الی معاویۃ۔ لو ائتمنتُ احدکم علی قدحٍ لَاَخذَ علاقتہ۔ اللّٰہم سئمتہم وسئمونی وکرہتُہم وکرہونی۔ اللّٰہم اَرِحہُم مِنّی وَاَرِحنِی مِنہُم۔

زہیر بن ارقمؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں، (سیدنا علیؓ نے جمعہ کے خطبہ میں ہم سے فرمایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ بُسر اب یمن میں آگئے ہیں۔ بخدا مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب تم پر غالب آجائیں گے۔ اور ان کے غلبہ کا سبب صرف یہی ہوگا کہ تم اپنے امام کے نافرمان ہو اور وہ اپنے امام کے مطیع ہیں، تم خیانت کرتے ہو اور وہ امانتدار ہیں، تم زمین میں فساد کرتے ہو اور وہ اس کی اصلاح کرتے ہیں۔
میں نے فلاں شخص کو بھیجا اس نے خیانت کی اور غدر کیا، میں نے فلاں شخص کو بھیجا اس نے بھی خیانت کی اور غدر کر کے مال معاویہ کو بھیج دیا۔ میں تم میں سے کسی کے پاس ایک پیالہ امانتاً رکھواؤں تو وہ اسے چاٹنا شروع کر دے گا۔ خدایا یہ مجھ سے تنگ آگئے اور میں ان سے، مجھے ان سے نفرت ہے اور انھیں مجھ سے۔ خدایا انھیں مجھ سے نجات دے اور مجھے ان سے"

یہ خطبہ بتا رہا ہے کہ جس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے رائے عامہ اپنے حق میں کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے، اسی طرح سیدنا علیؓ نے بھی اپنے گماشتے بھیجے تھے۔ لڑنے کے لئے نہیں جیسا کہ مسعودی وغیرہ کہتے ہیں، بلکہ پرامن طریقہ پر اپنے موقف کی تبلیغ کرنے۔ لیکن ان حضرات نے احوال کا مطالعہ کرنے کے بعد مناسب یہی سمجھا کہ سیدنا معاویہؓ کا ساتھ دیا جائے۔ رائے عامہ اسی طرف ڈھل رہی تھی، اور اس کے بغیر امت کا مستقبل درست نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ہو گئے، اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام عالم اسلام سیدنا معاویہؓ ہی کی طرف جھکتا چلا گیا۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ دیکھ رہے تھے کہ سبائیوں کی حرکتوں کی بناء پر مسلمانوں کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہیں، اور حضرت معاویہؓ کی مقبولیت کا دائرہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا امت کی خیر خواہی میں آپ نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ اور ایک بلند ترین حق پرست کی طرح اعتراف کیا کہ حضرت معاویہؓ اور اہل شام اپنے کردار کی رفعت، اپنے خلوص و امانت اور تعمیری رجحانات کے سبب اس کے اہل ہیں کہ انھیں کامرانی نصیب ہو۔ اب دیکھنا چاہئے کہ سیدنا بسرؓ کا کردار امیر المؤمنین علیؓ کے نزدیک کیا تھا، اور مسعودی وغیرہ نے اسے کس رنگ میں پیش کیا ہے۔

اس خطبہ کی گھڑی کیسی مقبول تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی دعا سن لی اور اس نابکار ٹولی سے آپ کو نجات دیدی جس نے آپ کی زندگی کو اجیرن اور امت کی حیاتِ اجتماعیہ کو برباد کر رکھا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جس ٹولی کے ایک فرد نے باہمی سازش سے سیدنا عثمانؓ کو شہید کیا تھا، بلکہ اس سے پہلے سیدنا عمر فاروق اعظمؓ کو بھی، اسی ٹولی کے ایک دوسرے فرد نے سازش کر کے سیدنا علیؓ کو بھی شہید کیا۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی جمیع الشہداء المظلومین المقتولین بایدی الکفرۃ الظلمۃ المرتدین عن الاسلام والبغاۃ علی المسلمین۔

شہادت امیر المؤمنینؓ

امت کی سیاست ایک اہم اور خاص رخ اختیار کر رہی تھی، کہ تین خارجیوں نے اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے یا اپنی دانست میں واقعی امت کی بھلائی کے خیال سے، یا اپنی فطری امن کُشی کے جذبہ کے تحت، یا امت کے عام اجتماع کے انعقاد سے مایوس ہو کر یہ عہد کیا کہ کوفہ میں سیدنا علیؓ کو، دمشق میں سیدنا معاویہؓ کو، اور مصر میں سیدنا عمروؓ بن العاص کو بیک وقت شہید کر دیا جائے۔ ان ملعونوں کے نزدیک امت میں فساد کے ذمہ دار یہ خود نہیں تھے، بلکہ امت کے ان ائمہ

نے یہ تباہی مچائی تھی۔

عبدالرحمٰن بن مُلجم نے سیدنا علیؓ کو شہید کرنے کا ذمہ لیا، عمرو بن بکر نے سیدنا عمروؓ بن العاص کو، اور حجاج بن عبداللہ صریمی نے جو بُرک کہلاتا تھا سیدنا معاویہؓ کو۔ تجویز یہ تھی کہ نماز کی حالت میں اور وہ بھی رمضان کے مہینہ میں یہ نیک کام انجام دیا جائے۔ سیدنا عمروؓ بن العاص کی طبیعت ناساز تھی، اور آپ نے سیدنا خارجہؓ بن حُذَیفہ کو نماز پڑھانے کے لئے مامور کیا تھا۔ اور یوں سیدنا عمروؓ کے دھوکہ میں سیدنا خارجہؓ کو شہید کر دیا گیا۔ سیدنا معاویہؓ کے زخم خفیف آیا، اور وہ چند دن میں تندرست ہو گئے۔ سیدنا علیؓ کے زخم کاری لگا، اور تیسرے دن آپ نے وفات پائی۔

لوگوں نے عرض کیا "اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر جائیے" آپ جانتے تھے کہ کیا ہوگا اس لئے انکار کر دیا اور فرمایا "میں تمہیں ایسے ہی چھوڑ جاؤں گا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔ اور جس طرح آپ کی وفات کے بعد بہترین شخص پر امت کا اجماع ہو گیا تھا، ایسے ہی میرے بعد امت کے بہترین شخص پر تمہارا اجماع ہو جائے گا" اس عرصہ میں آپ نے اپنے اقربا، اور اعزّہ کو بہت سی نصیحتیں کیں، جن پر ان سب حضرات نے پوری طرح عمل کیا، کہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں ان نصائح میں تھیں۔

حضرت امیر المؤمنین سیّدنا حسنؓ صلوات اللہ علیہ

عراقیوں کو نئی صورتِ حال کے پیش نظر کچھ توقف کرنا چاہیے تھا، اور جمہور صحابہ سے عرض داشت کرنی چاہیے تھی کہ جلد عام اجتماع منعقد کرکے خلافت کے مسئلہ کا تصفیہ کریں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنی شورہ پشتی پر قائم رہے۔ اہل بیت اطہار اور مخلص اہل ایمان نے اپنے نظریات کے مطابق انھیں من مانی کرنے دی، اور یوں حضرت امیر المؤمنین سیدنا حسن صلوات اللہ علیہ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ اور آپ نے بھی ان لوگوں کی بیعت قبول کرلی۔ مگر شرط یہ لگائی کہ جس سے چاہیں گے صلح کریں گے اور جس سے چاہیں گے جنگ۔ سبائی لوگ عزائم اہل بیت سے واقف تھے اس لئے اس شرط سے کھٹک گئے۔ مگر مجبوری تھی کہ سوائے اس نور مجسم کے اور کسی سے بیعت کرکے بارگاہِ مرتضوی میں اپنی نمائشی عقیدت کا ثبوت کیا دے سکتے تھے۔

سیدنا حسنؓ کو راہ سے بھٹکانے کے لئے ایک عظیم الشان فوج بھی مرتب کرلی گئی۔ ان کا مقصد تھا کہ جس طرح حضرت امیر المؤمنین علیؓ کی خلافت کو قدم قدم پر اپنے مقاصد سیئہ کے لئے کام میں لاتے رہے اور روز ایک نیا فتنہ کھڑا کرکے آپ کو پریشانیوں میں مبتلا رکھا، ایسے ہی نئی خلافت پر بھی حاوی ہو جائیں گے۔ حضرت امیر المؤمنین حسنؓ نے بھی اطمینان سے انھیں سب کچھ کرنے دیا، اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ واقعی آپ بھی اب تک کی افتراق انگیز حکمتِ عملی ہی پر کاربند رہیں گے۔ اور اس لشکر جرار کے ذریعہ حریف کو شکست دے کر کوسِ لمن الملک بجائیں گے۔

اہلِ شام ثالثوں کے تقرر کے بعد سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مستقلاً اپنے مستقر ہی میں رہتے تھے۔ اور کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ نے کبھی فوجی ضرورت کے لئے دمشق سے نکلنا ضروری سمجھا ہو، یا عراق کی سرحد پر کوئی فوج متعین کی ہو۔ لیکن سیدنا علیؓ کی شہادت کے بعد جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہزارہا عراقی اپنے نئے امام کی قیادت میں "لڑنے مرنے" کو تیار ہیں، تو آپ نے بھی لشکر مرتب کیا، اور پہلی مرتبہ دمشق سے حرکت کرکے مقابلہ پر آگئے، لیکن یہ صرف عراقیوں پر رعب ڈالنے کی بات تھی، ورنہ حقیقتاً آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دونوں فوجوں میں تصادم ہو۔ صرف احتیاط اور حزم کا تقاضہ تھا کہ باقاعدہ فوج لے کر میدان میں اُتریں۔

سیدنا حسنؓ اور سیدنا ابن عباسؓ وغیرہما کا موقف آپ کو معلوم تھا، اور جانتے تھے کہ ان کا خیمہ زن ہونا بھی محض نمائشی ہے۔ اہلِ بیت اور مخلص اصحاب شروع سے دیکھ رہے تھے کہ خلافتِ مرتضوی پر جو لوگ مسلط ہیں وہ کوئی صحیح اور تعمیری بات نہیں ہونے دیتے۔ سیدنا عثمانؓ کی شہادت سے لے کر تحکیم تک جتنے اقدامات ہوئے وہ سب سیدنا حسنؓ اور سیدنا ابن عباسؓ کی رائے کے خلاف ہوئے۔ اور سب کی ہمدردیاں سیدنا معاویہؓ کے ساتھ تھیں۔ محض امام کی طاعت کا جذبہ تھا جو یہ حضرات مدینہ چھوڑ کر کوفہ آنے پر راضی ہو گئے، اور جمل و صفین میں شرکت کی۔ ورنہ حقیقتاً ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح عراق سے نکل جائیں، اور مفسد ٹولی سے نجات پائیں جو امت کے لئے مستقل عذاب بن گئی ہے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ تو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے تھے، اور انہی کے موقف کو اس وقت حق جانتے تھے۔ لیکن سیدنا حسنؓ اور حضرت ابن عباسؓ اپنی خوردی کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکے۔

اس دوران میں سبائیہ کا زور بھی بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا۔ حُکیمؒ بن جبلہ، مالک الاشتر، کنانہ بن بِشر جیسے بڑے بڑے سبائی مارے جا چکے تھے یا مر گئے تھے۔ ان کا ایک طاقتور گروہ خارجی بن کر ملت سے کٹ چکا تھا، اور اب ان کی یہ حیثیت نہیں رہی تھی کہ ہاشمی سیاست پر حاوی ہو سکیں یا خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے تعمیری منصوبوں کو خاک میں ملا سکیں۔ لہٰذا سیدنا حسنؓ کے لئے اپنا موقف اعلان کے ساتھ بدل دینا آسان ہو گیا۔ اور آپ نے بطیبِ خاطر سیدنا معاویہؓ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔ اور یوں آپ کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی کہ عراق سے چھٹکارا ہو اور سبائی ٹولی سے امت کو نجات ملے۔

صُلح لیکن اس صلح میں بھی اصل پیشکش سیدنا معاویہؓ کی طرف سے ہوئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس مبارک ترین واقعہ کے لئے جس پر یہ امت رہتی دنیا تک فخر کرے گی، ہمیں مسعودی اور طبری دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح بخاری موجود ہے (ج ۱، کتاب الصلح):۔

عن ابی موسیٰ قال سمعت الحسن یقول استقبل واللہ الحسن بن علی علی معاویۃ بکتائب کامثال الجبال فقال عمرو بن العاص انی اریٰ کتائب لا تولی حتیٰ تقتل	حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں نے (حضرت) حسنؒ (بصری) کو فرماتے سنا ہے "بخدا (سیدنا) حسن بن علیؓ پہاڑوں کی طرح فوجوں کے پرے لے کر (سیدنا) معاویہؓ کے مقابلہ کو نکلے تھے۔

اقرانها فقال له معاویة وکان واللہ خیر
الرجلین ؓ اے عمرو ! ان قتل ہٰؤلاء
ہٰؤلاء و ہٰؤلاء ہٰؤلاء من لی بامور
الناس من لی بنسائہم من لی بضیعتہم
فبعث الیہ رجلین من بنی عبدشمس
عبدالرحمٰن بن سَمُرة وعبداللہ بن
عامر بن کُریز فقال اذہبا الی ھذا
الرجل فاعرضا علیہ وقولا لہ واطلبا
الیہ. فاتیاہ ودخلا علیہ فتکلما وقالا
لہ وطلبا الیہ۔

فقال لہم الحسن بن علی انا بنو
عبدالمطلب قد اصبنا ہٰذا المال
وانّ ھٰذہ الامّة قد عاثت فی دمائہا۔
قالا فانہ یعرض علیک کذا وکذا۔
ویطلب الیک ویَسأ لک. قال
فمن لی بہٰذا ؟ قالا نحن لک بہ۔
فماسألہما شیئاً الّا قالا نحن لک بہ۔
فصالحہ۔

قال الحسن ولقد سمعتُ
ابابکرة یقول رأیت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر و
الحسن بن علی الیٰ جنبہ وہو یقبل
علی الناس مرة وعلیہ اخریٰ ویقول
ان ابنی ھٰذا سیدٌ ولعل اللہ ان یُّصلح
بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین۔

(سیدنا) عمروؓ بن العاص نے فرمایا "میں
فوجوں کے ایسے پرے دیکھتا ہوں جو اپنے مقابل
لوگوں کو قتل کئے بغیر مُنہ نہیں پھیریں گے (یعنی
اگر جنگ ہوئی تب)۔ (سیدنا) معاویہؓ نے ارشاد
فرمایا اور بخدا وہ ان دونوں میں بہتر شخص تھے،
"اے عمرو! اگر اُن لوگوں نے انھیں قتل کر دیا اور
انھوں نے اُنھیں، تو پھر انتظام کے لئے میں
آدمی کہاں سے لاؤں گا۔ ان کی خواتین کی دیکھ بھال
کو مجھے کون ملے گا، اور ان کے مال و متاع کی
حفاظت میں کس سے کراؤں گا؟"

پھر آپؓ نے بنو عبدالشمس میں سے دو صاحبوں
کو بھیجا۔ یعنی (سیدنا) عبدالرحمٰن بن سَمُرةؓ اور
(سیدنا) عبداللہ بن عامرؓ بن کُریز کو۔ اور
فرمایا "ان صاحب کے پاس جاؤ، مسئلہ پیش
کرو، سمجھاؤ اور اپنے مطالبات ان کے سامنے
رکھو۔"

چنانچہ یہ دونوں صاحب تشریف لائے،
ملاقات کی، گفتگو فرمائی، پیغام پہنچایا، اور
مطالبہ پیش کیا۔ (سیدنا) حسنؓ بن علیؓ نے
ارشاد فرمایا "ہم بنو عبدالمطلب اس مال سے
بھر پائے اور اس امت نے بے وجہ کشت و خون
میں ہاتھ رنگے"۔ دونوں نے کہا "تو اُن کی طرف
سے یہ پیشکش ہے، ایسا ایسا مطالبہ ہے،
اور اس اس قسم کی ان کی فرمائش ہے"۔
آپؓ نے فرمایا "ان باتوں کا ضامن کون ہوگا؟"

دونوں نے کہا "ہم اس کے ضامن ہیں"۔

غرض یہ ہے کہ جو مطالبہ بھی آپ نے پیش کیا انھوں نے یہی جواب دیا "ہم اس کے ذمہ دار ہیں"۔ اس پر آپ نے صُلح کرلی۔

(حضرت) حسنؒ (بصری) فرماتے ہیں میں نے (سیدنا) ابوبکرہؓ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا (سیدنا) حسن بن علیؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ کبھی آپ مجمع کی طرف دیکھتے اور کبھی اُن کی طرف۔ اور فرماتے "میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا"۔

حضرت امیر المؤمنین سیدنا حسن صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے اس مبارک اقدام سے تمام امّت ایک مرکز کے نیچے جمع ہوگئی۔ اہل ایمان کے باہمی اختلافات سب مٹ گئے۔ جیسے پہلے ایک منظم جماعت تھی ویسی ہی جماعت پھر بن گئی، اور عالمِ اسلام نے سیدنا معاویہؓ سید الابدال کے دستِ مبارک پر بیعت کرکے آپ کو متفق علیہ امام تسلیم کرلیا۔ صلوات اللہ ورضوانہ علیہم۔

اس نہایت مسرت و ابتہاج کی یادگار میں اس سال کا نام "عام الجماعۃ" رکھ دیا گیا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مسلمان یوں تو رنج و خوشی کے بہت سے دن مناتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے دَور میں امّت کی تاریخ کا جو سب سے بڑا دن تھا، اور جس کی برکت و عظمت کا ادراک صحابۂ کرام نے کرلیا، اسے سب بھولے ہوئے ہیں، بلکہ زبانوں پر نہیں لانے دیتے، کیونکہ اس میں اختلاف مٹنے کی نمود ہے اور خیالات درست ہونے کی، نہ کہ اختلاف پیدا کرنے اور دلوں میں مایوسی بھرنے کی۔

کس قدر حسرت اور رنج کا مقام ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عظیم ترین کارنامہ جو امّت کے لئے باعثِ صد افتخار اور مایۂ ناز ہے، اور جس کی برکت و نورانیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اس کا ذکر لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی عظمت غارت ہو، اور اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے حقیر سے حقیر اور مکروہ سے مکروہ صورت میں پیش کرکے امّت کو گمراہ کریں۔ تاکہ امیر المؤمنین حضرت حسنؓ جن پر اُن کے جدّ امجد صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر فرمایا ہے" کی حیثیت ہیچ اور ان کا اقدام پوچ نظر آئے۔

ایک صاحب ہیں عبداللہ عمادی، انھوں نے تاریخ اسلام کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے (مطبوعہ محمدی پریس کراچی ۱۹۴۹ء) اور سرورق پر لکھا ہے "ترجمہ تاریخ طبری" غالباً طبری کی مبسوط تاریخ کی عبارتوں کا جستہ جستہ ترجمہ کر کے بطور خلاصہ شائع فرمایا ہے۔ یہ ظلم عظیم ان بچوں اور طالب علموں پر کیا گیا ہے جو اسلام کی تاریخ کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، اور اصل عربی متن تک اُن کی رسائی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے عمادی صاحب کو صرف وہی روایتیں پسند ہیں جن سے سلف صالحین کا کردار پست و حقیر نظر آئے۔ اب آپ کی جولانیٔ قلم ملاحظہ ہو۔ اور بالکل انہی کے الفاظ میں۔ صحابۂ کرام کے متعلق لہجہ بھی دیدنی ہے۔ فرماتے ہیں:

"حسن بن علیؓ اپنے والد کے بعد دو مہینے ٹھیرے رہے، اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے۔ انھوں نے عبیداللہ بن العباسؓ کو بارہ ہزار فوج کے ہمراہ معاویہ سے جنگ کے لئے روانہ کیا۔ اُن کے ساتھ قیس بن سعد بن عبادہ انصاری بھی تھے۔ انھوں نے عبیداللہ کو یہ حکم دیا کہ وہ قیس بن سعد کے حکم اور انہی کی رائے کے مطابق عمل کریں۔

عبیداللہ جزیرہ کی طرف روانہ ہوئے، معاویہؓ کو جب قتلِ علیؓ کی خبر پہنچی تو وہ قتلِ علی کے اٹھارہؓ روز بعد موصل روانہ ہو گئے۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، معاویہ نے قیس بن سعد سے کہلا بھیجا کہ وہ انھیں دس لاکھ درہم دیں گے بشرطیکہ وہ معاویہ کے ساتھ ہو جائیں، یا ان کے مقابلہ سے واپس چلے جائیں۔ قیس نے اُن کے پاس مال واپس کر کے کہا کہ تم مجھے میرے دین کے متعلق دھوکہ دیتے ہو۔" کہا جاتا ہی کہ انھوں نے عبیداللہ بن عباس سے کہلا بھیجا اور ان کے لئے بھی دس لاکھ درہم مقرر کئے۔ وہ اپنے آٹھ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ ان کے پاس چلے گئے۔ قیس اُن سے جنگ کرتے رہے۔

معاویہ خفیہ طور پر لشکرِ حسن میں ایسے لوگوں کو بھیجا کرتے تھے جو یہ کہیں، کہ قیس بن سعد نے معاویہ سے صلح کر لی ہے، اور ان کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور لشکرِ قیس میں لوگوں کو بھیجتے جو یہ بیان کرتے تھے کہ حسن نے معاویہ سے صلح کر لی ہے، اور معاویہ کو مان لیا ہے۔

معاویہ نے حسن کے پاس مغیرہ بن شعبہ و عبداللہ بن عامر بن کُریز و عبدالرحمٰن بن ام الحکم کو بھیجا۔ یہ لوگ اس وقت آئے جب وہ مدائن میں اپنے خیموں میں

اُترے ہوئے تھے۔ یہ لوگ اُن کے پاس یہ کہتے ہوئے اور لوگوں کو سناتے ہوئے نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے فرزندِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خون کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان کے ذریعہ سے فتنہ کو ٹھیرا دیا ہے۔ انھوں نے صلح منظور کر لی ہے۔ لشکر میں پریشانی ہوگئی۔ کسی کو ان لوگوں کی سچائی میں شک نہ تھا۔ لوگوں نے حسن پر حملہ کر دیا۔ ان کے خیمے اور ان کا سامان لُوٹ لیا۔ حسن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مظلم ساباط میں گئے۔ جرّاح بن سنان الاسدی کمینگاہ میں بیٹھا تھا۔ اس نے گیتی ان کی ران میں ماری اور زخمی کر دیا۔ حسن نے جرّاح کی داڑھی پکڑ لی، اسے اکھاڑ دیا، پھر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ حسن کو لاد کر مدائن لایا گیا۔ اُن کے سخت خون بہہ رہا تھا، اور سخت بیمار ہوگئے تھے۔ لوگ ان کے پاس سے منتشر ہوگئے۔ معاویہ عراق آگئے۔ حکومت پر غالب آگئے۔ حسن بہت سخت علیل تھے۔ جب حسن نے یہ دیکھا کہ ان کے پاس قوت نہیں۔ ہمراہی ان کے پاس سے ایسے جدا ہوگئے کہ دوبارہ ساتھ دینے کے لئے کھڑے نہ ہوئے تو انھوں نے معاویہ سے صلح کر لی۔ الخ"

کہاں صحیح بخاری کی یہ تصریح کہ جنگ نہیں ہوئی، طرفین نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ صلح کر لی اور امت کا کلمہ متحد ہوگیا، اور کہاں یہ مردود بیان کہ سیدنا حسنؓ نے حالات سے مجبور ہو کر صلح کی اور وہ بھی ایسے شخص سے جو لالچ اور رشوت دے کر ان کے ساتھیوں کو توڑتا تھا، اور ساتھی کون تھے؟ چچا! یہ سیدنا عبیداللہ بن عباسؓ وہی ہیں جن کے دو بیٹوں کو کہا جاتا ہے کہ حضرت بُسرؓ نے قتل کر دیا تھا، اور جس کی تفصیل طبری نے بھی اسی دلگداز طریقہ پر دی ہے جیسے مسعودی وغیرہ نے۔ یہی سیدنا عبیداللہؓ عقل اور غیرت سب کو خیرباد کہہ کر محض روپے کے لالچ میں سیدنا معاویہؓ سے جا ملے۔ پھر سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ کا نام بے وجہ ٹانک دیا گیا ہے حالانکہ وہ صلح تک غیر جانبدار تھے۔ انھوں نے سیدنا معاویہؓ سے صلح کے بعد بیعت کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ کتابوں کا یہ ڈھیر جسے تاریخ اسلام کہا جاتا ہے، دراصل صحابۂ کرام اور اہل بیتِ اطہار کے خلاف ایک ہمہ گیر منظم سازش ہے۔ اور مقصد محض یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو اسلاف کی عظمت و محبت کو اخلاف کے دلوں سے نکال کر دعوتِ محمدیہ کو مضمحل اور امّت مسلمہ کے قلوب کو بے عزیمت کر دیں۔ خدا ان مؤرخوں سے سمجھے گا۔ لیکن کاش مسلمان بھی سمجھ لیں۔

دونوں سفیر

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جن دو بزرگواروں کو امیرالمؤمنین حضرت حسنؓ کے پاس بھیجا تھا، اور صلح کے پورے اختیارات دیدیئے تھے کہ جن شرائط پر چاہیں صلح کرلیں۔ یہ دونوں اسلام کی عظیم ترین ہستیوں میں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عامرؓ بن کریز کے بھیجنے میں ایک نکتہ بھی تھا۔ باپ کی طرف سے آپ عبشمی ہیں، یعنی عبدالشمس بن عبدمناف کی اولاد اور آپ کی ننھیال ہاشمی ہے۔ آپ کی دادی صاحبہ کی والدہ بیضاء بنت عبدالمطلب تھیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی۔ جب یہ پیدا ہوئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں آپ کو ڈالا گیا ہے تو آپؐ نے ان کے والد سیدنا عامرؓ بن کریز سے فرمایا "یہ بچہ تم سے زیادہ ہم پر پڑا ہے"۔ پھر آپ نے اپنا لعابِ دہن اُن کے مُنہ میں ڈالا جسے وہ چُوسنے لگے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے امید ہے یہ بچہ لوگوں کی پیاس بجھانے والا ہوگا"۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شان تھی کہ پانی کے لئے جہاں بھی زمین کھودتے پانی نکل آتا۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عرفات کے میدان میں حاجیوں کے لئے حوض بنوائے، اور چشموں کا پانی ان میں بھروایا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی سیاسی خدمات وہ ہیں کہ رہتی دنیا تک یہ امت آپ پر فخر کرے گی۔ ایران کی فتح کی تکمیل آپ ہی کے دستِ مبارک پر ہوئی تھی۔ آپ ہی نے درفشِ کاویانی ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا، اور آپ ہی کے ہاتھوں ساسانیوں کا آخری بادشاہ یزدگرد مارا گیا تھا۔ آپ کی فتوحات کا سلسلہ سیدنا معاویہ امیرالمؤمنین کے مبارک عہد میں بھی جاری رہا۔

سیدنا عبدالرحمٰن بن سَمُرہ رضی اللہ عنہما جو سیدنا عبداللہؓ کے ساتھ بھیجے گئے تھے ان کی بھی بڑی عظیم شخصیت ہے۔ بعد کے جہادوں میں یہ سیدنا عبداللہؓ ہی کے تحت کام کرتے تھے، اور کابل تک کا علاقہ انھوں نے ہی فتح کیا تھا۔

ان دونوں بزرگواروں کی زندگیاں کفار کے ساتھ جہاد میں گذریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اس شرف سے بھی نوازا کہ اہل ایمان کے درمیان خوش اسلوبی کے ساتھ صلح کراکر دنیا و آخرت میں سُرخرو ہوں۔ جزاہما اللہ عن الاسلام والمسلمین افضل الجزاء۔

بیعتِ خلافت

امیر المومنین حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی، تو اس کا نتیجہ خود بخود یہی ہونا تھا کہ امت کی زمام کار اُن کے ہاتھ میں چلی جائے۔ اسی لئے سیدنا حسن رض نے آپ سے بیعت کر لی، اور پھر جمہور اہلِ اسلام نے۔ اس وقت سے آپ کو امیر المومنین اور امام المسلمین تسلیم کر لیا گیا۔

لوگوں کا بیان ہے اور خضری نے اس پر زور دیا ہے بلکہ عموماً یونہی کہا جاتا ہے کہ تحکیم کے نتیجہ میں سیدنا عمرو رض نے جب سیدنا معاویہ رض کو خلیفہ بنا دیا تو اہلِ شام نے آپ سے خلافت کی بیعت کر لی تھی، پھر مصر شامل ہو گیا اور پھر یمن و حجاز وغیرہ۔ یہ سب لوگ حضرت معاویہ رض کو خلیفہ کہتے تھے اور امیر المومنین سمجھتے تھے۔ گویا اس وقت دو خلافتیں تھیں، اور دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں مبتلا۔ یہ تصور قطعاً باطل اور بے اصل ہے۔ جیسا کہ اب تک کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہو گا۔

چونکہ تحکیم ہی کو غلط اور خلاف واقعہ صورت دیدی گئی ہے اس لئے اس کی توثیق کے لئے یہ مہمل بات وضع کرنی پڑی۔ حالانکہ نہ روایتاً اس کا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگ خلیفہ کہتے تھے یا وہ خود اپنے آپ کو سمجھتے تھے، اور نہ درایتاً اس کا کوئی امکان تھا۔

وہ حضرات جنھوں نے چار برس تک سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے بیعت نہیں کی، حالانکہ انہی کی مملکت میں رہتے تھے وہ سیدنا معاویہ رض کی خلافت کی بیعت کس طرح کر سکتے تھے۔ جو بزرگوار ایک آئینی سقم کی بنا پر سیدنا علی رض سے بیعت نہ کریں، وہ ایک کھلی ہوئی غیر آئینی بات پر سیدنا معاویہ رض سے کیسے بیعت کر سکتے تھے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا سعید بن زید، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابو موسیٰ اشعری، سیدنا مغیرہ بن شعبہ، سیدنا محمد بن مَسلَمہ، سیدنا ابو مسعود، سیدنا اُسامہ بن زید وغیرہم جو امیر المومنین سیدنا علی رض کی مملکت میں رہتے تھے، ان کے علاقے امیر المومنین علی رض ہی کی موجودگی میں سیدنا معاویہ رض کے تحت چلے گئے تھے، ان کے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بغیر حجت اپنا

موقف تبدیل کر دیا۔ یا تو کہتے تھے کہ جب تک اجماع نہ ہو ہم بیعت نہیں کریں گے یا اس طرح بیعت کر لی کہ نہ شرعاً اس کی کوئی حیثیت ہے اور نہ عرفاً۔

ان سب بزرگواروں نے بیعت اسی وقت کی جب سیدنا حسنؓ نے صلح کر لی، اختلاف مٹ گیا، اور امت نے محسوس کر لیا کہ بیعت سیدنا معاویہؓ ہی سے ہونی چاہئے۔ اس بات کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیا جا سکتا کہ "عام الجماعۃ" سے پہلے عالمِ اسلام کے کسی گوشہ میں سیدنا معاویہؓ کو امیر المؤمنین کہا جاتا تھا، اور آپ اپنے آپ کو خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے۔

سیدنا معاویہؓ تو ہمیشہ یہ فرمایا کہ ہماری گردنوں میں ہمارے امام کی بیعت ہے جنھیں ظلماً شہید کیا گیا، انہی کی طرف سے ہم اُن کے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور انہی کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت یہ سب کام ہو رہا ہے۔ ہم بیعت اس وقت کریں گے جب جمہورِ امت کسی عادلانہ فیصلہ پر مجتمع ہو جائے۔

اب سوچنا چاہئے کہ جو شخص خلافت کے اختلافی ہونے کی بنا پر سیدنا علی مرتضیٰؓ جیسے سید الابرار سے بیعت نہیں کرتا وہ اسی اختلاف کے دَور میں اپنی بیعت کی طرف کس طرح بلا سکتا تھا، اور بلاتا تو اس کی سُنی کب جاتی!

بیشک اہلِ شام کو آپ سے بہت عقیدت تھی، لیکن یہ عقیدت دین کی بنیاد پر تھی، آئین کے نام سے تھی، ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ محض جذبات میں بہہ جائیں گے، اور یہ نہ سوچیں گے کہ جس اختلاف کی بنا پر وہ سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کر رہے تھے جن کی خلافت اکثر عالمِ اسلام میں تسلیم کر لی گئی ہے، تو پھر محض شام یا شام و مصر کے اتحاد سے برپا ہونے والی خلافت کس طرح اجماعی سمجھ لی جائے۔

اس کے علاوہ یہ ہے کہ اگر اہلِ شام کو سیدنا معاویہؓ نے رام کر لیا تھا تب بھی وہ ان صحابۂ کرام سے کیونکر بیعت کا مطالبہ کر سکتے تھے جو اَب تک محض اس لئے محترز تھے کہ اسے برپا کرنے والے لوگ اربابِ حل و عقد نہیں۔ شام میں بھی تو صحابۂ کرام کی ایک تعداد موجود تھی جو عملی سیاست میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔

ممکن ہے اہلِ شام نے، اہلِ مصر نے، اور اہلِ یمن و حجاز نے آپ سے بیعت کی ہو، لیکن یہ بیعت صرف موقف کی حمایت کی ہو سکتی تھی، یا ان کی قیادت تسلیم کر لینے کی۔ ایسی بیعت ہر مسلمان لے سکتا ہے۔ ایسی بیعت کو خلافت کی بیعت نہیں کہہ سکتے۔ صحاح میں اور تاریخ میں جہاں

کہیں سیدنا معاویہؓ کے نام کے ساتھ امیر المؤمنین کا لفظ آیا ہے وہ اسی زمانہ کا ہے جب آپ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو چکے تھے۔ اگر انھوں نے عام بیعت سے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ صحابۂ کرام کی نگاہ سے گر جاتے، کیونکہ ظاہر ہے کہ انھیں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے افضل و اقدم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

سیدنا معاویہؓ جو کچھ کر رہے تھے وہ سیدنا علیؓ کی خلافت کے خلاف نہیں تھا۔ ان کا کھلا ہوا مطالبہ تھا کہ قاتلانِ عثمانؓ سے علٰحدگی اختیار کر کے رائے عامہ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کریں تو ہم بیعت کر لیں گے۔ پھر ان جیسے فرزانہ شخص سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ جو موقف انھوں نے اکثر عالمِ اسلام کے خلاف اس جرأت سے اختیار کیا تھا، اور اتنی عظیم قربانیوں کے ذریعہ اسے مقبول بنایا تھا، اور لوگوں کی روز افزوں ہمدردیاں حاصل کی تھیں، اس موقف کو اپنے ہی ہاتھوں کمزور کر دیں گے، اور جس قصر کی تعمیر اس محنت سے کی اسے خود ہی منہدم کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔

ان کی مقبولیت کی بنا ہی یہ تھی کہ وہ مقتول علیہ خلیفہ کا انتقام لینے کھڑے ہوئے تھے، اور ان کی دعوت تھی کہ جو خلافت قائم ہو اسے جمہور کے استصواب سے برپا ہونا چاہئے نہ کہ باغیوں کے استبلاء سے۔ یہ موقف قطعاً باطل ہو جاتا اگر آپ خود خلافت کا دعویٰ کر بیٹھتے۔

بیشک سیدنا معاویہؓ کے لئے عام اجتماع نہیں ہوا، کیونکہ اس کی ضرورت جاتی رہی تھی۔ معاملات خود بخود صاف ہوتے جا رہے تھے، اور طبعی طور پر سوائے اُن کے اور کوئی نہ تھا جس پر پوری امت اعتماد کر سکے۔ ان کی بیعت ایسی ہی قدرتی تھی جیسے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت ہوئی تھی، کہ کسی دوسرے پر نگاہ ہی نہیں پڑتی تھی۔ عام اجتماع کی ضرورت تھی امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی موجودگی میں۔ جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سُرخرو کر کے اٹھا لیا تو اور کون تھا جو مرجع اَنام بن سکے؟

سیدنا معاویہؓ کی چوبیس برس کی سیاسی زندگی سب کے سامنے تھی، اور امت نے عملاً دیکھ لیا تھا کہ سوائے اس یگانۂ روزگار ہستی کے اور کوئی نہیں جو کشتیِ ملّت کا ناخدا بن سکے۔ وہ تمام حضرات جو شخصی اعتبار سے ان پر فضیلت رکھتے تھے، جن پر اجماع ہو سکتا تھا، اور جنھیں خلافت سونپی جاتی تو ہر طرح اس کے اہل ثابت ہوتے، مثلاً سیدنا سعد بن ابی وقّاص، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس، وغیرہم اور خود حضرت امیر المؤمنین حسنؓ جن کی خلافت کا عراق میں

اعلان بھی ہو چکا تھا، وہ سب کے سب سیدنا معاویہؓ کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا حسنؓ سے صلح ہوتے ہی تمام امّت نے آپ سے بیعت کر لی۔

صحابۂ کرام کی رائے ان کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہی کہ حکومت چلانے کی جو صلاحیت ان میں ہے وہ ان سے زیادہ کسی میں نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جو شخص فضائل و مکارم اور زہد و اتقاء میں سیدنا معاویہؓ سے بدرجہا افضل تھے وہ نظم و نسق، اور خلافتِ نبوّت کے اعتبار سے سیدنا معاویہؓ کو اپنے سے بدرجہا افضل سمجھتے تھے۔ ان تمام بزرگواروں کے سامنے سیدنا معاویہؓ کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تینوں خلفاء کا طرزِ عمل تھا، اور چوتھے خلیفہ کی بھی رائے وہ جانتے تھے۔ پھر خود بھی اپنی آنکھوں سے ان کی تمام کارگذاریاں دیکھتے آرہے تھے، اس لئے طبعاً ان پر اجماع کر لیا۔ کسی قسم کا تأمل و توقف نہ کیا۔

صحابہؓ کی رائے

حضرت فاروق اعظمؓ کی رائے اوپر مذکور ہوئی، کہ کس طرح شام کی تمام ذمّہ داریاں مستقل طور پر آپ نے ان کے سپرد کر رکھی تھیں، اور روز بروز ان پر اعتماد کرتے چلے گئے۔ جیسا اطمینان آپ کو ان کی طرف سے تھا ایسے اطمینان کا دعویٰ کسی اور صاحب کے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ہمیشہ اپنے اعتماد کا مظاہرہ عملاً و قولاً اس طرح کیا کہ شک و شبہ کی اس میں قطعاً گنجائش نہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا عُمیرؓ بن سعد انصاری اوسی رضی اللہ عنہ کو حمص کی ولایت سے معزول کر کے یہ علاقہ بھی سیدنا معاویہؓ کے تحت کر دیا تو لوگوں نے کہا، "دیکھو تو عُمیرؓ کو معزول کر کے یہاں کی حکومت معاویہؓ کو دیدی!"۔ سیدنا عُمیرؓ نے یہ سُن کر فرمایا:

لاتذکروا معاویۃ اِلّا بالخیر فانّی سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللّٰھم اھدِ بہٖ (ترمذی)	معاویہ کا تذکرہ صرف بھلائی کے ساتھ کیا کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے "خدایا اسے ہدایت کا ذریعہ بنا" (ترمذی)

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں (۸ : ۱۳۵، منقول از العواصم من القواصم) حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کا یہ قول نقل کیا ہے: ماراٴیت رجلاً اسود من معاویۃ (میں نے معاویہ سے زیادہ کسی شخص میں سرداری نہیں دیکھی)۔ لوگوں نے عرض کیا "(حضرت) عمرؓ میں بھی نہیں؟" فرمایا "عمرؓ ان سے بہتر تھے، مگر سرداری میں معاویہ ان سے زیادہ ہیں"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد ہے: ماراٴیت رجلاً اخلق بالملک من معاویۃ (میں نے کسی شخص میں حکومت کی اہلیت

معاویہ سے زیادہ نہیں دیکھی)۔"

سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں "ما رأیت احداً بعد عثمان اقضیٰ بالحق من صاحب ھٰذا الباب، یعنی معاویۃ (میں نے عثمان کے بعد کسی شخص کو ایسا سچا فیصلہ کرتے نہیں دیکھا جیسا یہ دروازہ والا کرتا یعنی معاویہ)۔"

نماز کے بارے میں حضرت ابو الدرداءؓ کا قول اوپر نقل ہو چکا کہ سیدنا معاویہؓ کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے نہایت درجہ مشابہت رکھتی تھی۔ سرداری، حکومت سے طبعی مناسبت معاملات کا تصفیہ بے لاگ کرنے کی عادت، جب ایک شخص میں ہو اور سب سے زیادہ یہ صفات اس میں پائی جائیں، اور پھر اس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہو، تو پھر کیسے ممکن ہو کہ امت کے قلوب خلافت کے لئے قدرتی طور پر اس کی طرف مائل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء اور امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی وصیت کا ظہور ان کی خلافت کی شکل میں اہل عالم نے دیکھا۔

امام بیہقیؒ نے نہایت قوی سند کے ساتھ جلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہؓ اسدی سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ سے (آپ کے مہلک زخم لگنے کے بعد) عرض کیا "الا تستخلف علینا؟ (آپ ہمارا کوئی خلیفہ مقرر نہیں فرما جاتے؟)"۔ فرمایا:

ما استخلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاستخلف ولکن ان یرد اللہ بالناس خیراً فسیجمعھم بعدی علی خیرھم کما جمعھم بعد نبیھم علی خیرھم۔	"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا کہ میں کر جاؤں۔ ہاں اگر اللہ کو لوگوں کے ساتھ بھلائی منظور ہو گی تو وہ میرے بعد انھیں اسی طرح اپنے بہترین شخص پر مجتمع کر دے گا جیسے ان کے نبیؐ کے بعد اس نے ان کے بہترین شخص پر مجتمع کر دیا تھا۔"

یہ سب روایتیں البدایۃ والنہایۃ کی ہیں، اور العواصم من القواصم سے نقل کی گئی ہیں۔ ان کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ واقعات سامنے ہیں اور صحابہ و اہل بیتؓ کا ان کے ساتھ طرز عمل بھی۔ یہی وجوہ تھے جو طبعی طور پر امت کا اجماع سیدنا معاویہؓ پر ہو گیا۔ اور اس کی ضرورت نہ پڑی کہ عام اجتماع میں باقاعدہ تحریک و تائید کے ذریعہ ان کی خلافت کا مسئلہ پیش ہو کر طے پائے۔ جو لوگ اس قسم کا اجتماع نہ ہونے کو دلیل بنا کر سیدنا معاویہؓ کی خلافت کی حجیت کو مشتبہ بتاتے ہیں، کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انتخاب خلیفہ کے لئے ایسا اجتماع حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر حضرت

علیؓ مرتضیٰ تک کسی کے لئے ہوا تھا، جو یہ نیا سنگِ بنیاد امیر المؤمنین معاویہؓ کی خلافتِ رسالت کو مشتبہ بنانے کے لئے رکھا گیا ہے؟ بیعت تو اربابِ حل و عقد میں سے ایک دو آدمیوں کے کر لینے سے بھی منعقد ہو جاتی ہے۔ ان اربابِ حل و عقد میں سیدنا حسنؓ سے زیادہ کون ہوگا اور ان بزرگواروں کے مقابلہ میں کسے پیش کیا جا سکے گا جن کے بیعت کر لینے سے اب تک کے تمام خلفاء کی خلافت کی حجیّت قائم ہوئی تھی؟ ان سب نے برضاء و رغبت ان سے بیعت کی، حالانکہ انہی حضرات نے سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کی تھی۔ مسعودی نے حضرت ابن عمرؓ پر اپنی دانست میں بڑی چوٹ کی ہے، کہ انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی، لیکن حضرت معاویہؓ اور یزید بن معاویہؓ سے کی۔ اس قسم کے لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آئی کہ حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک خلافت اس وقت مسلّم ہوتی ہے جب امت کا اجماع ہو جائے۔ حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ پر چونکہ اجماع ہو گیا تھا اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے ان سے اور امیر المؤمنین یزیدؒ سے بیعت کر لی، اور پھر امیر المؤمنین عبد الملکؒ اور امیر المؤمنین الولیدؒ سے، لیکن حضرت علیؓ اور حضرت ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی، کیونکہ ان دونوں کی خلافت پر امت کا اجماع نہیں ہوا تھا۔

حضرت معاویہؓ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خاص کوفہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو چاہتے تھے کہ زمامِ امت اُن کے ہاتھ میں آجائے۔ اسلام کی جب سچی تاریخ مدوّن کی جائے گی تو سیدنا معاویہؓ کا نام پُشتیبانِ امت کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ اور یہ نام مُحسنینِ ملّت کی فہرست میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔ صلوات اللہ وسلامہ ورضوانہ علیہ۔

قتلِ عثمانؓ کا فتنہ ارتدادِ عرب سے کم نہ تھا، اور کشتیٔ ملّت اسی طرح ڈگمگا رہی تھی جس طرح سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کا عالم تھا۔ لوگ اپنے مقاصد کے تحت چاہتے ہیں کہ امّت سیدنا عثمانؓ کی شہادت کو بھول جائے۔ لیکن یہ وہ چیز ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، کیونکہ جسمِ ملّت پر جو چرکہ لگتا ہے اس سے عثمانؓ ہی کے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ اس عالم میں کامیاب ذات صرف ایک سیدنا معاویہؓ کی تھی جنھوں نے مقدور بھر سبائیہ کی کوششوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اور جمہور امت نے انھیں اپنا متفق علیہ امام بنا لیا، اور اموی خلافت کے استحکام میں بقائے ملّت سمجھی۔

الفئۃ الباغیۃ

(باغی ٹولی)

صِفّین کا جب ذکر آتا ہے تو مدعیانِ علم کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سُنا دیا جاتا ہے، جو اُن لوگوں کی دانست میں ایسی حجت ہے کہ آگے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یعنی حق سیدنا علیؓ کے ساتھ تھا، اور سیدنا معاویہؓ کی جماعت باغی ٹولی تھی۔ (صحیح بخاری: ج ۲، کتاب الجہاد والسیر، ک ۵۶، ب ۱۷، طبع مصر)۔ حضرت عِکرمہؓ کے حوالہ سے یہ حدیث مروی ہے:-

عن عکرمۃ انّ ابن عباس قال لہ ولعلیّ بن عبد اللہ ائتیا ابا سعیدٍ فاسمعا من حدیثہ فاتیناہ وہو واخوہ فی حائط لہما یسقیانہ۔ فلما رآنا جاء فاحتبی وجلس فقال کُنّا ننقل لَبِنۃً لَبِنۃً وکان عمّار ینقل لَبِنَتَین لَبِنَتَین فمرّ بہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم ومسح عن رأسہ الغبار وقال ویح عمّار تقتلہ الفئۃ الباغیۃ۔ عمّارُ یدعوہم الی اللہ ویدعونہم الی النار۔

حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان سے اور حضرت علی بن عبد اللہؓ (اپنے فرزند) سے فرمایا "تم دونوں ابو سعیدؓ (خدری) کے پاس جاؤ اور اُن کی باتیں سنو"۔ ہم دونوں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ اور ان کے بھائی اپنے باغ کو پانی دے رہے تھے۔ ہمیں جو دیکھا تو تشریف لے آئے، اور ٹانگوں کے گرد کپڑا لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ پھر (دورانِ گفتگو میں) فرمایا مسجد کے لئے ہم ایک ایک اینٹ ڈھو رہے تھے، لیکن عمار دو دو اینٹیں ڈھوتے تھے۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گذر ہوا۔ آپؐ نے ان کے سر سے خاک جھاڑی اور فرمایا "کیا کہنے ہیں عمار کے! انھیں باغیوں کی ٹولی قتل کرے گی۔ عمار تو انھیں اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ انھیں آگ کی طرف دعوت دیتے ہوں گے"۔

سیدنا عمارؓ کے بارے میں یہ حدیث تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ متعدد صحابہ کرام سے صحاح میں مروی ہے۔ اتنی سندوں سے جو بات کئی صحابہ سے مروی ہو وہ یقیناً شہرت پا چکی ہوگی۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ اس وقت ہو گئی ہو گی جب انھوں نے امت کی عملی سیاست

میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

امت کی بدقسمتی سے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ فتنہ میں مبتلا ہو کر امیر المؤمنین سیدنا عثمان صلوات اللہ علیہ کے خلاف ہو گئے تھے۔ اور اس مخالفت میں کچھ عملی حصہ بھی لیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ قریش کی بالادستی کے خلاف تھے۔ اسی کے نتیجہ میں سبائیوں نے ان کا نام بہت اچھالا ہے، لیکن اس بات کا کوئی عملی ثبوت نہیں کہ آپ واقعی حضرت امیر المؤمنینؓ کے اتنے خلاف تھے کہ ان کے قتل کے درپے ہو جائیں، یا قریش کو اتنا بُرا سمجھتے ہوں کہ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ معمولی اختلافات جو ہر معاشرہ میں ہوتے ہیں صحابہ کے مابین بھی تھے۔ لیکن فرقہ بازی اور جتھہ بندی ان میں قطعاً نہیں تھی۔ اگر کسی اجتہادی مسئلہ میں زبردست اختلاف ہو گیا جیسے سیدنا عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہو گیا تھا، اور دشمنانِ ملت کی چالاکی اور مکاری سے شمشیر زنی تک نوبت پہنچ گئی تھی، تو صحابۂ کرام نے اسے دین کا اختلاف نہیں بنایا، اور نہ وہ اپنا سود و زیاں ایک دوسرے سے جدا سمجھتے تھے۔ اختلاف کی حالت میں بھی ایک ہی جماعت رہتے تھے، اور اختلاف کے بعد بھی بے تکلف ایک ہو جاتے تھے۔ اوپر غیر مبایعین کے تحت سیدنا عمارؓ ہی کی بابت اسی صحیح بخاری سے ہم ایک حدیث نقل کر چکے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلافی مسائل میں صحابۂ کرام ایک دوسرے کی حرمت کس طرح برقرار رکھتے تھے۔

سیدنا عمارؓ کے منہ سے سیدنا عثمانؓ کے خلاف کچھ کلمات بیان کئے گئے ہیں، اور ان میں سے بعض نہایت ناشائستہ اور تکلیف دہ ہیں، لیکن چونکہ وہ بااحتیاط لوگوں کے روایت کردہ نہیں، اس لئے ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ بعض حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے، اور سب جانتے ہیں کہ قاتلانِ عثمانؓ کی شرارت سے سیدنا عمارؓ بھی جنگوں میں شامل ہوئے، اور صفین کے معرکہ میں شہادت پائی۔ اس لئے فتنہ پرداز لوگوں کو آپ کے متعلق باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔ مثلاً یہ حدیث جو اوپر مذکور ہوئی اس میں آگ کی طرف دعوت دینے کا ذکر ہے، جو اسی موضوع پر دوسری حدیثوں میں نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اضافہ کسی بعد کے راوی کا ہو۔

بہرحال معاملہ صاف ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، اور صفین کی جنگ میں سیدنا معاویہؓ کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ جمہور صحابہ جو سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ دونوں کو حق پر سمجھتے تھے، اور اب تک فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کا نہ دیں، ان پر سیدنا عمارؓ کی شہادت سے مسئلہ واضح

ہو جانا چاہیئے تھا کہ سیدنا معاویہؓ سے قتال واجب ہو گیا۔ کیونکہ سیدنا عمارؓ کی شہادت سے اُن کے باغی ہونے پر مہر لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (الحجرات : ۹۔۱۰) :

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔

اگر اہل ایمان کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو، اب اگر ان میں سے کوئی (گروہ) دوسرے کے خلاف بغاوت کرے تو تم اس باغی گروہ سے جنگ کرو تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ اب اگر وہ جھک جائے تو پھر اُن کے مابین انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور اپنے فیصلہ میں بے لاگ رہو۔ اللہ تعالیٰ بے لاگ رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہی تو ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے ساتھ صلح وصفائی رکھا کرو۔"

اس بدیہی حکم کی موجودگی میں سیدنا عمارؓ کی شہادت کے بعد تمام شکوک و شبہات رفع ہو جانے چاہیئے تھے۔ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب قرآن بلند کیا گیا، تو اس وقت بھی جنگ بند کر دینے کی شرط یہ ہونی چاہیئے تھی کہ ہتھیار ڈال کر بیعت کریں، اور پھر عدالت میں اپنا قضیہ لائیں، ورنہ قتال جاری رہے گا۔

لیکن جمہور صحابہؓ نے، ثالثوں نے، اور خود امیر المؤمنین سیدنا علیؓ نے بالکل برعکس کام کیا۔ صحابہ اپنی غیر جانبداری پر قائم رہے، سیدنا علیؓ نے معاملہ ثالثوں کے ہاتھ میں دے کر اپنا موقف خود ہی کمزور کر دیا، اور اپنا وہ امام ہونا مشکوک بنا لیا جس کی اطاعت واجب ہے۔ اور ثالثوں نے جو فیصلہ کیا وہ یقیناً سیدنا علیؓ کے موافق نہیں تھا۔ موافقت کے صرف ایک ہی معنے تھے کہ ثالثوں کی طرف سے سیدنا علیؓ کے امام برحق ہونے کا اعلان کر دیا جاتا، جو نہیں کیا گیا۔

تاریخی صورتِ حال جو ہمارے سامنے ہے وہ حسب ذیل امور بتاتی ہے :

(۱) حضرت علیؓ کا یقین کے ساتھ حق پر ہونا، اور حضرت معاویہؓ کا یقین کے ساتھ باطل پر ہونا مسلّم نہ رہا۔

(۲) مسئلہ کا تصفیہ سیدنا علیؓ کی موافقت میں نہیں کیا گیا، بلکہ اس کا بدستور مشکوک و مشتبہ ہونا تسلیم کر لیا گیا۔

(۳) متارکہ جنگ کی مدت ہی میں سیدنا علیؓ کی شہادت ہو گئی، تو سیدنا حسنؓ نے سیدنا معاویہؓ

سے صلح کر کے ان کی بیعت کر لی۔

(۴) تمام امت نے اسی شخص پر اجماع کر لیا جسے ان مؤرخوں اور عالموں کے بقول لسانِ نبوت نے باغی ٹولی کا سر گروہ بتایا ہے۔

اب اس صورتِ حال سے صرف حسب ذیل نتیجہ بر آمد ہوتا ہے:

(۱) یہ حدیث باوجود کثرت تناقل کے غلط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی، اور صحابۂ کرام ایسی کسی حدیث سے واقف نہ تھے۔

(۲) اگر یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں تو تمام صحابۂ کرام مع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دین سے قطعاً بیگانہ تھے۔ اور انھیں اس کی کچھ پروانہ تھی کہ اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم دیا ہے، انھوں نے اللہ اور رسولؐ کے خلاف عمداً اور صراحتاً اجماع کر کے اپنے کفر پر مہر لگادی۔

(۳) اگر حدیث بھی صحیح ہے اور صحابہ بھی وہی تھے جو اللہ نے انھیں بتایا ہے، اور امت انھیں سمجھتی ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ انھوں نے سیدنا معاویہؓ کو قتلِ عمارؓ کا مرتکب گردانا، اور نہ انھیں باغی سمجھا۔ بلکہ صحابہ اور جمہور امت کے نزدیک قتلِ عمارؓ کے مرتکب وہی لوگ تھے جنھوں نے فتنہ و فساد بپا کر کے قتال و جدال کی صورت پیدا کی۔

سیدنا معاویہؓ کا ایک قول مروی ہے جسے لوگ طنزاً بیان کرتے ہیں، کہ آپ نے جب سیدنا عمارؓ کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا "عمار کے قاتل وہ ہیں جو انھیں میدانِ قتال میں لائے" اور اس پر طعن کیا جاتا ہے کہ گویا شہدائے بدر و اُحد کے قاتل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو انھیں میدان میں لائے تھے۔

سیدنا معاویہؓ کا یہ قول اگر صحیح ہے تو آپ نے بالکل درست فرمایا۔ نہ سیدنا عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا جاتا، نہ سبائی لوگ خلافتِ مرتضوی پر حاوی ہوتے، نہ جمل و صفین میں مصالحت کی فضا پیدا ہونے کے بعد جنگ چھڑتی، اور نہ بے وجہ مسلمانوں کا کشت و خون ہوتا۔ بدر و احد کے شہیدوں کے بھی قتل کے ذمہ دار وہ کفار تھے جو اُن جنگوں کا سبب بنے، نہ کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو صلح و امن اور عدل کے لئے تشریف لائے ہیں، اور جن کے ذریعہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اپنی حفاظت کے لئے دی گئی تھی۔ (الحج: ۳۹):

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ	جن لوگوں سے جنگ کی جاتی ہے (انھیں جوابی

وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِہِمْ لَقَدِیْرُ ۔ اِلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِہِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ..... الآیۃ۔

حملہ کی اجازت ہے، اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے یہ لوگ وہ ہیں جنھیں ان کے گھروں سے بے وجہ نکالا گیا، ان کا قصور کچھ نہ تھا سوائے یہ کہنے کے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے ۔۔۔۔ الخ

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جن حضرات نے سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کی تھی، وہ ایک جم غفیر تھا۔ اور جمہور امت جمل وصفین کے محاربہ میں غیر جانبدار تھی، محض اس سبب سے کہ وہ سیدنا علیؓ اور اصحابِ جمل وصفین کے موقف میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے اپنا یہ موقف سیدنا عمارؓ کی شہادت کے باوجود نہیں بدلا۔ اور سیدنا علیؓ کی شہادت کے بعد سیدنا معاویہؓ کی بیعت پر اجماع کر لیا۔

جنگِ جمل سے پہلے حضرت امیر المؤمنین اور اصحابِ جمل کے مابین صلح کی جو شرط طے ہوئی تھی وہ یہی تھی کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے، اور انھیں مثل ان مرتدوں کے سمجھا جائے جن کا قتل واجب ہے، چنانچہ سیدنا علیؓ نے حکم دیدیا تھا کہ جو لوگ قتلِ عثمانؓ میں شریک ہیں وہ ہماری جماعت سے باہر ہو جائیں۔ اس لئے یہ ہزارہا لوگ لشکر سے باہر چلے گئے۔ سیدنا قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی مساعی جمیلہ سے امت کا یہ متفق علیہ مسئلہ طے ہوا تھا۔ صبح کو صلحنامہ پر دستخط ہونے والے تھے اسی لئے مسلمان اس رات چین کی نیند سوئے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

بے چینی اور تشویش صرف سبائیوں کو تھی اس لئے رات کو اندھیرے میں انھوں نے جنگ چھیڑ دی تاکہ قصاص کا یہ اجماعی فیصلہ بروئے کار نہ آسکے۔ جمہور صحابہ اور امت کا یہی متفق علیہ مسئلہ لے کر سیدنا معاویہؓ کھڑے ہوئے تھے، تو پھر صحابۂ کرام انھیں "باغی ٹولی" میں کیسے سمجھ لیتے۔ انھوں نے تو شروع سے لے کر آخر تک انھیں بھی ایسے ہی حق پر سمجھا جیسے امیر المؤمنین سیدنا علیٰ مرتضیٰؓ کو۔

صحابۂ کرام چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں باہمی جنگ نہ ہو اور ان کی مجموعی قوت ان باغیوں کے خلاف صرف ہو، گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ اجماعی مسئلہ تھا کہ "الفئۃ الباغیۃ" یعنی باغی ٹولی ان سبائیوں کی ہے چاہے وہ سیدنا علیؓ کے ساتھی بن کر جمہور صحابہ کو گردن زدنی سمجھیں، اور چاہے خارجی بن کر سیدنا علیؓ کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرنے والے ہوں۔ ان دونوں فرقوں کے خلاف صحابۂ کرام نے ہمیشہ جہاد کو واجب جانا۔ شروع سے لے کر آج تک امت مسلمہ کا یہی متفق علیہ موقف ہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت سے الگ ہو گئے، ان کا تعلق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (الانعام : ١٦٠):

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔

جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کئے اور ٹولیوں میں بٹ گئے، تمھارا (اے نبی) ان سے کسی بارے میں کوئی تعلق نہیں۔ اُن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کیا حرکتیں کیا کرتے تھے۔

کسی زمانہ میں جماعت نے سیدنا معاویہؓ کو باغی نہیں سمجھا، اور نہ خود سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے۔ لیکن سبائیوں کو ہمیشہ سب نے باغی جانا اور خود سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے بھی۔ اسی لئے جنگِ جمل سے پہلے آپ نے انھیں اپنے لشکر سے نکال دیا تھا، اور اسی لئے آپ نے خوارج سے جنگ کی اور اُن کے ساتھ مرتدوں کا معاملہ کیا۔ وہ لوگ جنھوں نے امیر المؤمنین عثمانؓ کے خلاف ہنگامہ بپا کیا اور آپ کو شہید کر دیا، اور اس طرح اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے درپے ہوئے، ان کے متعلق امیر المؤمنین علیؓ کے بھی جذبات وہی تھے جو بقیہ اہل بیت اور اصحابِ کرام کے ہمیشہ رہے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

جنگِ جمل کے موقعہ پر آپ نے کوفہ میں جو تقریر کی اس کا اقتباس طبری نے پیش کیا ہے (٥ : ١٩٤)۔ واقعات ثابتہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ واقعی آپ نے اپنے جذبات کا انہی الفاظ میں اظہار کیا ہوگا۔ آپ نے امت پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بیان کئے، کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی بنائی ہوئی جماعت کی شیرازہ بندی آپ کے خلیفہ برحق کے ذریعہ کی گئی، اور پھر خلیفہ دوم کے ذریعہ اور ان کے بعد خلیفہ ثالث کے ہاتھوں۔ ان ہنگامہ پروروں کے متعلق آپ نے فرمایا:

ثم حدث ھٰذا الحدث الذی جرّہ علی الامۃ اقوامٌ طلبوا ھٰذا الدنیا، حسدوا من افاء اللّٰہ علیہ علی الفضیلۃ وارادوا ردّ الاشیاء علیٰ ادبارہا۔

پھر یہ حادثہ رونما ہوا۔ ایسے امت پر ان لوگوں نے لاڈالا جو دنیا کے طلبگار تھے اور ان لوگوں سے حسد کرتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے فضائل کے سبب اپنی نعمتوں سے نوازا (صحابہ کے ان حاسدوں اور باغیوں نے) چاہا کہ حالات کو قدیم دورِ جاہلیت کی طرف لوٹا دیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنے والی جماعت جو پہلے دن سے آج تک جماعت چلی آتی ہے، اور جسے پہلے دن سے آج تک اسلام کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے، اور سوائے

اس جماعت کے کسی دوسری ٹولی کو یہ شرف کسی درجہ میں کبھی حاصل نہیں ہوا، اس جماعت کا مذہب حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں جو بیان فرمایا ہے (۲: ۲۱۹-۲۲۰) اس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس بیان میں آپ نے اہلِ کلام، اہلِ فقہ اور اہلِ حدیث کے جو مذاہب گنائے ہیں ان میں عمومیت کے ساتھ سب نے سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ دونوں کو حق پر بتایا ہے، دونوں کو مجتہد کہا ہے، اور دونوں کا شمار ائمۂ ہدیٰ میں کیا ہے۔ البتہ بعض ہیں جنھوں نے سیدنا معاویہؓ کی خطا اجتہادی بتائی ہے، لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ یہ سب مذاہب بیان کر کے حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

ومنهم من يقول كان الصواب ان لا يكون قتالٌ وكان ترك القتال خيراً للطائفتين فليس فى الاقتتال صوابٌ ولكن عليٌ كان اقرب الى الحق من معاوية۔ والقتال قتال فتنة ليس بواجب و لامستحب وكان ترك القتال خيراً للطائفتين مع ان علياً كان اولىٰ بالحق۔ هٰذا قول احمد واكثر اهل الحديث و اكثر ائمة الفقهاء، وهو قول اكابر الصحابة و التابعين لهم باحسان۔ وهو قول عمران بن حصين رضى الله عنه وكان ينهىٰ عن بيع السلاح فى ذٰلك القتال ويقول هو بيع السلاح فى الفتنة وهو قول اسامة بن زيدٍ ومحمد بن مَسْلَمَة وابن عمرُ و سعد بن ابى وقّاص واكثر من بقى من السابقين الاوّلين من المهاجرين والانصار رضى الله عنهم، ولهٰذا كان مذهب اهل السنة الامساك عما شجر

ان میں سے بعض کہتے ہیں " بہتر تھا کہ قتال نہ ہوتا، اور مناسب تھا کہ دونوں فریق نہ لڑتے۔ کیونکہ لڑائی میں کوئی بھلائی نہیں، لیکن معاویہؓ کے مقابلہ میں علیؓ حق کے زیادہ قریب تھے۔ مگر لڑنا فتنہ کی بات تھی جو نہ واجب ہے نہ مستحب بلکہ دونوں کے لئے بہتر تھا کہ نہ لڑیں۔ اگرچہ حق علیؓ کے زیادہ قریب تھا۔ یہ قول امام احمدؒ کا ہے۔ اور اکثر اہلِ حدیث، اور اکثر ائمۂ فقہا۔ کا۔ اور یہی قول ہے اکابر صحابہؓ کا، اور خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں کا۔ اور یہی قول ہے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا۔ وہ اس جنگ میں ہتھیاروں کی خرید فروخت کو ناجائز کہتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے یہ بیع فتنہ انگیز ہو گی۔ یہی قول ہے حضرت اسامہ بن زید، حضرت محمد بن مَسْلَمَہ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور اکثر ان حضرات کا جو قدیم مہاجرین اور انصار میں سے اس وقت موجود تھے، رضی اللہ عنہم۔

بین الصحابۃ فانہ قد ثبتت فضائلھم و وجبت موالاتھم و محبتھم۔

اسی لئے اہل سنت کا یہ مذہب ہے کہ صحابہ کے اختلافات کے ذکر کے وقت اپنی زبان روکیں۔ کیونکہ ان کے فضائل ثابت ہیں ان کا ساتھ دینا واجب ہے اور ان کی محبت فرض ہے۔

اس بیان کو حضرت شیخ الاسلام نے اس طرح شروع کیا ہے :۔

لم یکن معاویۃ ممن یختار الحرب ابتداءً بل کان اشد الناس حرصاً علیٰ ان لّا یکون قتالٌ و کان غیرہ احرص علی القتال منہ۔

معاویہؓ ان میں نہیں جو لڑائی چھیڑنا چاہتے تھے بلکہ سب سے زیادہ خواہش تو انہی کی تھی کہ لڑائی نہ ہو۔ البتہ دوسرے لوگ جنگ چھیڑنے میں ان سے زیادہ حریص تھے [یعنی سبائی لوگ، ...... جنھوں نے صلح کا ہر موقعہ غارت اور جنگ کو ہر زمانہ میں ہوا دی]

کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ سیدنا معاویہؓ نے جنگ کے لئے کبھی پیش قدمی کی ہو۔ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ جنگ جمل کے وقت اپنی فوجیں لے آئیں اور اس وقت سیدنا علیؓ کو ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کے لئے آسان تھا کہ جنگِ جمل کے ختم ہوتے ہی اپنی فوجیں حرکت میں لے آئیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ نہروان کے قضیہ کے بعد عراق پر حملہ کر دیں، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ سیدنا علیؓ کی شہادت کے بعد ایک دم اپنی خلافت کا اعلان کر کے سیدنا حسنؓ پر حملہ کر دیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہر موقعہ پر صبر و ضبط سے کام لیا، اور کوشش کی کہ جنگ کی آگ نہ بھڑکے۔ انھوں نے صفین کی جنگ میں ابتدا نہیں کی، اور نہ اپنی فوجیں سیدنا علیؓ کی فوجوں کی حرکت سے پہلے حرکت میں لائے، اور وہی تھے جنھوں نے صفین کی جنگ بند کرائی۔ گویا انھوں نے ہمیشہ مدافعانہ جنگ کی، اور جب تک مجبور نہ ہو گئے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایسا شخص باغی ٹولی کا امام کیسے کہلا سکتا تھا۔ اور صحابہ کرام جو تمام احوال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ انھیں فئۃ باغیہ میں کیسے سمجھ سکتے تھے۔

یہی سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جو الفئۃ الباغیۃ کی حدیث کے راوی ہیں، انہی کی روایت خوارج کے متعلق صحیح مسلم میں موجود ہے (صحیح مسلم: ک ۱۲، ج ۳، طبع مصر) :۔

تمرق مارقۃ عند فرقۃ المسلمین یقتلھا اولی الطائفتین بالحق۔

"مسلمانوں کے اختلاف کے زمانہ میں ایک ٹولی جماعت سے باہر ہو جائے گی۔ اور اس کو جماعت کا وہ فریق قتل کرے گا جو حق سے زیادہ قریب ہوگا۔"

خوارج کے اس گروہ نے صفین کے بعد ملت سے علیحدگی اختیار کی، اور امیر المؤمنین علیؓ نے اسے قتل کیا جو حق سے زیادہ قریب تھے۔ گویا اس حدیث کے مطابق حق سیدنا معاویہؓ کے ساتھ بھی تھا، اور یہ دونوں فریق جماعتِ حقہ سے تعلق رکھتے تھے، برخلاف خوارج کے جو مسلمانوں کی جماعت سے باہر ہوگئے تھے۔

سیدنا ابوسعیدؓ کی یہ حدیث اپنے پورے پس منظر کے ساتھ صحیحین میں اس طرح ہے:-

قال بعث علیؓ رضی اللہ عنہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بذهیبة فقسمها بین الاربعة الاَقرَع بن حابس الحنظلی ثم المجاشعی، وعُیَینة بن بدر الفزاری، وزید الطائی ثم احد بنی نبهان، وعَلقمَة بن عُلاثة العامری ثم احد بنی کلاب۔ فغضبت قریش والانصار قالوا یعطی صنادید اهل نجد ویدعنا؟ قال "انما اتألفهم" فاقبل رجلٌ غائر العینین مشرف الوجنتین، ناتی الجبین کث اللحیة، محلوق فقال اتق اللہ یا محمد! فقال من یطع اللہ اذا عصیتُ؟ ایأمنّی اللہ علی اهل الارض فلا تأمنونی؟" فسأله رجلٌ قتلَه، احسبه خالد بن الولید فمنعه۔ فلما ولّٰی قال انّ من ضئضئ هذا او فی عقب هٰذا قوم یقرءون القرآن لایجاوز حناجرهم یمرقون من الدین مروق السهم من الرمیّة یقتلون اهل الاسلام ویدعون اهل الاوثان لئن ادرکتهم لاقتلنّهم قتل عاد۔

فرماتے ہیں (سیدنا) علیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑا سا سونا بھیجا۔ آپ نے اسے ان چار آدمیوں پر تقسیم کر دیا۔ اَقرَع[1] بن حابس حنظلی مجاشعی، عُیَینہ[2] بن بدر الفزاری، زید[3] طائی نبہانی، اور علقمہ[4] بن عُلاثہ عامری کلبی۔

....

....

....

اس پر قریش اور انصار کو ناگواری ہوئی کہ نجد کے بڑے لوگوں پر تو نوازش ہو رہی ہے اور ہمیں نظر انداز کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تو محض ان کی دلجوئی کر رہا ہوں" اتنے میں ایک شخص آیا آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، کنپٹیاں اٹھی ہوئیں، پیشانی پر گومڑا، خوب گھنی داڑھی اور سر گھٹا ہوا۔ آتے ہی کہنے لگا "محمد! خدا سے ڈرو!" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بھلا میں نافرمانی کروں گا تو خدا کی اطاعت کرنے والا کون ہوگا، خدا نے مجھے اہل زمین کا امین بنایا ہے، تو کیا تم مجھے امین نہیں سمجھتے؟" اس پر ایک صاحب نے اُسے قتل کرنے کی اجازت مانگی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ شاید وہ

خالدؓ بن ولید تھے۔ مگر آپ نے منع فرما دیا۔ وہ شخص جب چلا گیا تو آپ نے فرمایا اس کی نسل سے یا فرمایا اس کی پشت سے ایک گروہ پیدا ہو گا جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے۔ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔ اگر میرے زمانہ میں یہ پیدا ہوئے تو انھیں ایسے قتل کروں گا جیسے قوم عاد کو فنا کر دیا گیا۔"

اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خوارج کو اسلام دشمنی اور مسلم کشی ورثہ میں ملی تھی، اور یہ خوارج اپنی اصل میں سبائی ہی تھے، جنھوں نے امیر المؤمنین عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی، اور اس فتنہ کو فروغ دینے کے لئے سیدنا علیؓ کے ہوا خواہ بنے اور جب صلح و آشتی کی فضا پیدا ہونے لگی تو سیدنا علیؓ کے بھی خلاف ہو گئے۔ غرض یہ ہے کہ سبائی لوگ جس رنگ میں بھی ظاہر ہوئے مآل ہمیشہ نکلا نبیؐ کے اصحاب سے عداوت، اور جماعت میں انتشار پھیلانے کی کوشش۔ اصحابِ نبیؐ اور اہل ایمان کی یہ بات نہیں۔ سیدنا حسنؓ کے متعلق سیدنا معاویہؓ سے صلح کے بارے میں جو متفق علیہ حدیث ہے اس میں بھی صحابہ اور تابعین کے دونوں گروہوں کو مسلمانوں کا عظیم گروہ بتایا گیا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ سیدنا علیؓ، سیدنا معاویہؓ اور امت کے غیر جانبدار سوادِ اعظم کے درمیان جو اختلاف تھا وہ اجتہادی تھا، اور اجتہادی اختلاف میں فرق حق و باطل کا نہیں ہوتا، بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے، جمہور صحابہؓ نے، اور اصحاب کا اتباع کرنے والی جماعت نے، دونوں گروہوں کو ملّتِ اسلامیہ کے دو گروہ کہا ہے۔ اخوت کی لڑی میں منسلک بتایا ہے، اور ان میں باہمی صلح و آشتی کی فضا قائم رکھنی واجب کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ فتنہ جو لوگوں کی حرکتوں سے جماعت اسلام میں جب انتشار ہو اور اس کی لپیٹ میں صلحاء بھی آجائیں، تو تم فریق مت بننا، بلکہ اُس حیات بخش طریقۂ کار پر جمے رہنا جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر کیا ہے۔ اور ان فتنہ جُو لوگوں سے ہشیار رہنا جو دلوں کو اپنی خرافات کے ذریعہ خراب کرنے کے درپے ہوں۔ [الانفال: ۲۴-۲۵] :-

یا ایہا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون۔	اے اہل ایمان جب اللہ اور رسول تمھیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمھارے لئے حیات بخش ہے تو اُن کی بات دل سے قبول کر لو اور جان رکھو

واتقوا فتنۃً لاتصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃً واعلموا ان اللہ شدید العقاب۔	کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی (یاد رکھو) کہ اسی کے

حضور تمھیں جانا ہے۔ ان فتنوں سے ڈرتے رہنا جس کی لپیٹ میں محض وہی لوگ نہیں آئیں گے جو ظالم ہوں اور جانتے رہو کہ اللہ کا عذاب سخت ہوا کرتا ہے۔"

صحابۂ کرام کی عظیم اکثریت نے اسی حکم ربانی کی پیروی کی، اور جو حضرات فتنوں میں مبتلا ہوئے وہ بھی فوراً سنبھل گئے، اور اس کی تلافی کی کوشش کی۔

ہمارے اس بیان کی توثیق کے لئے صحابۂ کرام کا عمل کافی ہے۔ جمل وصفین کی جنگوں میں شرکت سے انھیں گریز تھا، جو جنگ میں مبتلا ہوئے انھوں نے اطمینانِ قلب کے ساتھ ذرا سے اشارہ پر جنگ بند کردی، فریقین نے اپنا معاملہ ثالثوں کے سپرد کر دیا، ان کے فیصلہ کا اپنے آپ کو پابند بنایا، پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ آپس میں صلح کرلی، سیدنا معاویہؓ پر اجماع کرلیا، اور سب ایسے شیر وشکر ہوگئے جیسے ان رنجشوں سے پہلے تھے۔ وہی محبت وہی باہمی تعظیم وتکریم، اور ایک دوسرے کے جذبات کی پاسداری اور حقوق کی نگرانی۔

برخلاف اس کے صحابہ نے خوارج اور سبائیوں کو ملتِ اسلامیہ کا دشمن اور دعوتِ محمدیہ کا مخالف جانا، انھیں کبھی جماعت میں شامل نہ سمجھا، اور ہمیشہ اُن کے خلاف شمشیر بکف میدان میں اُترنے پر تیار رہے۔ یہی سبب ہے کہ خوارج اور سبائیہ دونوں کو جمہور صحابہ سے نفرت ہے۔ اور ان کی سنت مٹانے کی فکر۔

سیدنا حسنؓ نے صلح کی شرائط میں یہ بات رکھی تھی کہ اہل عراق سے جنگ کا انتقام نہیں لیا جائے گا۔ سیدنا معاویہؓ نے یہ شرط منظور کرلی اور اس کی پوری پاسداری کی، بلکہ اُن کے خلاف کبیدگی کو دل سے قطعاً نکال دیا۔ جتنے مسلمان آپ کے خلاف لڑے تھے ان میں سے نہ کسی کی طرف سے دل میں میل رکھا اور نہ ان اہل ایمان نے سیدنا معاویہؓ سے اخلاص رکھنے میں کبھی کمی کی۔ تمام صحابہ اور اہل بیت اطہار کا رویہ سیدنا معاویہؓ کے ساتھ بغایت محبّت ومودت وعقیدت کا تھا۔

لیکن آپ نے تحقیقات کے بعد چُن چُن کر سبائی گروہ کے افراد کو قتل کیا۔ اس قتل پر سیدنا حسنؓ اور صحابۂ کرام کی طرف سے قطعاً کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ بلکہ سب نے اسے بنظرِ استحسان دیکھا کیونکہ سب کی خواہش تھی کہ یہ مفسد طبقہ ختم کر دیا جائے۔

حُجر بن عدی

صرف ایک ذات حجر بن عدی کی ہے۔ اُن کے قتل پر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور بعض دوسرے صحابہ نے اعتراض کیا تھا حضرت ام المومنینؓ نے اپنی طرف سے قاصد بنا کر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حارث کو بھیجا۔ لیکن ان کے دمشق پہنچنے سے پہلے حُجر قتل کئے جا چکے تھے۔

امیر زیادؒ جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دے رہے تھے حُجر نے آواز دی "الصلوٰۃ" یعنی نماز پڑھیے۔ لیکن امیر زیاد نے اپنا خطبہ جاری رکھا، تو لوگوں نے آوازے کسے اور ان پر کنکریاں پھینکیں۔ امیر زیاد اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو سخت سزائیں دے سکتے تھے، مگر آپ نے ضروری سمجھا کہ اوّل امیر المومنین معاویہؓ کو ان احوال سے مطلع کر دیں۔ ان لوگوں کا با قاعدہ جتھا تھا اور یہ وہی حرکتیں کرنے پر تُلے ہوئے تھے جو اب تک کوفہ کے والیوں کے ساتھ کرتے آئے تھے جس کی تفصیل طولانی ہے۔ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ان کے سرکردہ لوگوں کو مع گواہوں کے دمشق بھیج دیا گیا۔ حضرت امیر المومنینؓ نے ان کے متعلق تحقیقات کی، اور گواہوں کی گواہیوں سے مطمئن ہو کر حُجر اور دو چار دوسرے آدمیوں کو قتل کرا دیا، اور جن پر جرم ثابت نہیں ہوا انھیں چھوڑ دیا۔

حُجر کے قتل کو لوگوں نے بہت اچھالنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک تاریخی واقعہ بنا کر انھیں اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کر دیا ہے، تاکہ سیدنا معاویہؓ پر ایک صحابیِ رسولؐ کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا جا سکے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ امیر المومنین عثمانؓ کو شہید کرنے والے لوگ، سیدنا طلحہؓ اور سیدنا زبیرؓ جیسے اکابر محبوبانِ الٰہی کو شہید کر دیں تو اس کو اپنا مجاہدانہ فعل گردانیں، اگرچہ ان میں سے کسی کا قتل جنگ میں نہیں ہوا تھا۔ لیکن حُجر بن عدی کو باقاعدہ عدالت کی طرف سے جب فساد فی الارض، اور اہانتِ حکومت کے جرم میں قتل کی سزا دی جائے تو سیدنا معاویہؓ پر یہ الزام عائد کرنے کی جرأت کی جائے کہ انھوں نے حجر بن عدی جیسے عابد، زاہد صحابی کو قتل کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ اور دوسرے ائمہ نے انھیں تابعی لکھا ہے، اور یہی رائے صحیح ہے اگرچہ بعض حضرات انھیں صحابی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے صحابی اور غیر صحابی ہونے میں اختلاف ہو وہ روایت کے اعتبار سے بہر حال تابعی ہوگا۔ اور اگر بالفرض صحابیت مسلّم بھی ہو جائے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اس پر حدود شرعیہ جاری نہ ہوں۔ اور نہ ایسے شخص کی یہ حیثیت ہے کہ سیدنا معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور امام الصحابہ کے مقابلہ پر

کھڑا کردیا جائے۔ وہ ان کی رعایا میں تھے اور ان مفسدوں میں جو امت کے اندر دوبارہ فتنہ جگانا چاہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (فتنہ برپا کرنا قتل سے زیادہ سنگین ہے)۔ اتنے برس کے بعد امت کو یہ دن نصیب ہوئے تھے کہ اختلال رفع ہو، امن قائم ہو، داخلی ترقیوں کے وہ دروازے کھل جائیں جو پانچ برس سے بند پڑے تھے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف مسلمان یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو سکیں۔ حُجر بن عدی اور اُن کے ساتھیوں کو یہ صورتِ حال ناگوار تھی، وہ نظامِ مملکت میں تزلزل پیدا کرنے کے درپے تھے، اور چاہتے تھے کہ اُبہتِ خلافت ماند پڑ جائے۔

انھیں اگر امیر زیادؓ کے کسی عمل سے اختلاف تھا، تو سلامت روی کے ساتھ بھی تو اصلاح کی کوشش کر سکتے تھے، خود امیر المؤمنین تک ان کی شکایتیں لے جاتے تو کیا ان کی شنوائی نہ ہوتی؟ لیکن علانیہ مجمع میں ان کی بے حرمتی کرنا، اُن پر آوازے کسنا، اور کنکریاں پھینکنا، اور وہی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرنا جو شہادت امیر المؤمنین عثمانؓ سے پہلے انھوں نے امیر ولیدؓ بن عقبہ اور امیر سعیدؓ بن العاص جیسے بے نظیر والیوں کے خلاف مستقلاً کر رکھی تھیں۔ اور ہر والی کے متعلق یہی مطالبہ کرتے تھے کہ اسے برطرف کر دیا جائے۔ کسی دوسری جگہ اگر ایسا ہوتا جو حُجر بن عدی نے کوفہ میں کیا تو شاید اس سے چشم پوشی کر لی جاتی، لیکن عراق میں یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔

اگر حضرت معاویہؓ کی جگہ حضرت فاروق اعظمؓ ہوتے تو ان حالات میں وہ بھی حُجر کو سخت ترین سزا دیتے۔ حضرت امیر المؤمنین عثمانؓ نے جس طرح ان لوگوں کی گستاخیوں اور بے تمیزیوں سے چشم پوشی فرمائی اور درگذر سے کام لیا، اور اُن کے کہنے پر پے بہ پے اپنے والی بدل دیئے، اس کا ہولناک نتیجہ سامنے تھا۔ حضرت امیر المؤمنین علیؓ کے ساتھ بھی اُن کی یہی کیفیت تھی۔ اور آپ ان سے سخت بیزار ہو گئے۔ اب اس غلطی کا اعادہ سیدنا معاویہؓ کی طرف سے کیونکر ممکن تھا۔ حُجر کا جتھا نہ ہوتا تو تب بھی شاید اُن کے ساتھ رعایت برتی جاتی، مگر وہ تو باقاعدہ عہد عثمانی کا فتنہ واپس لانا چاہتے تھے۔ اس لئے اُن کا قتل واجب ہو گیا۔ کوئی دوسری حکومت ہوتی، تو غالباً محض قتل پر اکتفا نہ کرتی، اور بھی عبرتناک سزائیں دی جاتیں، بلکہ خود کوفہ کی بستی پر وہ عذاب نازل کیا جاتا کہ پھر سر اٹھانے کی یہ لوگ

ہمت ہی نہ کرتے۔ لیکن امیر المؤمنین معاویہؓ نے خلیفہ راشد ہونے کی بنا پر بس اتنا ہی کیا جو کتاب و سنّت کی حدود میں تھا۔

سیدنا معاویہؓ جب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے ہیں تو حضرت ام المؤمنینؓ نے پھر یہ ذکر چھیڑا۔ آپ نے عرض کیا "دعینی و حُجرا حتّیٰ نلتقی عند اللہ (مجھے اور حُجر کو چھوڑے رکھئے تا آنکہ ہم اللہ کے حضور اکٹھے ہوں)۔ یہ الفاظ صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صمیم قلب سے اپنے عمل پر مطمئن ہو۔ ہمارا بھی یہی فرض ہے کہ اس معاملہ میں حضرت امیر المؤمنین پر طعن سے گریز کریں۔ ہمارے سامنے صرف روایتیں ہیں اور وہ بھی اکثر و بیشتر کذابوں اور دجالوں کی، لیکن اُن کے سامنے عینی شہادتیں تھیں۔

اگر ظلم ہوا ہوگا اور حُجر واقعی بے گناہ تھے اور اُن کے متعلق جو کچھ کہا گیا، جتنی گواہیاں پیش ہوئیں، اور مستند حالات بیان ہوئے وہ سب غلط ہیں، تب بھی دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ چکے، اور ہمارے کچھ کہنے نہ کہنے سے ان پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ حقیقتاً اس قتل کی ذمہ داری ہے تو اُن پر جنھوں نے اپنی گواہی سے انھیں بغاوت کا مجرم ثابت کر دیا تھا۔

ذاتی طور پر ہم اس واقعہ کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور نہ قانوناً و شرعاً اس کی کوئی اہمیت ہے۔ امام عادل ہو اور وہ بھی حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ جیسا امام مجتہد اور یکتائے روزگار، تو اس کے اجتہاد کے سامنے، کسی ہمعصر کا اعتراض بھی قیمت نہیں رکھتا، چہ جائیکہ بعد کے کسی شخص کی بات، اگرچہ وہ اپنے زمانہ کا مجتہد ہی کیوں نہ ہو۔ الحمدللہ کہ اس بارے میں اعتراض کرنے والے لوگ صرف وہی ہیں جنھیں صحابہ پر طعن کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ جنھیں حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہے، کہ انھوں نے مسیلمہ کذاب اور مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیوں کیا، جنھیں اس پر خوشی ہے کہ ابو لؤلؤۃ نے امیر المؤمنین سیدنا عمرؓ کو شہید کیا، جنھیں سیدنا امیر المؤمنین عثمانؓ پر اعتراض ہے کہ آپ نے ہرمزان کے قصاص میں سیدنا عبیداللہ بن عمرؓ کو قتل کیوں نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جو سیدنا معاویہؓ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے حُجر کو قتل کر دیا۔ مسیلمہ کذاب اور مانعینِ زکوٰۃ مؤمن ہیں، ابو لؤلؤۃ قاتلِ فاروق اعظم مجاہد ہے، ہرمزان جو اس قتل میں شریک تھا بڑا صاحبِ ایمان ہے، اور منافق کون ہے، دین کا دشمن کون ہے، ننگِ انسانیت کون ہے؟ ——— ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ اور ہر وہ شخص جس نے جان اور مال اللہ کے نام پر قربانی کے لئے پیش کر دیا، اور ظاہری و

باطنی ہر تکلیف اٹھاکر، ہر مصیبت کا سامنا کر کے کلمۃ اللہ بلند کیا!

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ (ق : ۳۷)	اس میں ان لوگوں کے لئے نصیحت کا سامان ہے جو دل رکھتے ہوں، یا غور سے سن سکیں یا واقعات پر ان کی نگاہ ہو"

دَورِ خلافت

حضرت امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی امت کی داخلی اور خارجی حکمت عملی درست کرنے پر توجہ فرمائی۔ ہر قسم کے فتنہ و فساد کا سدِ باب کیا، اور امت کی حرکت فی سبیل اللہ میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اسے دُور کر کے کاروانِ ملت کو رواں دواں کر دیا۔

داخلی اصلاحیں

تمام عالمِ اسلام کو نئے سرے سے منظم کیا، یعنی ایسے معاشی اور معاشرتی واحدوں میں تقسیم کر دیا کہ بڑی حد تک خود کفیل رہیں، اور سیاسی اعتبار سے اس قابل ہوں کہ اپنے علاقہ کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں۔ عام طور پر یہ واحدے لسانی بنیاد پر قائم کیے گئے۔

ان سب کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے شاہ راہیں درست کیں، اور یوں سب کا تعلق مرکز سے جوڑ دیا۔ ہر انتظامی واحدے کا والی مرکز سے بھیجا جاتا تھا، اس کے عملہ کے معمولی کارکنوں کے علاوہ باقی تمام خدمتوں پر مقامی مسلم باشندے فائز ہوتے تھے۔ ہر علاقہ کی فوج بھی مقامی لوگوں ہی سے مرتب کی جاتی تھی۔ پولیس کا انتظام بھی سب مقامی تھا۔ فوجی خدمت رضاکارانہ تھی۔ علاقہ کی اکثر آمدنی خود اسی علاقہ پر صرف ہوتی تھی۔ صرف ایک مقررہ حصہ ہی مرکز کو بھیجا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کا روپیہ بھی مقامی ضرورتوں پر خرچ ہوتا تھا۔ جس جگہ کے مالداروں سے لیا جاتا وہیں کے ضرورتمندوں پر خرچ ہوتا۔ اس طرح ہر علاقہ کے لوگ اندرونی خود مختاری اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ اس دَور میں عرب کی زندگی خصوصاً اور دوسری قوموں کی عموماً قبائلی تھی، اس لئے اسی قسم کا سیاسی نظام کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس نظام کی اصل فاروقی ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے جو انتظامی اصول مرتب فرمائے تھے، بعد کے خلفاء نے انہی پر عمل کیا۔ حضرت امیر المؤمنین معاویہ رضؓ نے مزید اصلاحات کیں۔

جناب عبد اللہ العمادی صاحب نے تاریخ اسلام کے نام سے تاریخ طبری کا جو اردو ترجمہ ایک ملخص کی صورت میں شائع کیا، جس کا ایک حوالہ سیدنا حسن رضؓ کی صلح کے سلسلہ میں دیا جا چکا ہے، اس میں فرماتے ہیں: (ص ۲۷۰)

معاویہ نے ہر شہر سے وہ حصہ نکال ڈالا تھا جو ملوکِ فارس، آباد جائدادوں سے صَرفِ خاص کے لئے لیا کرتے تھے۔ معاویہ نے اسے اپنا مخصوص حصہ بنالیا تھا۔"

کاش یہ روایت درج کرنے سے پہلے انھوں نے حضرت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج ملاحظہ فرمائی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ ان راویوں نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام بے بنیاد لگایا ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ملوکِ فارس کی چھوڑی ہوئی "صرفِ خاص" کی تمام جائداد کو حکومتِ اسلامیہ کی ملک قرار دیدیا تھا۔ اس زمین کا رقبہ چالیس لاکھ جریب کے قریب تھا۔ اس کی حیثیت افتادہ زمین کی سی قرار دی گئی تھی، اور امام کو اختیار تھا کہ مصلحتِ ملّیہ کے تحت مناسب اشخاص کو عُشری یا خراجی بنا کر دیدے۔ جسے یہ زمین دیدی گئی اسی کی ملکیت ہو گئی۔ امام ابو یوسفؒ کی بحث کے خلاصہ کے لئے ملاحظہ ہو [الخضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، ج الدولۃ العباسیہ (ص ۱۴۸)]

اسی علاقہ کی کچھ زمین سیدنا طلحہؓ کو عہد فاروقی میں دیدی گئی تھی۔ اسی زمین کے بارے میں امیر کوفہ سیدنا سعید بن العاصؓ کے سامنے تذکرہ ہوا تھا۔ اور آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی زمین میرے پاس ہو تو میں بھی حضرت طلحہؓ کی طرح سخاوت کروں۔ اس پر ایک صاحب نے عرض کیا تھا، "آپ بھی درخواست دے کر یہاں کچھ زمین لے لیجیے"، تو اشتر نخعی وغیرہ بگڑ گئے تھے کہ ہماری زمین کے متعلق تم ایسی بات کہتے ہو، گویا ان کے نزدیک وہ زمین حکومت کی نہیں تھی بلکہ ان کی تھی۔ اسی پر جھگڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اہل شہر کی درخواست پر امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ نے ان سبائیوں کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس شام بھیج دیا تھا جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ عمادی صاحب کو یہ بھی تو بتانا چاہئے تھا کہ حضرت معاویہؓ کی اس بدعت اور متغلبانہ تصرف پر حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے اعتراض کیا تھا یا نہیں، اور علمائے حدیث و فقہ نے اس بارے میں کیا موقف اختیار کیا؟ محض ہوائی باتیں کرنے سے علمی بحث کا امکان نہیں رہتا۔

رسل و رسائل

امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ نے نقل و حمل کا خاطر خواہ انتظام درست کرنے کے علاوہ رسل و رسائل کا بھی وہ انتظام کیا کہ باید و شاید۔ تاریخِ اسلام میں اس اعتبار سے اوّلیت کا شرف آپ ہی کا ہے۔ بارہ بارہ میل کے فاصلہ پر چوکیاں قائم کیں، جہاں کوتل گھوڑے اور سوار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ علامت کے طور پر ڈاک کے گھوڑوں کی دُمیں کاٹ دی گئی تھیں، تاکہ لوگ پہچان لیں کہ

ڈاک جارہی ہے۔ گھوڑوں کی گردنوں میں گھنٹیاں ہوتی تھیں، تاکہ چوکی پر پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہوجائے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ہر قسم کی ڈاک اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی تھی۔ یہ مستقل محکمہ تھا اور "البرید" کہلاتا تھا۔

دیوان

دیوان کا محکمہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وقت سے جاری تھا۔ سیدنا معاویہؓ نے اس میں مزید باقاعدگی پیدا کی۔ ہر سرکاری حکم پر مہر کا انتظام کیا، اور ہر حکم کی ایک نقل محفوظ رکھنے کا بھی۔ اس طرح ناجائز تصرف کے امکانات ختم ہوگئے، دفتری زبان البتہ رومی اور سریانی تھی۔ یہ فخر امیر المؤمنین عبدالملکؒ کا ہے کہ آپ نے عربی کو دفتری زبان بنایا۔

عدلیہ

اسلام کا نظامِ عدلیہ شروع سے نہایت اصیل بنیاد پر قائم تھا۔ اور انتظامیہ سے ہمیشہ بالکل آزاد رہا۔ امتِ مسلمہ کو اپنے نظامِ عدلیہ پر بجا فخر رہا ہے۔ اور دنیا کی کوئی قوم اس بارے میں اس سے بازی نہ لے جاسکی۔ یہی نظام سیدنا معاویہؓ نے بھی پورے اہتمام سے جاری رکھا۔ عموماً صحابۂ کرام کو منصب قضا سپرد کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اس کا اہتمام رکھا۔ کہ انتظامیہ سے عدلیہ بالکل آزاد رہے۔ اور اگر ایسے واقعات فراہم کئے جائیں کہ کس طرح ایک قاضی اپنی عدالت میں حاکمِ وقت کو طلب کرلیتا تھا بلکہ خود امیر المؤمنین کو بھی، تو ایک مستقل اور ضخیم کتاب مرتب ہوجائے اور ایسی روح پرور کہ باید وشاید۔

رفاہِ عام

آپ نے رفاہِ عام کے وہ سب طریقے جاری رکھے جو خلفاءِ پیشین کے وقت سے چلے آرہے تھے۔ کمی کچھ نہیں کی۔ البتہ اضافہ کیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد سے ہر پیدا ہونے والے بچہ کی کفالت حکومت کرتی تھی۔ آجکل کی بعض حکومتوں نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور اس پر فخر کرتے ہیں، مگر ان کے طریقہ میں ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سرکاری اداروں میں کی جاتی ہے۔ اور اس طرح بچہ کا تعلق اپنے والدین سے اوّل تو رہتا ہی نہیں، اور اگر رہتا بھی ہے تو محض رسمی۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں بچہ کی تربیت کی تمامتر ذمہ داری والدین کے سپرد ہوتی ہے۔ حکومت سرکاری اداروں یعنی مکاتب ومدارس کے ذریعہ والدین کی مدد کرتی ہے اور اس کی بھی نگرانی کرتی ہے کہ اسلامی روایات ضائع نہ ہونے پائیں یعنی کفیل ہوتی ہے حکومت اور پرورش کرتے ہیں والدین۔ اور بچہ اس فطری ماحول میں پل کر دارالاسلام کا شہری اور دعوتِ اسلام کا سپاہی بن کر زندگی بسر کرتا ہے۔

امیر المؤمنین عثمانؓ نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ بچوں کے ساتھ مملوکوں کے بھی مخصوص اخراجات

کا بار حکومت نے اٹھالیا، اور انہیں خاص وظائف دیئے۔ نظامِ اسلامی میں مملوک بھی خاندان کا فرد ہوتا ہے، اور احکامِ قرآنی کے مطابق اس کے تمام اخراجات اس کے آقا کے ذمہ ہوتے ہیں اور ان کا معیار وہی ہوتا ہے جو خود آقا اور اس کے گھر والوں کا۔ آجکل کی حکومتوں میں جنگی قیدیوں کو قیدی ہی رکھا جاتا ہے اور ان سے اسی طرح کام لیا جاتا ہے جیسے اسلام سے پہلے غلاموں سے لیا جاتا تھا، کہ جانوروں کی طرح ان کی گردن میں جُوا ہوتا تھا۔ اسلام میں جنگی قیدیوں کو مسلمانوں کے گھروں پر تقسیم کر کے اس گھر کے افراد میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن امیر المؤمنین عثمانؓ نے ان کا تعلق مرکز سے قائم کر کے ان کی معاشرتی حیثیت اور بھی بڑھا دی۔ یہ تجویز امیر کوفہ سیدنا ولید بن عقبہؓ کی تھی، جو حضرت امیر المؤمنین نے پسند فرمائی۔ سیدنا ولیدؓ کی دوسری تجویز یہ تھی کہ ہر شہر میں سرکاری اقامت گاہیں قائم کی جائیں، تاکہ باہر سے آنے والوں کو قیام و طعام کی دقت نہ ہو۔ یہ اخراجات بھی حکومت کے ذمہ تھے۔ محدود پیمانہ پر حضرت فاروق اعظمؓ نے بھی مسافروں کے لئے ایسی سرکاری اقامت گاہیں بنائی تھیں۔

امیر المؤمنین معاویہؓ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ہر شہر میں متعدد سرکاری کارکن مقرر کر دیئے۔ جو روزانہ صبح کو اپنے اپنے علاقوں میں گشت کر کے پتہ چلاتے تھے کہ کس کے ہاں ولادت ہوئی۔ اور کس محلہ میں کوئی مہمان آیا۔ یہ کارکن معلومات حاصل کر کے دفتر کو مطلع کر دیتے تھے، اور وہاں سے سب انتظام کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو راشن کارڈ کے لئے درخواستیں لے کر دفتروں کے چکر نہیں لگانے پڑتے تھے۔ اور نہ اپنے روپے سے اپنی غذائی ضرورت پوری کرنے کے لئے دکانوں کے سامنے قطار بنانی پڑتی تھی۔ یہ کام حکومت کا تھا کہ اس کے گماشتے شہریوں کی سب ضرورتوں کا انتظام کریں۔

علامہ بغویؒ نے سُوَید بن سعید سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں ہم سے ضمام بن اسمٰعیل نے بیان کیا، اور انھوں نے ابو قُبَیس کا حوالہ دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہؓ نے ہر قبیلہ میں ایک شخص کو نمائندہ مقرر کیا تھا۔ ہمارے قبیلہ میں ایک صاحب تھے جن کی کنیت ابو یحییٰ تھی۔ وہ ہر صبح مختلف مجلسوں میں گھوم کر دریافت کیا کرتے تھے "رات آپ لوگوں کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ کوئی خاص واقعہ تو رُونما نہیں ہوا؟ اور کسی کے ہاں کوئی مہمان تو نہیں آیا؟" لوگ جواب میں کہتے "ہاں! ایک صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ یمن سے آئے ہیں" ان کے

نام بھی بتاتے اور اہل وعیال کا شمار بھی۔ جب وہ تمام محلوں کا دورہ لگا کر فارغ ہوجاتے تو دفتر عطیات میں جاکران سب کے نام لکھوادیتے۔"

محمد بن عوف طائیؒ نے اپنی سند کے ساتھ عطیہ بن قیس کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے (سیدنا) معاویہ بن ابی سفیانؓ کو یہ خطبہ دیتے سنا ہے: (المنتقیٰ: ص ۳۸۸، طبع مصر، مطبعۃ السلفیۃ):

"آپ لوگوں کے بیت المال میں، آپ سب کا حق ادا کر کے بھی کچھ روپیہ بچ گیا ہے، اور میں اسے تقسیم کرنے والا ہوں۔ اگر اگلے سال بھی فاضل روپیہ رہا تو اُسے بھی تقسیم کردوں گا۔ اور نہ بچا تو پھر مجھ پر الزام مت رکھنا کیونکہ مال میرا نہیں ہے اللہ کا ہے جو اس نے تمھیں عطا فرمایا ہے"

شفاخانے اس وقت تک قائم نہیں ہوئے تھے۔ یہ شرف امیر المؤمنین ولیدؒ اوّل کو ہے کہ آپ نے تمام مملکتِ اسلامیہ میں سرکاری شفاخانے قائم کئے اور معذوروں کی خدمت کے ادارے بھی، جن کا تمام انتظام حکومت کرتی تھی، اور یوں ہر قسم کی طبّی امداد ہر شخص کو سرکاری طور پر مفت حاصل تھی۔ مفت طبی امداد مسلم حکومتوں کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے۔ صقلیہ کے شفاخانے اس بارے میں سب پر بازی لے گئے تھے، ان کی تفصیلات سے جہاں روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے وہاں موجودہ صورتِ حال دیکھ کر دل پرچرکہ لگتا ہے کہ اللہ نے ہمیں کیا بنایا تھا اور ہم کیا بن گئے۔ آج اگر وہ باتیں بیان کی جائیں تو افسانے معلوم ہوں کہ طبی امداد کس پیمانہ پر مفت میسر تھی، اور شفاخانوں کو کس طرح جنّت بنا کر رکھا جاتا تھا۔

زرعی اصلاحات

رعایا کے شخصی آرام و آسائش کے ساتھ آپ نے اپنے عہد میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ زرعی اصلاحات کا تھا۔ عہدِ نبوی سے کاشتکاروں کو بٹائی پر زمین دینے کا رواج تھا، اور اس پر عمل ہوتا رہا، لیکن مہاجروں کی حالت درست ہوجانے کے بعد اگرچہ آپ نے بٹائی کو ممنوع نہیں کیا تھا لیکن یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر فاضل زمین کاشت کے لئے بلامعاوضہ ہی دیدی جائے تو بہتر ہے۔ صحیح بخاری میں باب المزارعۃ کے تحت آپ کے عہد کی تدریجی اصلاحیں اور ارتقائی تحدیدیں مفصل مذکور ہیں جن پر یہاں بحث خارج از موضوع ہے۔

امیر المؤمنین معاویہؓ نے بٹائی کا یہ سلسلہ موقوف کردیا۔ تمام زمین سرکاری ملکیت قرار

پانی اور جو شخص جتنی زمین کاشت کرے اس سے انتفاع کا حق اسی کا ہے۔ گویا جسے زمین کی ملکیت اور وراثت میں اس کی تقسیم سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ دراصل وراثت اسی حقِ انتفاع کی ہے۔ ورنہ مملکت تمام مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین اپنی اصل میں پوری قوم کی ملکیت ہے جس کی متولی حکومت ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے عُشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ اور ذمیوں سے خراج وغیرہ سب پیداوار کی شکل میں لیا جاتا تھا۔

زرعی مسائل کی تنقیح کے لئے ملاحظہ ہو، صحیح بخاری: ج ۲، باب ما جاء فی الحرث والمزارعۃ،

عن نافع ان ابن عمر رضی اللہ عنہما کان یکری مزارعہ علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر وعثمان وصدراً من امارۃ معاویۃ۔ ثمّ حُدِّث عن رافع بن خدیج انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیٰ عن کراء المزارع۔ فذہب ابن عمر الی رافع فذہبت معہ فسألہ فقال نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء المزارع فقال ابن عمر قد عَلِمتَ انا کنا نکری مزارعنا علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بما علی الاربعاء وبشیٔ من التبن۔

حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اور حضرت معاویہؓ کے ابتدائی دور تک بٹائی پر دیا کرتے تھے لیکن پھر سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہما کی روایت نے شہرت پکڑی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزروعہ زمین بٹائی پر دینے کی ممانعت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ خود حضرت رافعؓ کے پاس تشریف لے گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ گیا۔ آپ نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزروعہ زمین کو بٹائی پر دینے کی ممانعت فرمادی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چوتھائی بٹائی اور کچھ بھوسہ پر اپنی زمینیں دیدیا کرتے تھے"

حضرت ابن عمرؓ نے اس طرح اپنا عمل بتاکر جواب تو دیدیا، مگر پھر آپ نے اپنے موقف سے رجوع فرمالیا۔

عن ابن شہاب اخبرنی سالم ان عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما قال کنت اعلم

ابن شہابؒ (امام زہری) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں مجھ سے سالمؒ (فرزند حضرت ابن عمرؓ)

فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض تکری. ثم خشی عبد اللہ ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد احدث فی ذلک شیئاً لم یکن یعلمہ فترک کراء الارض.	نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہ ارشاد نقل کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مجھے علم ہے کہ زمین بٹائی پر دی جاتی تھی۔ پھر حضرت عبد اللہؓ نے یہ سوچ کر کہ شاید نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم میں کوئی تبدیلی کر دی ہو جس کا علم نہ ہو سکا۔ اس لئے بٹائی پر زمین دینی آپ نے موقوف کر دی"۔

یہ سیدنا رافع بن خُدیجؓ رضی اللہ عنہما، حضرت امیر المومنین معاویہؓ کی طرف سے قاضی تھے۔ اور آپ ہی کے فتویٰ پر عمل ہوا اگرچہ یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا اور بعد میں یہ طریقہ کار چھوڑ دیا گیا۔ مگر آپ تو اپنے عہد میں یہ اہم کام کر ہی گئے۔ اگر اب علماء امت نے اس بارے میں کوئی زرعی دستور مرتب کیا تو ناممکن ہے کہ وہ حضرت امیر المومنین معاویہؓ کے طرز سے ہٹنے کی جرأت کر سکیں۔

دفاع

سیدنا معاویہؓ کے عہد تک فوجی خدمت رضاکارانہ تھی۔ بلکہ آخر عہد اموی تک یہی حالت رہی۔ لیکن آپ نے مرکز کے تحت بھی ایک باقاعدہ فوج کی تشکیل کی تھی۔ اور جب وہ اہم مواقع پر حرکت میں آتی تو کار آزمودہ لوگ اس میں رضاکارانہ شریک ہو سکتے تھے۔ یہ فوج عموماً رومی حکومت سے برسرپیکار رہتی تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ جو فوج جاڑوں کے زمانہ میں جہاد کرتی اس کو "شتائیہ" (جاڑوں کی فوج) کہتے تھے۔ اور جو فوج گرمیوں میں مصروفِ عمل رہتی تھی وہ "صائفہ" (گرمیوں کی فوج) کہلاتی تھی۔ دونوں قسم کی فوجوں کے لئے الگ الگ انتظام تھے۔ بحریہ کا ذکر اوپر ہو چکا۔

غزوۂ روم

بحریہ کی تشکیل ہی اس غرض سے کی گئی تھی کہ حکومتِ اسلامیہ کو بحری حملہ آوروں سے بچایا جا سکے۔ یہ شعبہ حضرت امیر المومنین عثمانؓ کے زمانہ میں سیدنا معاویہؓ ہی کی تحریک و انتظام سے وجود میں آیا تھا۔ اپنے دورِ خلافت میں آپ نے اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ جزیرۂ رہوڈس وغیرہ آپ ہی کے زمانہ میں فتح ہوئے۔

آپ کے عہد کا سب سے بڑا فوجی کارنامہ تھا قسطنطنیہ پر حملہ۔ اس کے لئے بری اور بحری دونوں فوجیں حرکت میں آئی تھیں۔ جزیرۂ قبرص کے جہاد کی طرح اس غزوہ کا منظر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دیا گیا تھا۔ یہ دونوں منظر آپ نے ایک ہی رؤیا میں دیکھے تھے۔

اور دونوں پر فخر کا اظہار کیا تھا۔ آپ نے بشارت دی تھی کہ ان دونوں غزوات میں جو لوگ شریک ہوں گے وہ سب کے سب جنّتی ہیں اور ان کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

اس بشارتِ نبویہ کا مورد ہونے کے لئے اجلّۂ صحابہ نے غزوۂ روم میں شرکت کی تھی۔ مثلاً سیدنا ابو ایوب انصاریؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، سیدنا عبداللہ بن عباسؓ، سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ، وغیرہم۔ بعض صحیح روایات کے مطابق سیدنا حسینؓ بھی اس غزوہ میں شریک تھے۔ فوج کی کمان امیر المؤمنین کے فرزند امیر یزید کے ہاتھ میں تھی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

امیر یزید کے ہاتھ میں اس فوج کی کمان ہونا ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا، اور غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکا، کا جنتی ہونا بھی ایسا ہی یقینی ہے کہ اس کی تکذیب کی گنجائش نہیں۔ لیکن جس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ وحی ہونے کے بارے میں یہ شیطانی باریکی نکالی گئی ہے کہ قرآن کے علاوہ باقی چیزوں کی کتابت آپ کے سپرد تھی، اسی طرح امیر یزید کا اس غزوہ میں شریک ہونا، اور عساکرِ اسلامیہ کی کمان ان کے ہاتھ میں ہونا بھی معرض بحث بنادیا گیا ہے۔ لیکن جو حقیقت ہو اس کا انکار کیونکر چل سکتا ہے، اور قسطنطنیہ کی فصیل سے سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار شریف کس طرح ہٹایا جاسکتا ہے۔

متفق علیہ ہے کہ اپنے دفن کے متعلق سیدنا ابو ایوبؓ نے اپنی وصیت امیر یزید ہی کو کی تھی کہ آپ کا جنازہ جتنی دور دشمن کی زمین میں لے جاسکتے ہوں لے جا کر دفن کریں۔ یہ واقعہ اس درجہ قطعی ہے کہ ناسخ التواریخ کا غالی مؤرخ بھی اسے کسی طرح نہ چھپا سکا۔ کہتا ہے: "چوں ابو ایوب درگذشت یزید سوار شد و جیش او سوار شد و نعش او را مشایعت نمودند (جب ابو ایوب کا انتقال ہوگیا تو یزید سوار ہوئے اور ان کا لشکر بھی سوار ہوا اور ان کی نعش کو لے کر چلے)"۔ پھر کہتا ہے کہ جب رومیوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے تو امیر یزید نے جواب دیا (ناسخ التواریخ: کتاب دوم ص ۴۲)۔

یا اہل قسطنطنیۃ ھٰذا رجل من اکابر اصحاب محمد نبیّنا و قد دفنّا حیث ترون و واللہ لئن تعرّضتم لہ لاھدمنّ کلّ کنیسۃ فی ارض الاسلام ولا یضرب ناقوس بارض العرب ابداً۔	اے اہل قسطنطنیہ یہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب میں سے ایک بزرگ ہیں۔ اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے انھیں کہاں دفن کیا ہے۔ بخدا اگر تم نے اُن کی بے حرمتی کی تو میں عالمِ اسلام کا ایک ایک گرجا منہدم کردوں گا اور پھر سرزمین عرب پر کہیں ناقوس نہیں بجایا جاسکے گا۔"

اب یہ معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر عساکر اسلامیہ کی کمان امیر یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو سیدنا ابو ایوبؓ اس وصیت کے لئے انھیں خاص کیوں کرتے؟ فوجی پیشقدمی کی وصیت تو اسی کو کی جاسکتی ہے جس کے حکم سے کوئی سرتابی نہ کرسکے۔ امیر یزیدؒ ہی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی جن میں سب صحابہ اور تمام مجاہدین کرام شریک تھے۔ اور فوجی اہتمام کے ساتھ جنازہ اٹھایا گیا۔ اگر فوجوں کی کمان امیر یزیدؒ کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو اس جماعت کی امامت وہ کیسے کرتے۔ قلعہ کی فصیل کے عین نیچے قبر کھودی گئی، اور یوں سیدنا ابو ایوبؓ کا مزار شریف آج تک زبانِ حال سے امیر یزیدؒ کے اس کارنامہ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان کے اور فضائل تو مٹانے کی سعی بلیغ ہوتی رہی، مگر اس فضیلت کو کوئی نہ مٹا سکا۔ اور نہ مٹا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا جوش اور جذبہ اس وقت انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ امیر یزیدؒ کی کیفیت یہ تھی کہ بار بار قلعہ کے دروازہ پر گرز مارتے تھے۔

اگرچہ شہر فتح نہ ہوسکا، اور صدیوں تک مسلمانوں کی کوششیں ناکام رہیں لیکن کام کی ابتداء ہوگئی، اور اس کا سہرا امیر المؤمنین معاویہؓ اور ان کے فرزند یزیدؒ کے سر ہے، جن کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بہترین حضرات اس میں شریک ہوئے، تا آنکہ جس کی قسمت میں تھا اس نے یہ مہم سر کرلی، یعنی شیر بیشۂ جلالت، سلطان محمد الفاتحؒ جنھیں لسانِ نبوت نے بہترین فوج کا بہترین امیر قرار دیا ہے۔

بہرحال ان دونوں بحری غزوات میں اولیت کا شرف امیر المؤمنین معاویہؓ کو حاصل ہے اور آپ ہی کے زیر اہتمام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت پوری ہوئی۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری؛ ج ۱، ص ۴۰۹ ، باب قتال الروم، طبع اصح المطابع دہلی و کراچی :-

..... حدثنا عُمَیرٌ فحدثتنا ام حرام انہا سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اوّل جیش من امّتی یغزون البحر قد اوجبوا قالت ام حرامٍ قلتُ یارسول اللہ انا فیہم؟ قال انتِ فیہم قالت ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوّل جیش من امّتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لہم۔ فقلت انا فیہم	..... ہم سے عُمَیر نے کہا اور وہ کہتے ہیں ہم سے (رسیدہ) امِ حرامؓ نے فرمایا کہ انھوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے "میری امت کی پہلی فوج جو بحری جہاد شروع کرے گی اُن پر جنّت واجب ہوگئی"۔ حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا "یارسول اللہ! میں ان میں ہوں؟" فرمایا "تم ان میں ہو" پھر فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

یا رسول اللہ، قال "لا" | "میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے دارالحکومت
پر حملہ کرے گی وہ سب کے سب بخشدیئے گئے"۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ"! میں ان میں ہوں؟
فرمایا "نہیں"۔

حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے غزوۂ قبرص میں شرکت کی۔ آپ کے شوہر سیدنا عبادہ بن صامت رضی بھی اس لشکر میں تھے۔ جب جہاز سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہونے لگیں تو گر گئیں اور شہادت پائی۔ آپ کا مزار شریف قبرص میں ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ غزوۂ قسطنطنیہ میں بھی شریک ہوں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ اس میں شریک نہ ہوسکیں گی۔

لوگ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اور امیر یزیدؒ کے فضائل کم کرکے دکھانے کی کتنی ہی کوشش کرلیں، اور جتنی برائیاں اپنی طرف سے وضع کرکے ان میں ثابت کرنے پر دلیر ہوں وہ اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتے کہ صحابۂ کرام اور ائمۂ اسلام نے ان دونوں غزوات کی بشارت کا مورد ان دونوں باپ بیٹے ہی کو سمجھا۔ اور اس بشارت کو دلائل النبوۃ میں جانا۔

یہ باب جس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خلفائے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیسا بلند مقام ہے، اور آپ کی شخصی اور ملّی عظمت کس درجہ کی ہے، اسے ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ خود آپ کا ایک ارشاد نقل کردیا جائے۔ اسی کو آپکے مقاصد، آپ کی حکمت عملی اور آپ کی سیرت کا مختصر لیکن جامع لبِ لباب سمجھا جائے۔ امام ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ (۸ : ۱۳۴) میں اسے ایک قوی سند سے بیان کیا ہے، نیز ابن سعدؒ نے سیدنا معاویہ رضی کے مولیٰ ثابت کے حوالہ سے [منقول از العواصم من القواصم ص ۲۰۳]۔

عن العتبی ان معاویۃ خطب فقال یا ایہا الناس انا بخیرکم وانّ منکم لمن ہو خیر منّی عبداللہ بن عمرو وعبداللہ بن عمرو وغیرہما من الافاضل ولکن عسیٰ ان اکون انفعکم ولایۃ وانکاکم فی عدوکم و ادرّکم حلبا۔

عتبی سے مروی ہے کہ (حضرت امیر المؤمنین) معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں فرمایا "حضرات: میں آپ میں سب سے بہتر نہیں ہوں، آپ کے درمیان مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اور ان جیسے دوسرے بزرگ۔ لیکن امید ہے کہ میں حکومت کے اعتبار سے آپ کے لئے زیادہ سودمند رہوں گا، آپکے دشمنوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ، اور مالی اعتبار سے آپکے لئے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوں گا"۔

اور الحق کہ آپ نے امت سے جو وعدہ کیا تھا اُسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔ انہی صفات کی بنا پر اکابر صحابہ نے آپ پر اجماع کیا تھا۔ سیدنا حسنؓ جن کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا اور باقی حضرات جنھیں منتخب کیا جا سکتا تھا وہ سب آپ کی طرف جُھک گئے۔

صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین۔

خلافتِ نبوّت

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ خلافتِ نبوّت امیرالمؤمنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر ختم ہوگئی، اور اس کے بعد سے ملوکیت کا دور رہا۔ اس تصور کو آلِ بُوَیہ کے وقت سے اتنا اُچھالا گیا ہے کہ جیسے یہ بھی شریعتِ اسلامیہ کا کوئی مسئلہ اور عقائد کا کوئی جزئیہ ہو۔ بیشک امت میں یہ تصور پہلے سے موجود تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک خلافتِ نبوّت کا دَور رہے گا، پھر ملوکیت آجائے گی اور اس کے بعد پھر آخر میں خلافتِ نبوّت کا قیام عمل میں آئے گا۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشگوئیوں کو لوگوں نے اپنے اپنے وقت پر منطبق کرنے کی کوششیں کیں، اور چونکہ بات بے جوڑ تھی، نصوصِ صریحہ کے خلاف تھی، اس لئے محض بعض شخصیتوں سے مرعوب ہوکر، امت بلاوجہ الجھنوں میں گرفتار ہوگئی۔ کاش اُسے شریعت کا مسئلہ بناتے وقت ان بزرگواروں سے پوچھ لیا گیا ہوتا جنھوں نے شریعت قائم کی، جان و مال قربان کرکے دین برپا کیا، اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا اہلِ علم کو سمجھایا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی راہ سے ہٹ کر جو بات پیدا کی جائے گی اور جو نظریہ بنایا جائے گا وہ کبھی موجبِ طمانیت نہ ہوگا، اور ہرگز تعمیری نہ بن سکے گا۔

اہلِ تشیّع کا خیال بلکہ عقیدہ ہے، اور عقیدہ بھی بنیادی کہ خلافتِ نبوّت سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی، اور اگر ہوئی تو اسی وقت جب سیدنا علی مرتضیٰؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اور نظم امت درہم برہم ہوگیا۔ یعنی ان کے نزدیک امت کے افتراق و انتشار و اختلال کا جو زمانہ ہے وہ تو صحیح معنی میں خلافتِ نبوّت کا دَور ہے، لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد کا زمانہ غاصبوں اور ظالموں کی مستبدّانہ حکومتوں کا دَور رہا۔ جس میں دین غارت ہوا، کتاب ضائع کردی گئی، اور مقصدِ نبوّت فنا ہوگیا۔ سیدنا علیؓ کے بعد خلافتِ نبوّت پھر زاویۂ خمول میں چلی گئی، اور اس کا ظہور ان کے اس امام غائب کے زمانہ میں ہوگا جس کا یہ لوگ انتظار اسی طرح کر رہے ہیں جس طرح قرونِ ماضیہ میں اقوامِ عالم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ اسی لئے ایک ہزار برس کی اس مدّت میں انھیں اسلام اور مسلمانوں

سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا۔ اور ان کی زندگی کا مقصد یہ رہا کہ صحابۂ کرام اور خلفائے اسلام پر لعنت کریں، اور مسلم حکومتوں کو زیروزبر کرنے کی کوششوں میں مشغول رہیں۔

خوارج کا خیال ہے کہ خلافتِ نبوّت کا دَور امیر المؤمنین حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد سے یہ امت گمراہی اور باطل پرستی میں مبتلا ہے۔ انھوں نے بطور خود اپنے چند آدمیوں کو "امیر المؤمنین" کہا، جو سب کے سب مارے گئے۔ اس طرح دعوتِ محمدیہ کا کوئی نظام دنیا میں رہا ہی نہیں۔ اور اسی لئے ان کا مقصدِ حیات بھی یہی رہا کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے بعد جتنے صحابہ زندہ رہے اور اسلام میں جتنے خلفاء ہوئے ان پر لعنت کریں اور ہر مسلم حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے رہیں۔

پھر کچھ لوگ ہوئے جو کہتے تو چلے آرہے ہیں اپنے آپ کو سنت کا پابند اور جماعت سے وابستہ، لیکن اُن کا خیال ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد "اس امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی" یعنی دَورِ ملوکیت شروع ہوگیا۔ ان لوگوں کی حیثیت رہی تو ہے ہر زمانہ میں انفرادی، لیکن چونکہ یہ اصحابِ تصنیف ہیں، اس لئے اُن کی تحریروں کا زہر امت مسلمہ میں پھیلتا چلا گیا، اور اب اکثر ناواقف مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ خلافتِ نبوّت کا دَور صرف تیس ۳۰ برس رہا جس کے پورے پانچ برس اختلال کی نذر ہوگئے۔ اور جس میں تین خلفاء کے گلوں پر چھری پھیر دی گئی۔ ان لوگوں کا ایک طرف تو دعویٰ ہے کہ جس نبی کے یہ نام لیوا ہیں وہ آخری نبی ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اس کی لائی ہوئی کتاب آخری کتاب ہے کہ اب کوئی کتاب نہیں آئے گی، اور اس کی برپا کی ہوئی امت آخری امت ہے، اب کوئی نئی امت ایسی پیدا نہیں ہوگی جس کا تعلق سلسلۂ نبوّت سے ہو، اور اس کا لایا ہوا نظامِ حیات آخری نظام ہے، اب اس نظام کی علمبردار کوئی قوم پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن پھر اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ جس امت کو اللہ تعالیٰ نے خیرِ امت کہا ہے اور جس گروہ کو اس نے زمین پر اپنا گواہ بنایا ہے، اس بہترین امت اور اس گروہِ باصفا نے اپنے آخری نبی کا لایا ہوا نظام تیس برس بھی قائم نہ رکھا اور اپنے ہی ہاتھوں اپنا نظام تباہ و برباد کر ڈالا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس دین کو غالب کرنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ غلط نکلا، اور اپنے جن بندوں کو اس نے کہا تھا اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (یہی ہیں سچے مومن)، وہ سب اپنا دین کھو بیٹھے، اور ایک ایسے نظامِ حیات پر راضی ہوگئے جو اُن کے نزدیک اللہ و رسولؐ کے منشاء کے خلاف تھا، اور مقاصدِ نبوّت کے

منافی۔ نعوذ باللہ من شرور الناس۔

معلوم نہیں اس ناپاک تصوّر کی بنیاد دین کے کس اصول پر ہے۔ باقی معاملات میں تو یہ لوگ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہؐ، اجماعِ صحابہ، اور قیاس ہی پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن خاص اس اہم ترین مسئلہ میں انھوں نے سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک خود ساختہ تصوّر کو پے بہ پے بیان کرکے اس بدعت و ضلالت کو اتنا رواج دیا کہ اب یہ مسلّمات میں سے ہے، بلکہ اس سے اختلاف کرنے والا شاید مبتدع کہلائے۔ حالانکہ اُن کا وضع کردہ یہ تصوّر قطعاً بے بنیاد ہے بلکہ عیاناً کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماعِ صحابہ اور قیاس کے خلاف ہے۔ اور اسی لئے اس کا مآل بھی ایک درجہ میں وہی نکلا جو روافض اور خوارج کے تصوّرات کا ہے۔ کہ امّت آج اپنے اسلاف کرام سے سوءِ ظن میں مبتلا ہے، اور اپنی تاریخ پر فخر کرنے کی بجائے مایوسیوں کا شکار ہے اور دل کی گہرائی سے یہ سمجھتی ہے کہ دین فرسودہ ہوگیا، امت کا دَور ختم ہوگیا، اور اس کی نشأۃ ثانیہ کے اب امکانات نہیں۔

بات یہ ہوئی کہ جب آلِ بُوَیہ نے عروج پکڑا، اور نظامِ خلافت پر اتنے حاوی ہوگئے کہ جیسے انہی کے ہاتھ میں امّتِ محمدیہ کے امور کا انصرام آگیا ہو، تو جہاں اور قسم قسم کی بدعات انھوں نے پھیلائیں اور اسلامی معاشرہ میں زندقہ والحاد کو فروغ دینا چاہا اس کے لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس یاس انگیز تصوّر کو امّت کے دلوں میں القاء کریں، تاکہ تاریخ اسلام مسخ ہو، اور ائمۂ اسلام کے اجتہاد کی حجیّت ختم ہو جائے۔

چونکہ عباسیوں کی خلافت تھی اور آلِ بُوَیہ اپنے آپ کو ان کی بیعت میں اسی طرح کہتے تھے جیسے اُن کے متقدمین نے سیدنا علیؓ کا دامن پکڑ رکھا تھا، اس لئے انھیں علانیہ ملوک کہنے کی ہمت نہ کرسکے۔ ادھر جمہور اہل اسلام کو خلفاء ثلٰثہ سے عقیدت تھی اس لئے ان لوگوں کو اپنا نظریہ کھُل کر سرکاری بنانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انھوں نے جب لعنت اور سبّ وشتم کا سلسلہ شروع کرنا چاہا، اور اس سے مسلمان برافروختہ ہوئے تو اس سے بھی یہ لوگ ایک درجہ میں باز آگئے۔ لیکن یہ مسئلہ بہر حال اٹھا دیا کہ خلافتِ نبوّت کو چاروں اصحاب پر ختم سمجھ لیا جائے۔

امویوں کی خلافت جاتی رہی تھی، لہٰذا انھیں جبّاروں میں شامل کرنا چنداں دشوار نہ تھا، اور نہ ان کی خلافت کے مبارک دور کو جاہلیت کا تسلّط بتا دینا مشکل تھا۔ روایتوں کی ٹکسال اُن کے ہاتھ میں تھی، اور جس قسم کی جو بات رائج کرنا چاہتے تھے، اس کی حمایت میں جیسی نص

کی ضرورت ہوتی وہ تیار کرلی جاتی تھی۔ اپنے انہی مقاصد کے تحت انھوں نے یہ بات طے کرادی کہ خطبوں میں صرف چار خلفاء کا نام لیا جائے اور باقی عشرۂ مبشرہ کا ذکر اجمالاً ہو۔ ناموں کی تصریح نہ کی جائے۔ خلیفۂ عصر کے لئے البتہ دعاء کی اجازت تھی، مگر اس طرح کہ ساتھ ساتھ خود ان کا مردود نام بھی لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات میں سے صرف حضرت سیدۂ فاطمہ صلوات اللہ علیہا کا تذکرہ ہو۔ اور آپ کی اولاد کی اولاد میں سے صرف سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کا۔ سیدنا عباسؓ کا ذکر خلفاء عباسیہ کے مورث ہونے کی بناپر روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اسی لئے سیدنا حمزہؓ کا نام بھی شامل کردیا۔ اگرچہ ان کے خطابات "اسداللہ" اور "سیدالشہداء" ان سے چھین لئے گئے۔ سیدنا عقیل رضی اللہ عنہ میں چونکہ ان لوگوں کے نزدیک جاہلیت کی رگ تھی اور نہ سیدنا علیؓ کی زندگی ہی میں سیدنا معاویہؓ سے جا ملے تھے، اس لئے ان کا نام لینا ممنوع ٹھہرا، اور اسی کی پاداش میں سیدنا جعفر طیارؓ کا مبارک نام بھی ساقط کردیا گیا۔

غرض یہ ہے کہ آلِ بُوَیہ اور مسلمانوں کے درمیان یہ ایک قسم کا غیر مکتوب سمجھوتہ تھا جس پر عمل شروع کردیا گیا۔ مسلمانوں نے بھی بزرگانِ پیشین کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے اس بدعت کو برداشت کرلیا کہ بہرحال خلفاء اربعہ کا نام لینے کی سبیل تو نکلی۔ ورنہ بغداد کا حال تو یہ تھا کہ علانیہ مساجد کے دروازوں پر خلفائے اسلام کے نام لے لے کر لعنت لکھی جاتی تھی، جسے رات کو مسلمان مٹادیا کرتے تھے[۱] (ملاحظہ ہو محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ، الدولۃ العباسیۃ، ص ۳۸۲)

[۱] آلِ بُوَیہ کے تسلط سے پہلے عباسی امامت میں سنت کا اتباع کیا جاتا تھا، جماعت کی حرمت برقرار تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ یکساں عقیدت و محبت کا عالم تھا۔ پھر احوال بدل گئے۔ محاضرات کے حوالے سے جو کچھ یہاں بیان کیا جارہا ہے وہ اس عہد کی معتبر تاریخ میں ہر جگہ بیان کیا گیا ہے۔

فقد کان اھل بغداد قبل الدولۃ البویہیۃ علی مذہب اھل السنۃ والجماعۃ ویفضلون الشیخین ابا بکر وعمر علی سائرھم ولا یقدحون فی معاویۃ ولا غیر من سلف المسلمین فلما جاءت ھذہ الدولۃ وھی متشیعۃ

بُوَیہی حکومت سے پہلے اہل بغداد سب مذہب اہل السنۃ والجماعت کے پیرو تھے۔ تمام صحابہ کی عزت کرتے تھے اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر دونوں بزرگواروں کو سب سے افضل جانتے تھے۔ حضرت معاویہ کی جناب میں سوء ادب سے احتراز تھا، اور نہ کسی دوسرے

(باقی برصفحہ ۲۰۰)

لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ کسی کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا اعتقادی مسئلہ نہیں ہے کہ لوگ جب چاہیں اور جس قسم کا نظریہ چاہیں بنالیں۔ ایسے امور کا فیصلہ ہمعصر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بعد کے لوگوں کی رائے کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر کسی شخص کے خلیفہ اور امام ہونے پر ہمعصر امت نے اجماع کر لیا تو وہ خلیفہ اور امام ہے ورنہ نہیں۔ یہ کوئی خیالی اور نظری بات نہیں ہوئی واقعی اور حسّی ہوئی ہے۔ عقل اگر خبط ہو جائے اور واقعات کی دنیا سے نکل کر آدمی خیالی فضاؤں میں پرواز شروع کر دے تب البتہ یہ کر سکتا ہے جو ایک صاحبِ تصنیف صوفی صاحب نے کیا کہ سیدنا حسینؓ شہیدِ مظلوم رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی کے ساتھ موٹے موٹے حروف میں "امیر المومنین" لکھ دیا۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۹)۔ غالیۃ تما مذہب الشیعۃ ببغداد دوجدلہ من قوۃ الحکومۃ انصاراً فقد کتب علی مساجد بغداد ۳۵۱ھ ما صورتہ:

"لعن اللہ معاویۃ بن ابی سفیان ولعن من غصب فاطمۃ رضی اللہ عنہا فدکاً ومن منع ان یدفن الحسن عند قبر جدہ علیہ السلام ومن نفی اباذر الغفاری ومن اخرج العباس من الشوریٰ"۔

گذرے ہوئے مسلمان پر طعن کرتے تھے۔ لیکن جب یہ فرقہ پرست غالی حکومت آئی تو بغداد میں شیعہ مذہب پروان چڑھا اور حاکمانہ اقتدار کے بل پر اس کے مددگار پیدا کئے گئے۔ ۳۵۱ھ میں بغداد کی مسجدوں پر یہ عبارت لکھوائی گئی:

"خدا معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت کرے، اور اس شخص پر لعنت کرے جس نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کا فدک کا حصہ غصب کیا اور اس پر جس نے حسنؓ کو ان کے نانا علیہ السلام کے پاس دفن نہیں ہونے دیا، نیز اس پر جس نے ابوذر غفاریؓ کو شہر بدر کیا، اور اس پر جس نے عباسؓ کو شوریٰ سے خارج کر دیا"۔

والخلیفۃ کان محکوماً علیہ لا یقدر علی المنع واما معز الدولۃ فبامرہ کان ذلک۔ فلما کان اللیل حکہ بعض الناس۔ فاراد معز الدولۃ اعادتہ فاشار علیہ وزیرہ ابو محمد المہلبی بان یکتب مکان ما محی:

لعن اللہ الظالمین لآل رسول اللہ

خلیفۂ وقت بے دست و پا تھے اور اسے روکنے کی ان میں قدرت نہ تھی۔ یہ صرف معز الدولہ تھا جس کے حکم سے یہ حرکت کی گئی۔ جب رات ہوئی تو بعض لوگوں نے اسے مٹا دیا۔ معز الدولہ نے چاہا کہ اس کا اعادہ کرے لیکن اس کے وزیر ابو محمد المہلبی نے مشورہ دیا کہ جو عبارت مٹا دی گئی ہے اس کی بجائے صرف حسب ذیل عبارت لکھ دی جائے:۔

(باقی بر ص۲۰۱)

امیر المؤمنین ایک شرعی اور سیاسی اصطلاح ہے، اور سوائے اس شخص کے جو امّتِ مسلمہ کا حاکمِ اعلیٰ ہو کسی دوسرے کے لئے مستعمل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ صحابۂ کرام اور جمہورِ امّت نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جب بیعت کی تو انھوں نے یہ بیعت کن الفاظ میں کی، اور کس خطاب سے آپ کو مخاطب کیا۔

دَورِ خلافت ختم ہو کر دَورِ ملوکیت شروع ہونے کے معنی ہیں اسلام کے سیاسی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی۔ صحابۂ کرام نے کبھی اس بنیادی تبدیلی کا اعلان کیا؟ یا بیعت کے الفاظ میں، یا حاکمِ اعلیٰ کے خطاب میں کوئی ترمیم کی، جس سے معلوم ہو کہ منصب کی نوعیت بدل گئی۔ صحابۂ کرام

(بقیہ حاشیہ صنہ ۳) صلی اللہ علیہ وسلم۔ ولا یذکر احداً فی اللعن الا معاویۃ۔"

"خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جنھوں نے آلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کیا۔" نام لے کر کسی پر لعنت نہ کی جائے سوائے معاویہ کے۔"

ففعل ذٰلک۔

چنانچہ اسی پر اس نے عمل کیا۔

یہ جن حضرات پر لعنت کی گئی ان میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ فدک کے غاصب سے مراد حضرت صدیق اکبرؓ ہیں، سیدنا حسنؓ کو روضۂ شریف میں دفن نہ ہونے دینے والے سیدنا مروان بن الحکم ہیں، سیدنا ابو ذرؓ کو شہر بدر کرنے والے سے مراد سیدنا عثمانؓ ہیں اور سیدنا عباسؓ کو شوریٰ میں شامل نہ کرنے والے سیدنا عمرؓ ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

سیدنا عباسؓ کا نام محض خلیفۂ وقت کا غصہ دھیما کرنے کے لئے ٹانک دیا گیا ہے، ورنہ سب جانتے ہیں کہ اُن کے ہاں ان کی کتنی عزت ہے [ملاحظہ ہو نواب محسن الملکؒ کی آیاتِ بیّنات، ص؟، طبع دار الاشاعت، کراچی]۔ ہم یہ عبارت نقل کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے۔ البتہ اہلِ ایمان کو بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے اپنے بعد جن چھ حضرات کو نامزد کیا تھا ان میں سیدنا عباسؓ کو تعظیماً شامل نہیں کیا۔ حضرت فاروقؓ کے دل میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اتنی عظمت و عقیدت تھی کہ جب قحط پڑتا تو اِنہی کے وسیلہ سے دعا مانگا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری: ج ۲، ص ۳۰۱ طبع مصر:-

عن انس رضی اللہ عنہ انّ عمر بن الخطاب کان اذا قحط استسقیٰ بعباس بن عبد المطلب فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبیّنا صلی اللہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (امیر المؤمنین) عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کی عادت تھی کہ جب قحط پڑتا تو (سیدنا) عباس بن عبد المطلب کے وسیلہ سے بارش کی

(باقی بر صنہ ۲۰۲)

نے حضرت صدیق اکبرؓ کو "خلیفۂ رسول اللہ" کہا، اور حضرت فاروق اعظم کو "خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ" گویا سیدنا عثمانؓ کو کہتے "خلیفۂ خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ"۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے سیدنا عمروؓ بن العاص نے لفظ "امیر المؤمنین" تجویز کیا، اور یہی لفظ تمام خلفاء کے لئے رائج ہو گیا۔ اب صحاح کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرامؓ نے سیدنا معاویہؓ کو "امیر المؤمنین" کے علاوہ کسی دوسرے خطاب سے یاد کیا ہو۔ وہ تو آپس میں بھی ان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) علیہ وسلم فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبیّنا فاسقنا قال فیسقون۔

دعاء کیا کرتے تھے، اور عرض کرتے "خدایا ہم پہلے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعاء کیا کرتے تھے اب اپنے نبی کے چچا کے وسیلہ سے دعاء کرتے ہیں" (سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ بارش ہو جاتی تھی)۔

اسی طرح جب وظائف کا دیوان مرتب ہوا ہے اور صحابہ نے چاہا کہ اوّل امیر المؤمنین سے ابتداء کریں تو آپ نے فرمایا "نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے ابتداء کرو اور عمر کو وہیں رکھو جہاں اس کا مقام ہے" چنانچہ سب سے پہلے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی لکھا گیا پھر بقیہ بنو ہاشم کا۔ بہرحال ہمیں اہل بیت کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ خلفائے عباسیہ کی موجودگی میں اور ان کا مذہب جانتے ہوئے معز الدولہ یا اس کے کسی ہیرو کو اس سے کیا مطلب تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سیدنا عباسؓ کو شوریٰ میں شامل کیا یا نہیں۔

رہا فدک کا مسئلہ تو ہم بحث میں پڑنے کی بجائے اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر فدک پر اہل بیت کا مالکانہ کوئی حق تھا تو امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی خلافت کے زمانہ میں اس پر ذاتی قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے نہیں کیا تو اس کے بعد پھر کسی کو بولنے کا یارا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بارے میں انہی صفحات میں روشنی ڈال دی گئی ہے۔ اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کو شہر بدر کرنے کا جو افسانہ تراشا گیا ہے اس کی بھی قلعی کھول دی گئی ہے۔

آلِ بُوَیہ کی اسی ناپاک حرکت کا ردِّ عمل تھا جو امام ابو بکر ابن العربیؒ نے بیان فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو آلِ بُوَیہ کے تسلط سے نجات دی تو مسلمانوں نے بغداد کی مسجدوں کے دروازوں پر یہ عبارت لکھدی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین ہستی حضرت ابو بکرؓ کی تھی، پھر حضرت عمرؓ کی، پھر حضرت عثمانؓ کی، پھر حضرت علیؓ کی، اور پھر اہل ایمان کے ماموں حضرت معاویہؓ کی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔ ورنہ مسجدوں پر یہ کلمات لکھنے کی کیا ضرورت ہوتی۔

یہ معز الدولہ ہی ہے جس نے عشرۂ محرم کو ماتم کرنے کا حکم دیا اور پھر جشنِ غدیر منانے کا۔ یہی

(باقی برصفحہ ۲۰۳)

ذکر امیر المؤمنین ہی کہہ کر کیا کرتے تھے [صحیح بخاری: ج ۱، ص ۵۳۱، کتاب المناقب طبع اصح المطابع]

قیل لابن عباس هل لك فی امیر المؤمنین معاویة فانه ما اوتر الا بواحدة۔ قال اصاب انه فقیه۔

"حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا گیا" ذرا دیکھئے تو امیر المؤمنین معاویہؓ نے کیا کیا۔ انھوں نے وتر کی ایک ہی رکعت پڑھی"۔ فرمایا "اچھا کیا۔ انھیں دین کی سمجھ ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۲) خاندان ہے جس نے اپنے خوشامدیوں سے ایسی کتابیں لکھوائیں جو سلف صالحین پر طعن سے مملو ہیں۔ مسعودی اسی دربار کا وظیفہ خوار تھا۔

محمد خضری کی بیان کردہ اس تفصیل میں ایک بات البتہ تعجب انگیز ہے کہ انھوں نے آلِ بُوَیہ کو زیدی مذہب کا متبع بتایا ہے، اور کہتے ہیں (محاضرات: ص ۳۷۸، الدولة العباسیة):۔

وکان یخطر ببال معز الدولة ان یزیل اسم الخلافة ایضاً عن بنی العباس ویولیها علویاً لان القوم کانوا شیعةً زیدیةً لان التعالیم الاسلامیة وصلت الیهم علیٰ ید الحسن بن زید ثم علیٰ ید الحسن الاطروش وکلا منهما زیدی۔

معز الدولہ کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ بنو عباس کے نام سے خلافت کا نام مٹا دے اور کسی علوی کو قائم کرے کیونکہ یہ لوگ زیدی شیعہ تھے اور اسلامی تعلیمات ان تک حسن بن زید کے ذریعہ پہنچی تھیں، اور پھر حسن الاطروش کے ذریعہ۔ اور یہ دونوں زیدی تھے۔

ان دونوں ہاشمیوں کا زیدی ہونا مسلّم ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ انہی کے ذریعہ آلِ بُوَیہ تک اسلام پہنچا۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مذہباً آل بُوَیہ زیدی شیعہ تھے۔ اقتدار جب اُن کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے زیدی مذہب کو خیرباد کہا بلکہ اس صحیح النسب فاطمی خاندان سے اپنا ظاہری تعلق بھی توڑ دیا۔ ۳۵۵ھ تک آلِ اطروش کا وجود جبالِ دیلم میں موجود تھا، اور یہ زمانہ آلِ بُوَیہ کے انتہائی عروج کا ہے۔ ایک طرف ان لوگوں کی اتنی طاقت تھی کہ اگر چاہتے تو خلیفۂ عباسی کی امامت ہی ختم کر دیتے۔ چنانچہ پہلا کام معز الدولہ نے یہ کیا کہ اپنے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر امیر المؤمنین المستکفی باللہ رحمہ اللہ کو معزول کر دیا، قصرِ خلافت کو لوٹ لیا، حتیٰ کہ وہاں کچھ باقی نہ رہا تو امیر المؤمنین کو پابجولاں معز الدولہ کے گھر تک لایا گیا تھا۔ اور ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے ان بدباطنوں کا غلبہ برداشت نہیں کیا۔

اگر ان لوگوں کے دل میں اپنے ان ائمہ کی کوئی قدر ہوتی جنھوں نے انھیں کلمہ شریف پڑھایا تھا، تو

(باقی بر صفحہ ۲۰۴)

صحابۂ کرام نے جب جلوت و خلوت میں سیدنا معاویہؓ کو ہمیشہ اسی خطاب سے یاد کیا جو حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا، تو کیسے سمجھ لیا جائے کہ ان کی منصبی حیثیت کو وہ کچھ اور سمجھتے تھے۔ پھر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اُن کے حقوق کی رعایت میں صحابۂ کرام نے کیا فرق برتا؟ وہ تو ان کے احکام کے ایسے ہی پابند تھے جیسے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے احکام کی پابندی کیا کرتے تھے۔ ان کے اجتہاد پر ایسے ہی عمل ہوتا تھا جیسے خلفاء پیشین کے اجتہاد پر۔ ان کے جھنڈے کے نیچے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳) ان کی سسکتی ہوئی حکومت کو بحال کرتے، اور نہیں کیا تھا تو کم از کم ان کے عقائد ہی کی پیروی کرتے۔ زیدی مذہب میں خلفاء ثلثہ پر طعن حرام ہے۔ اُن کی خلافت کو وہ درست سمجھتے ہیں۔ اور جمہورِ صحابہ کی تعظیم ان کا شعار ہے۔ سیدنا معاویہؓ اور اموی سادات کے ساتھ جو اُن میں سے بعض کی بے ادبی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ بعد کی باتیں ہیں۔ خود خضری نے امام زید رضی اللہ عنہ کے خروج کے کوائف بیان کرتے وقت یہ متفق علیہ بات بیان کی ہے کہ جب امام زیدؓ نے خروج کی تیاری مکمل کر لی تو آپ کے ہاتھ پر جان دینے کی بیعت کرنے والوں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ "ابوبکر و عمر کی بابت آپ کی رائے کیا ہے"؟ آپ نے جواب دیا تھا: [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، ج ۲، ص ۱۹۵] :

"رحمها الله وغفر لهما ما سمعت احداً من اهل بيتي يقول فيهما الاخيرا وان اشد ما اقول فيما ذكرتم انا كنا احق بسلطان من رسول الله صلى الله عليه وسلم من الناس اجمعين فدفعونا عنه ولم يبلغ ذلك عندنا بهم كفراً وقد ولوا فعدلوا في الناس وعملوا بالكتاب والسنة"

"اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کی خطائیں بخشے۔ میں نے اپنے گھر والوں میں کسی کو ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی دوسری طرح کرتے نہیں سُنا۔ تم نے جو کچھ کہا اس پر میں جو سخت سے سخت بات کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سب لوگوں کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے حقدار ہم تھے، لیکن انھوں نے ہمیں اس سے دور رکھا۔ یہ بات ہمارے نزدیک کچھ کفر کی نہیں کیونکہ یہ لوگ جب حاکم ہوئے تو انھوں نے لوگوں کے ساتھ عدل کیا اور کتاب و سنت پر عمل رکھا۔"

جو لوگ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے مذہب پر ہیں اُن کی زبان و قلم سے وہ کلمات ہرگز نہیں نکل سکتے جو معز الدولہ نے مسجدوں کے دروازوں پر لکھوائے۔ چنانچہ یہاں ہم زیدی مذہب کے ایک بڑے عالم محمد بن الحسن دیلمی یمانی کی کتاب قواعد عقائد آل محمدؐ کے وہ ابتدائی کلمات نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ کے مذہب کے بطلان پر لکھی ہے۔ یہ کتاب مرحوم امام یحییٰ حمید الدین کے کتب خانہ میں محفوظ تھی۔

(باقی بر صفحہ ۲۰۵)

جہاد کو اسی طرح افضل العبادات سمجھا جاتا تھا، ان کا حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت اسی طرح طیب اور نعمتِ الٰہی کہلاتا تھا۔ زکوٰۃ اور عُشر انھیں اسی اصولِ دین کے تحت ادا کیا جاتا تھا جس طرح پہلے خلفاء کو۔

زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلہ میں اگر صحابۂ کرام نے حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت معاویہؓ کی حکومت میں کوئی فرق کیا ہوتا تو اس تصوّر کی گنجائش تھی جو لوگوں نے بے دلیل وضع کر لیا ہے'

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴) اور ۱۹۵۰ء میں مطبعۃ السعادۃ مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ابتدا ان کلمات سے ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قبل الاشتغال ببیان مذہب الباطنیۃ نذکر طرفاً من مذہب الغلاۃ والمفوضۃ لانہم منہم ایضاً۔ وذٰلک لانّ اصول مذہب الغلاۃ والمفوضۃ والباطنیۃ من الاسماعیلیۃ و الامامیۃ الاثنی عشریۃ مختلط بعضہا ببعض فی کثیر من المسائل ولذٰلک قیل الامامیۃ دھلیز الباطنیۃ لانّ الکل دخلوا فی الشیعۃ من جہتہم وکلہم یدّعون التشیع ویغلون فی الدین ویخرجون من طریق المسلمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

باطنیوں کا مذہب بیان کرنے سے پہلے ہم غالیوں اور مفوّضوں کی بعض باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ لوگ بھی انہی میں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالی ہوں یا مفوّضی، اسماعیلی باطنی ہوں یا اثنا عشری امامی، ان سب کے مذہبی اصول بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ امامیہ کا مذہب باطنی مذہب کی دہلیز ہے۔ انہی کے ذریعہ لوگ شیعیت میں داخل ہوتے ہیں اور سب کے سب تشیّع کے مدعی ہو کر دین میں غلو کرتے ہیں اور مسلمانوں کے طریق سے نکل جاتے ہیں۔

مفوّضہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے کاروبار سیدنا علیؓ کے اور ان کی اولاد کے سپرد کر رکھا ہے:۔

ان اللہ تعالیٰ فوّض امر العالم الی الائمۃ الی علیّ والحسن والحسین علیہم السلام وباقی الائمۃ من بعدہم وہم یخلقون ویرزقون ویمیتون ویحیون ویبعثون ویعاقبون ویثیبون (ص ۱)

"اللہ تعالیٰ نے کارِ جہان ائمہ کے سپرد کر رکھا ہے یعنی سیدنا علی کے سیدنا حسن کے اور سیدنا حسین علیہم السلام کے اور اسی طرح ان کے بعد آنے والے باقی اماموں کے۔ یہی لوگ پیدا کرتے ہیں، رزق دیتے ہیں، مارتے ہیں، زندہ کرتے ہیں، قیامت کے دن اٹھائیں گے، اور پھر سزا و جزا دیں گے"

پھر آگے چل کر (ص ۱۰۵ میں) باطنیوں کے کفر کی دسویں وجہ بتاتے ہیں:۔

(باقی بر صفحہ ۲۰۶)

ورنہ قطعاً نہیں۔ سیدنا معاویہ رضؓ کی خلافت پر امت کا ایسا ہی اجماع ہوا جیسے حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت پر ہوا تھا۔ ان کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو صحابہ کرام نے اسی طرح باغی اور واجب القتل جانا جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو۔ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار آفتاب نصف النہار کے انکار کے مرادف ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵) منہا انہم یکفرون الامۃ المسلمۃ باجمہا ویسمونہم الامۃ المنکوسۃ ای عن رشدہا ویسمون الائمۃ والعلماء والفضلاء من لدن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا الطواغیت والاصنام ..... فاول صنم من اصنام الطاغوتیۃ ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ومن کان مثلہم فی کل وقت و زمان ....

وہل ہذا الا کفر صراح وشرک محض ؟

"علاوہ ازیں یہ لوگ (یعنی باطنیہ) تمام امتِ مسلمہ کی تکفیر کے قائل ہیں اور انھوں نے ان کا نام "امتِ سرنگوں" رکھا ہے۔ یعنی راہِ ہدایت چھوڑ دینے والی امت۔ پھر یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک کے ائمہ، علماء اور فضلاء امت کو شیاطین اور اصنام کہتے ہیں .....

(ان کے نزدیک) شیطانی بتوں میں پہلے بت ابوبکر ہیں، پھر عمر ہیں، پھر عثمان ہیں، اور انہی کی قسم کے دوسرے سب حضرات ہیں۔ جو کبھی اور کسی وقت پیدا ہوئے ہوں.....

کیا یہ خیال صریح کفر اور شرک محض نہیں ہے "

غرض یہ ہے کہ خضری کا یہ بیان کسی درجہ میں درست نہیں کہ آلِ بُوَیہ زیدی مذہب پر تھے اور نہ ان لوگوں کا قول درست ہے جو انھیں معتزلی المذہب کہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ سلف صالحین کا منہاج چھوڑ چکے تھے۔ انھیں امام زیدؒ یا ان زیدی ائمہ سے کچھ علاقہ نہ تھا جن کے ہاتھ پر اُن کا مسلمان ہونا بتایا جاتا ہے۔ یہ تو سبائیوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔ اگر انھیں ادنیٰ ترین درجہ میں بھی حسن الاطروش سے کچھ عقیدت ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں ان کا مذہب اور ان کی نسل دونوں کو ختم کر دیں۔ زیدی مذہب کا احیاء تو آلِ بُوَیہ کے ختم ہو چکنے کے بہت بعد کیا گیا۔ اگرچہ بعض زیدی لوگ صحابہ کرام کے مذہب سے دور جا پڑے ہیں، لیکن اصولاً اُن کے ہاں جماعت کی حرمت ہے، جمہور صحابہ کی تعظیم کرتے ہیں، کتابِ مبین پر ان کا ایمان ہے اور سنت کے ساتھ استمساک کرتے ہیں۔ مرحوم امام یحییٰ حمید الدین ایسے جامع الکمالات شخص تھے کہ زیدی مذہب کے علاوہ فقہ حنفی و شافعی و مالکی و حنبلی پر بھی انھیں عبور تھا۔ اور چلتے پھرتے بھی وہ ہر مذہب والے کو اس کے مذہب کے مطابق فتویٰ دیدیا کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زیدی لوگ اپنی

اصل میں جماعت سے کس درجہ قریب ہیں۔ آلِ بُوَیہ اور دوسرے سبائیوں کو زیدیوں سے کیا علاقہ ؟

اب ہم آتے ہیں نصوصِ شرعیہ اور آثارِ صحابہ کی طرف کہ ایک صاحبِ ایمان کے نزدیک صرف وہی حجت ہیں:

کتابُ اللہ آیتِ استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو زمین پر خلافت دینے کا جب وعدہ کیا تو اس میں مطلقاً اس کا اشارہ نہیں کہ یہ وعدہ صرف تیس برس کے لئے ہے (النور: ۵۵)۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۔

اللہ تمھارے ان لوگوں سے وعدہ کرتا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے کہ وہ یقیناً انھیں زمین پر ایسے ہی حکومت عطا فرمائے گا جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔ اور وہ یقیناً اُن کے لئے وہی دین برپا رکھے گا جو اس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور وہ یقیناً ہر خوف کے بعد انھیں امن سے نوازے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ اس (وعدہ کی موجودگی میں بھی) کوئی انکار کرے تو یہی لوگ ہیں فاسق (یعنی بدراہ)۔"

اب یہ کیسا غضب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عام وعدہ کو جو قیامت تک کے لئے پوری اُمت سے ہے، صرف تیس[۳۰] برس کے لئے سمجھ لیا جائے، جس میں سے پانچ برس خالص اختلال کی نذر ہو جائیں اور فتنہ پر فتنہ بپا ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ امت اس لئے بپا کی تھی، اور اس غرض سے انھیں زمین پر گواہ بنایا تھا کہ وہ اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام پورے تیس برس بھی نہ چلا سکے۔ اور یہ توفیق نہ ہو کہ اگر گردابِ فتن میں مبتلا ہو جائے تو اس سے نکل کر وعدۂ الٰہی کا مورد بن سکے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کا دین برپا رکھے گا، اور ہر خوف کے بعد امن سے نوازے گا، لیکن یہ مجدد و مجتہد بننے والے لوگ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تیس[۳۰] برس کے بعد سے نہ دین برپا رہا، نہ خوف کے بعد امن نصیب ہوا، اور نہ اختلال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی کوئی سبیل پیدا کی۔ گمراہی کا جو نظام امیر المؤمنین معاویہؓ کے عہد سے قائم ہوا، اسی پر یہ امت چل پڑی۔ اب یا تو انھیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو غلط یا عارضی قرار دیں (نعوذ باللہ من ذٰلک)، یا پھر سمجھیں کہ خود یہ غلطی پر ہیں، اور صحابۂ کرام اور ان کا اتباع کرنے والی جماعت حق پر تھی،

اور جو منہاج انھوں نے قائم کیا وہ صواب تھا۔

دراصل لوگوں نے خلافتِ نبوت کے متعلق خیالی اور وضعی باتیں پیدا کرلی ہیں۔ اور خلفائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے منہاج کی حقانیت اپنے خود ساختہ تصورات کے تحت ظاہر کرنے کے لئے ایسی ایسی احمقانہ روایتیں گھڑی ہیں کہ اُن کی عقلوں پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی بابت مسعودی کا بیان ہے (مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۳۱):

لم یلبس علیہ السلام فی ایامہ ثوبًا جدیدًا ولا اقتنیٰ ضیعۃً ولا ربعًا الاشیئًا کان لہ بینبع مما تصدق بہ وحبسہ۔

"(سیدنا علی) علیہ السلام نے اپنی خلافت کی پوری مدت میں نیا کپڑا نہیں پہنا اور نہ کوئی گاؤں خریدا اور نہ زمین رکھی سوائے ینبع کی کچھ جائداد کے جو آپ نے صدقہ اور وقف کردی تھی۔"

گویا آپ کے لئے کارگاہ میں پہلے ہی سے پرانا کپڑا بُنا جاتا تھا، یا دوسروں کی اُترن پہنا کرتے تھے۔ یعنی اوروں کے لئے نیا کپڑا پہننا جائز تھا مگر سیدنا علیؓ کے لئے ناجائز۔ یہ فرضی اور خیالی بات جو مدح سے زیادہ ذم ہے، اس شخص کے متعلق کہی گئی ہے جس کے سامنے قرآن مجید کی ایک ایک آیت اُتری، اور جو تیئیس برس تک جلوت وخلوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ جس نے زندگی میں نو نکاح کئے، اور ان کے علاوہ کئی اولاد والی لونڈیاں (امہات الاولاد) چھوڑیں، جس کے تیس سے زیادہ اولادیں ہوئیں، جس پر اُن کا نان ونفقہ فرض تھا، جس کی محض زکوٰۃ کی رقم ہزاروں دینار ہوتی تھی، صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔ ایسی ہی فضول اور لغو باتیں حضرت فاروق اعظمؓ حضرت صدیق اکبرؓ بلکہ خود سرور معلّین صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت وضع کی گئی ہیں جن کا نہ سر ہے نہ پیر۔

پھر ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ خلافت یا ملوکیت یا بادشاہت یا ریاست یا مملکت، یا جو بھی اس کا نام رکھا جائے، اس کا انحصار سربراہِ حکومت کی شخصیت یا کارکنوں کی ذاتوں پر نہیں ہوتا، اس سے مراد ہوتا ہے وہ اجتماعی سیاسی نظام جو رائج الوقت ہو، وہ قوانین جن پر حکومت کی بنیاد ہو، اور وہ دستور جس کے تحت سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام چلایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت اور خلافتِ نبوت کے مقاصد بتادیئے ہیں جن کی تاویل وتفصیل کے لئے رازیؒ وزمخشریؒ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عربی داں عیاناً جانتا اور سمجھتا ہے۔ ارشاد ہے (الحج: ۴۱):-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا

وہ لوگ جنھیں ہم زمین پر جب حکومت عطا

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔	فرماتے ہیں، تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور تمام امور کی انجام دہی اللہ کے ہاتھ ہے۔"

جس حکومت نے ان شعبہائے زندگی کو منظم رکھا، اس نے مقاصدِ الٰہی پورے کر دیئے۔ اگر ایسی حکومت کو بھی خلافتِ نبوت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا تو پھر کتاب و سنت کی روشنی میں خلافت کی کوئی تعریف ہی نہیں۔

اولی الامر

قرآن حکیم میں جا بجا اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے۔ مثلاً (النساء: ۵۹):-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔	اے اہل ایمان اللہ کی اطاعت کیا کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کیا کرو اور اُن کی بھی جو تم میں سے حاکم ہوں۔ اب اگر کسی مسئلہ میں تمھارا اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہی سب سے بہتر طریقہ اور نتیجہ کے لحاظ سے بہتر صورت"

یہاں اور ایسے ہی دوسرے مقامات پر اس کی قطعاً کوئی تحدید نہیں کہ اولوالامر فلاں طبقہ اور فلاں حیثیت کے ہوں گے، فلاں زمانہ سے اُن کا تعلق ہوگا، یا فلاں طریقہ پر برسرِ اقتدار آئیں گے۔ یا اس حکم کا اطلاق فلاں وقت تک ہوگا، اور اس کے بعد اولوالامر کی اطاعت اللہ و رسول ؐ کی اطاعت نہیں رہے گی۔

صرف ایک آیت ہے وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (شوریٰ) (وہ اپنے معاملات باہم مشورہ سے طے کیا کریں گے)۔ لیکن کسی زمانہ میں اور کسی صاحبِ عقل نے اس کا مطلب یہ نہیں لیا کہ اپنے گھر کے معاملات میں اپنے محلہ والوں سے مشورہ لیا کریں، یا مریض کی بابت انجینیر سے رائے لی جائے، یا طبیعیات کا مسئلہ اور عمل کیمیاوی کی کوئی اُلجھن ہو تو اس کا حل فقیہ سے دریافت کیا جائے، یا علمِ عروض کی بات ہو تو درزی سے اس کی تحقیقات کی جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے لوگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ سیاست کا تعلق اربابِ حل و عقد سے ہے، یعنی ان لوگوں سے جو عملی سیاست کے ماہر ہوں، یا معاشرہ میں اُن کی یہ حیثیت ہو کہ اجتماعی مسائل میں رائے دیں، تو اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔ ارشادِ خداوندی ہے: (النساء: ۸۳):-

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ	"جب اُن کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات

۱۴۱

اَذَاعُوا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ، وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ؀	پہنچتی ہے تو اُسے شہرت دینے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اُسے رسول تک پہنچادیں اور اپنے حاکموں تک، تاکہ جو لوگ اس قسم کے مسائل اور صورتِ حال کا مآل دیکھ سکتے ہیں وہ بات کی تہ

تک پہنچ سکیں۔ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند کے علاوہ باقی تم سب شیطان کے پیچھے ہولیا کرتے۔

اس آیتِ مبارکہ میں ایک اہم دستوری مسئلہ بیان ہوا ہے کہ امورِ سیاسی پر غور و فکر اور رائے زنی کا حق اربابِ سیاست کو ہے۔ عسکری امور سے باخبر رہنا، اور خطرناک نتائج سے بچنے کی تدبیریں کرنا امرائے عساکر کا کام ہے۔ نظری حیثیت سے مسئلہ کا مالہٗ و ماعلیہ دریافت کرنا فقہاء اور قانون داں لوگوں کے ذمہ ہے۔ یہ شرط کہ بات اُن تک پہنچائی جائے جو مسئلہ کا حل دریافت کر سکتے ہیں، اس سے ان سب لوگوں کی تردید ہوگئی جو اس بات کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہر قسم کا مسئلہ ہر کس و ناکس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اور جو بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کی بھی رائے لی جائے۔

دوسرا اہم معاشرتی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ افواہیں پھیلانا، اور بے تحقیق باتوں کو ایک کان سے دوسرے کے کان میں پہنچانا شیطانی فعل ہے۔ اس کے ذیل میں وہ سب لوگ آجاتے ہیں جنھوں نے مجہول راویوں کی روایتیں اپنی کتابوں میں بھری ہیں، اور درایت و عدل کو خیرباد کہہ کر امت کو گمراہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا۔ ان کی بیان کردہ باتوں کو جب تک سند بناکر لوگ پیش کرتے رہیں گے، ان سب کی گمراہی کا وبال ان مصنفوں پر پڑے گا، اور ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی قیامت تک بڑھتی چلی جائے گی۔

تیسرا اہم بنیادی مسئلہ یہ بیان ہوا کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی راہ سے ہٹ کر، یا اُن کے اجماع کی توہین کر کے کوئی دوسری راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ عیاناً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کتاب و سنت کا علم اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھا، انھیں ہے۔ اس طرح یہ سب لوگ شیطان کے پیرو بن گئے۔

اہلِ عالم پر یہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت کو ہمیشہ جماعت رکھا، اور ہر زمانہ میں اسلام کی نمائندگی کا شرف اسی متبعِ سنت جماعت کے ہاتھ میں رکھا، یہ برکت صحابۂ کرام کے قائم کیے ہوئے نظامِ خلافت کی ہے۔ اور اسی کا مآل

یہ نکلا ہے کہ آج تک کبھی اور روئے زمین کے کسی گوشہ میں اہلِ عالم نے یہ نہیں سمجھا کہ اسلام کے متعلق صحیح معلومات پیش کرنے کا حق کسی درجہ میں انھیں بھی ہے جو جماعت سے کٹ گئے، اور اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر اپنا سود و زیاں جماعت سے جدا کر لیا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جب بات ہوگی، شمال میں، جنوب میں، مشرق میں مغرب میں، مسلمانوں کے حلقے میں یا کافروں کے اداروں میں، وہ بات ہمیشہ اسی قرآن مجید سے ہوگی جو امتِ محمدیہ کے ہاتھ میں ہے، اسی نظامِ خلافت سے ہوگی جو حضرت صدیق اکبرؓ اور آپ کے خلفاء کا ہے، اور اسی نظامِ فقہی سے ہوگی جو حضرت امام اعظمؒ سے لے کر حضرت امام احمدؒ کے عہد تک مدوّن ہوا۔

امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے جتنے خلفاء ہوئے، ان کے برسرِ اقتدار آنے کے طریقے مختلف رہے، کسی کے طریقۂ انتخاب میں دوسرے طریقۂ انتخاب سے مماثلت نہیں۔ اس اختلاف میں وجہ اتفاق صرف ایک ہے یعنی امت کا اجماع اور یہی اصلِ اصول ہے۔ یہ کہنا کہ انتخاب کا فلاں طریقہ درست ہے اور فلاں غلط، فلاں صواب ہے اور فلاں مشتبہ، یہ لوگوں کی اپنی خیالی باتیں ہیں۔ اور صحابۂ کرام کے ساتھ گستاخی پر مبنی۔ یہ جو لوگ جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگاتے ہیں، اگر یہ اپنے ہی زمانہ کو دیکھیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک لفظ جمہوریت کی کتنی تعبیریں موجود ہیں، انگلستان، امریکہ، فرانس، روس، چین، اور ہندوستان سب جگہ جمہوریت ہی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اور یہ دعویٰ سب کو تسلیم بھی ہے تو اُن کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ اسلام میں جمہوریت کا جو تصور ہے اس کی بھی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ویسے اگر انصاف اور اخلاص سے دیکھا جائے کہ صحیح معنی میں کس شخص کو اپنے منتخب ہونے سے پہلے ہی جمہور اہلِ اسلام کی تائید حاصل تھی، تو تاریخ اسلام میں ایسا سب سے پہلا شخص امیر المؤمنین معاویہؓ ہیں۔ باقی سب کے لئے محدود استصواب ہوا تھا، اور بعض کے لئے استصواب قطعاً نہیں ہوا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ اسلام صرف جمہوریت کا قائل ہے کہ جو شخص برسرِ اقتدار آئے اسے امت قبول کرلے، اور اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت جانے، اس کے خلاف کھڑے ہونے والوں کا ساتھ نہ دے بلکہ انھیں باغی اور واجب القتل سمجھے۔

سنّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر اپنے بعد خلافت کے بارے میں تصریحات کی ہیں، وہاں بھی کوئی بات ایسی نہیں جس سے زمانہ کی قید نکالی جاسکے۔ بلکہ زمانہ کی قید نکالنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کا لایا ہوا دین، آپ کی بنائی ہوئی امت اور آپ کا برپا کردہ

نظام تھوڑی سی مدت کے لئے ہے۔ ارشاد مبارک ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لانبی بعدی فسیکون خلفاء فیکثرون قالوا فما تامرنا قال فوا ببیعۃ الاول فالاول۔ اعطوھم حقھم فان اللہ سائلھم عما استرعاھم۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے فرمایا "آپ کا ارشاد ہے "بنو اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کے ہاتھ میں تھی۔ ایک نبی کا جب انتقال ہوتا، توان کی جگہ دوسرے نبی کا تقرر ہوجاتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے (یا یہ کہ ایک وقت میں کئی کھڑے ہوجائیں گے)۔ صحابہ نے عرض کیا "پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" فرمایا "جو بھی پہلے آتا جائے اس کی بیعت پوری کرو، اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ اُن کی رعایا کے بارے میں اُن سے خود ہی بازپرس کرے گا (بخاری ومسلم)

اس متفق علیہ حدیث کی موجودگی میں خلفاء کی تعداد مقرر کرنا انتہائی جرأت کا کام ہوگا۔ دین کی شوکت اور تمام عالمِ اسلام میں ایک مستحکم امامت کے قیام کے متعلق آپ نے پیشگوئی فرمائی: (صحیح بخاری: کتاب الاحکام؛ صحیح مسلم: کتاب الامارۃ):-

عن جابر بن سَمُرَۃَ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یکون اثنا عشر امیراً فقال کلمۃ لم اسمعھا فقال ابی انہ قال کلھم من قریش۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ بارہ امیر ہوں گے۔ پھر آپ نے کچھ فرمایا جو میں سُن نہ سکا، تو میرے والد نے بتایا "فرمارہے ہیں کہ سب قریش میں سے ہوں گے"

اس کے بعد مُسند احمد میں نہایت قوی سند سے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے (ج ۱، ص ۳۹۸):-

عن مسروق بن الاَجدعِ الھمدانی قال کنّا جلوساً عند عبداللہ بن مسعود وھو یقرئنا القرآن۔ فقال لہ رجل یا ابا عبدالرحمٰن ھل سألتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مسروقؒ بن اجدع ہمدانی سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں ہم حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی خدمت میں حاضر تھے اور آپ ہمیں قرآن مجید پڑھارہے تھے۔ ایک صاحب نے دریافت کیا:

کم یملک ہذہ الامۃ من خلیفۃ۔ فقال عبداللہ بن مسعود ماساًلنی عنہا احدٌ منذ قدمتُ العراق قبلک ثم قال نعم ولقد ساًلنا ہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقال اثنا عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل۔

"اے ابوعبدالرحمٰن! کیا آپ حضرات نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ بااختیار ہوں گے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "جب سے میں عراق آیا ہوں تم سے پہلے کسی شخص نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔" پھر فرمایا: "ہاں ہم نے واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا "بارہ" یعنی جتنے بنو اسرائیل کے نقیب تھے۔"

یہ حدیث حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد کی ہے۔ اور اسی وقت سے صحابۂ کرام نے امت کو بتا دیا تھا کہ ان کے دَور میں بارہ بااختیار خلیفہ ہوں گے۔ گویا یہ اختتام خلافتِ امویہ تک کی بشارت ہے۔ یہ شرف اموی خلفاء کو حاصل رہا کہ تمام عالمِ اسلام کا ایک سیاسی مرکز تھا، اور صرف ایک امام ہوتا تھا جس کا حکم پوری اسلامی دنیا پر چلتا تھا۔ اور یہ شرف بھی صرف اموی خلفاء کو حاصل ہے کہ صحابۂ کرام نے ان سے بیعت کی۔ بعد کے خلفاء زمانہ گذر جانے کی بنا پر اس شرف سے محروم رہے۔ یہ سعادت بھی اموی خلفاء ہی کو حاصل تھی کہ ان کی مملکت کے کارکنوں میں صحابۂ کرام ہوتے تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ آخر عہدِ اموی تک کا زمانہ صحابۂ کرام کا زمانہ ہے، اور جو نظامِ مملکت تھا وہ صحابہ ہی چلا رہے تھے، اور انہی کی رائے اور منشاء کے مطابق کاروبارِ جہانبانی قائم تھا۔

ایک اہم حدیث

سیاساتِ اسلامیہ کے متعلق صحاح میں ایک نہایت ہی اہم حدیث ہے، جس پر عموماً توجہ نہیں کی جاتی۔ اور اگر کسی نے اس پر توجہ کی بھی تو تعبیر میں غلطی کی۔ (صحیح بخاری: کتاب الفتن: باب کیف الامر اذا لم تکن جماعۃٌ)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

کان الناس یسئلون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر وکنت اساًلہ عن الشر مخافۃ ان یدرکنی۔ فقلت یا رسول اللہ انا کنا فی جاہلیۃ وشرٍ فجاءنا اللہ بہذا الخیر

لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی بابت پوچھا کرتے تھے۔ لیکن میں شر کے متعلق بات کیا کرتا تھا کہ کہیں میرے زمانہ میں بپا نہ ہو میں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! ہم جاہلیت

فہل بعد ہذا الخیر من شر؟ قال نعم، قلتُ وہل بعد ذٰلک الشر من خیر قال نعم وفیہ دخن، قلتُ وما دخنہ؟ قال قوم یہدون بغیر ہدیی تعرف منہم وتنکر۔ قلتُ فہل بعد ذٰلک الخیر من شر؟ قال نعم دعاۃٌ علیٰ ابواب جہنّم من اجابہم الیہا قذفوہ فیہا۔ قلتُ یا رسول اللہؐ! صفہم لنا؟ قال ہم من جلدتنا ویتکلمون بِاَلسِنَتِنَا۔ قلتُ فما تأمرنی ان ادرکنی ذٰلکَ؟ قال تلزِمُ جماعۃ المسلمین و امامہم۔ قلتُ فان لم یکن لہم جماعۃ ولا امام؟ قال فاعتزل تلک الفِرَق کلہا ولوان تعضّ باصلِ شجرۃ حتّٰی یدرکک الموت وانت علیٰ ذٰلک۔

اور شر میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لے آیا (یعنی اسلام)، تو کیا اس خیر کے بعد کچھ شر آجائے گا؟" فرمایا "ہاں"۔ میں نے عرض کیا "اس شر کے بعد خیر ہوگی؟" فرمایا "ہاں مگر اس میں کمزوری رہے گی"۔ میں نے عرض کیا "کمزوری کیا ہوگی؟" فرمایا "ایسے لوگ ہوں گے جو میری ہدایت کا خیال کئے بغیر عمل کریں گے، کوئی بات تمھیں اُن کی گوارا ہوگی اور کوئی ناگوار"۔ میں نے عرض کیا "پھر اس خیر کے بعد تو شر نہیں آئے گا؟"۔ فرمایا "ہاں! جہنم کے دروازوں پر بُلانے والے کھڑے ہوں گے، جو بھی اس طرف اُن کے کہنے سے جھکے گا وہ اسے اس میں (جہنم میں) دھکیل دیں گے"۔ میں نے عرض کیا "یارسول اللہؐ! ان کی علامت تو بتایئے؟" فرمایا "ہم ہی میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولیں گے"۔ میں نے عرض کیا "اگر ایسا وقت مجھ پر آجائے تو پھر میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟"۔ فرمایا "مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا"۔ میں نے عرض کیا "اگر ان کی جماعت اور امام نہ ہو تب؟"۔ فرمایا "تو پھر ان سب فرقوں سے الگ ہو کر بیٹھ رہنا، اگرچہ کسی درخت کی جڑ کو دانتوں سے پکڑنا پڑے، تاآنکہ تمھیں موت آجائے اور تمھیں اس حال میں پائے"۔

امامت کے بارے میں یہ حدیث بڑی اہم نص ہے۔ سیدنا حُذَیفہؓ پر اللہ کی یہ بڑی رحمت تھی کہ فتنہ پھیلنے سے پہلے ہی آپ کو اٹھا لیا گیا۔ امیر المؤمنین سیدنا عثمان صلوات اللہ علیہ کی شہادت سے کچھ ہفتے بعد مدائن میں وفات پائی۔ اور اُن ہنگاموں کا آپ پر کچھ اثر نہ ہوا جو مرکزِ اسلام میں بپا تھے۔

اس ارشادِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے، اور حقیقت بھی یونہی ہے کہ اسلام کے بعد جو شر آیا وہ تمام عالم کو محیط ہو جاتا، اگر اللہ تعالیٰ ارتدادِ عرب کے وقت حضرت صدیق اکبر صلوات اللہ وسلامہ علیہ

کو قائم کر کے آپ کو وہ عزیمت نہ بخشتا جس نے اسلام کو معجزانہ بچالیا۔

اس کے بعد خیر کا زمانہ ہے وہ صدیوں تک کا ہے، یعنی اس وقت تک کا جب مسلمانوں کی جماعت اور اس کا امام نہ ہو۔ اس دورِ خیر میں اس جماعت اور اس کے ائمہ کے حلقہ سے باہر وہ لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازوں پر کھڑے بُلا رہے ہوں گے۔ کسی ایک دروازہ پر نہیں بلکہ سب دروازوں پر، اور قسم قسم کی گمراہیاں اور عقائد باطلہ لے کر امتِ محمدیہ کو تباہ کرنے کے درپے ہوں گے۔ اس صورت میں پناہ کی ایک ہی سبیل ہو گی کہ آدمی جماعت اور اس کے امام سے وابستہ رہے۔ ہر وہ تحریک جو جماعت کو کمزور اور امام جماعت کی فاعلیت کم کرنے کے لئے چلائی جائے گی وہ جہنم میں دھکیل دینے کے مرادف ہو گی۔

یہ کمزوری خود مسلمانوں میں بھی ہو گی۔ وہ اور ان کے امام سب کے سب یک گونہ اس کمزوری میں مبتلا ہوں گے۔ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو دین سے عقیدتاً وابستہ اور جماعت میں شامل رہنے کے باوجود معیاری زندگی بسر نہیں کریں گے۔ ان کی بعض باتیں اچھی ہوں گی اور بعض بُری۔ ہر بڑی قوم میں جس کا حلقۂ اثر و نفوذ وسیع اور مدتِ بقار طویل ہو، اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چھوٹے پیمانہ پر تو ممکن ہے کہ ہر شخص معیاری زندگی بسر کرے اور تعلیمات میں پورا رچا ہوا ہو، لیکن یہ امر فطرتِ انسانیہ کے خلاف ہو گا کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد جب ہو، اور ملک کے ملک ان کے تصرف میں ہوں تو ان کے اندر کوئی خرابی اور کمزوری نہ آئے۔

دعوتِ محمدیہ کی بنیاد فطرۃ اللہ پر ہے۔ جس کا ایک بنیادی اصول ہے "کُلٌّ یعمل علٰی شاکلتہ (ہر شخص اپنی افتادِ طبع کے مطابق عمل کرتا ہے)"۔ غلطیاں ہوتی ہیں، گناہ ہوتے ہیں، خرابیاں آتی ہیں، کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود چونکہ وہ اپنی زندگی کا معیار عقیدتاً وہی رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرمایا ہے، اس لئے دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ انھیں نوازتا ہے۔ انھیں سزائیں ملتی ہیں، لیکن ہر خوف کے بعد امن اور ہر ذلت کے بعد انھیں سربلندی عطا ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ دعوتِ نبوت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا رتبہ بلند ہے، اور تمام اقوامِ عالم کے مقابلہ میں حق کی گواہی کا شرف انہی کو حاصل ہے (الفاطر: ۳۲):۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا	پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا،

مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ	جنھیں اپنے بندوں میں سے چُن لیا تھا۔ بعض ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض درمیانی راہ چلنے والے اور بعض ایسے جو

اللہ کے حکم سے نیکیوں کی طرف رغبت کے ساتھ بڑھیں۔ یہ ہے بڑا فضل۔"

جب تک جماعت اور اس کا امام موجود ہے وہ خیر کا مرکز ہے اور رحمتِ الٰہی کا مورد، اگرچہ اس امام یا اس کی جماعت کے افراد کے افکار و اعمال معیاری نہ ہوں۔ وجہ ظاہر ہے کہ کتاب کی وراثت نے انھیں سب کو برگزیدہ کر دیا ہوگا، اور چونکہ نظام بہر حال برپا ہوگا، اس لئے اس کی یہ برکت بھی مشہود ہوگی کہ اصلاح کے امکانات قوی رہیں۔ جب تک جماعت اور اس کا امام ہے اس وقت تک کسی قسم کا اُتار چڑھاؤ مہلک نہیں ہو سکتا، اور نہ جماعت پراگندہ ہو سکتی ہے۔ ہر ٹھوکر کے بعد سنبھلیں گے، اور ہر انتشار کے بعد مرکزیت کی طرف دوڑیں گے۔

لیکن جب وہ وقت آجائے کہ نہ مسلمانوں کی جماعت ہو اور نہ اس کا امام تو پھر وقت ہوگا اپنے اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کا۔ مسلمانوں میں اگر کچھ جان ہوگی تو پھر وہ قرونِ اُولیٰ کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں گے، کہ نئے سرے سے امّت کی شیرازہ بندی ہو اور اس میں مرکزیت پیدا کر کے امام کے نصب کا انتظام کیا جائے۔

امت کی پوری تاریخ میں یہ منحوس زمانہ ہمارا ہے کہ عالمِ اسلام کا کوئی امام نہیں، اور نہ جماعت کا کوئی نظام ہے۔ سب کے سب جغرافیہ، نسل اور فرقہ بازی کے شرک میں مبتلا ہیں، اور محض ادنیٰ زمینی اور مادّی منافع کے درپے۔ وہ مقصد عُلیا جس کے لئے اس امت کی تشکیل کی گئی تھی، سب نے پسِ پشت ڈال دیا۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں موجود ہیں، لیکن سب کی سب آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ لیکن جو طاقتیں حقیقتاً اور عقیدتاً اسلام کی دشمن اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے درپے ہیں، ان کے سامنے سب کے سر خم ہیں۔ ان کفار نے اور ان مکذبانِ دعوتِ محمدیہ نے عالمِ اسلام کو آپس میں بانٹ رکھا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ مسلمان کسی طرح ایک جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہونے پائیں۔

عالمِ اسلام کی اس صورتِ حال سے دعوتِ محمدیہ کے مقاصد ضائع ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں میں روز بروز اپنے دین سے بیگانگی بڑھ رہی ہے۔ اگر کسی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے اور کسی طبقہ میں جذبہ بیدار ہوتا ہے تو اپنوں ہی کے ہاتھوں وہ بار در نہیں ہو پاتا۔

اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو امامتِ عالم کا منصب عطا فرمایا تھا۔ لیکن مسلمانوں کا عالم یہ ہے کہ کسی کے گلے میں صلیب ہے اور کسی کے سر پر درانتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جو ملک جماعت سے کٹ کر امام کے حلقۂ اثر سے باہر ہوا اسی پر کفر نے چھاپہ مارا،

سب سے پہلے اندلس نے علٰحدگی اختیار کی تھی، وہی سب سے پہلے دار الکفر بنا، اور ایسا کہ اب اسے دار الاسلام بنانا خواب و خیال ہوگیا۔ ہندوستان نے بھی امیر المومنین کی بیعت سے انکار کیا، اس پر انگریز مسلّط ہوگیا، یہی حال مصر کا ہوا، بخارا کا ہوا، تاآنکہ آخری جرکہ عرب نے لگایا۔

حدیث بالا میں یہ الفاظ بہت غور طلب ہیں "وہ ہماری ہی نسل اور ہماری ہی زبان کے ہونگے" ہوتے تو رہے، سب ہی شر کے داعی نام کے مسلمان اور عربی بولنے والے، کیونکہ عربی ہی سرکاری زبان تھی۔ لیکن یہ کارنامہ صرف عربوں کا ہے، اور وہ بھی ہاشمیوں کا کہ جو ملک ڈیڑھ ہزار برس سے دار الاسلام تھے یعنی عراق و شام، ان پر نصاریٰ مسلّط ہوگئے۔ اور ساتھ ہی فلسطین میں "اسرائیل" کا مستقل ناسور جسدِ اسلام کو کھا جانے کے لئے جڑ پکڑ گیا۔

یہ خمیازہ اس جرم عظیم کا ہے کہ عربوں نے امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کی، اور اس کے لئے سہارا لیا اُن کا جن کے متعلق صریح حکم ہے (المائدۃ : ۵۱) :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔	اے ایمان لانے والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا کارساز مت بنانا وہ آپس میں ایک دوسرے کے کارساز ہیں۔ جس نے بھی ان سے دلی دوستی رکھی وہ انہی میں ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ظلم کیش لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

جس امت کے نبی کی آخری وصیت تھی "اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب" (یہود و نصاریٰ کو عرب کے جزیرہ سے نکال دینا) اسی ہادی برحق کی اولاد میں ایک شخص نے جان بوجھ کر یہود و نصاریٰ دونوں کو سرزمینِ عرب پر مسلّط کر دیا۔ اشتر نخعی سے لے کر شریف حسین تک، سب وہی لوگ امت کو تباہ کرنے کے درپے رہے جو اسلام کا جامہ پہنے رہتے تھے نسلاً عرب تھے یا عربی بولتے تھے۔ اِنَّ فی ذٰلک لعبرۃ لاولی الابصار۔ کافروں سے کھلی جنگ میں مسلمانوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ ہر میدان انھوں نے مارا۔ البتہ ہر فتح کو شکست میں تبدیل

کرنے والے وہ نام نہاد مسلمان تھے جو کافروں سے مل گئے، اور ان میں اکثر و بیشتر سبائی گروہ کے لوگ ہی ہوئے ہیں۔ تیرہ سو برس کی اس تاریخ سے بے اعتنائی برتنا انتہائی حماقت اور بدترین جہالت ہوگی۔

ایک اور حدیث

سیدنا نعمان بن بشیرؓ نے سیدنا حُذَیفہؓ سے اسی مضمون کو ایک اور طرح نقل کیا ہے۔ اگرچہ حدیث کا ماخذ قوی نہیں لیکن واقعات کے مطابق ہے، اور اس میں ایک بات ہے بہت غور طلب۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں بیان کیا گیا ہے:۔

"تم میں نبوّت کا وجود اس وقت تک باقی رہے گا جب تک خدا چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ نبوّت کو اٹھالے گا اور اس کے بعد نبوّت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک خدا چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو اٹھالے گا اور اس کے بعد ملوکیت ہو جائے گی کاٹنے والی۔ جب تک خدا چاہے گا اسے قائم رکھے گا۔ پھر اس کے بعد نبوّت کے طریقہ پر خلافت ہوگی۔"
اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے۔ (مسند احمد و سنن بیہقی)۔

اس حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ جب عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو میں نے ان کو یہ حدیث لکھ کر بھیج دی اور امید ظاہر کی کہ آپ ہی وہ خلیفہ ہیں جن کا ذکر اس حدیث میں کاٹنے والے بادشاہ اور جبر کی حکومت کے بعد آیا ہے۔ (حضرت امیر المؤمنین، عمر بن عبد العزیزؒ اس سے بہت خوش ہوئے۔

مقدس نوشتوں کی اسی قسم کی تاویل سے پیچیدگی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ راویِ حدیث نے اسے اس زمانہ پر منطبق کر دیا جو اسلام کی عظمت و عروج کا زمانہ تھا۔ اور پھر ارشادِ نبوی کو اشخاص کے بارے میں سمجھ لیا۔ حالانکہ صراحۃً ذکر نظام کا ہے۔ کسی صرفی اور نحوی اصول یا علمِ معانی کے اعتبار سے اسے خلفاء کی شخصیتوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پانچ قسم کی حکومتوں کے دَور بیان کئے گئے ہیں:

(۱) **حکومتِ نبویہ**:۔ جہاں اختلاف و اجتہاد کا کوئی سوال نہیں۔ محض سُننا اور اطاعت کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی حکم دیں، اس کی تعمیل بے چون و چرا واجب ہے۔ اختلاف صرف ان امور میں تھا جو آپ بحیثیت بشر یا فردِ ملت کے بیان فرمائیں،

اور اجتہاد صرف ان امور میں جب آپ امام کی حیثیت سے کوئی رائے دیں۔ نبی کی حیثیت سے جو فرمائیں اس کی اطاعت فرض تھی۔ مثال کے طور پر غزوۂ احد کا ذکر کافی ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کی حیثیت سے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حملہ آوروں کا مقابلہ شہر میں رہ کر کیا جائے۔ لیکن صحابہ میں سے وہ حضرات جو شوقِ شہادت سے سرشار تھے وہ باہر نکل کر لڑنا چاہتے تھے۔ اور یہی اکثریت کی رائے ہوگئی۔ آپؐ نے مآل عیاناً دیکھ چکنے کے باوجود اکثریت کے اس فیصلہ کو قبول کرلیا، اور اندر ہتھیار لگانے تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں صحابہ پر انفعالی کیفیت طاری ہوئی اور سب نے فیصلہ کیا کہ جو حضورؐ کی رائے ہے اسی پر عمل کیا جائے۔ اور جب آپؐ باہر تشریف لائے تو سب نے معافی مانگی، اور عرض کیا کہ حضور جس طرح فرماتے ہیں اسی پر عمل فرمائیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا نبی جب ہتھیار لگا لیتا ہے تو پھر مہم سر کئے بغیر نہیں اُتارتا۔

پہلا حکم بحیثیت امام کے تھا جس سے اختلاف کیا جا سکتا تھا، لیکن دوسرا حکم بحیثیت نبی کے تھا جس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ فردِ ملت ہونے کی حیثیت سے آپ کے بہت سے مشورے آپ کے اصحاب رد کر دیا کرتے تھے۔ نظامِ اسلامی میں فرد آزاد ہے اور اپنی رائے کا مختار۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ خود قرآن مجید میں موجود ہے کہ انھیں آپؐ نے بار بار مشورہ دیا کہ اپنی زوجۂ محترمہ کو طلاق نہ دیں، مگر انھوں نے دیدی۔ یہ اُن کا حق تھا جو انھوں نے استعمال کیا۔ کیونکہ میاں بیوی میں ایک دن نہ نبھی۔ بہر حال اس نہج کی حکومت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اب کوئی انسان ایسا نہیں آسکتا جس کی بات محض اس لئے مانی جائے کہ اس کی ہے۔ اور نہ کسی کا ایسا حکم چل سکتا ہے جو اللہ و رسولؐ کے منافی ہو، یا شخصی آزادی پر اس سے حرف آتا ہو۔ جس کا بھی حکم چلے گا وہ اسی وقت جب شریعت کے مخالف نہ ہو۔

۲۔ خلافتِ نبوت :۔ یہ دور ہے کتاب و سنت کے مطابق دنیوی حکومت کا۔ اس حکومت کے چلانے والوں میں کوئی شخص مطاع مطلق نہیں۔ اصل مطاع صرف اللہ اور اس کا رسول ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ خلفاء اور ائمہ کا کام ہے اللہ و رسولؐ کے احکام کا نفاذ۔ قانوناً کسی اصلِ دینی اور حکمِ صریح کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک مرکز کے تحت ایک جماعت کی صورت میں امامتِ عالم کے فرائض انجام دیں۔ اور اقوامِ عالم میں وہ نظامِ عدل برپا رکھیں جو منشاء بعثتِ انبیاء ہے۔ اس حکومت میں کوئی شخص قانون سے بالا نہیں اور نہ کسی کا یہ منصب ہے کہ وہ قوانین بنائے، اختیاراتِ شخصِ واحد کے ہاتھ میں ہوں،

یا ایک بااثر حلقہ کے۔ یہ حلقہ امام نے چُنا ہو یا رعایا نے منتخب کر کے امام کی مدد کے لئے بھیجا ہو۔ یہ انتخاب محدود استصواب پر مبنی ہو یا رائے عامہ لی جائے۔ یہ لوگ اپنی طرف سے خود کوئی قانون نہیں بنا سکتے البتہ اللہ و رسول کے عطا کئے ہوئے احکام کے نفاذ اور ان احکام کی رُوح اور منشاء کو بروئے کار لانے کے لئے اجتہاد کر سکتے ہیں۔ اسی لئے فقہائے اسلام نے یہ شرط رکھی ہے کہ جو لوگ کاروبارِ حکومت چلائیں ان میں اجتہاد کی قابلیت ہونی چاہیئے، تاکہ ماحول کے مطابق احکامِ الٰہی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور فعّال بنا کر معاشرہ میں زندگی اور ارتقاء برقرار رکھ سکیں۔ خامیاں سب میں ہوتی ہیں اور غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، لیکن چونکہ مرجع موجود ہے لہٰذا اصلاح ہر وقت ہو سکتی ہے۔

۳۔ **ملک عضوض** :۔ نظامِ خلافت ختم ہونے کے بعد کٹکھنی حکومت قائم ہوگی۔ ہر حکومت کی اپنی وفاداری، اپنا دستور اور اپنا منہاج ہوگا۔ سب ایک دوسرے کو حریفانہ دیکھیں گے۔ اور اگر آپس میں ملیں گے بھی تو چند ادنٰی مادی اور دنیوی مفاد کے لئے۔ مسلمانوں کی ایسی حکومتیں بھی قائم ہوں گی جو صراحت کر دیں کہ ان کی حکومت دینی نہیں ہے، اور نہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔

اور ایسی حکومتیں بھی ہوں گی جو کہلاتی تو ہوں گی مسلم، اور اس انتساب پر انھیں فخر بھی ہوگا، لیکن اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں اُن کے ہاں قانوناً حلال ہوں گی۔ اور ان کبائر کے ارتکاب کے لئے سرکاری طور پر آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔ عدالتوں میں سودی کاروبار کے فیصلے ہوا کریں گے، سود خوروں کو سرکاری حمایت حاصل ہوگی، زنا کے لئے سرکاری اجازت نامے دیئے جائیں گے، اور شراب خانوں کو سرکاری ٹھیکے ملیں گے۔ آبکاری کا محکمہ حکومت کا ایک مستقل شعبہ ہوگا، اور اس کے افسروں اور کارکنوں میں وہ لوگ ہوں گے جو بظاہر نماز روزہ کے پابند ہوں گے خود نشہ نہ کرتے ہوں گے، اور اُسے حرام بھی جانتے ہونگے لیکن ان ملازمتوں کو حلال اور اپنی آمدنی کو طیّب جانیں گے۔ نماز کا انتظام انفرادی ہوگا، کہ جس کا جی چاہے پڑھے اور جو نہ چاہے نہ پڑھے۔ زکوٰۃ کی وصول یابی کا ان کے ہاں کوئی بندوبست نہیں ہوگا، لیکن ٹیکس لگانے پر یہ حکومتیں دلیر ہوں گی۔ جب یہ جنگ کریں گی تو مقصد اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں ہوگا، بلکہ ان کا جہاد ہوا کرے گا فی سبیل الوطن۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکومتِ اسلامیہ کے جو فرائض بتائے ہیں وہ سب ان حکومتوں میں غارت کئے جائیں گے۔ اقامتِ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی ایک بات کو بھی سرکاری

حیثیت نہیں دی جائے گی، اور پھر بھی دعویٰ ہوگا مسلم حکومت ہونے کا۔ اور بات بات میں اسلام اور سلف صالحین کا نام لیا جائے گا۔ ان ملکوں کے عضوض ہونے کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ انھوں نے عربی کو فروغ دینے کی بجائے اسے ملک بدر کر رکھا ہے۔ اللہ نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر انسان کی اس فطری اور قدیم ترین زندہ و پائندہ زبان کو اپنی آخری کتاب کے لئے چنا، اور صرف یہی وہ زبان ہے جو مسلمانانِ عالم کو ذہنی طور پر قریب لاسکتی ہے، لیکن اب سیاست کے معنی ہیں کہ اس زبان کے الفاظ اپنی اپنی زبان سے نکال دیئے جائیں، تاکہ مسلمانوں کی اجنبیت مکمل ہو جائے۔ اور جب وہ اپنے سالانہ بین الاقوامی اجتماع میں اپنے مرکز پر جمع ہوں تو ایک دوسرے کا مُنہ تکیں۔ عربی زبان سے بے نیازی بالآخر حج کو ختم کر کے رہے گی، جسے بے روح تو پہلے ہی کر دیا گیا ہے، عنقریب اس کا تصور بھی سرد ہو جائے گا۔

۴۔ جبر کی حکومت:۔ جب مسلمانوں کی یہ حالت الم نشرح ہو جائے گی تو پھر انھیں مجبوری کی زندگی بسر کرنے کا عذاب دیا جائے گا، ان پر کفار مسلط ہوں گے، اور معمولی فرائض دینیہ ادا کرنے کے لئے مسلمان اپنے ان کافر آقاؤں کے چشم و ابرو کو دیکھا کریں گے۔ جیسے ہندوستان کے مسلمان ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے، یا جیسے آج کے مسلمان کسی ایک کافر جتھے کے خیمہ بردار بنے ہوئے ہیں یا کسی دوسرے کافر جتھے کے۔ کہ اپنی سیاست، اپنی معاش اور اپنی معاشرت سب دوسروں کے ہاتھ میں دے کر عملاً ان کے محکوم بنے ہوئے ہیں۔ سب سے نمایاں مثال چین اور روس کے کروڑوں مسلمانوں کی ہے کہ جو مجبوری کی زندگی اُن کی ہے ایسی حالت شاید ہی کسی جگہ کے مسلمانوں کی ہوئی ہو جبر اپنی پوری شان سے وہاں ہو رہا ہے۔

یہ حالت جب انتہا کو پہنچ جائے گی، تو پھر بطور ردِ عمل کے یا تو خود مسلمانوں میں آزادی کی حرکت ہوگی، یا اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق نظامِ خلافت کے احیاء کے لئے کسی دوسری قوم کو حلقہ بگوش اسلام بنا کر اپنا کام لے گا۔ اس نے پہلے بھی ایسا کیا ہے "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے" اور آئندہ بھی ایسا کرنے کی اسے قدرت ہے۔ وہ قوموں کا محتاج نہیں۔ قومیں اس کی محتاج ہیں۔

اقوام عالم کی تاریخ میں ایک دَور کے بعد اچانک دوسرا دور شروع نہیں ہوتا، بلکہ آثار پیدا ہوتے ہیں، اور ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، تاآنکہ ایک دَور بالکل ختم ہو جائے، اور دوسرا دور بالکلیہ نمودار ہو جائے۔ اگر حدیث زیر نظر پر غور کریں تو واقعات کے بالکل مطابق ہے، تسبیح کے دانوں کی

طرح ایک کے بعد دوسرا واقعہ رونما ہوتا رہا۔ اندلس اور ہندوستان وغیرہ کی علٰحدگی سے لے کر عربوں کی بغاوت تک پہلا دور ختم ہوگیا۔ اس کے بعد خلافتِ اسلامیہ کا کہیں وجود نہیں، نہ مسلمان سیاسی حیثیت سے ایک جماعت ہیں اور نہ ان کا کوئی امام ہے، اور نہ خلافت کے احیاء کے فی الحال امکانات ہیں۔

البتہ حریف مسلم ممالک ہیں جو کسی طرح ایک وحدانی نظام میں منسلک ہونے پر آمادہ نہیں۔ ان ممالک نے کفر کے دو حلقوں کے تحت مجبوری کی زندگی شروع کر دی ہے، تا آنکہ وہ وقت آجائے جب تمام عالمِ اسلام مجبور و مقہور ہو، اور اُن کا یہ تصور مٹ جائے کہ کفر کے سہارے کے بغیر بھی زندہ رہنے کا امکان ہے۔ جسے دیکھو یہ عذر پیش کرتا ہے کہ فی الحال بالکل غیر جانبدار رہنے کی سبیل نہیں۔ کسی نہ کسی جتھے میں شامل ہونا پڑے گا، ورنہ ہم زندہ نہیں رہ سکتے (المائدۃ: ۵۲):۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۔	تم دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں گھسنے پر بڑے چست ہیں اور کہتے ہیں ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر کوئی افتاد نہ پڑ جائے۔

ابھی تو کفر کے اصرار پر یا اہل کفر کی خوشامد میں بعض "مسلم" حکومتوں نے "اسرائیل" کو تسلیم کیا ہے، پھر حکماً ایسا کرنا ہوگا۔ جب ذہنی غلامی اور سیاسی پستی انتہا کو پہنچ جائے گی، تو غیرتِ حق کو حرکت ہوگی، اور خلافتِ نبوّت برپا کرنے کا وقت آجائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔	ہو سکتا ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ فتح سے ہمکنار کرے یا کوئی اور صورت پیدا کر دے، اور پھر دلوں میں یہ باطل خیال پالنے والے اپنی کوتاہ عقلی پر پشیمان ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو اُمَّةً وَّسَطًا بنایا ہے (درمیانی امت) یہ ہر اعتبار سے درمیانی ہو۔ جغرافیائی حیثیت سے یہ کفر کے دونوں جتھوں کے درمیان حجاب حاجز ہے۔ اور غیر جانبدار رہ کر تصادم کو روک سکتی ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی درمیانی چال چلتی ہے، نہ اُس کے ہاں سرمایہ داری ہے اور نہ شخصی ملکیت کی نفی، معاشرتی امور میں اس کا موقف فطری اور عادلانہ ہے، نہ اس کے ہاں طلاق حرام ہے اور نہ ایسی آسان کہ خاندان کی وحدت برقرار ہی نہ رہ سکے، دین اس کا دنیوی ہے، یعنی تمام دینی امور ادا کرنے کے لئے اسے دنیا میں منہمک ہونا پڑتا ہے، نہ بالکل مادی طرزِ

زندگی ہے اور نہ مادّہ کی نفی کرکے خالص رُوحانی۔ اس کی آخرت کا انحصار اس کی دنیا پر ہے۔ اس میں طبقاتی کشمکش کے امکانات نہیں۔ اس کی حکومت میں نہ فرد اتنا آزاد ہے کہ جو چاہے نظریات رکھے اور جس قسم کے چاہے اعمال رکھے اور نہ فرد اتنا مجبور اور مقہور ہے کہ بطورِ خود نہ کچھ سوچ سکے، اور نہ اپنی ذمہ داری پر کچھ کرسکے۔ غرض یہ ہے کہ ظاہراً و باطناً اس کے پاس وہ تمام وسائل موجود ہیں کہ اگر یہ دین کو پکڑے تو جغرافیہ، نسل اور زبان کی افتراق انگیزیوں سے نجات پاکر ایک عادلانہ وحدت بن سکتی ہے اور جب اللہ چاہے گا کہ خلافتِ نبوّت قائم ہو تو اسے وحدت بن کر رہنا پڑے گا۔ بہر حال مسلمانانِ عالم اگر اپنے دین سے اسی طرح بیگانہ رہے، اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر مائل نہ ہوئے تو پھر جب تک چاہے گا اللہ ڈھیل دے گا، اور جب پکڑے گا تو پھر اس کے چنگل سے یہ نکل سکیں گے وَ اُمۡلِیۡ لَهُمۡ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ۔ (میں انھیں ڈھیل دیتا رہتا ہوں مگر میرا داؤں مضبوط ہوتا ہے)۔ آخری فتح ہمیشہ اللہ اور رسولوں کی ہوتی ہے۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ (اللہ نے یہ لکھ رکھا ہے کہ غلبہ اسے اور اس کے رسولوں ہی کو ہوگا)۔

سطورِ بالا سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سیدنا حذیفہؓ کی بیان کردہ حدیث کا جو مطلب اس کے راوی نے لیا تھا وہ کس درجہ بے اصل تھا، اور منشاء نبوّت کے کتنے خلاف۔

حدیثِ سفینہ

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جسے ایک منکرِ حدیث مؤرخ نے بطورِ حجت پیش کرکے "تاریخ الامت" میں یہ فیصلہ دیدیا کہ خلافت ختم ہوگئی، اور سیدنا معاویہؓ کے عہد سے ملوکیت کا دَور شروع ہوگیا۔ جو لوگ حدیث سے استناد کرتے ہیں انھوں نے نقد و جرح کے تمام اصول بالائے طاق رکھ کر اس حدیث کو صحیح سمجھ لیا۔ محض اس لئے کہ اس کی روایت امام مسلمؒ نے کی ہے۔ حالانکہ پیش لفظ میں ہم بیان کرچکے کہ صحیحین کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ان میں وارد شدہ تمام حدیثوں کو بے چون و چرا تسلیم کرلیا جائے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جیسے امامِ حدیث کا قول وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں "خلافت تیس۳۰ برس رہے گی اور پھر ملک ہو جائے گا"۔ اسی حدیث کو لوگوں نے اس موضوع پر حرفِ آخر قرار دے کر تمام نصوص کے مقابلہ میں اسے کھڑا کر دیا۔ گویا وہ دین جو قیدِ زمانی و مکانی سے آزاد ہے اس کا نظام صحیح بنیاد پر صرف تیس۳۰ برس رہا۔ اہلِ تاریخ جانتے ہیں کہ یہ تیس۳۰ برس کس طرح پورے ہوئے۔ پھر بھی اس حدیث کو حجت بنایا جاتا ہے۔ اس تحدیدِ زمانی کے معنی یہ ہوئے کہ سیدنا علیؓ اگر شہید نہ ہوتے تو ۴۱ھ سے وہ خلیفہ راشد

رہنے کی بجائے بادشاہ بن جاتے، بلکہ کٹکھنے بادشاہ۔ یا اگر سیدنا معاویہؓ کی بجائے اجماعِ امت سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص پر ہو جاتا، جو ایک وقت میں خلافتِ راشدہ کے لئے نامزد کئے جا چکے تھے تو انھیں ۴۱ھ تک زندہ رہنے کی یہ سزا دی جاتی کہ ان کی بیعت ہوتے ہی خلافت ختم اور کٹکھنا ملک شروع۔

دراصل یہ حدیث محض اموی خلفاء کی بے حرمتی کے لئے وضع کی گئی ہے۔ اسی لئے سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ جیسے غیر سیاسی اور مرنجان ومرنج صحابی کی زبان سے امویوں کو مہذّب گالی دلوائی گئی ہے "کنجی آنکھ والی کی اولاد"۔

دریافت طلب ہے کہ سیدنا سفینہؓ نے امیر المؤمنین معاویہؓ سے بیعت کی تھی یا نہیں۔ اگر کی تھی تو اللہ اور رسولؐ کے نام پر جس شخص کی اطاعت کا انھوں نے عہد کیا تھا، اس امام کے متعلق یہ ناشائستہ الفاظ کس حد تک درست ہیں؟ صحابہ کرام جس طرح بیعت کیا کرتے تھے اس کے الفاظ صحاح میں مروی ہیں۔ مثلاً سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے امیر المؤمنین عبدالملکؒ سے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی تھی (بخاری: صحیح، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناسَ ج ۴، ص ۲۴۵، طبع مصر)

الیٰ عبد اللہ عبدالملک امیر المؤمنین انّی اُقِرُّ بالسمع والطاعة لعبد اللہ عبدالملک امیر المؤمنین علیٰ سنة اللہ وسنة رسوله فیما استطعت وانّ بنیّ قد اقرّوا علیٰ ذٰلک۔	"اللہ کے بندے امیر المؤمنین کی جناب میں! میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے بندے عبدالملک امیر المؤمنین کا حکم میں سنوں گا اور اطاعت کروں گا۔ (میرا یہ اقرار) اللہ کی سنت اور اس کے رسولؐ کی سنت کی پیروی میں ہے۔

جس حد تک بھی میرا مقدور ہوگا (میں کوتاہی نہ کروں گا)، یہی اقرار میرے بیٹوں نے بھی کیا ہے"

اب سوچنا چاہئے کہ ان الفاظ کے ساتھ جس شخص سے بیعت کی جائے گی وہ "کٹکھنا بادشاہ" شرالملوک (بدترین بادشاہ) ہوگا یا خلیفہ رسول اللہؐ اور امام المسلمین؟ امیر المؤمنین عبدالملکؒ بہت بعد میں آئے ہیں اور تابعی ہیں، سیدنا ابن عمرؓ نے اسی قسم کے الفاظ کے ساتھ ان سے پہلے خلفاء سے بیعت کی تھی۔ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ ظاہر ہے کہ سیدنا سفینہؓ نے بھی اسی طریقہ پر بیعت کی ہوگی تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے ہوں جو اس حدیث کے مختلف طرق میں مذکور ہیں، مثلاً مُصنّف ابن ابی شیبہ میں۔

امام ابوبکر ابن العربیؒ نے (العواصم من القواصم: ص ۲۰۱ میں) مسلم شریف کی اس حدیث کو غیر صحیح بتایا ہے۔ ویسے بھی اس کی سند میں کوئی صاحب ایسے نہیں جن کا معتبر ہونا معرضِ بحث نہ ہو۔ پھر امام ابن العربیؒ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے کہ "اگر بالفرض یہ حدیث صحیح ہو تب بھی قابلِ قبول نہیں کیونکہ نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے"۔ دیکھا جائے تو محض دوسری احادیث صحیحہ ہی کے نہیں جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئیں بلکہ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماعِ صحابہ اور قیاس سب کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کو اگر واقعی خلافت جیسے اہم ترین اجتماعی مسئلہ کی بابت جمہور صحابہ سے ہٹ کر کوئی مخصوص علم دیا گیا تھا کہ خلافت تیس برس رہے گی، اور پھر ملک ہو جائے گا، تو انھوں نے جمعیتِ صحابہ کو کیوں متنبہ نہیں کیا، کہ سیدنا علیؓ کی خلافت تیس برس کے اندر قائم ہوئی ہے، اس لئے ان سے اختلاف کی گنجائش نہیں، اور جو اُن کے خلاف کھڑا ہو گا وہ خلیفۂ راشد کے خلاف کھڑا ہونے کی بنا پر مثل مرتد کے ہو جائے گا، اور جو اُن کی بیعت نہیں کرے گا وہ بھی حلال الدم ہو گا۔

پھر سیدنا معاویہؓ کو پسِ پشت بُرا کہنے سے تو بہتر یہ تھا کہ خود انہی سے صاف کہہ دیتے کہ تم خلیفہ نہیں ہو، اس لئے تمھیں اللہ و رسول کی بیعت لینے کا حق نہیں۔ ہم تمھارے ملک میں رہتے ہیں، تمھارے قوانین کی پابندی کریں گے، مگر یہ نہیں ہے کہ تم سے اختلاف کو عصیان سمجھیں، اور تمھاری اطاعت کو موجبِ رضاءِ الٰہی جانیں، کیونکہ تم محض بادشاہ ہو۔

کیسی عجیب بات ہے کہ بیعت تو کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی سنّت پر، اور اسی کی پیروی میں بات سننے اور اطاعت کرنے کی، لیکن سمجھتے ہیں بادشاہ، جو خود قانون ساز ہوتا ہے، قانون سے بالا ہوتا ہے، اور الٰہی قانون کا لازماً پابند نہیں ہوتا۔

عقلاً و نقلاً ہم یہ کبھی باور نہیں کر سکتے کہ سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی ہو گی جو تمام نصوص صریحہ و صحیحہ اور اجماعِ صحابہ کے خلاف ہے۔

الرّاشدون

سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے جس میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:-

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی تمسکوا بھا و — اپنے اوپر میری سنت اور میرے بعد میرے ان خلفاء کی سنت کی پابندی لازم سمجھو جو

عضوا علیھا بالنواجذ۔	ہدایت یافتہ اور ہدایت بخش ہوں گے۔ اسی سے وابستہ رہنا اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑنا۔

معلوم نہیں عربی زبان کے کن قواعد کے تحت اور دین کے کس اصول کے مطابق اس حدیث سے چار کی تخصیص کردی گئی۔ حالانکہ الفاظ اور جملوں کی ترکیب میں ادنیٰ ترین اشارہ بھی اس کا نہیں کہ پانچواں خلیفہ راشد نہیں ہوگا۔ یا کہ راشد صرف چار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو اور پھر ان کا اتباع کرنے والے تمام امتیوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔	لیکن اللہ نے تو تمھارے نزدیک ایمان کو محبوب کیا ہے، اور اسی سے تمھارے قلوب کو آراستہ فرمایا اور تمھارے دلوں میں کفر سے، بے راہ روی اور نافرمانی سے نفرت ڈال دی

یہی لوگ ہیں راشد (ہدایت یافتہ) یہ اللہ کا فضل و نعمت ہے اور اللہ ہی تمام باتوں کا جاننے والا، اور حکمت کے ساتھ بروئے کار لانے والا"

اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کی اس توصیف میں ان کا راشدون ہونا، اور ان کے احوالِ قلبیہ کا مزکّٰی و مطہّر ہونا بطور امرِ واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ مذہب ہے کہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔ اور بعد کے اصحابِ رجال کی جرح و تعدیل سے بالا۔ یعنی ایک حدیث کی روایت میں سند کے ہر شخص کو پرکھا جائے گا، لیکن جب صحابی تک سند بطریق صحیح پہنچ جائے تو اس صحابی کی عدالت میں شک نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اُن کے اجتہاد سے اختلاف ہو۔

انفرادی طور پر ہر صحابی کا فتویٰ یا مذہب قابلِ استدلال ہے، اور مجموعی طور پر جب وہ کسی امر میں متفق ہو جائیں یعنی بھاری اکثریت سے، تو ان کا موقف ایسا ہی حجت ہے جیسے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت صحابۂ کرام کے اجماع کا منکر نفس دین کا منکر ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اپنے اس انکار کے ذریعہ اس گروہ کی حجّیت ختم کردے جن سے ہمیں دین ملا ہے، جنھوں نے دین قائم کیا ہے، اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا گواہ بنایا ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا صحابی اور مجتہد ہونا مسلّم ہے۔ اب بڑی دلچسپ بات ہوگی

کہ آپ جو کچھ صحابی اور مجتہد ہونے کی حیثیت سے حکم دیں وہ قابلِ پذیرائی ہو، لیکن امّت کے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو فرمائیں اور حکم نافذ کریں اس کی تعمیل واجب نہ رہے، اور موجبِ رضائے الٰہی نہ ہو، کیونکہ وہ حکم ہوگا ایک غیر راشد بلکہ کٹکھنے بادشاہ کا۔ ایسا حکم سنت بھی نہیں کہلائے گا، کیونکہ یہ ۴۱ھ کے بعد کا ہوگا، اور اس وقت خلافتِ راشدہ کا دَور ختم ہو چکا ہوگا۔

موطأ شریف، بخاری شریف اور صحاح کی دوسری کتابوں میں امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ کے جو فتاویٰ مذکور ہیں اور آپ کے فقہی اجتہادات بیان ہوئے ہیں وہ اب فقہاء کے لئے نظیر نہیں رہیں گے، اور کسی اسلامی حکومت کی دفعات میں انھیں بار نہیں ملے گا، کیا کبھی تیرہ سو برس کی اس مدت میں کسی صاحبِ ایمان نے ایسی بات کہی ہے یا کہہ سکتا ہے؟

امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو حیثیتِ امامت تھی وہ صحابۂ کرام اور اموی دَور میں تو تھی ہی، لیکن بعد میں بھی یعنی خلافتِ عباسیہ میں بدستور قائم رہی۔ موطأ کی تدوین امیر المؤمنین عبد اللہ المنصورؒ کے فرمان کے مطابق کی گئی تھی۔ امیر المؤمنین محمد المہدی، امیر المؤمنین ہارون الرشید، امیر المؤمنین محمد الامین، اور امیر المؤمنین عبد اللہ المامون کو خود حضرت امام مالکؒ سے اس کی سماعت کا شرف حاصل ہے۔ یہ سب ائمۂ دین اس مبارک اور عظیم ترین کتاب الآثار میں امیر المؤمنین سیدنا معاویہ، امیر المؤمنین سیدنا مروان، اور امیر المؤمنین سیدنا عبد الملک کے فتاویٰ، فیصلے اور مرویات پڑھتے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امیر المؤمنین عبد اللہ المنصورؒ نے موطأ کی تدوین کے متعلق جو فرمان حضرت امام مالکؒ کو بھیجا تھا، اسے علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں نقل کیا ہے (ص ۱۸، طبع مصر)۔ الفاظ ہیں:

یا ابا عبد اللہ لم یبق علیٰ وجہ الارض اعلم منی ومنک وانی قد شغلتنی الخلافۃ فضع انت للناس کتاباً ینتفعون بہ۔ تجنب فیہ رخص ابن عباس وشدائد ابن عمر ووطئہ للناس توطئۃ۔	اے ابو عبد اللہ! روئے زمین پر اس وقت مجھ سے اور آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں رہا۔ مجھے خلافت نے مشغول کر رکھا ہے۔ لہٰذا آپ لوگوں کے لئے ایک ایسی کتاب مرتب کیجئے جس سے وہ فائدہ اٹھائیں، اس میں حضرت ابن عباسؓ کی نرمی اور حضرت ابن عمرؓ کی سختی سے پرہیز کیجئے، اور لوگوں کے لئے خوب خوب روندیئے (یعنی بغایت تحقیق کیجئے)

قال مالک فو اللہ لقد علّمنی التصنیف یومئذٍ۔	حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بخدا اس فرمان کے ذریعہ انھوں نے مجھے تصنیف کا طریقہ سکھلادیا۔

اسی لئے آپ نے اپنی کتاب کا نام "الموطاً" رکھا۔ (خوب روندی ہوئی یعنی بغایت محقق)۔ یہی کتاب مشرق و مغرب میں تمام اسلامی حکومتوں کا دستورِ اساسی قرار پائی۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خلفائے اسلام اور ائمۂ عظام کے ہاں امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفۂ راشد اور امام برحق ہونے پر کس طرح اجماع رہا۔

چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو آلِ بُویہ کے تسلّط سے نجات دی، تو مسلمانوں کے جذبات اور عباسی خلفاء کے نظریات و معتقدات کا جو نظارہ امام ابوبکر بن العربیؒ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تمام اہلِ اسلام کے لئے بھی دیدنی ہے۔ [ملاحظہ ہو العواصم من القواصم، ص ۲۱۳، طبع مصر] فرماتے ہیں:

وہٰذہ مدینۃ السلام دار خلافۃ بنی العباس وبینہم وبین بنی امیۃ مالا یخفیٰ علی الناس مکتوب علیٰ ابواب مساجدہا خیر الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ثم علی ثم معاویۃ خال المؤمنین	اور یہ ہے مدینۃ السلام (بغداد شریف) بنو العباس کا دار الخلافہ۔ اور ان کے اور بنو اُمیہ کے درمیان جو کچھ ہے وہ لوگوں سے پوشیدہ نہیں ـــ اُس کی مسجدوں کے دروازوں پر لکھا ہوا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص ابوبکر ہیں، پھر عثمان، پھر علی اور پھر معاویہ اہلِ ایمان کے ماموں"۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

یہ ردِ عمل تھا آلِ بُویہ کی شیطنت اور خبثِ نفس کا کہ انھوں نے سیدنا معاویہؓ پر صراحتاً لعنت لکھوائی تھی، اور اصحابِ ثلثہ پر اجمالاً۔ چونکہ مسلمان اس وقت سیاسی اعتبار سے مغلوب تھے اور خلفاء کے اختیارات سلب کئے جاچکے تھے اس لئے وہ کچھ نہ کرسکے۔ لیکن جب وہ آزاد ہوگئے اور خلفاء کی امامت واقعی ہوگئی تو جماعت کے عقائد کا اس طرح اعلان کیا گیا۔

اب عجیب تر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حضرات کو بطورِ امرِ واقعہ اور نہایت زور دے کر فرمایا ہے اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرَّاشِدُوْنَ (یہی ہیں ہدایت یافتہ) انھوں نے جب حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اجماع کرلیا تو وہ خلیفۂ راشد ہوگئے، اور ان کی خلافت کی حجیت قائم ہوگئی۔ پھر انھوں نے حضرت امیر المؤمنین عمر الفاروقؓ پر اجماع کیا تو وہ بھی خلیفۂ راشد ہوگئے اور ان کا عمل سنت ٹھیرا۔ پھر انھوں نے امیر المؤمنین عثمانؓ ذوالنورین پر اجماع کیا تو وہ

بھی خلیفۂ راشد ہو گئے، اور ان کے خلاف کھڑے ہونے والا گروہ باغی اور واجب القتل ٹھیرا۔ لیکن جب انھوں نے امیر المؤمنین علیؓ کے بارے میں اختلاف کیا، اور نصف امت کے قریب ان کی بیعت سے محترز رہی تو اس اختلاف کے باوجود وہ خلیفۂ راشد رہے۔ کیونکہ ان کی خلافت تیس[۳] برس کے اندر تھی۔ البتہ جب انہی راشدوں نے امیر المؤمنین معاویہؓ پر اجماع کیا اور اس طرح کہ ساری امت میں ایک آدمی بھی نہ تھا، جو اُن کی بیعت سے خارج ہو، تو رشد و ہدایت کے سوتے بند ہو گئے۔ نہ خود خلیفہ راشد رہا اور نہ اس کی خلافت پر اجماع کرنے والے۔

نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیآت اعمالنا۔

دین کی حفاظت

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے جتنے کارنامے گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئے، وہ اگرچہ بغایت درخشاں اور امت کے لئے موجب فخر اور لائق اتباع ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں وہ ہیں جنھیں ہر مخلص، صاحب عزیمت و قوت کیا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسے قابل فخر اور مایۂ ناز ہستیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے خلفاء، امراء اور سلاطین میں ایسی بڑی بڑی اور پر عظمت شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پے بہ پے کثیر تعداد میں، کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ جسے دیکھو آفتاب جلالت اور ماہتاب رفعت ہے۔

لیکن یہاں ہم سیدنا معاویہؓ کی اس حکمت عملی سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس کے سبب وہ واقعی کشتیِ ملت کے ناخدا ثابت ہوئے۔ انھوں نے محض سیاسی نظام ہی مستحکم نہیں کیا، بلکہ دین کو خالص رکھنے کا بھی نہایت مؤثر بندوبست کر گئے۔ ان کے عہدِ خلافت سے پہلے تین عظیم الشان تحریکیں اسلام پر اثر انداز ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اگرچہ منبع ایک ہی ہے یعنی ایران، لیکن اہمیت اور فاعلیت کے اعتبار سے اُن میں فرق ہے۔

(۱) عجم کی سیاسی حرکت

حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے ایران کو دار الاسلام بنا دیا، تو انھوں نے امیر المومنین علیؓ کے زمانہ میں سر اٹھایا، اور کوشش کی کہ مسلمانوں کے اندرونی اختلال سے فائدہ اٹھا کر "عربوں" کے تسلط سے آزاد ہو جائیں، اور اپنی مستقل حکومت قائم کر لیں۔ حضرت امیر المومنینؓ نے اپنی داخلی مشکلات کے باوجود اس تحریک کو پوری قوت سے کچل دیا۔ اور یوں ایران میں دوبارہ امن قائم کر دینے، اور اسلام کی حکومت مضبوط کر دینے کا سہرا امیر زیاد رضی اللہ عنہ کے سر رہا۔ جس کا تذکرہ مسعودی نے اُسی تلبیس کے انداز میں کیا ہے جو اس کا وتیرہ ہے۔ اور "امیر زیاد" کے عنوان کے تحت اس کتاب میں ملے گا۔

اس قسم کی سیاسی تحریکیں بعد میں بھی اٹھیں، مثلاً امیر المومنین ہشامؒ کے زمانہ میں بربروں کی بغاوت۔ لیکن سوائے سیاسی انتشار کے مسلمانوں پر اور کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہر بڑی اور

وسیع حکومت کو ایسے حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اگر حکومت طاقتور ہوئی تو ایسی بغاوتیں فرو کردی جاتی ہیں، جیسے امیر المؤمنین ہشامؒ نے بربروں کی سرکوبی کردی، ورنہ پھر مملکت کے حدودِ اربعہ سے کچھ علاقے نکل جایا کرتے ہیں، جیسے یہی بربروں کا علاقہ عباسیوں کے دور میں سبائیوں کی سازش سے نکل گیا۔ لیکن دین کے اعتبار سے ان تحریکوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (لوگوں کے درمیان زمانہ کی ایسی الٹ پھیر ہم کرتے رہتے ہیں)

(۲) سبائی تحریک

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اسلام کے "خطرہ" کا سب سے پہلے احساس ایران کو ہوا۔ چنانچہ دعوتِ محمدیہ کو ناکام کرنے کے لئے ایران ہی کے زیرِ اثر علاقوں میں مدعیانِ نبوّت کھڑے کئے گئے۔ جنھیں حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم کردیا[ك]۔ امتِ مسلمہ کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ نبوّت ختم ہوگئی۔ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں اس مسئلہ

ك قتالِ مرتدین کے سلسلہ میں مؤرخین نے عموماً سب تفصیلات دی ہیں۔ لیکن زیادہ حسن اور اجمال کے ساتھ ان تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو محمد خضری، محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ: ج ۱، ص ۱۷۳)۔ لیکن ان تفصیلات میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ مرتدین کا مسئلہ طے کرچکنے کے بعد ایران کے خلاف فوجی اقدامات کی فوری ضرورت کیوں پیش آئی۔ حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نہایت اہم مسئلہ تھا اور اس کی صفائی ضروری تھی۔

یہ اقدام اگر محض دعوتِ محمدیہ کی اشاعت کے لئے کیا گیا تھا تو جنگ کا کیا موقعہ تھا۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین میں زبردستی نہیں)۔ اور نہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسے برداشت کرتے کہ کتاب وسنت کی تعلیمات کو فراموش کرکے فتوحِ ممالک پر توجہ مرکوز ہو، کیونکہ یہ بعثتِ انبیاء کے مقاصد میں نہیں ہے۔

یہ خیال بھی قطعاً قابلِ قبول نہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ کسریٰ کا ملک مسلمانوں کے ہاتھ آئے گا اس لئے یہ پیشقدمی کی گئی۔ محض پیشگوئی کو سچا کر دکھانے کے لئے کافروں پر چڑھ دوڑنا بھی اصولِ دین کے خلاف ہے۔ پیشگوئی پورے ہونے کے طبعی اسباب پیدا ہوا کرتے ہیں، انھیں پیدا نہیں کیا جاتا۔ اور نہ یہ اسباب پیدا کرنے کو صداقت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اب ہم تاریخی حیثیت سے اس کا پس منظر معلوم کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ ایران کے خلاف فوجوں کی حرکت محض جذباتی تھی یا اس کا کوئی فوری محکم سبب بھی تھا۔

سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام دی تھی اور اپنے قاصد بھیجے تھے

(باقی برصفحہ ۲۳۲)

کو نہایت صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے، اور مسلمانوں نے بے تکلف ہر اس شخص کی تکذیب کی جو اپنے اوپر وحیِ الٰہی کا دعویٰ لے کر اٹھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیش بندی کے امت کو متنبہ کر دیا ہے کہ تیس کے قریب دجال کذاب پیدا ہوں گے، جن میں سے ہر شخص نبی اللہ ہونے کا دعوے کرے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۱) کسریٰ کے پاس سیدنا عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔ نامۂ مبارک پڑھ کر کسریٰ اتنا برافروختہ ہوا کہ اسے چاک کر کے پرزے پرزے کر دیئے، اور اپنے نائب کو حکم بھیجا کہ اس حجازی مدعیِ نبوت کو گرفتار کر کے یہاں بھیج دو۔ اس زمانہ میں ایران کی طرف سے یمن کی حکومت سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی جو اس وقت کافر تھے۔ سیدنا باذان رضؓ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر کسریٰ کے "فرمان" کی تعمیل کرنے کے لئے "دو" قوی ایرانیوں کو مدینہ بھیج دیا۔ کسریٰ کی حکومت کے احساسِ برتری اور طاقت کے غرور کا یہ عالم تھا کہ عرب کے ایک طاقتور حکمران کی گرفتاری کے لئے دو آدمیوں کا بھیج دینا کافی سمجھا گیا۔ یہ دونوں جب حاضر ہوئے تو رعب نبوی سے اُن کے سب دم خم فنا ہو گئے۔ اور انھوں نے عاجزی کے ساتھ صورتِ حال عرض کر دی۔ آپؐ نے فرمایا تمھارا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ تمھارا بادشاہ مارا جاچکا ہے، اور عنقریب میرا دین اور میرا تسلط تمھاری مملکت پر ہو جائے گا۔ اس پُر عظمت اور نورانی ماحول نے ان کے دلوں کو متاثر کیا۔ وحی کی صداقت کا یقین لے کر وہ واپس ہوئے، اور سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ یہاں پہلے ہی خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع آچکی تھی۔ اور نئے بادشاہ شیرویہ کا فرمان بھی کہ نبیٔ عربی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصدوں کے ذریعہ سیدنا باذانؓ کو یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ اگر انھوں نے دین اسلام قبول کر لیا تو یمن کی حکومت پر بدستور فائز رہیں گے۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ سیدنا باذانؓ اور ان کے سب ایرانی ساتھی صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔ اور یوں یمن کا علاقہ بطور خود دارالاسلام بن گیا۔

گویا دینی اور سیاسی حیثیت سے بظاہر اب کوئی بات ایسی نہ تھی جو حکومتِ اسلامیہ اور سلطنتِ ایران کے درمیان مسلمانوں کے نزدیک مابہ النزاع ہو۔ مگر ایران کے نزدیک سیدنا باذان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام موجبِ تشویش تھا اور عجمی سیاست و ثقافت کے لئے سخت خطرناک۔ لہٰذا اُن کے اہلِ تدبیر نے ایک نہایت مؤثر چال چلی، کہ اپنے زیر اثر علاقوں میں مدعیانِ نبوّت کو کھڑا کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دینِ اسلام کی عالمگیری کی روک تھام اگر نہ کی گئی تو پھر عجم کی قوت اس سیل میں بہ جائے گی۔ اور قومی عصبیت کے تحت قاطبۃً تمام عرب اس نئے نبیؐ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائے گا جس کی دعوت کی کارگری کا توڑ نہیں۔ چنانچہ اہلِ عرب میں قبائلی عصبیت کو زیادہ مؤثر انداز میں اُبھارنے کے لئے طاقتور قبیلوں میں حریف جھوٹی نبوتیں

(باقی بر صفحہ ۲۳۳)

اب عجیب بات ہے کہ بعد میں جتنے لوگ بھی یہ دعوی لے کر اٹھے اُن سب کی اصل ایرانی ہے، اگرچہ نسلاً وہ عرب ہوں جیسے مختار ثقفی، یا حبشی مثلاً بہبود زنگی۔ کیونکہ نبوت کا دعویٰ جس شخص نے بھی کیا وہ سبائی تحریک کا متبع ہونے کے بعد۔ حتیٰ کہ آخر زمانہ میں بہائی تحریک بھی سرزمینِ ایران ہی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۲) برپا کی گئیں " سرِ مار بدستِ دشمن کوب" اہل کفر کا قدیم شعار ہے۔ انھیں مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے ہر جگہ یہ نسخہ آزماکر کامیابی ہوئی ہے۔ اور ہو رہی ہے۔ اسی اصول کے تحت اسود عنسی یمن میں، مسیلمۂ کذاب یمامہ میں، اور طُلیحہ اسدی کو بنو اسد اور طے میں کھڑا کیا گیا۔ لوگوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ یہ جھوٹی نبوتیں قریش کی نبوت کے جواب میں عصبیت جاہلیہ کے تحت کھڑی کی گئیں، مگر یہ نہ دیکھا کہ انھیں کھڑا کس نے کیا ہے۔ اور نہ اس پر توجہ کی کہ جن علاقوں میں یہ جھوٹے مدعی کھڑے ہوئے ہیں وہ انہی علاقوں میں کیوں کھڑے ہوئے جہاں ایرانی سیاست چل رہی تھی۔

ان مدعیانِ نبوت میں سب سے زیادہ اہمیت مسیلمۂ کذاب کی ہے کہ وہ بڑے طمطراق سے قریش کی نبوت کو چیلنج دینے کھڑا ہوا تھا۔ حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مرتدوں سے قتال کے لئے فوجیں روانہ کیں۔ مسیلمہ کے مقابلہ پر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا، اور آپ کو ہدایت دی کہ یمامہ کو زیر کرنے کے بعد ایران کی سرکوبی کے لئے آگے بڑھیں، اور اس کا خیال رکھیں کہ جو لوگ ارتداد سے توبہ کرکے دوبارہ مسلمان ہوئے ہوں ان میں سے کوئی شخص اسلامی فوج میں شامل نہ ہونے پائے۔

یہ تحدید صرف سیدنا خالدؓ کے لئے تھی۔ باقی مجاہدوں پر اس کی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ طُلیحہ اسدی جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور اپنی حرکت پر منفعل رہے اُن کی سرکوبی کے لئے جب لشکرِ اسلام بنی طے کے علاقہ کی طرف چلا ہے، تو سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے، اور آپنے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص طور پر اس کی اجازت لے لی تھی کہ اپنے قبائل کی حفاظت اور اصلاح کے لئے جائیں۔ آپنے اجازت دیدی اور سیدنا عدیؓ بڑی تیزی کے ساتھ کہیں لڑتے اور کہیں سمجھا کر اصلاح کرتے ہوئے سیدنا خالدؓ سے جا ملے، اور درخواست کی کہ تین دن کی مہلت دیں اور فوجی پیش قدمی روک دیں۔ سیدنا خالدؓ نے منظور کرلیا۔ اور یوں سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے ان قبائل کے لوگوں کو اسلام پر قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی اور ایک ہزار کے قریب جانباز تائبوں کو لے کر سیدنا خالدؓ کے پاس پہنچ گئے۔

گویا جب تک جنگ عربی قبائل سے تھی حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر

(باقی بر صفحہ ۲۳۴)

اٹھی۔ جس کے قیام کا مقصد خود اس تحریک کے داعی بتاتے ہیں کہ قرآنِ مجید کو منسوخ کر کے نیا دین برپا کرنا ہے۔ بر کوچک پاک و ہند میں بھی ایک صاحب نے دعویٰ کیا تھا۔ اب یہ بات کتنی دلچسپ ہے کہ خود ان کے اپنے اعتراف کے مطابق ان کے آبا۔ واجداد میں سے کسی نے فارسی الاصل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) اعتراض نہ تھا کہ توبہ کرنے والوں کو اپنی توبہ کی صداقت کے ثبوت میں جہاد کی اجازت دی جائے۔ لیکن جونہی ایران کے خلاف پیشقدمی کا وقت آیا آپ نے طریقۂ کار بدل دیا اور اس کی اجازت نہ دی کہ توبہ کرنے والے لوگ مجاہدین کے لشکر میں شامل ہوں۔

یہ محض اس لئے تھا کہ ایرانی حکومت نے اپنے زیرِ اثر علاقوں کو ذہنی طور پر مغلوب کر لیا تھا، اور یمامہ وغیرہ کے لوگ اس ناپاک اتحاد میں شریک تھے جو دعوتِ محمدیہ کو شکست دینے کے لئے کیا گیا تھا۔ عرب کا نقشہ سامنے رکھ کر اس صورتِ حال کو سمجھنا چاہیئے کہ تغلب وطے اور یمامہ کے تمام ساحلی علاقوں کے مقابل ایران کی چھاؤنیاں قائم تھیں۔ سیدنا خالدؓ نے یمامہ سے فارغ ہو کر ایران کے ایک طاقتور سرحدی قلعہ دار ہرمز کو اسلامی شعار کے مطابق دعوتِ مبارزت بھیج دی۔ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ ہے کہ سخت سے سخت دشمن کے خلاف بھی فوجی کارروائیوں میں پیش قدمی نہیں کرتے، اگرچہ دنیا کے ارباب سیاست کا یہ وتیرہ نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے کفار حربی سے مقابلہ کے وقت بھی توبہ کا آخری موقع دیا جاتا ہے کہ یا اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ پھر جنگ ہے۔ مرتدوں کو بھی اسی انداز میں دعوت دی گئی تھی سوائے اس کے کہ جزیہ کا ذکر نہ تھا۔ کیونکہ وہ مرتد تھے۔ ان کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے، یا اسلام لائیں یا جنگ کریں۔

سیدنا خالدؓ کو یہ چیلنج دینے کی ضرورت اصولاً نہیں تھی، کیونکہ ایران جنگ میں کود چکا تھا۔ دشمن کا حلیف اور پشت پناہ بھی دشمن ہی ہوتا ہے۔ اب یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہرمز کے ساتھ اسلامی فوجوں کا پہلا تصادم کاظمہ پر ہوا تھا جو عرب کے حدود میں ہے۔ گویا وہ عرب میں داخل ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آیا تھا۔ پھر بھی کیا یہ سمجھنے میں دشواری ہے کہ ان تمام مدعیانِ نبوت کو شہ دینے اور وسائل مہیا کرنے کی باگ ایرانی مدبروں کے ہاتھ میں تھی؟ اس لئے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے واجب تھا کہ اندرونی اختلال رفع کر کے اس سب سے بڑے دشمن کی سرکوبی کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی۔ اور بے سروسامان مسلمانوں نے قلتِ تعداد کے باوجود تھوڑی سی مدت میں ایران کو دارالاسلام بنا دیا۔ (باقی بر صفحہ ۲۳۵)

ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن ان صاحب کی "نبوت" کی تکمیل اس وقت تک نہ ہوسکی جب تک ان پر یہ "وحی" نہ آگئی کہ اُن کی اصل ایرانی ہے۔

عجم پر سب سے زیادہ شاق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت، قرآن حکیم کی قطعیت، کعبۃ اللہ کی مرکزیت، اور عربی زبان کی جامعیت۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری اور دائمی عالمگیر دین کی جتنی اساسی باتیں رکھیں انہی کو فنا کرنے کی سب ترکیبیں ان مدعیانِ نبوت کی قسمت میں لکھی گئیں۔ عربی رسم الخط بدلنے اور اپنی اپنی زبانوں سے عربی الفاظ نکال دینے کی غایت بھی یہی ہے۔ کیونکہ عربی الفاظ و محاورات تمام مسلم زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے اور وحدتِ ملّیہ کو مؤثر بنانے کا ذریعہ ہیں۔ اُن سے "نجات دلاکر" مسلم قوموں کو ایک دوسرے سے اجنبی بنا دینا آسان ہو جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۴) لیکن ایران کی اس سیاسی مغلوبیت سے عجمی ذہن پر وطن پرستی برابر مستولی رہی۔ بالآخر یہ ترکیب چلی گئی کہ سیدنا علی زین العابدینؒ کو ان کی حقیقی والدہ سے چھین کر ایک فرضی ماں کا بیٹا بنا دیا گیا اور اس کا خیالی نام شہر بانو بھی تجویز کر لیا گیا۔ اس فرضی وجود اور خیالی نام کو طرح طرح سے شہرت دی گئی، اس کی شان میں قصیدے کہے گئے، منقبتیں لکھی گئیں، اور جس طرح ممکن ہو سکا اُسے حقیقی وجود بنانے کی کوشش کی گئی، تا آنکہ یہ انتساب اب گویا حقیقت ثابتہ ہے، اور جسے دیکھو وہ یہ سمجھتا ہے کہ سیدنا حسینؓ کے یہ فرزند اور "ائمہ" کے یہ مورث ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کے نواسے تھے۔

یہ محض اس لئے ہے کہ ایرانی عوام کو بہکایا جاسکے کہ مسلمان ہو جانے سے ہمارا رشتہ تختِ کیانی سے ٹوٹا نہیں ہے بلکہ ہم کسریٰ کے نواسوں کی امامت میں ہیں اور ان کے مذہب کے پیرو۔ اس طرح عربوں کے خلاف عموماً اور اموی خلفا کے خلاف خصوصاً جو محاذ قائم کیا گیا تھا اسے یوں تقویت دی۔ علامہ شبلیؒ نے یہ مسئلہ اچھی طرح صاف کر دیا ہے۔ بلکہ ابھی حال میں ایرانی محقق پروفیسر سعیدی غریب نے بھی یہ سچی بات کہہ دی تھی کہ "سیدنا زین العابدینؒ کی والدہ کا یہ نسب وضعی ہے، تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی"۔ تو اُن کے گھر پر پتھراؤ کیا گیا، تا آنکہ حکومت نے ان کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔

علمائے انساب کے نزدیک سیدنا علی زین العابدینؒ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی سلافہ یا غزالہ تھا۔ معارف، مؤلفہ ابن قتیبہؒ میں پہلا نام دیا گیا ہے، اور طبقات ابن سعد میں دوسرا۔ [ملاحظہ ہو شاہ معین الدین ندوی کی تابعین: ص ۲۹۶]

ویسے سرزمینِ ایران سے اجلّہ علماء، وفقہاء، وصوفیہ اٹھے، نورِ محمدی پوری طرح پھیلا، لیکن اس نور کو ماند کرنے کی سب تحریکیں بھی یہیں پروان چڑھیں، اور یہیں سے پرچم اسلام کو سرنگوں کرنے کی بھی جدوجہد ہمیشہ ہوتی رہی۔ ان تحریکوں کا صحیح اور مؤثر نقطۂ آغاز ہے عبد اللہ بن سبا (ابن السوداء)، جس کا مقصد تھا دین مبین کو مسخ اور امتِ محمدیہ کو باہمی افتراق و انشقاق کے ذریعہ پست کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے چار کام کئے، تین نمایاں اور ایک خفیہ۔

پہلا نمایاں کام تھا سیدنا عثمان رضؓ اور اُن کے عمّال کے خلاف اُمّت کو اُبھارنا۔ اسی کے نتیجہ میں حضرت امیر المؤمنینؓ کی شہادت کا المناک ترین حادثہ رونما ہوا جس نے تمام عالمِ اسلام کو ہلا ڈالا۔ لیکن امّت اس تحریک میں ملوّث نہیں۔ چند شریر النفس دشمنانِ دین کے ہاتھوں یہ ظلمِ عظیم ہوا، اور محض اس لئے کہ حضرت امیر المؤمنین صلوات اللہ علیہ نے ان باغیوں کے خلاف حرکت کرنے والوں کو اپنی بیعت سے خارج کر دینے کی دھمکی دیدی تھی۔ ورنہ ان کی سرکوبی چنداں مشکل نہ تھی۔ آخر زمانہ میں آپ کی خواہش ہوئی تھی کہ ان کا مقابلہ کیا جائے، لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مشیّت یونہی تھی۔ لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (کہ اللہ تعالیٰ اچھے بُرے کی تمیز کرنے والوں کو جدا کر دے)

ابن سبا کا دوسرا مقصد تھا قریش کو نامقبول بنانا، اور تیسرا نصب العین تھا کسی ایک کا نام لے کر باقیوں کو دین کا دشمن ثابت کرنا۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ سیدنا عثمان رضؓ کے بعد سیدنا علی رضؓ خلیفہ بننے کے لئے تیار ہو گئے۔ ورنہ اُن لوگوں نے اوّل سیدنا طلحہ، سیدنا زبیر اور سیدنا سعد بن ابی وقاص کو ناکا تھا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ سب حضرات تو اپنے آپ کو صاف بچالے گئے، لیکن امت کی بدقسمتی تھی کہ اوّل خود بار بار انکار کر چکنے کے باوجود علی رضؓ نے تمام مخلصوں بلکہ فرزندوں اور بھائیوں تک کی رائے ٹھکرا کر محض امت کی خیر خواہی میں امامت قبول فرمالی۔ اگر آپ یہ نہ کرتے تب بھی ممکن تھا کہ اس ٹولی کے عزائم کو خاک میں ملا دیا جاتا۔

لیکن اب انھیں سہارا مل گیا تھا۔ اور یوں ان لوگوں نے آپ کی جناب میں غلو کر کے دوسروں کی بے حرمتی کا کام شروع کر دیا۔ اگلوں پچھلوں سب کو لپیٹ لیا۔ کسی کو نہ چھوڑا جس پر طعنہ زن نہ ہوئے ہوں، اور پھر نئے نئے عقیدے ایجاد کئے۔ چونکہ ابن سبا اپنی اصل میں یہودی تھا، اور اپنی تحریک میں مجوسی، اس لئے دین اسلام میں اس نے دونوں طریقوں کی پیروی کی۔ کم سے کم بات جو اس نے ایجاد کی وہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضؓ کو معصوم قرار دے کر انھیں

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسے ہی "وصی" بنادیا جیسے سیدنا یوشع بن نون علیہ السلام کو یہودی لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا وصی کہتے ہیں۔ چنانچہ مسعودی نے آپ کی شہادت کی تاریخ بھی وہی متعین کردی جو انھوں نے بطورِ خود سیدنا یوشعؑ کی وفات کی فرض کر رکھی ہے۔ یہ شخص حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی زبان سے کہلواتا ہے اور وہ بھی قسمیہ [مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۲۶]

ثم قال اما واللہ انّھا اللیلۃ التی ضرب فیھا یوشع بن نون لیلۃ سبع عشرۃ۔	پھر آپ نے فرمایا (یعنی سیدنا علیؓ نے) بخدا یہی ہے وہ رات جس میں یوشع بن نون کو شہید کیا گیا تھا، یعنی سترھویں شب۔

ناظرینِ کرام کو غالباً کتابِ مقدس کے اس بیان سے دلچسپی ہوگی کہ سیدنا یوشع علیہ السلام شہید نہیں ہوئے تھے، بلکہ ایک سو دس برس کی عمر میں طبعی طور پر وفات پائی تھی [کتاب مقدس: صحیفۂ یوشعؑ: باب: ۲۴، آیت ۲۹]

"وصی" ہونے کے معنی ہیں خلفائے پیشین کو غاصب اور متغلب بتانا، اور معصوم ہونے کا مطلب ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی، جو کریں سو صواب ہے، نکتہ چینی کی گنجائش نہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ نکتہ چینی کرنے والا یہی گروہ تھا۔ قدم قدم پر اُن کی راہ میں کانٹے انہی نے ڈالیں، جیساکہ گذشتہ اوراق سے ثابت ہو چکا۔

بہرحال یہ سب سے ہلکی بات ہے جو انھوں نے کہی، ورنہ ان میں تو یہاں تک کہنے والے بھی موجود ہیں کہ نبوت کیلئے فی الحقیقت انتخاب ہوا تھا سیدنا علیؓ کا، لیکن جبرئیل امین علیہ السلام دھوکہ کھا گئے، اور غلطی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے آئے۔ پھر اللہ نے بھی کہا، چلو کوئی بات نہیں ایک بھائی نبی نہ ہوا دوسرا ہوگیا۔ اس غلطی کا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ "دونوں آپس میں ایسے مشابہ تھے جیسے کوا کوے کے"۔ تشبیہ کے الفاظ کے اس دلنشین انتخاب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی عقل کی خیرگی دیدنی ہے کہ صورتاً سیدنا علیؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی مشابہت نہ تھی، دونوں کا حلیہ کتابوں میں مرقوم ہے، اور بسندِ صحیح امت کو پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ ایک صاحب چالیس برس کی پختہ عمر کے تھے، اور دوسرے نوعمر لڑکے۔ ایسی دو ہستیوں میں ایک جانور کو بھی دھوکہ نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ ناموس اکبر کو۔ مگر بات تو کچھ نہ کچھ کہنی ہی چاہیئے۔

اس احمقانہ بلکہ خبیثانہ تصور و تشبیہ کے علاوہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو

سیدنا علیؓ کو خدا کہتے ہیں، اور ایسے لوگ تو بکثرت ہیں جو آپ کی اولاد میں سے بعض کے اندر الٰہی صفات کے قائل ہیں۔ اور انھیں مافوق البشر جانتے ہیں۔

حضرت امام ابوالحسن الاشعریؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقالات الاسلامیین میں ان کے عجیب و غریب عقائد بیان کئے۔ فرماتے ہیں [المنتقی: ۱۰۰-۱۰۱]

"بعض غالیوں میں وہ لوگ ہیں جن کا گمان ہے کہ روح القدس ہی اللہ ہے جس نے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) میں حلول کیا، پھر (سیدنا) علیؓ میں، پھر (سیدنا) حسنؓ میں، تا آنکہ باقی دس اماموں میں ان کے امام منتظر تک حلول کرتی چلی گئی۔ ان سب کو یہ لوگ معبود ہونے کا درجہ دیتے ہیں"

بعض کہتے ہیں کہ (سیدنا) علیؓ ہی خدا ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ لوگ بُرا جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "علیؓ نے تو انھیں اپنے متعلق وضاحت کرنے کے لئے بھیجا تھا، لیکن وہ کر بیٹھے اپنی نبوّت کا دعویٰ"۔

بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ ہستیوں میں حلول کیا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں، (حضرت) علی میں، (حضرت) حسن میں، (حضرت) حسین میں، اور (حضرت) فاطمہ میں۔ اُن کے مقابلہ میں پانچ شیطان ہیں۔ یعنی (حضرت) ابوبکرؓ (حضرت) عمرؓ، (حضرت) عثمان، (حضرت) معاویہ، اور (حضرت) عمرو بن العاصؓ"۔

منصبِ نبوّت کے اس استخفاف کے ساتھ، قرآنِ حکیم پر بھی انھوں نے حرف رکھا۔ اور کہا کہ یہ وہ اصل قرآن نہیں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر اُتارا تھا، بلکہ ابوبکر و عمر و عثمان نے اس میں کمی بیشی اور تغیر و تبدل کیا ہے۔ یہ مسئلہ ان کے ہاں اس درجہ مسلّم ہے کہ ان کے ایک مجتہد اور صاحبِ کلام لکھنوی صاحب نے ایک عجیب استدلال پیش کیا ہے۔ اور اپنی دانست میں قلم توڑ دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہم نے جو یہ کہا ہے کہ صحابہ نے قرآن میں تبدیلی کی، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابوبکر نے فلاں آیت بڑھائی اور عمر نے فلاں آیت نکال دی، بلکہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے قلوب نے جب حق کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ آیتیں نازل نہیں کیں جو وہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے کہ ان تعلیمات کو ان لوگوں کے قلوب قبول نہ کرتے۔ اس طرح یہ اصل قرآن نازل نہ ہوسکنے کا سبب بنے"۔

یہ عقیدہ محض برائے گفتن نہیں ہے بلکہ امیر المومنین القادر باللہؒ کے زمانہ میں انھوں نے

ایک مصحف نکالا، اور دعویٰ کیا کہ یہ مصحف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ہے۔ چونکہ یہ مصحف قرآن حکیم سے بہت مختلف تھا، اوران لوگوں کا اپنا وضع کردہ، اس لئے اس حرکت سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ امیر المومنین نے علماء و فقہاء کی مجلس طلب کر کے اسے ان کے سامنے پیش کیا۔ امام احمد بن محمد اسفرائنیؒ نے اسے آگ لگا دینے کا فتویٰ دیا، اور یوں یہ فتنہ دبا۔ یہ واقعہ ۳۹۸ھ کا ہے۔ آلِ بویہ اپنے عروج پر تھے، اور امیر المومنین اپنے تمام فضائلِ ذاتیہ کے باوجود ان لوگوں پر حدِ شرعی جاری نہ کر سکے۔ اور محض مصحف جلانے پر اکتفاء کر لیا۔ [طبقات الشافعیۃ الکبریٰ : ج ۳، ص ۲۶، طبع مصر]

ان کے ہاں صحیح ترین ماخذ کُلَینی کی الکافی ہے۔ جس کا درجہ وہی ہے جو اہلِ ایمان کے ہاں صحیح بخاری کا ہے۔ اس میں جابر الجعفی سے روایت ہے، جو اس نے سیدنا محمد الباقرؒ کے حوالہ سے بیان کی کہ:

"جس شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ پورا قرآن اسی طرح جمع کیا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا، تو وہ شخص جھوٹا ہے۔ اللہ نے اسے جس طرح اُتارا ہے اسی طرح جمع کر کے کسی نے حفظ نہیں کیا۔ سوائے (حضرت) علی بن ابی طالب کے اور ان کے بعد کے ائمہ کے" (کلینی : الکافی: ص ۵۴، طبع ۱۲۸۸ھ)

پھر اسی کتاب کے ص ۵۷ پر ابو بصیر کی روایت ہے کہ:

"میں ابو عبداللہ (یعنی سیدنا جعفر الصادقؒ) کے پاس گیا۔ ......

تا آنکہ ابو عبداللہ نے دعویٰ کیا "ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے۔" میں نے پوچھا: "مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟" تو جواب دیا" وہ ایسا مصحف ہے کہ تمہارے اس قرآن سے تین گنا ہے۔ اور بخدا اُس میں تمہارے اس قرآن کا ایک حرف بھی نہیں"

قرآنِ مجید کے متعلق اس تصوّر کی ضرورت ان لوگوں کو اس لئے پیش آئی کہ اپنے مخصوص عقائد کو یہ کتاب مبین سے ثابت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اپنے ہر خاص مسئلہ میں اسے عیاناً اپنے خلاف پاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا گمان ہے کہ اصل قرآن ان کے امام غائب لے کر آئیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہی قرآن حفظ کیا، اپنے دور میں اسی کی اشاعت

کی، اور تراویح میں اسی کو پڑھا اور سُنا، وہی تراویح جو سبائیوں کے ہاں حرام ہے۔

رسول اور کتاب کو اس طرح ختم کر دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیتِ اطہار کے متعلق جھوٹی روایتوں کا وہ جال پھیلایا کہ اچھے اچھے سمجھدار لوگ ان کے چکّر میں آ گئے۔ گویا کتاب اور رسول کے ساتھ امّت بھی غائب! علامہ محبّ الدین الخطیب نے المنتقیٰ کے صفحہ ۲۳ پر تعلیقہ ۲ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ:

"اہل السّنّۃ کے ایک عالم حضرت ابراہیمؒ الراوی نے ایک شیعہ مجتہد محمد مہدی سبزواری کے نام ۱۴ صفر ۱۳۴۷ھ کو ایک مراسلہ بھیجا، جس میں انھوں نے ایک شیعہ عالم بہاء الدین عاملی کی اس حرکت پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ قرآن پاک کی جو آیت ہے: یَحْلِفُونَ بِاللّٰہِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا کَلِمَۃَ الْکُفْرِ وَکَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِہِمْ (وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ واقعی انھوں نے یہ کلمۂ کفر کہا تھا۔ اور اس طرح اسلام لانے کے بعد وہ کافر ہو گئے) اس آیت کی تفسیر انھوں نے بیضاوی شریف کے حاشیہ پر یہ لکھ دی کہ یہ آیت ابوبکر و عمر اور صحابہ کے بارے میں اُتری ہے"

اب حضرت ابراہیم الرّاویؒ پوچھتے ہیں کہ اگر ابوبکر و عمر اور باقی صحابہؓ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھے اب ان میں پانچ یا چھ یا سات کو چھوڑ کر باقی سب کے سب کافر ہو گئے یا منافق تھے، یا ایسے ہی مُرتد ہو گئے جیسے عرب کے قبائل ہو گئے تھے، تو انھیں چاہیے تھا کہ دینِ جاہلیت کا اعلان کرتے اور مرتدوں سے قتال نہ کرتے۔ پھر یہ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم تیئیس برس کی مدت ان کافروں کے ساتھ رہے، اور اس طویل عرصہ میں ایک کافر بیوی بھی آپؐ کے پاس رہیں اور آپؐ کو ان کا علم نہ ہو سکا۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اگلوں اور پچھلوں سب کا علم دیدیا تھا"

اس کے جواب میں سبزواری صاحب نے ۱۴ ربیع الاول کا لکھا ہوا مراسلہ بھیجا، جس میں فرماتے ہیں:

"خدا آپ کا سایہ قائم رکھے، آپ فرماتے کہ اگر ارتدادِ صحابہ کے بارے میں

جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، شیعوں کا یہ قول صحیح ہے کہ استثناء صرف پانچ یا چھ یا سات کا ہے۔ حالانکہ صحیح استثناء صرف تین کا ہے، تو پھر ابو بکر نے اہلِ ارتداد سے جہاد کیوں کیا، اور اسلام کی طرف انھیں واپس کیوں لائے؟ تو بات یہ ہے کہ ان کا کفر حکمی ہے، ایسا واقعی کفر نہیں جیسا دیوی اور بتوں کے پوجنے والوں کا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ہے کہ شیعہ لوگ صحابہ اور عائشہ کے کفر کا عقیدہ نبی کی زندگی میں نہیں رکھتے، بلکہ وہ تو صرف یہ کہتے ہیں کہ نبی کی وفات کے بعد یہ سب مرتد ہو گئے"۔

گویا ارتداد صحابہ کا عقیدہ اس بیسویں صدی تک متواتر چلا آرہا ہے، اور کلینی کی کتاب الکافی جب تک موجود ہے اس وقت تک قرآن کے محرّف اور مفقود ہونے کا عقیدہ بھی قائم رہے گا۔

دراصل یہ تحریک بعینہٖ وہ ہے جو سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے دین کو مسخ کرنے کے لئے پولوس یہودی نے شروع کی تھی۔ یہ شخص یہودیوں کے سامنے اپنے آپ کو یہودی کہتا تھا، یونانیوں کے سامنے یونانی، اور رومیوں کے سامنے رومی۔ اس طرح وہ نصرانیت کو ایک مشرکانہ دین بنا کر ایسی شکل دیدینے میں کامیاب ہو گیا جسے سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے ظاہری و باطنی کوئی تعلق نہیں۔

آپ کی بھی کتاب غائب کر دی گئی۔ اور اس کی جگہ لوگوں کی تصنیف کی ہوئی متضاد قسم کی کتابیں رکھ دی گئیں جن کے مصنفوں کے بارے میں بھی حتمی علم نہیں کہ کون تھے۔ ان کے ہاں بھی اصحابِ رسولؑ کی بے حرمتی کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ شخص جس سے پولوس کو اختلاف ہوا، اسے شیطان بنا دیا گیا۔ حالانکہ خود پولوس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السّلام کو ظاہر میں دیکھا بھی نہیں تھا، چہ جائیکہ آپ سے اخذِ نور کیا ہو۔ اس نے آپ کے اصحاب کو دیکھا تھا مگر ان سب کو اس نے گمراہ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ شریعت موسوی کے پابند تھے۔ سیدنا مسیح علیہ السّلام خود فرماتے ہیں "یہ خیال کبھی نہ کرنا کہ میں شریعت یا انبیاء کی تعلیمات کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ میں ضائع کرنے نہیں آیا، بلکہ ان تعلیمات کو پورا کرنے آیا ہوں۔

میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ آسمان و زمین ٹل جائیں لیکن شریعت کا ایک شوشہ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا جب تک سب کا سب پورا نہ ہو جائے (عہد جدید: متّی: باب ۵، آیت ۱۷-۱۸)
اس کے مقابلہ میں پولوس کہتا ہے "ہم شریعت کے تحت پیدا نہیں ہوئے بلکہ لطفِ مسیح میں پرورش پاتے ہیں۔" اس طرح اوّل یہ دلنشین بات کہی کہ ہمیں قانون کے الفاظ کی بجائے اس کی رُوح پر جانا چاہئے۔ پھر آخر میں کہہ دیا کہ "شریعت لعنت ہے۔" اسی ذیل میں سیدنا مسیحؑ کی ابنیت، کفارہ، اور صلیب کے متعلق عقائد ایجاد کئے، اور رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو سنتِ انبیاء سے ہٹا دیا۔

آج خود نصرانی مفکر مثلاً ڈبلو ریڈ (W. WREDE) یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ج ۱۷، ص ۳۹۳، زیرِ عنوان پال):

> پولوس اور مسیحؑ دونوں کو بیک وقت قبول نہیں کیا جا سکتا، اگر رہنما پولوس ہے تو مسیحؑ نہیں، اور اگر مسیحؑ ہیں تو پولوس نہیں۔"

اسی عزیمت کے ساتھ ابن سبا نے بھی اپنی تحریک شروع کی، اور پولوس ہی کے قدم بقدم چلا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ، آخری کتاب، اور آخری امت کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو توفیق دی، کہ وہ اپنے نظامِ خلافت کو اس نہج پر قائم کریں کہ دشمنانِ دین و ملّت کو نفسِ دین پر دسترس نہ ہو سکے۔ اور اگر کبھی انھیں سیاسی بالادستی حاصل ہو جائے تو جماعت کی اتنی قوّت ہو کہ یہ لوگ کُھل کر کام نہ کر سکیں۔ اس انتظام کا سہرا امیرالمؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔

۳۔ **خوارج**:۔ تیسری تخریبی تحریک خارجیوں کی تھی۔ اپنی اصل میں تو یہ بھی سبائی تھے لیکن صرف اس حد تک جو سبائیہ کی ظاہری تحریک تھی۔ یعنی قریش کے خلاف نفرت اور اسی کے ضمن میں جمہور صحابہ پر طعن۔

یہ لوگ بہت قرآن پڑھتے تھے، اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ طویل نمازیں پڑھنا ان کا شعار تھا۔ شریعت کے احکام پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے اُن کے نزدیک آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ان کا نام قُرّاء پڑ گیا تھا (یعنی بہت قرآن پڑھنے والے)۔ ان کا اصل مطمحِ نظر صرف اتنا تھا کہ امت کی قیادت قریش سے چھین کر تمام امت

پر عام کر دی جائے۔ اصولِ شرعیہ کے تحت یہ مطالبہ ناجائز نہیں تھا بلکہ اس حد تک درست تھا کہ امامت کے لئے قرشیت شرط نہیں۔ نفسِ دین کے عقائد و اعمال میں امت کو ان سے چنداں اختلاف نہیں۔ لیکن صحابہ کرام نے نہایت اصیل بنیاد پر اُن کے سیاسی مطالبہ کی پذیرائی نہیں کی۔ اگر اس وقت خوارج کی بات مان لی جاتی تو دین محفوظ نہ رہتا۔ اور معلوم نہیں اس کی صورتِ نوعیہ کیا ہوتی۔

ان خوارج میں سے کسی نے نہ قرآن اُترتا دیکھا تھا، اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی تھی۔ مگر قرآن اور سنّت کے مفسّر بہر حال بن بیٹھے، اور جمہور امت کی تکفیر کے قائل ہو گئے۔ جیسے آجکل فلاں صاحب اور فلاں صاحب اپنے آپ کو صحابہ کرام سے زیادہ دین کا عالم اور امت کا خیر خواہ باور کر کے یہ خیال قائم کئے بیٹھے ہیں کہ تیرہ سو برس سے یہ امت اپنے مسائل میں گمراہ چلی آرہی ہے۔ اور اس بارے میں کسی قسم کی گستاخی بلکہ دریدہ دہنی سے بھی انھیں گریز نہیں۔ یہی کیفیت خوارج کی تھی۔ امت کو ان سے جو اختلاف تھا وہ ان کے غلو سے تھا، ان کی فرقہ بازی سے تھا، اور ان کے اس ادّعاء سے تھا کہ ان میں دین کی سمجھ صحابہ سے زیادہ ہے۔

اگر یہ لوگ میانہ روی اختیار کرتے، ملّت سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتے تو ان کی قوت دین کی حمایت میں صرف ہوتی۔ اور ان کی کارروائیاں اس طرح تخریبی نہ ہوتیں جس طرح ہوئیں کہ جب تک عملاً انھیں فنا نہ کر دیا گیا، امت کو ان کی چیرہ دستیوں سے نجات نہ ملی۔ صحابہ کرام نے ان خوارج کو دین سے باہر سمجھا، اور ان کے خلاف جہاد کو لازم جانا۔ اتنی رعایت کی کہ جب تک یہ جمعیت بنا کر مقابلہ پر نہ آئیں انھیں چھیڑا نہ جائے۔ لیکن اگر جنگ ہو تو پھر اُن کے ساتھ معاملہ کفار کا سا کیا جائے۔

نہروان کی جنگ میں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے جب ان لوگوں کو قتل کیا تو ان کی نعشیں بے گور و کفن چھوڑ دی گئیں، اور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ ان کے ساتھ یہی طرزِ عمل حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کا رہا۔ بلکہ بعد کے تمام خلفاء کا۔ سیدنا علیؓ کا ایک طرزِ عمل یہ تھا، اور ایک وہ تھا جو شہداء جمل و صفین کے ساتھ آپ کا اور اہلِ جمل و صفین کا رہا۔

مسعودی نے یہ بالکل افتراء کیا ہے کہ امیر المومنین علیؓ کا برتاؤ جمل و صفین اور نہروان

تینوں میں مختلف رہا۔ وہ کہتا ہے کہ شہدائے صفین کی آپ کے ہاں وہ حرمت نہ تھی جو شہدائے جمل کی تھی، کہ طرفین نے سب کی نمازِ جنازہ بلا امتیاز پڑھی، اور یکساں عزت و احترام کے ساتھ ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس کا خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ آدمی شہید کس طرف سے ہوا ہے۔

ہم کہتے ہیں اور یہی امر واقعہ ہے کہ شہدائے صفین کے ساتھ بھی طرفین کا یہی طرزِ عمل تھا، اور مسعودی نے جو غلط بیانیاں کی ہیں وہ سب بے سروپا ہیں۔ ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کا برتاؤ شہدائے صفین کے بارے میں جانبدارانہ ہوتا، یا سیدنا معاویہؓ نے اپنا طرزِ عمل معاندانہ رکھا ہوتا تو پھر متارکۂ جنگ کی کوئی سبیل نہ تھی۔ جیسے خوارج کے مقابلہ میں قتال ترک نہیں کیا گیا۔ علامہ ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ (۸ : ۲۰) میں حافظ عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی روایت نقل کی ہے کہ صفین کے موقع پر ایک شخص نے کہا اَللّٰھُمَّ الْعَنْ اَھْلَ الشَّامِ (خدایا اہل شام پر لعنت کر) تو امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے فرمایا:

لاتسبّ اہل الشام فان بہا الابدال فان بہا الابدال فان بہا الابدال۔	اہلِ شام کو بُرا مت کہنا۔ کیونکہ ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں۔

اور پیچھے البدایۃ والنہایۃ ہی سے ہم حضرت امیر المؤمنین کا وہ خطبہ نقل کر آئے ہیں جس میں آپ نے سیدنا معاویہؓ کے کارکنوں کے کردار کی رفعت اور اپنے نام نہاد کارکنوں کی پستی بیان فرمائی تھی۔

بہرحال دینِ مبین اور امتِ مسلمہ کے خلاف یہ تین تحریکیں تھیں، جن میں سے ایک کو ایک عرصۂ دراز کے لئے کچل دیا گیا، یعنی ایران کی بغاوت کو۔ ایک کو عملاً ختم کر دیا گیا، یعنی خوارج کو۔ جنگِ نہروان کے بعد ان کی حیثیت ایک جداگانہ اقلیت کی ہوگئی تھی، اور گو ان سے بڑے ہولناک معرکے ہوئے، حتّٰی کہ امیر المؤمنین ہشامؒ کے عہد تک، مگر یہ مسلمانوں کے اندرونی مسائل پر اثر انداز نہ ہو سکے، اور مسلم معاشرہ ان کے اثر سے محفوظ رہا۔

پھر سیدنا حسنؓ کے بیعت کر لینے کے بعد سبائی لوگ بھی کچھ پست ہوگئے۔ اس طرح زمامِ کار پھر قریش کے ہاتھ میں آگئی، اور صحابۂ کرام کو وہی مقام مل گیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقرر کیا تھا کہ تمام امور میں امت کی قیادت وہی کریں، اور انہی کا منہاج معیاری قرار پائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہی کی راہ کو سبیل المؤمنین بتایا ہے۔ مصلحتِ ملیہ کا بھی اصولی تقاضا یہی تھا، تاکہ دعوتِ محمدیہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ

قائم رہے، اور اس میں غیر عناصر کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آخر عہدِ اموی تک عموماً مناصبِ حکومت و عدالت پر صحابہ کرام ہی کو فائز رکھا جاتا تھا، اور فوجوں کی قیادت بھی وہی کرتے تھے جن بعض مناصب پر تابعین کو رکھا گیا، تو اس میں بھی یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اجلّہ صحابہ کی انھوں نے صحبت اٹھائی ہو۔ غرض یہ ہے کہ زندگی کے چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں صحابہ کرام ہی امّت کی رہنمائی فرماتے تھے، جن میں سے بعض اہم شخصیتوں کے نام انہی صفحات میں ملیں گے۔

دین کے اوّلین علمبردار قریش ہیں، جنھوں نے پورے غور و خوض کے بعد ایک مخالف ماحول میں دین قبول کیا تھا، اور پھر ظاہری و باطنی ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اسے برپا رکھا، حتّٰی کہ اس کی خاطر وطن بھی چھوڑ دیا۔ ان کے بعد درجہ ہے انصار کا۔ مرتبہ کے اعتبار سے نہیں، کیونکہ مرتبہ میں دونوں طبقے برابر ہیں، اور دونوں لازم و ملزوم ہیں، بلکہ افادیت کی حیثیت سے۔

انھوں نے ایمان قبول کر کے مہاجروں کو ٹھکانہ دیا، اور یوں دعوتِ محمدیہ کو ایک مرکز مل گیا۔ یہی مہاجر و انصار ہیں جنھیں بارگاہِ احدیت سے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کا صداقت نامہ ملا، یعنی یہی ہیں صحیح معنی میں اہلِ ایمان۔ انہی کی راہ میں ہدایت محصور کر دی گئی۔ ان کے منہاج سے ہٹ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ اہلِ ایمان کی نہ ہوگی۔

[النساء : ۱۱۵]

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔

"اور جس نے ہدایت کی مکمل توضیح ہو جانے کے باوجود رسول کی مخالفت کی، اور وہ طریقۂ کار اختیار کیا جو اہلِ ایمان کا نہیں ہے تو ہم بھی اس کا رُخ اسی طرف پھیر دیں گے جدھر اس نے مُنہ کر لیا ہو اور پھر اسے جہنم میں جھونک دیں گے جو بُرا ٹھکانہ ہے۔"

قیادت کی شرط

تمام اہلِ فکر متفق اللّسان ہیں، اور ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ تحریک کی قیادت اس کے داعیوں اور بانیوں ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے ورنہ وہ اپنی اصل سے ہٹ جائے گی۔ دین قائم کیا تھا صحابہ کرام نے، اس لئے سبائیہ اور خوارج کی یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی تھی کہ قیادت قریش کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اس کا نظام بالکل وہی ہونا چاہیے تھا جو مہاجر و انصار تجویز کریں۔

جن لوگوں نے اہلِ عالم کی تحریکوں کا علمی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے اُن پر یہ حقیقت

کھل گئی ہوگی کہ ہر وہ تحریک جس کا دائرۂ عمل وسیع ہو، اور پھر سُرعت کے ساتھ مقبولیت حاصل کرلے، اس میں اگر انحطاط آتا ہے تو ان لوگوں کی وجہ سے جو اجتماعی حیثیت سے اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں، اور انھیں اتنا موقع نہیں ملتا کہ انفرادی طور پر تحریک کا بغائر مطالعہ کریں، اسے پرکھیں، اور اس کے نظریات و اعمال براہِ راست ان لوگوں سے لیں جو تحریک کے اصل داعی ہیں، اور جنھوں نے جان و مال قربان کرکے اس کی آبیاری کی ہے۔

اجتماعی طور پر تحریک میں شامل ہونے والے لوگ ایک وقتی اور ظاہری تاثر کے تحت شامل ہوتے ہیں، اور جونہی انھیں کچھ اہمیت حاصل ہونے لگتی ہے تو پھر اس کے درپے ہوجاتے ہیں کہ اپنے قدیم نظریات کو نئی تحریک میں سمو دیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خام تصورات کے تحت لوگ ایک تحریک میں شریک ہوتے ہیں اور پھر خام ہی تصورات کے تحت چاہتے ہیں کہ تحریک کی قیود سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں۔ یعنی فی الحقیقت خود تحریک میں شامل نہیں ہوتے بلکہ تحریک کو اپنے مقاصد کے لئے کام میں لانا چاہتے ہیں۔

ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے، اور معماران عالم سمجھتے ہیں کہ دعوت کے تحفظ و کارگری کے لئے وہ کیا ذرائع کام میں لائیں۔

فتوحاتِ اسلامیہ کے نتیجہ میں قومیں کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ ان کے سامنے مقابلہ کے لئے صرف دو باتیں تھیں، ایک پُرانی غلامی اور نئی آزادی کا فرق اور دوسری چیز تھی فاتحوں کا بلند کردار اور نظامِ اسلامی کی راحتیں۔ ان لوگوں نے بس یہ ظاہر دیکھا اور مسلمان ہوگئے۔ خلفاءِ اسلام کی نگرانی میں علماء و فقہائے ملّت نے نومسلموں کی تربیت کی ذمّہ داری اٹھائی، اور ہر جگہ تعلیم کے دائرے قائم کئے۔ یہ سلسلہ امیر المؤمنین عمر الفاروقؓ کے عہدِ مبارک سے باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا، اور سنّتِ نبویہ کے آداب کے مطابق ان اداروں کی تشکیل کی گئی۔ امیر المؤمنین حضرت ولید اولؒ کے زمانہ میں اتنی ترقی ہوگئی کہ ہر وہ عرب جو قرآن مجید حفظ کرلیتا تھا، اس کا سرکاری وظیفہ مقرر ہوجاتا تھا، اور اس کا کام یہ تھا کہ نومسلموں میں تعلیماتِ قرآنیہ پھیلائے۔ ان بزرگوں کی چونکہ زبان عربی تھی، اور صحابۂ کرام یا تابعینِ عظام سے بلاواسطہ فیض ہوتا تھا، اس لئے ان حضرات کو قرآن کی خالص تعلیمات پیش کرنے میں دقّت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھوں وہ تفسیری پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئیں جو عجمی مفسّروں کی پیدا کردہ ہیں۔ بلکہ آج تک جتنے لوگوں نے قرآن مجید میں

عجیب وغریب معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کی اصل غیر عربی ہے، اور چونکہ زبان پر عبور نہیں اس لئے ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر معانیِ قرآن مسخ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں بھی ایک مفسرِ قرآن پیدا ہوئے ہیں جو خیر سے صرف پنجابی عربی جانتے ہیں۔

صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام نے نومسلم افراد کی تربیت تو خوب کی، اور ان میں ایسے بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے کہ جس قوم میں بھی ایسے لوگ ہوں وہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، چہ جائیکہ اس کثرت سے ہوں جتنے مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن اجتماعی پیمانہ پر ایسا نہیں ہوتا کہ پوری قوم کا ذہنی رجحان فوراً بدل جائے۔ اور قدیم نسلی ثقافت کے اثرات بالکلیہ نئے قالب میں ڈھل جائیں۔ یہ کام کئی نسلوں میں پورا ہوتا ہے۔ اس لئے تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ اور ان تربیتی اداروں کے باوجود اس کی سخت ضرورت رہتی ہے کہ جو لوگ اجتماعی حیثیت سے تحریک میں شامل ہوئے ہیں، ان کے حقیقی رجحانات کا جائزہ لیا جاتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی نفسیاتی تجزیہ کا کتابِ مبین میں حکم دیا ہے (الممتحنۃ : ۱۰):

یَآ اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُہٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْہُنَّ ؕ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِہِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْہُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْہُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ الخ	اے ایمان والو! جب ایمان والی عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کا امتحان لیا کرو، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کا بہتر علم رکھتا ہے۔ لیکن تم اگر جان لو کہ وہ ایمان والی ہیں تو پھر انھیں کافروں کی طرف مت لوٹاؤ

یہ ایسا واضح اور تعمیری حکم ہے کہ اس کی حکمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک زیر دست خاتون اپنے گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے نیا دین قبول کر کے آزادی حاصل کرنا چاہے، یا کوئی دوسرا سبب ہو، اس لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ واقعی اس نے یہ اقدام حق پرستی کے تحت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض اس عورت کا اقرار اور زبانی بیان تو کافی نہیں، اور نہ ظاہر میں اسلامی معاشرہ کی پابندی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لئے اچھی طرح تحقیقات کرنی چاہیئے تاکہ پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں۔ "اللہ ان کے ایمان کا بہتر علم رکھتا ہے" اس آیت کا ایسا زبردست ٹکڑا ہے کہ باید و شاید۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک عورت سچے دل سے مسلمان ہوئی ہو لیکن تحقیقات کرنے والے لوگ اس کے ایمان کو نہ پہچان سکیں، اور دارالکفر کی طرف لوٹا دیں، تو اُن پر کوئی الزام نہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد تعمیر تھا، اور وہ یہ چاہتے تھے کہ

اسلامی معاشرہ کو اندرونی اختلال سے محفوظ رکھیں۔

بعینہٖ اسی اصول کی پابندی ان نومسلموں کے بارے میں بھی لازمی ہے جو اجتماعی طور پر مسلمان ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی سفلی جذبہ کام کررہا ہو، یا تبدیلی مذہب محض سطحی ہو۔ اسی تعمیری اصول کے تحت امیرالمؤمنین حضرت ہشامؒ نے ان نومسلموں پر جزیہ قائم رکھا جو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ہوئے تھے۔ اس جزیہ کی شرح سالانہ کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ اور اس کا انحصار تھا ان لوگوں کے ثباتِ قلب پر۔

اس حکمت عملی سے وہ لوگ برافروختہ ہوگئے جو ظاہر دین دیکھتے تھے، اور انھوں نے اسے دنیا طلبی پر محمول کیا۔ اور یہ معنی دیئے کہ چونکہ لوگوں کے بکثرت مسلمان ہوجانے سے حکومت کو جزیہ کی آمدنی کم ملنے لگی، اس لئے خلافت کی طرف سے یہ حرکت ہوئی۔ واقعی حجروں میں بیٹھ کر چلّے کھینچنے والے یا درسی کتابیں پڑھ کر دستارِ فضیلت حاصل کرنے والے حضرات ان مصالح پر کیا نگاہ ڈال سکتے ہیں جو قوم کے معماروں کے سامنے ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں بھی ایک "بڑے عالم" نے "مجدّدانہ تبحّر" کے ساتھ اس جزیہ قائم رکھنے کو اسلام کی اشاعت میں رُکاوٹوں سے تعبیر کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں "جس کی بدترین مثال نومسلموں پر جزیہ لگانے کی صورت میں ظاہر ہوئی"۔ اب ان صاحب سے پوچھا جائے کہ جزیہ لگانا اور جزیہ اس طرح قائم رکھنا کہ سالانہ اس کی شرح گھٹتی رہے، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مرادف ہیں؟ پھر ان سے پوچھا جائے کہ تاریخی تجربہ کیا کہتا ہے؟ یہ لوگ جن پر جزیہ قائم رکھا گیا، وہ پھر اپنے دین پر لوٹ گئے یا مسلمان رہے؟ اگر اپنے دین قدیم پر واپس ہوگئے تو معلوم ہوا کہ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور اگر دینِ اسلام پر قائم رہے تو جزیہ قائم رکھنے سے اشاعتِ اسلام پر کیا اثر پڑا؟ یہ صاحب جو صرف نسلی تعصّب اور برہمنی تصوّر میں مبتلا ہیں، اور اسی لئے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے متعلق جس قسم کی لغوبات چاہیں کہہ دیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے تاریخ کا مطالعہ مسعودی اور طبری کی عینک سے کیا ہو تو کیا ہو لیکن روایات کی تنقیح اور دعوت کی غایت کے زاویۂ نگاہ سے نہیں کیا۔

ایک واقعہ علامہ خضری نے امیرالمؤمنین یزید ثانیؒ کے عہد کی تفصیلات میں نقل کیا ہے، اس سے سب صورتِ حال سامنے آجاتی ہے [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، ج ۲، ص ۱۹۱]

امیرالمؤمنین ہشامؒ نے خراسان کی ولایت اَشرسؒ بن عبد اللہ سلمی کے سپرد کی، اور حکم دیا کہ اس بارے میں (اپنے بھائی) خالد کو مراسلہ بھیجیں۔ یہ اشرسؒ بڑے فاضل تھے اور خوبیوں کے مالک، اسی لئے ان کے فضائل کی بنا پر انھیں "کامل" کہا جاتا تھا۔ جب آپ خراسان آئے تو لوگوں کو مسرت ہوئی۔ آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اہلِ سمرقند و ماوراء النہر کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اسلام لے آئیں تو اُن پر سے جزیہ اٹھا لیا جائے گا۔ چنانچہ لوگ اسلام کی طرف دوڑ پڑے۔ صاحبِ خراج نے اَشرسؒ کو خط لکھا کہ اب کے خراج بہت کم ہو گیا۔ اشرسؒ نے اس پر امیرِ سمرقند کو خط بھیجا کہ خراج مسلمانوں کی قوّت کا سبب ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہلِ صغد وغیرہم نے رغبتِ دلی کے سبب اسلام قبول نہیں کیا، بلکہ صرف جزیہ سے بچنے کے لئے مسلمان ہوئے ہیں۔ لہٰذا دیکھو کہ جس نے ختنہ کرائی ہے، فرائض ادا کرتا ہے، اور قرآن کی کوئی سورۃ یاد کر لی ہے تو اس پر سے جزیہ اٹھا دو۔

امیر اشرسؒ نے اہل صغد کو اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے جن صاحب کو بھیجا تھا ان کا نام تھا ابو صیداء صالح بن طریف۔ انھوں نے جب دیکھا کہ عمال ان لوگوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں جو اسلام لے آئے، تو انھیں اس بات سے روکا۔ وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور یہ اپنی بات پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل صغد نے (جزیہ دینے کا) حکم ماننے سے انکار کر دیا، اور ابو صیداء اور ان کے ساتھیوں نے اِس بارے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ امیر اشرسؒ کے سپہ سالار نے ابو صیداء، اور ان ذی اثر لوگوں کو گرفتار کر لیا جو اس بارے میں ان کی مدد پر تھے، اور انھیں قید کر دیا۔ پھر عجمی رؤساء اور زمینداروں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا۔ نتیجہ میں اہل صغد پھر مرتد ہو گئے، ترکوں سے فوجی امداد طلب کی، اور اُن کے ساتھ ہو گئے۔

امیر اشرسؒ کو جب اس بات کا علم ہوا تو اپنے لشکر کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے چلے۔ نہر عبور کر کے آمل پہنچے تھے کہ صغد اور

ترک مل کر مقابلہ پر آگئے۔ فریقین میں سخت جنگ ہوئی، اور مسلمانوں کو شکست سی ہونے لگی، لیکن وہ پلٹ پڑے، اور جم کر لڑے تا آنکہ اپنے دشمن کو مار بھگایا۔"

اگر واقعی یہ لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور محض جزیہ سے چھٹکارا پانے کے لئے دین نہیں بدلا تھا، تو کیا اُن کا طرزِ عمل یہی ہوتا جو ہوا؟ جزیہ کی ایسی کونسی بڑی رقم ہوتی ہے۔ انھیں چند درہم سالانہ دینے اتنے بھاری تھے کہ اس کی خاطر اپنا دین چھوڑ دیا۔ حقیقتاً انھوں نے قدیم دین چھوڑا ہی نہ تھا۔ اور اشرس رح نے جو شرط جزیہ اڑانے کی عائد کی تھی وہ صحیح تھی۔ رہا یہ ہنگامہ تو محض ابو صیدا، کی کج فہمی سے ہوا۔ اگر وہ حائل نہ ہوتے تو امیر اشرس رح کی بات پوری ہو جاتی۔

راقم الحروف کو یاد پڑتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں ڈاکٹر امبیدکر نے یہ پیشکش کی تھی کہ وہ اپنی پوری قوم کے ساتھ مسلمان ہو جائے۔ اس طرح مسلمان اور یہ نو مسلم اچھوت مل کر بڑی زبردست اور مؤثر قوت بن جاتے، بلکہ ہندوستان میں اکثریت انہی کی ہوتی، اور یوں ہندو اکثریت کا خواب دیکھنے والوں کی سیاست غارت ہو جاتی۔ لیکن قائدِ اعظم رح نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اور فرمایا ہم اجتماعی تبدیلیِ مذہب کے قائل نہیں۔ ہم سے قدیم مسلمان ہی نہیں سنبھالے جاتے تو پھر ان کروڑوں (پشتینی کافروں) کی تربیت کا بوجھ کیسے اپنے سر لے لیں۔ امبیدکر کی نیت للہ نہیں تھی، اور اس کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ اگر اسے آخرت مطلوب ہوتی، اور وہ صحیح معنی میں اپنی قوم کی فلاح اسلام میں سمجھتا تو بطور خود ان میں تبلیغِ اسلام کے ذرائع اختیار کرتا۔ لیکن وہ تو محض سیاسی اُلجھنوں میں گرفتار تھا اور خدا کا شکر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی قیادت کسی برخود غلط اور جذباتی شخص کے ہاتھ میں نہ تھی۔ مسلمانوں کی قیادت وہ شخص کر رہا تھا جس کی فراست وبصیرت اور تفقہ بڑے بڑوں کی پہنچ سے بالا تھی۔

ایسے ہی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ روس کا پیٹر اعظم مسلمان ہونے کو تیار تھا بشرطیکہ اسے سؤر کھانے اور شراب پینے کی اجازت دیدی جائے۔ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا "ہمیں تمھارے اس طرح مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں"۔ ایک فاضل مؤرخ نے خود راقم الحروف کے سامنے بڑی حسرت سے یہ واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ "شیخ الاسلام نے مصلحتِ ملّیہ نہیں دیکھی، پیٹر اگر مسلمان ہوتا تو تمام روس کو ہم آج دارالاسلام پاتے"۔ ممکن ہے ایسا ہوتا، لیکن سؤر کھانے والا اور شراب پینے والا دارالاسلام ہمارے کس کام کا ہوتا؟۔ ان حقائق پر نگاہ حضرت خلیفہؒ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ آپ نے مانعینِ زکوٰۃ کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا۔ حالانکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو زکوٰۃ کی فرضیت اور رکنِ اسلام ہونے کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ انھوں نے یہ تاویل کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زکوٰۃ کی رقم اس شخص کو ادا کرنے کا حکم دیا تھا جو یہ رقم وصول کر کے ہمارے لئے دعاء کرے اور اس دعاء سے ہمیں تسکین ہو۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ تسکین ہمیں کسی دوسرے شخص کی دعاء سے نہیں ہو سکتی، اس لئے ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے۔

اسلام ایک دین ہے، ایک نظامِ حیات ہے، اسے اسی طرح قبول کرنا ہوگا جس طرح وہ ہے۔ ورنہ ضرورت نہیں۔ سیاسی فوائد اور عددی قوت اگر مطلوب ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسولؐ سے یہ نہ فرماتا [ن]

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۔ | اُن منکروں کی بات مت مان لینا۔ وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ کچھ تم نرم پڑو تو وہ بھی اپنے رویّے میں نرمی برتیں

راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ مشہور نومسلم انگریز ڈاکٹر خالد شیلڈریک نے جب ہندوستان کا دورہ کیا، اور اپنے اس دورہ کی خوب نشر و اشاعت کی کہ جیسے اسلام قبول کر کے مسلمانوں پر کوئی احسان کیا ہو، وہ طبّیہ کالج دھلی میں بھی آیا تھا۔ اور راقم الحروف اس محفل میں موجود تھا جس میں اس نے تقریر کی تھی۔ وہاں اس نے سرورِ عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اپنی عقیدت کا خوب خوب مظاہرہ کیا، اور ہم سمجھے کہ واقعی اس کے اندر کوئی حقیقی فکری تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ایک نجی مجلس میں اس کے سکریٹری سے گفتگو کا موقع ملا جو خود بھی نومسلم تھا اور ڈاکٹر خالد شیلڈریک ہی کے ہاتھ پر "مسلمان" ہوا تھا، تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے سوّر کا گوشت کھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور کہا ہے کہ جو سوّر حرام ہوا تھا وہ عرب کے گندے ماحول میں پلنے والا تھا۔ انگلستان کے "صاف ستھرے" سوّر اس حکم کے تحت نہیں آتے۔

یہی حال ہے اُن ذی اثر نومسلموں کا جو اس طرح حکمتِ شرعیہ کو اپنے نظریہ سے دیکھ کر دین کو مسخ کرتے ہیں۔ یہی نتائج ان صوفیاء کی جلد بازی سے مرتّب ہوئے جنھوں نے اسلام میں باقاعدہ داخل کئے بغیر کفار کو ذکر و شغل اور مراقبات کی تلقین کی، یا انھیں مسلمان تو کر لیا، لیکن شریعت سکھائے بغیر طریقت پر ڈال دیا۔ ایسی مثالیں بھی راقم الحروف کے ذاتی علم

میں ہیں کہ کس طرح ان نومسلم صوفیوں کے ہاتھوں دین مسخ ہوتا ہے۔ میں خود ایسے نومسلم صوفیوں کو جانتا ہوں جو صاحبِ کیفیت ہیں، لیکن شریعت سے بالکل کورے۔ اسی لئے ان کی کیفیت میں اثر تو ہے لیکن لطافت و نورانیت نہیں۔ ان کے مریدوں نے دین کو ایک تحریک سمجھنے کی بجائے کشف و کرامات کا ادارہ بنا دیا جس میں اوامر و نواہی سے بحث نہیں۔ سب روا ہے بشرطیکہ ذکرِ قلبی اور مراقبات جاری رہیں، اور جسے یہ لوگ فیض کہتے ہیں وہ آتا رہے۔ ان بزرگ صاحب نے اپنے ایک مرید سے ملاقات کرائی جو بڑے کٹر آریہ سماجی تھے اور مسلمانوں کے سخت مخالف۔ لیکن ان بزرگ صاحب نے اپنے تصرف سے انھیں بزرگانِ اسلام کا عقیدتمند بنا دیا تھا۔ اور اسے اپنا تعمیری کارنامہ سمجھے۔ حالانکہ یہ مرید بھی دین سے ایسے ہی کورے تھے جیسے ان کے نومسلم پیر۔ مگر مراقبات کے پابند تھے اور واردات سے بہرہ ور۔

ان کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آئی کہ جسے یہ فیض کہتے ہیں وہ خاص اوراد و آداب کا نتیجہ ہے جو ہر نفسِ انسانی پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کے لئے کفر و اسلام کی کوئی شرط نہیں، کیونکہ کمالات نفسِ انسانیہ کا کرشمہ ہے۔ جیسے ہر مومن و کافر جسمانی حیثیت سے پہلوان ہو سکتا ہے اور ذہنی حیثیت سے عالم متبحر، ایسے ہی ریاضات و اذکار سے اس کے اندر دنی احوال میں بھی کیف آسکتا ہے، اور تصرف فی القلوب کی طاقت نصیب ہو جاتی ہے۔ مشکوٰۃِ نبوت کے نور سے اور ان تماشوں سے کیا نسبت۔

صوفیوں کی ایسی ہی ایک غلط روی کا نتیجہ سکھوں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، کہ مسلم بننے کی بجائے یہ ہندوؤں کا ایک فرقہ بن کر رہ گئے، بلکہ اسلام کی دشمنی میں غالباً یہود سے بھی آگے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان صوفیوں نے دین کو نہیں سمجھا، اور اپنے زہد و ریاضت کے سبب اسلام کے دوست بننے کی بجائے دشمن ثابت ہوئے۔

ایک متفق علیہ حدیث ہے جو تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے، اور متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے۔ اس کے مطابق دین کے تین شعبے ہیں۔ ایمان، اسلام اور احسان۔ صوفیاء کا تعلق اس گروہ سے ہے جو دائرۂ احسان میں قدم رکھیں۔ لیکن یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایمان اور اسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے منہاج پر درست نہ کر لیا جائے۔

اس دائرہ میں قدم رکھنے والوں کے لئے کتاب اللہ، اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے سب آداب مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ایمان جو علماء کے فیض سے استدلالی ہوتا ہے وہ وجدانی ہو جائے۔ اور اسلام جو فقہاء کی کوششوں سے منضبط اور مدوّن ہوا ہے اس کے اعمال کی نورانیت و غایت مکشوف ہو۔ گویا طریقت دراصل شریعت کی مصدّق و مؤید ہے۔ تمام اکابر اولیاء، اور مرشدانِ راہِ طریقت کا یہی طریقہ کار رہا ہے کہ وہ مرید کو شریعت کے لوازمات کا پابند بناتے ہیں، اور اپنے ہر کشف کو کتاب و سنت پر پیش کر کے دیکھتے ہیں کہ موافق ہے یا مخالف۔ موافق ہو تو اللہ کا شکر کرتے ہیں اور مخالف ہو تو "کشف را بر کفش میز نند"۔

لیکن افسوس کہ یہ عظیم ترین راہِ عمل جو نبوّت کے اعلیٰ ترین فیوض میں ہے، لوگوں نے اس کا نام لے کر اپنے سفلی مقاصد برلانے کی کوشش کی۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی ورطۂ ہلاکت میں ڈالا۔ کبھی غلط فہمی سے کبھی غلط روی سے، اور اکثر و بیشتر بد نیتی سے، حتیٰ کہ تصوف بھی سبائی تحریک کی ایک شاخ بن کر رہ گیا۔ وہی سیدنا علیؓ کی جناب میں بے جا غلو، وہی بارہ اماموں کا تصوّر، وہی شریعت کو قشر کہنا کہ محض خول ہے اور اصل سے بے تعلق، وہی کرامات و تصرّفات کا ذکر لاطائل، نظامِ خلافتِ اسلامیہ کی توہین، اور دین اور دنیا میں مغائرت، خلفاء و امراءِ اسلام کی اہانت اور فلاں زاویہ نشین اور بسجہ خواں صاحب کو خاصانِ خدا کا صدر نشین اور محورِ دین بتا کر القاب و آداب میں ناجائز اور مضحکہ خیز غلو۔

یہ ہے روئداد حال اور ماضی قریب کی اور کچھ ماضی بعید کی، ایسی ہی کچھ روئداد قرونِ اولیٰ کی تاریخ کی بھی ہے، انفرادی حیثیت سے جو لوگ مسلمان ہوئے، اور انھیں صحابہ و تابعین کی صحبت میسّر آئی وہ امامت کے درجہ تک پہنچ گئے، اور امّت ان کے فیوض سے بہرہ ور ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اقوام کے جاہلی تصوّرات کا بھی قلع قمع کر دیا گیا تھا۔

عربوں میں من حیث القوم یہ تبدیلی اس لئے آسان ہوئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ اکتسابِ نور کے مواقع تھے۔ پھر ان پر کسی نام نہاد تمدن و تہذیب و ثقافت کا سایہ نہ پڑا تھا۔ سادہ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے، اور ان میں مثبت صفاتِ انسانیہ کی پوری جلوہ گری تھی۔ اس لئے ان کے اندر ذہنی انقلاب آسان ہو گیا، اور جب وہ مسلمان ہوئے تو حقیقتاً ہوئے۔ یہی کیفیت ہمیں ترکوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی صفات بھی عربوں کی سی تھیں، اس لئے ان کی ذہنی تبدیلی بھی اصیل ثابت ہوئی۔ اور یہی حالت ہمیں پٹھانوں میں بھی ملتی ہے۔ عربوں میں اور ان دونوں قوموں میں دین سے بے رغبتی کے جو آثار اب

پیدا ہوئے ہیں وہ اقوامِ مغرب کے تسلّط اور تہذیبِ مغرب کے چھا جانے کا نتیجہ ہیں، اور اس کا کہ مسلمانوں کا کلمہ متفرق ہے۔ پھر بھی سب قوموں سے زیادہ انہی قوموں سے توقع کی جاتی ہے کہ یہ دوبارہ اپنی اصلاح پر مائل ہوں گے۔

برخلاف ان قوموں کے جو متمدن کہلاتی تھیں، جنھیں اپنے ثقافتی سرمایہ پر فخر تھا، اور جو چاہتے تھے کہ اپنا یہ ورثہ من وعن اسلام میں داخل کریں، ان کی کیفیت اب تک حریفانہ ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دینِ اسلام میں مختلف قسم کی نظری اور عملی بدعتیں رائج ہوئیں اور فرقے بنے۔

اب اس حقیقت کو بھی دیکھنا چاہئے کہ عرب کے جو قبائل پے بہ پے مسلمان ہوئے اور اجتماعی حیثیت سے انھوں نے دین قبول کیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُن میں کیسی ارتداد کی ہوا پھیلی، اور وہ کس طرح اسلام کے لئے نہایت زبردست خطرہ بن گئے۔ ان کی قسمت تھی، خدا کا وعدہ تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی کہ زمامِ اُمّت حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آئی، جنھوں نے سرزمینِ عرب کو پھر دارالاسلام بنا دیا۔

بے شک دعوتِ محمدیہ کوئی انقلابی تحریک نہیں جیسا کہ لوگ بے خیالی میں الفاظ کے صحیح انتخاب کے بغیر کہہ دیا کرتے ہیں۔ دعوتِ محمدیہ فرمانِ الٰہی کے مطابق ارتقائی تحریک ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت یہ نہیں کہ آپ قوموں کی ثقافتوں کو منسوخ کریں۔ آپؐ تو تکمیلِ ادیان کے واسطے تشریف لائے ہیں، تاکہ اقوامِ عالم کے حریفانہ جذبات میں وجہِ مشارکت دکھلا کر نظامِ عدل قائم کریں جو شریعتِ مطہرہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، اور جس سے اکتساب کر کے دنیا کی ساری قومیں رفتہ رفتہ اپنے نظریات اور معاشرتی و سیاسی تصوّرات میں اصلاحیں کرتی چلی جا رہی ہیں۔

اسی لئے مسلمانوں نے پوری رغبت کے ساتھ ایک فرضِ دینی سمجھ کر اقوام و ملل کے ثقافتی سرمایوں کی حفاظت کی، اور انھیں آدابِ قرآنیہ کے مطابق اسلامی قالب دے کر اپنا لیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ ثقافت رُونما ہوئی جو اپنی اصل میں نہ عربی ہے نہ عجمی، نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ شمالی نہ جنوبی، نہ نسلی اور نہ جغرافیائی، بلکہ اس میں اتنی لچک ہے کہ ہر ماحول اور ہر زمانہ میں اسے بے تکلّف اپنایا جا سکتا ہے، اور ساتھ ساتھ خود اس کے اپنے

ارتقاء کے لئے بھی وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی اس کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمانی اور مکانی قیود سے آزاد کردیا ہے۔ وہ تمام عالم کا مشترک ورثہ ہے۔ لیکن یہ کام ہے عرق ریزی کا، بے محابا فراخ دلی نہیں برتی جاسکتی۔

اگر مسلمان فراخ دلی برتتے جو اُن مہذب اقوام کی دلی خواہش تھی، اور دین کے اصول کی پرواکئے بغیر محض مسلمانوں کی عددی قوت اور سیاسی شوکت پر نگاہ رکھتے تو اسلام وہی کچھ بن جاتا جو یہ ذی اثر نومسلم بنانے کے درپے تھے۔

ہر عالمگیر تحریک کا سب سے خطرناک پہلو یہی ہے کہ بااثر لوگ جب تبدیلیِ قلب کا اعلان کرتے ہیں تو ان کا مقصد فی الحقیقت یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو تحریک کا تابع بنانے کی بجائے تحریک کو اپنا تابع بنالیں۔ اسلام کی تاریخ میں ان تمام امور کا نقشہ موجود ہے۔ اور اگر ہم فکر صحیح کے ساتھ سطور بالا کا جائزہ لیں تو جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی تصدیق ہوگی۔ اس کا چھوٹا سا تجربہ خود پاکستان کے پچھلے دَور میں ہمیں بھی ہوچکا ہے۔

یہ صرف صحابۂ کرام کی برکت ہے کہ اسلام اپنی اصل صورت میں محفوظ ہوگیا۔ ان کے دلوں میں دعوت رَچ چکی تھی۔ انھیں ثباتِ قلب کے ساتھ اس ذمہ داری کا احساس تھا کہ جس طرح انھوں نے اس دین کو قائم کیا ہے، اسی قوت کے ساتھ اسے محفوظ وکارگر رکھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پورے عرب میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ لیکن بعض صحابہ پر وقتی تأثر کے علاوہ کوئی خوف اور ہراس طاری نہیں ہوا۔ ان کی عزیمت کوہِ تمثال تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شخص نے خوب جانچ کر، کھلا مقابلہ کرکے دین قبول کیا تھا اور بلاواسطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تربیت سے منوّر تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مہاجرین وانصار کو یہ حیثیت دی ہے کہ ان کا اتباع کیا جائے، انہی کا اجماع حجّت ہے، اور ہر مسئلہ کی تعبیر وہی درست ہے جو صحابۂ کرام نے بیان فرمائی ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام اگر ان کے ہاتھ سے نکل جاتا، اور ان کی آواز بے حیثیت ہوجاتی تو دین اسلام کا بھی وہی حشر ہوتا جو نصرانیت کا ہوا۔ یہ صحابۂ کرام کی احتیاط تھی کہ انھوں نے اجتماعی طور پر مسلمان ہونے والوں کو مناصبِ حکومت عطا نہیں کئے۔ تحریک کی قیادت چُن چُن کر خاص خاص حضرات کے ہاتھ میں رکھی، یعنی صرف انھیں تفویض کی جو بلاواسطہ فیضانِ نبوی سے مستفیض تھے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوتِ تصرف سے

ان کے قلوب کو منوّر کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم عیاناً دیکھتے ہیں کہ ارتدادِ عرب کے موقعہ پر اُن کے قبائل کے وہ سردار مستقیم الحال رہے جن کا تقرر خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

امامتِ قریش

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد دفعہ اسلام کے مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کی ہیں۔ منجملہ ازاں یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کی امامت قریش کے ہاتھ میں رہے گی۔ اصحابِ کرام نے ان پیشگوئیوں کو شرعی حکم نہیں سمجھا، بلکہ وہ حیثیت دی جو دوسری پیشگوئیوں کی تھی۔ مثلاً کسریٰ کا ملک فتح ہونا، یا قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانا، گویا یہ حکم نہیں تھا، بلکہ اطلاع تھی کہ ایسا ہوگا اور یوں ہوگا۔ اگر صحابۂ کرام کے نزدیک قریش کی امامت کا کوئی حکم ہوتا، اور اس کی حیثیت شرعی قرار دی جاتی تو پھر سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کا کوئی امکان نہ تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ اور دوسرے مہاجروں نے انصار کے اس اقدام پر دینی حیثیت سے قطعاً حرف گیری نہیں کی، اور اُن کی یہ حیثیت تسلیم کی کہ زمام کار اُن کے ہاتھ میں ہو کیونکہ وہ ہر طرح اس کے اہل تھے اور ہر اعتبار سے دین کے محافظ اور قائد ثابت ہوئے۔ حضرت صدیقؓ کی تقریر کا لبِّ لباب یہ تھا کہ عرب جو ہمیشہ سے قریش کی قیادت کے عادی ہیں، وہ غیر قرشی امام کی امامت قبول نہیں کریں گے۔ گویا قریش کی امامت کا قیام مصلحتِ ملّیہ کے تحت عمل میں آیا، نہ کہ اصولِ شرعی سمجھ کر۔ جو بے ادب لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع پر طعن کرتے ہیں، ان کا یہ طعن محض انصار پر نہیں ہے بلکہ جمہور صحابہ پر ہے، جنھوں نے انصار کا یہ حق تسلیم کیا کہ اگر قیادت انھیں ملے تو درست ہوگی۔

چونکہ مدتِ مدیدہ تک خلافت کا نظام قریش کے ہاتھ میں رہا، اس لئے بعد کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ امامت کا حق صرف قریش کو ہے۔ بلکہ بعض بعض تو ایسے تیز نکلے جیسے سیوطیؒ وغیرہ کہ اُن کے نزدیک امام کا عباسی ہونا اولیٰ ہے۔ وجہ محض یہ ہے کہ عباسیوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو صدیوں تک رہی۔

امامتِ قریش کی بابت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات سامنے رکھے جائیں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ مراد امامت عرفی نہیں ہے بلکہ لغوی ہے۔ چنانچہ تیرہ سو برس کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں پر جب کوئی وقت پڑا اور وہ کسی مشکل میں گرفتار ہوئے تو اس گرداب بلا سے نکالنے کے لئے ایک قرشی ہی آگے بڑھا، اور یہ مقبولیت حاصل کی کہ باقی

امت بھی اس کی بات اٹھالے۔ مسلمانوں نے جب کبھی زندگی کے کسی چھوٹے بڑے مسئلہ میں تعلیماتِ قرآنیہ کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہا تو قیادت کا سہرا ہمیشہ ایک قرشی کے سر رہا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، علمی، فنی، اخلاقی اور روحانی دائرہائے عمل میں ہر جگہ اور ہر موقع پر قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک قائدانہ سرگرمیوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہر تعمیری کام میں سرِفہرست ایک قرشی ہی کا نام ملتا ہے۔ اگر اس زاویۂ نگاہ سے مختلف شعبہائے زندگی کی تدوین پر نگاہ ڈالی جائے، اور تلاش کی جائے کہ اس خاص موضوعِ فکر میں قدمِ اول کس نے اٹھایا تو قرشیوں کے ناموں اور کاموں کی ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ یہ ہے الامامۃ فی قریش کا مطلب اور الائمۃ من قریش کا مفہوم۔

لیکن جس طرح زندگی کے اور شعبوں میں غیر قرشی بھی بکثرت نمایاں ہیں بلکہ غیر عرب بھی، ایسے ہی خلافت کی زمام قریش کے ساتھ مختص نہیں کی جاسکتی، بلکہ سب عربوں اور غیر عربوں میں جاسکتی ہے۔ چنانچہ مصر کے آخری عباسی خلیفہ نے برضاء و رغبت امرِ خلافت کو ترکوں کی طرف منتقل کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں خلافتِ آلِ عثمان کی پوری تاریخ مرتب ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی خلافت میں عباسی امام کو وہ وسائل میسر نہ تھے جو حقیقی خلیفہ کے لئے ضروری ہیں، اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس رسمی امامت سے ملت کو چنداں فائدہ نہیں۔ برخلاف اس کے ترکوں کی نئی اٹھتی ہوئی قوم میں، دین کی والہانہ محبت، اور اس کی خاطر سرفروشی کا جذبہ پوری طرح پیدا ہو گیا تھا، اور دعوت کی روح ان میں اچھی طرح رچ گئی تھی۔ فرقہ بازی کے شرک سے وہ پاک تھے، پھر انھیں مادّی وسائل بھی حاصل تھے، اور ان میں پوری صلاحیت تھی کہ خلافت کی کارگری اور عظمت و شان کو برقرار رکھ سکیں۔ چنانچہ امیر المؤمنین سلطان المعظم سلیم خان اولؒ اس منصب پر فائز ہو گئے، اور الحق کہ انھوں نے ان کارہائے نمایاں کی طرح ڈال دی جنھوں نے عثمانی خلفاء کو زندہ جاوید بنا دیا۔

بہر حال سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امامتِ قریش سے مراد عرفی امامت یعنی خلافت نہیں لی، اور جب قریش کی خلافت پر ان کا اجماع ہوا تو محض اس مصلحت کے تحت کہ دنیائے عرب میں کسی اور قبیلہ کی امامت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اسی مصلحتِ ملّیہ کو صحابۂ کرامؓ نے بعد میں بھی ملحوظ رکھا، اور جس اصیل بنیاد پر انھوں نے خلافت کو قریش میں محصور کیا تھا،

اسی مقصد کے پیشِ نظر اس دائرہ کو تنگ تر کرکے خلافت کے لئے بنو عبد مناف کو خاص کر دیا گیا، اس کی ضرورت پچھلے دس برس کے احوال نے پیدا کی تھی۔

بنو عبد مناف

علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں ولایتِ عہد کے عنوان کے تحت مختصر الفاظ میں صورتِ حال کا لبِّ لباب پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان عصبیۃ مُضر کانت فی قریش و عصبیۃ قریش فی عبد مناف و عصبیۃ عبد مناف انما کانت فی امیۃ تعرف ذٰلک لہم قریش وسائر الناس ولا ینکرونہ (مقدمہ، ولایت عہد، ص ۱۵۲)

مُضر کی عصبیت قریش میں تھی، اور قریش کی عصبیت عبد مناف میں، اور عبد مناف کی عصبیت صرف امیہ میں تھی جسے قریش اور سب لوگ جانتے تھے۔ اور کسی کو اس پر اعتراض نہ تھا [مقدمہ ابن خلدون، ولایت عہد ۱۵۲]

عصبیت کے معنی ہیں وہ جذبہ جو ایک کو دوسرے کے قریب کر دے، اور غیروں کے مقابلہ میں ساتھ لا کھڑا کرے۔ عرب اگر مجتمع ہو سکتے تھے تو مُضر کی قیادت میں، اور مُضر اگر اکٹھے ہوتے تو قریش کی قیادت میں، اور قریش سرداری قبول کرتے تو عبد مناف کی اور عبد مناف کی اولاد میں یہ حیثیت امیہ کی تھی کہ ان کے جھنڈے کے نیچے سب جمع ہوں اور ان کی آواز پر لبیک کہیں۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدونؒ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

وانما نسی ذٰلک اوّل الاسلام لماشغل الناس من الذہول بالخوارق وامر الوحی وتردد الملئکۃ لنصرۃ المسلمین واغفلوا امور عوائدہم و ذہبت عصبیۃ الجاہلیۃ ومنازعہا و نسیت ولم یبق الا العصبیۃ الطبیعیۃ فی الحمایۃ والدفاع ینتفع بہا فی اقامۃ الدین وجہاد المشرکین۔ اَلدِّیْنُ فِیْہَا مُحْکَمٌ والعادۃ معزولۃ حتّٰی اذا انقطع امر النبوۃ والخوارق المہولۃ

لیکن اسلام کے ابتدائی دور میں لوگ اسے بھول گئے تھے اس لئے کہ ان کی توجہ معجزات پر تھی، وحی آ رہی تھی اور فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے اتر رہے تھے، اس لئے پچھلی منفعتوں سے (یعنی عکاظ کے میلوں میں جو اپنے آباء پر فخر اور قبیلوں کی برتری کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں ان سے) لوگ غافل ہو گئے، اور جاہلیت کے عہد کی عصبیت جاتی رہی، جھگڑے مٹ گئے، اور ذہنوں سے بات اتر گئی۔ اس میں سے کچھ باقی نہ رہا سوائے اس فطری

تراجع الحکم بعض الشئی للعوائد فعادت العصبیۃ کما کانت ولمن کانت واصبحت مضر اطوع لبنی امیۃ من سواہم بما کان لہم من ذٰلک قبل۔	عصبیت کے جس کا تعلق تحریک کی حمایت اور مسلمانوں کے دفاع سے تھا، اس طرح وہ عصبیت اب دین قائم کرنے اور مشرکوں سے جہاد کرنے میں کام آتی تھی۔

امت کے دلوں میں دین مضبوطی سے قائم تھا اور پچھلی عادتیں معطل ہو چکی تھیں، یہاں تک کہ نبوت کا معاملہ ختم ہو گیا، اور وہ معجزات بند ہو گئے جو دلوں کو دہلاتے رہتے تھے۔ اس طرح پرانی عادتوں کی طرف طبائع کچھ راغب ہو گئیں، اور وہی تعصب ابھر آیا جو شروع میں تھا، اور جن لوگوں کے حق میں تھا چنانچہ قبیلہ مُضَر دوبارہ دوسروں کے مقابلہ میں بنوامیہ کی طرف پہلے ہی کی طرح جھک گیا۔"

یہ تجزیہ اگرچہ بعض اعتبارات سے صحیح ہے لیکن بالکلیہ درست نہیں۔ پہلی عصبیت ماند نہیں پڑی تھی۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ اس عصبیت پر حرف لانا چاہتے تھے۔ آپ کی دعوت کے بقاء کا انحصار ہی اس عصبیت پر تھا۔

دعوت کے اوّلین علمبردار قریش تھے۔ اکابر بنو عبدالشمس کا مسلمان ہونا اور حکومتِ نبویہ میں اہم ترین مناصب پر فائز ہونا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی قیادت کو بدستور قائم رکھنا، اور پھر ان کی یہی حیثیت عہد صدیقی و فاروقی میں جاری رہنا، پھر حضرت امیرالمؤمنین عثمانؓ کا خلیفہ منتخب ہونا، ایسے قدرتی اسباب تھے کہ سیاسیاتِ اسلامیہ میں بنوامیہ کی قائدانہ حیثیت مسلّم ہو چکی تھی۔ قریش کے کسی گھرانے کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اس کے اتنے بہت سے افراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے کارکن ہوں جتنے بنوامیہ میں تھے۔

گویا اسلام کی جو پہلی حکومت مدینہ طیبہ میں قائم ہوئی اس کے چلانے والے اموی سادات نمایاں ہو چلے تھے۔ اور جس طرح جاہلیت میں قریش کی قیادت کا شرف امویوں کو حاصل تھا، اسی طرح اسلام میں بھی رہا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ قائدانہ حیثیت برقرار رکھی۔ اموی سادات میں سے پانچ حضرات نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے والی تھے، اور ان میں سے چار آخرِ عہدِ نبوی تک ان مناصب پر فائز رہے:

والیِ مکہ ، سیدنا عتّابؓ بن اُسید بن ابی العاص بن امیہ۔

والیِ نجران ، سیدنا ابوسفیانؓ بن حرب بن امیہ۔

والیِ یمن و مذحج ، سیدنا خالدؓ بن سعید بن العاص۔

والیِ تیماء و خیبر ، سیدنا عثمان رضؓ بن سعید بن العاص

والیِ بحرین ، سیدنا ابان رضؓ بن سعید بن العاص۔ ان کا تقرر سیدنا علاء الحضرمی رضؓ کے بعد ہوا تھا جو بنو امیہ کے حلیف تھے۔

اس کے مقابلہ میں بنو ہاشم کی حیثیت جاہلیت میں کعبہ شریف کی خدمت کی وجہ سے احترام کی تھی۔ اسلام میں ان کا احترام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کے سبب اور بھی بڑھ گیا، مگر نہ جاہلیت میں بنو ہاشم کی حیثیت سیاسی تھی اور نہ اسلام میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ہاشمی کو کوئی سیاسی منصب عطا نہیں فرمایا۔ صرف ایک واقعہ خیبر کے ایک قلعہ کی فتح کا ہے جو سیدنا علی رضؓ نے زیر کیا تھا۔ باقی متعدد قلعے اور اہم مورچے دوسرے بزرگواروں نے فتح کئے تھے۔ خیبر کوئی گاؤں نہیں تھا ایک بڑا علاقہ تھا جہاں کئی مضبوط قلعے تھے۔ سیدنا علی رضؓ ہی کا ایک واقعہ ہے کہ غزوۂ تبوک پر روانہ ہوتے وقت اہل و عیال کی نگرانی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ میں چھوڑا تھا۔ سیدنا علی رضؓ کو اس کا سخت رنج تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے انھیں عورتوں، بچوں اور معذوروں میں چھوڑا گیا۔ لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسکین فرمادی۔ [صحیح بخاری: ج ۳، ص ۸۶، طبع مصر]

عن مصعب بن سعد عن ابیہ انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خرج الیٰ تبوک استخلف علیاً فقال اتخلفنی فی الصبیان والنساء۔ قال الا ترضیٰ ان تکون منّی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لیس نبی بعدی۔

"حضرت مصعب بن سعدؓ سے روایت ہے انھوں نے اپنے والد ماجد کے حوالہ سے بیان کیا۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک کے لئے نکلے ہیں تو آپ نے (سیدنا علی رضؓ کو اپنی نیابت سپرد کی۔ انھوں نے عرض کیا "کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ تمھاری قدر میرے ہاں وہی ہو جو موسیٰؑ کے ہاں ہارونؑ کی تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

پھر جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا ہے اور اس کے بعد سورۃ البرأۃ نازل ہوئی ہے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ سنانے کے لئے سیدنا علی رضؓ کو بھیجا تھا، اور آپ نے امیر حج کے نائب کی حیثیت سے یہ سورۃ سُنائی، جس میں اگر ایک طرف مشرکوں کو حرم شریف میں حج کے لئے آنے کی ممانعت تھی، تو اس میں دوسری طرف آیتِ غار بھی تھی،

جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظیم ترین منقبت ہے کہ آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ معیت خاصہ حاصل ہے جس میں کوئی مرد آپ کا شریک نہیں۔

پس بنو ہاشم میں سے قابلِ ذکر صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہ خدمات ہیں۔ ان کی جلالت مسلّم ہے، اور ان سے آپ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ان کو صحیح معنی میں سیاسی کہنا مشکل ہے۔ لوگوں نے ان امور سے جو معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ سب عجمی دماغ کی پیداوار ہیں۔ عربوں نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے، اور خود سیدنا علیؓ اور اہل بیت نے یہ معانی نہیں لئے۔

پھر خلافتِ صدیقی و فاروقی و عثمانی میں بھی امت کی عملی سیاست میں ہاشمیوں کی کچھ مؤثر خدمات نہیں۔ سیدنا علیؓ اور سیدنا ابن عباسؓ کا عہدِ فاروقی میں رکنِ شوریٰ ہونا، یا سیدنا ابن عباسؓ کا آخر عہد عثمانی میں امیرِ حج مقرر ہونا، کچھ ایسے امور نہیں کہ ان کی بناء پر امویوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ یعنی بنو ہاشم کو نہ جاہلیت میں حکومت کا کوئی تجربہ تھا اور نہ اسلام میں۔

ادھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے ایک دشمنِ ملت ٹولی کے ہاتھوں ایسی سخت اور اندوہناک باتیں رونما ہو گئی تھیں کہ خود بنو ہاشم کا یہ نظریہ ہو گیا کہ امت کی قیادت مستقل طور پر امویوں کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے تمام ہاشمی سادات کے مشورہ اور حمایت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے بیعت کر لی۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کو جو مقام حاصل ہوا تھا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کافر و مؤمن سب کی نگاہیں انہی کی طرف اُٹھتی تھیں، اور سب جانتے تھے کہ نبی کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ تو یہ بات ان دونوں کے ساتھ خاص تھی۔ چنانچہ اُحد کے دِن حضرت ابو سفیانؓ نے جو اس وقت کافر تھے اور مسلمان فتح پا چکنے کے بعد ایسی حالت میں تھے جو مثل شکست کے تھی، تو انھوں نے فخریہ بلند آواز سے پوچھا تھا "تم میں محمدؐ ہیں؟" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جواب مت دینا"۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ "تم میں ابو قحافہ کے بیٹے ہیں یعنی حضرت صدیقؓ؟" آنحضرتؐ نے فرمایا "جواب مت دینا"۔ پھر تیسری مرتبہ انھوں نے پوچھا "تم میں خطاب کے بیٹے ہیں، یعنی حضرت فاروقؓ؟" اس پر بھی آنحضرتؐ نے فرمایا "جواب مت دینا" چنانچہ جواب نہ پا کر حضرت ابو سفیان نے اپنے کافر ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا "لو بھئی ان کا تو تم فیصلہ کر چکے"۔ اب حضرت فاروقؓ

ضبط نہ کر سکے اور فرمایا "او اللہ کے دشمن ہم سب زندہ ہیں"۔

یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کافر بھی یہ جانتے تھے کہ دعوت جن کے بل بوتے پر چل رہی ہے وہ یہ تین ہیں۔ کسی چوتھے کا انھوں نے نام نہیں لیا۔ اور مسلمانوں میں جو ان دونوں بزرگوں کی حیثیت تھی وہ ظاہر ہے۔ لیکن ان دونوں کی یہ حیثیت محض ان کی شخصیتوں کی بناء پر تھی۔ اور انھیں خلافت بھی محض اس شخصی عظمت و جلالتِ قدر کی بناء پر ملی۔ ورنہ قریش میں تَیمیوں اور عَدَویوں کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی کہ بنو عبد مناف کے مقابلہ میں ان کی قیادت تسلیم کی جائے۔

لہٰذا امّت کے ان دونوں باپوں کے اُٹھ جانے کے بعد یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ سیاسات اسلامیہ پر بنو عبد مناف جلوہ گر ہوں۔ انہی امور کو دیکھ کر نہایت صحیح اور موزوں اقدام تھا، ان چاروں حضرات کا خلافت سے دستبردار ہو جانا جنھیں حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے بعد نامزد کیا تھا، اور یوں معاملہ سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ پر آن پڑا۔

اہلِ مدینہ نے بظاہر دو مقبول شخصیتوں میں سے ایک کا انتخاب کیا تھا، اور اتفاق سے وہ صاحب اموی تھے جو منتخب ہوئے، اس لئے امویوں کو خود بخود وہ مقام مل گیا جو جلد یا بہ دیر انھیں ملنا تھا۔ اگر اس وقت سیدنا علیؓ کا انتخاب ہو جاتا تو شاید تاریخ کچھ اور ہوتی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہوتی۔ ممکن تھا کہ قیادت بنو ہاشم ہی کے ہاتھ میں رہتی، اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ دن بعد امویوں کی طرف منتقل ہو جاتی۔ البتہ یہ ناممکن تھا کہ امویوں اور ہاشمیوں سے نکل سکے۔

سیوطیؒ جیسے مؤرخین نے یہ خیالی باتیں کہی ہیں کہ اگر امیر المؤمنین معاویہؓ اپنی زندگی میں اپنے فرزند کی ولایتِ عہد کی بیعت نہ لیتے تو خلافت کے لئے ایسے ہی شوریٰ ہوا کرتا جیسے اس وقت تک ہوتا رہا تھا۔ اور خلافت قریش کے سب بطون میں آتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر سیدنا عثمانؓ کا اس وقت انتخاب نہ ہوتا تو خلافت بنو امیہ میں نہ جاتی۔ یہ سب فرضی باتیں ہیں جو نہ اسلامی معاشرہ کے سیاسی مطالعہ پر مبنی ہیں، اور نہ اُن احوال پر جو نفسِ دین کو پیش آئے۔

خلافت کو یقیناً بنو عبد مناف میں آنا تھا، اور شوریٰ کی نوعیت یہی رہنی تھی جو ہزار برس سے امت کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ جیسا ہونا ممکن نہیں، اسی طرح حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ جیسی ہستیوں کا پیدا ہونا مستبعد ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کے ان دونوں باپوں کے بعد سب کو یکساں نظر

سے دیکھتے تھے۔ اور اگر کسی تیسرے کا نام لیا بھی جاتا تھا تو وہ سیدنا عثمانؓ ہی کا تھا۔ اس لئے اس خیال کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ نظامِ خلافت غیر خاندانی رہے۔ عربی ماحول کے لئے ایسے سب اقدامات موجبِ فتنہ ہوتے اور نہایت تباہ کن اور کبھی کوئی مستحکم سیاسی نظام برپا نہ ہو سکتا۔

لہٰذا اس موضوع پر جتنے اوراق سیاہ کئے گئے ہیں اور واقعات دیکھنے کی بجائے تصورات کی دنیا میں کھو جانے کی کوشش کی گئی ہے وہ محض لایعنی ہیں۔ اور اپنے آپ کو صحابہ کرام سے زیادہ عقلمند اور دیندار سمجھنے کے مرادف۔ اپنے احوال سے وہ حضرات جتنے واقف تھے ایسی واقفیت بعد کے لوگوں کو کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور دین کے جتنے وفادار وہ تھے اس سے زیادہ وفادار ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ اگر کوئی کرے تو جھوٹا ہے اور راندۂ درگاہِ خداوندی۔ صحابہ کرام نے اپنے وقت میں جو کچھ کیا، اس سے بہتر حل کی تلاش ان حالات میں ممکن نہ تھی۔ یہ ہے ایک توجیہ جس کی بنا سیاسی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ پورے عرب کی طاقت خلافت کی پشت پر ہو گئی۔ اور یہ بالکل درست ہے کہ امویوں کی خلافت عربی خلافت تھی۔ اور صحابہ کی قیادت میں چلتی تھی۔

دوسری توجیہ ہے دعوت و تحریک کے اعتبار سے، سیدنا حسنؓ نے جب سیدنا معاویہؓ سے صلح کر کے زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں دیدی، اور صحابہ کرام نے ان کی امامت پر اجماع کیا تو یہ نقلِ حکومت نہ محض ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف تھا، اور نہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف، بلکہ یہ دعوتِ محمدیہ کی حفاظت کی نہایت اہم اور مؤثر ترین تدبیر تھی۔ نہایت اصیل بُنیاد پر اس انتقال کو لازم سمجھا گیا تھا۔ اس کا فوری اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سبائیوں کو اور ان نومسلموں کو جو اجتماعی حیثیت سے مسلمان ہوئے تھے حکومت کے کلیدی مناصب پر دسترس نہیں رہی۔

ہاشمیوں نے برضاء و رغبت جب امرِ خلافت کو امویوں کی طرف منتقل کیا، تو یہ کسی وقتی مغلوبیت کی بناء پر نہیں تھا، جیسا کہ بعض مفتری کہتے ہیں، بلکہ ہاشمی سادات کے نزدیک یہ موقف اتنا اصیل تھا کہ وہ پوری قوت اور یکجہتی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہ صلوات اللہ علیہ کی وفات کے بعد سیاسی اختلال کی جتنی صورتیں پیدا ہوئیں، ان میں تمام بنو ہاشم کی ہمدردیاں بنو امیہ سے وابستہ رہیں۔ سخت ترین حالات میں بھی انھوں نے

اپنا موقف نہیں بدلا۔ یہی حال دوسرے اکابرِ قریش اور سابقون الاوّلون کا تھا، یعنی سب سے پہلے مسلمان ہونے والوں کا جنھوں نے دین قائم کیا تھا۔

امیر المؤمنین یزید کے خلیفہ ہونے پر جب کوفیوں کی شرارت سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے حصولِ خلافت کی کوشش کی تو کسی صحابی نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور نہ بنو ہاشم کے اہل الرائے نے اُن کے موقف کی تائید کی۔ خود آپؓ بھی جب حقیقت کھُل گئی کہ کوفیوں نے محض دشمن ملّت ہونے کے سبب غداری کی ہے، اور دوستی کے پردہ میں اہلِ بیت سے اپنی دشمنی نکالی ہے، اور یہ کہ امت سب کی سب امیر المؤمنین یزید بن معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہے، اور عراق پر بالکلیہ ان کا قبضہ ہے تو آپ نے بھی اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کر دیا۔ اس کی کچھ تفصیل ولایتِ عہد کے عنوان کے تحت بیان ہوگی۔

پھر امیر المؤمنین یزید کی وفات کے بعد جب سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت کا اعلان کیا، تو کسی ہاشمی نے آپ سے بیعت نہیں کی، اور اکابرِ قریش بھی آپ سے محترز رہے۔ اسی زمانہ میں سبائیوں نے زور پکڑا، اور مختار ثقفی نے اس امر کی خوب تشہیر کی کہ حضرت محمد بن علی بن ابی طالب ہمارے ساتھ ہیں [جنھیں سبائیہ کی شرارت سے عموماً ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے] اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں انہی کے حکم سے کر رہے ہیں۔ لیکن ہاشمی سادات نے مطلقاً اس تحریک کی طرف توجہ نہیں کی، جلوت و خلوت میں اس سے برائت کا اعلان کیا، اور ظاہراً و باطناً مختار ثقفی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

حضرت ابن الزبیرؓ پر یہ وقت سخت تھا۔ آپ کو مختار ثقفی کی طرف سے بڑی تکلیفیں پہنچی تھیں، حتیٰ کہ اس کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی، اور سیدنا مُصعَب بن الزبیرؓ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا۔ لیکن مختار کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بنو ہاشم کی خلافت کے لئے کر رہا ہے، آپنے اس کی تحریک کی ذمہ داری بنو ہاشم پر نہیں رکھی۔ اسی طرح جب امیر المؤمنین عبدالملکؒ کامیاب ہوگئے، اور سبائیوں سے آپ کے معرکے ہوئے تو آپ نے بھی بنو ہاشم کا دامن اس سیاسی اختلال اور دینی اختلاف سے پاک سمجھا۔

مؤرخ خضری نے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (ج ۲، ص ۱۴۰) میں یہ بیان ناقابلِ قبول دیا ہے کہ :-

كان عمل المختار سبباً لتغير ابن الزبير	مختار کی حرکات اس کا سبب بنیں کہ (حضرت)

علی محمد بن الحنفیۃ ومن معہ من اہل بیتہ فدعاہم لیبایعوہ فابو علیہ فحبسہم فارسل الیہم المختار من خلصہم من سجنہ۔	ابن الزبیرؓ کا دل محمدؒ بن الحنفیہ اور ان کے گھر والوں سے پھر گیا۔ انھوں نے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا، اور ان کے انکار پر انھیں قید

کر دیا، اس پر مختار نے اپنے آدمی بھیج کر انھیں رہا کرا لیا۔

اگر واقعہ یوں ہی ہوتا تو بیعت سے انکار پر محض اتنا ہی نہ کیا جاتا کہ انھیں قید کر دیں۔ اور اگر قید کیا تھا تو مختار کی کیا مجال تھی جو انھیں قید سے رہا کرا سکتا۔ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما صاحبِ طاقت و شوکت تھے، اور مکہ پر اُن کی حکومت تھی۔ یہ حکومت انھوں نے عاقبوں کے بَل پر حاصل نہیں کی تھی کہ اپنے امام کی ہر بات رَد کر دیں اور اس کے مخالفوں کا فروغ ہونے دیں۔ حضرت ابن الزبیرؓ نے ان بزرگواروں کو ہرگز قید نہیں کیا، اور اگر کرتے تو پھر اس کا امتیاز کیوں، کہ صرف حضرت محمدؒ اور ان کے گھر والے قید کئے جائیں۔ بیعت تو کسی ہاشمی نے نہیں کی تھی تو پھر سب کو قید کیوں نہیں کیا۔

اور اگر بالفرض آپ نے انھیں قید کیا تھا اور مختار نے اپنے آدمی بھیج کر انھیں چھڑا لیا تھا تو وہ تو اس کا ثبوت ہو گیا کہ سیدنا محمدؒ سے مختار کا تعلق تھا، اور وہ جو اس سے اپنی برأت ظاہر کرتے تھے وہ منافقت سے کرتے تھے۔ پھر جب اُن کا تعلق ثابت ہو گیا تو سیدنا ابن الزبیرؓ نے یہ کیسے برداشت کر لیا کہ وہ ان کی مملکت میں بدستور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے انھیں اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہم کو طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ تو طائف بھی تو آپ ہی کے قبضہ میں تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مختار سے جنگ ہو رہی ہے اس کے ساتھیوں کو قتل کیا جا رہا ہے لیکن جو شخص اس فتنہ کا بانی ہے وہ آرام سے ہے، اور اس سے کوئی تعرض نہیں۔

لہٰذا یہ سمجھنا قطعاً ممکن نہیں کہ حضرت ابن الزبیرؓ کے نزدیک سیدنا محمد بن علیؓ یا کسی دوسرے ہاشمی کا مختار کی تحریک سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا۔ یہ حضرات طائف میں اپنی مرضی سے مقیم تھے۔ ان کا موقف واضح تھا، وہ اموی خلافت کی حمایت میں تھے۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابن الزبیرؓ کی حکومت کتنی ہی مضبوط ہو جائے اس کی بقاء ناممکن ہے اور نہ اس کے قیام سے اقوامِ عالم میں ملّت کی کچھ عظمت بڑھے گی۔ خود خضری ہی آگے کہتے ہیں کہ قید سے نکل کر حضرت محمدؒ شام کی طرف (امیر المؤمنین) عبد الملک کے پاس جانے کے لئے

چلے، لیکن ایلہ تک پہنچنے کے بعد پھر واپس آ گئے۔" اس بیان سے انھوں نے اپنی پہلی بات خود رَد کردی۔ حضرت محمدؒ کو تو چاہئے تھا کہ قید سے نکل کر سیدھے مختار کے پاس جاتے۔ شام کی طرف تو وہی جا سکتا تھا جس کی ہمدردیاں امویوں کے ساتھ ہوتیں۔ ایلہ سے آپ کی واپسی مکہ کو اس وقت ہوئی جب مکہ امیرالمؤمنین عبدالملکؒ کی حکومت میں آ گیا۔

حضرت ابن الزبیرؓ کو جو وقتی کامیابی حاصل ہوئی تو محض اپنی شخصیت کی بنا پر، چنانچہ سیدنا ضحاک بن قیس اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم جو امیرالمؤمنین حضرت معاویہؓ اور امیرالمؤمنین یزید کے عمائد میں تھے، وہ خلافتِ شام میں اس اختلال کے سبب جو امیرالمؤمنین معاویہ بن یزید کے دستبردار ہونے کی بنا پر پیدا ہو گیا تھا، سیدنا ابن الزبیرؓ کے ساتھ ہو گئے تھے، اور ایسے ہی بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ویسے حضرت ابن الزبیرؓ کے زمانہ کو فتنہ کا زمانہ کہا جاتا ہے، اور کتبِ حدیث میں ان کے دور کا تذکرہ عموماً "فتنہ ابن الزبیرؓ" کے نام سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ناممکن تھا کہ سیدنا ابن الزبیرؓ کے بعد ان کے خاندان میں خلافت قائم رہتی یا اس کا امکان پیدا ہو جاتا کہ خلافت غیر خاندانی ہو۔ خود حضرت ابن الزبیرؓ کے گھر کے لوگ عرب کی قدیم عصبیت کے تحت بنوامیہ کی طرف مائل تھے، حتّٰی کہ ان کے فرزند اور بھائی بھی امیرالمؤمنین عبدالملک سے جا ملے۔

حضرت ابن عباسؓ کا موقف صحیح بخاری میں مذکور ہے (ج ۲، کتاب التفسیر، باب قولہ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار)

حدثنا الحجاج قال ابن جُریج قال ابن ابی مُلَیکۃ وکان بینہما شیٔ فغدوت علی ابن عباس فقلت اترید ان تقاتل ابن الزبیر فتحل حرم اللہ؟ فقال معاذ اللہ! ان اللہ کتب ابن الزبیر وبنی امیہ محلّین وانی واللہ لا اُحلہ ابداً۔ قال قال الناس بایع لابن الزبیر فقلت واین بہذا الامر عنہ؟ اما ابوہ فحواری النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ہم سے حجاج نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ان سے ابن جُریج نے ابن ابی مُلَیکہ کی بات بیان کی اور ان دونوں کے مابین کچھ اختلاف تھا (یعنی حضرت ابن الزبیرؓ کا ساتھ دینے یا نہ دینے کے بارے میں)۔ ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں گیا اور کہا کیا آپ ابن الزبیرؓ سے جنگ کر کے حرم کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا "معاذ اللہ! کعبہ کی بے حرمتی تو اللہ تعالیٰ نے

یرید الزبیر واما جدّہ فصاحب الغار یرید ابابکر واما امہ فذات النطاقین یرید اسماء واما خالتہ فام المؤمنین یرید عائشۃ واما عمتہ فزوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید خدیجۃ واما عمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجدتہ یرید صفیۃ۔

ثم عفیفٌ فی الاسلام قاریٌ للقرآن واللہ ان وصلونی وصلونی من قریب وان ربّونی ربّنی اکفاءٌ کرامٌ۔ فآثر التُوَیتات والاسامات والحمیدات یرید ابطنا من بنی اسد بنی تویت وبنی اسامہ وبنی اسد۔

ان ابن ابی العاص برز یمشی القدمیۃ یعنی عبدالملک بن مروان وانہ لوّی ذنبہ یعنی ابن الزبیر۔

ابن الزبیر اور بنو امیہ کی قسمت میں لکھی ہے بخدا میں اس کی بے حرمتی کبھی نہیں کروں گا۔"

پھر فرمایا "لوگوں نے کہا تھا ابن الزبیر سے بیعت کرلو" میں نے کہا ان سے زیادہ اس امر کا حقدار اور کون ہوگا:

ان کے باپ دیکھو تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری ہیں، یعنی سیدنا زبیر رضؓ۔ ان کے نانا دیکھو تو وہ "صاحب غار" ہیں، یعنی حضرت ابوبکر رضؓ۔ اُن کی والدہ کو دیکھو تو وہ "ذات النطاقین" ہیں، یعنی سیدہ اسماء رضؓ ان کی خالہ کو دیکھو تو وہ ام المؤمنین ہیں، یعنی سیدہ عائشہ رضؓ ان کی پھوپھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہیں، یعنی سیدۃ خدیجہ رضؓ۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ان کی دادی ہیں، یعنی سیدۃ صفیہ رضؓ۔

پھر اسلام میں وہ پرہیزگار ہیں، قرآن کے بڑے عالم ہیں۔ بخدا اگر (بنو امیہ) میرے ساتھ صلہ رحمی کریں تو یہ صلہ رحمی قریبی رشتہ داروں کی طرف سے ہوگی۔ اور اگر وہ میری پرورش کریں تو یہ پرورش ذی احترام، ہمچشموں کی طرف سے ہوگی۔ پھر میں تُوَیتات، اُسامات، اور حُمَیدات کو ترجیح دوں: آپ کی مراد بنو تُوَیت، بنو اُسامہ اور بنو اسد سے تھی۔

اور یہ جو ابوالعاص کے فرزند ہیں (یعنی سیدنا عبدالملک بن مروان) تو مردانہ وار بڑھ رہے ہیں، اور یہ صاحب جو ہیں (یعنی حضرت ابن الزبیر) تو انھوں نے اپنی دُم سکیڑ رکھی ہے"

اس حدیث سے سب صورتِ حال سامنے آگئی۔ شخصی حیثیت سے حضرت ابن الزبیر رضؓ خلافت کے اہل تھے، لیکن خاندان کی مقبولیت کے اعتبار سے وہ بنو امیہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ پھر حضرت ابن عباس رضؓ کے نزدیک ان میں وہ قائدانہ صلاحیتیں نہیں تھیں جن کے ذریعہ وہ پیش آمدہ مشکلات پر قابو پالیتے۔ یہ صفات اموی سادات میں تھیں، اور یہ مقام امیر المؤمنین

عبد الملکؒ کا تھا کہ قلوب اُن کی طرف جھکیں، اور کامیابی کے ساتھ وہ امامت کے فرائض ادا کر سکیں۔ سیدنا ابن عباسؓ نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ آپ کی وفات کے بعد سب کے سب فوراً اپنے بنو العم کے پاس شام چلے جائیں۔ چنانچہ سیدنا علی بن عبد اللہؒ نے اس وصیت پر عمل کیا، اور قصبۂ حمیمہ چلے گئے۔ سادات امویہ کے دشمنوں نے اس نقلِ مکانی کی یہ تعبیر کی ہے کہ عباسی سادات کو اموی خلفاء نے یہاں نظر بند کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بے اصل بات ہے۔ ان حضرات کا حمیمہ میں قیام سیدنا ابن عباسؓ کی وصیت کے مطابق تھا۔

اموی حکمتِ عملی کے نتائج

اموی حکمتِ عملی سے سیاسیاتِ اسلامیہ پر جہاں یہ اثر پڑا کہ عربی ثقافت سے عجمی ممالک متأثر ہوئے، اور یوں مختلف قوموں میں مستحکم ربط کی صورت پیدا ہو گئی، وہاں سب سے بڑا سیاسی فائدہ یہ ہوا کہ تمام عالمِ اسلام ایک مرکز کے تحت آ گیا، اور اندرونی اختلال کی صورتیں کم ہو گئیں۔ اس سے بھی بڑا فائدہ جس کے سامنے سب فوائد ہیچ ہیں، وہ یہ ہوا کہ دین اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فگن رہا، اور نفس دین میں کسی قسم کی ماندگی نہیں آئی۔ اموی دَور میں عالمِ اسلام فرقہ بازی سے پاک تھا۔ اور کسی بدعت و زندقہ اور الحاد کے فروغ کے امکانات نہ تھے۔

امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے امامتِ امّت کا بنو عبد مناف میں محصور ہو جانا، اور ان میں سے بھی بنو امیہ میں، یہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نہایت اصیل کارنامہ تھا، اور اس کا اعتراف نہ کرنا دعوتِ محمدیہ کے ساتھ غدر کے مرادف ہے۔ ہمارے سامنے پوری تاریخ موجود ہے، اور ہاشمی خاندانوں کی حکومتوں کا دَور بھی۔

عباسیوں کے دَور میں سبائی تحریک نے پھر قوّت پکڑی، محض اس لئے کہ ان کی خلافت بپا کرنے میں عجم کا ہاتھ تھا۔ عجیب و غریب قسم کے فرقے نمودار ہوئے، جن کی سمیّت سے امت کو محفوظ رکھنے میں عباسی خلفاء کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ بعض دفعہ انھیں بڑے سخت اقدامات کرنے پڑے۔ مثلاً ملاحظہ ہو یاقوت حموی: معجم الادباء (ج ۱: ص ۲۳۸) جہاں امیر المؤمنین الراضی باللہؒ کا وہ فرمان مذکور ہے جو آپ نے محمد بن علی الشلغمانی کو سولی دینے کے بعد جاری کیا۔ یہ شخص ابن ابی العذاقر کے نام سے مشہور تھا۔ اس فرمان میں آپ نے اس کے عقائد و اعمال پر مکمل تبصرہ فرمایا ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے:

ویتحل التقۃ فی دین آل محمدؐ وہو یضمر التبرا منہا ویشنوہ۔	وہ دعویٰ تو کرتا تھا عقیدتاً آلِ محمدؐ کے دین سے وابستہ ہونے کا، لیکن دراصل اپنے دل میں اس سے تبرا کرتا تھا اور اسے اس سے عداوت تھی۔

عباسیوں پر ڈیڑھ سو برس کے قریب ایسے گذرے کہ امت پوری طرح خطرہ میں گھر گئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آلِ بویہ اور مصر کے عُبَیدی دونوں مل کر دینِ مبین کو ختم کر دیں گے۔ امیرالمؤمنین القادر باللہؒ کے عہد میں قرآن مجید کا جو حشر انھوں نے کرنا چاہا تھا اس کا حال اوپر گذر چکا۔ شریعت مطہرہ کے معمولی مسائل میں جو حال ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سلطان طغرل بیگؒ کی قبر نور سے بھرے کہ انھوں نے عین بحران کے وقت مسیحائی کی، ۴۵۰ھ کے حدود میں انھوں نے آلِ بویہ کو ختم کر دیا، اور یوں امت میں پھر جان آگئی، ورنہ آج پولوس کی طرح دینِ محمدؐ بھی ایک ایسا چولہ اختیار کر چکا تھا جس کا تعلق سرورِ عالم وعالمیان صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نہ ہوتا۔ عیاذاً باللہ۔

اسلام کی طرف انتساب کرنے والوں میں جتنی ٹولیاں بنیں، جس جس قسم کے مدعی اٹھے ان کی تفصیل حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقالات الاسلامیین میں بیان کی ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو عباسی خلافت میں فروغ ہوا۔ حالانکہ خود یہ خلفاء متبعِ سنت صحیح العقیدہ تھے اور اخلاقِ فاضلہ سے متصف۔ اُن کے علمی اور رُوحانی فیوض سے یہ امّت مستفیض ہے۔ ان کے شخصی احوال اتنے رفیع القدر ہیں کہ دشمنانِ دین وملت کے افترا، وتلبیس کے باوجود ان کی عظمت اور جلالتِ قدر کو ماند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہاشمی خلافت میں چونکہ زنادقہ کو سر اٹھانے کے مواقع ملتے رہے، اور آلِ بویہ وغیرہم کو سیاسی بالادستی حاصل ہوگئی، اس لئے ہسپانیہ کی اموی حکومت میں خلافتِ اسلامیہ کو شیعہ امامت کہا جاتا تھا۔

گویا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، اس کے وعدہ کی حقانیت تھی، صحابۂ کرام کی برکت تھی، اور حضرت امیرالمؤمنین معاویہؓ کا خلوص تھا کہ انھوں نے خلافت کو عربی رکھ کر اور امویوں کے ہاتھ میں قیادت دے کر دین کو ایسا مستحکم اور مدوّن کر دیا کہ ملتِ اسلامیہ کو کتاب وسنت کی حفاظت کرنے میں کامیابی ہوئی۔

اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی دور بینی سے خلافت کے نظام کو اموی سادات سے

مختص نہ کر جاتے، اور جمہور صحابۂ کرام اور بنو ہاشم اس بارے میں ان کے ہمنوا نہ ہوتے تو وہ سب فرقے جو خود اس وقت پیدا ہو چکے تھے، اور جنھوں نے بعد میں قسم قسم کی صورتیں اختیار کیں، وہ سب اسلام کو کھا جاتے، اور ہم حتمی طور پر یہ جان ہی نہ سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی سنت کیا ہے۔ جتنے لوگ جماعت سے الگ ہوئے وہ آپس میں ایک دوسرے کی کیسی ہی ضد ہوں لیکن صحابۂ کرام کی عداوت پر سب متفق ہیں، اور سب کی دلی تمنا یہ رہی کہ کسی طرح کتاب اور سنت کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔

اموی حکمت عملی کی یہ افادیت محض مشرق ہی میں نہیں رہی، بلکہ وہ جہاں کہیں بھی گئے وہاں انھوں نے اپنا محافظِ دین ہونے کا امتیاز برابر قائم رکھا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی امارت اور پھر خلافت میں انھوں نے کسی قسم کی فرقہ بازی کو اُبھرنے نہیں دیا۔ سیاسی چپقلشیں ہوئیں، لیکن عقائدِ اسلامیہ سے کوئی کھیل نہ سکا۔ موطأ شریف ہی کو وہاں بھی دستور اسلامی ہونے کی حیثیت حاصل رہی۔ وہی موطأ جس میں اگر ایک طرف سیدنا معاویہؓ، سیدنا مروانؒ اور سیدنا عبدالملکؒ جیسے اموی خلفاء کے فتاویٰ اور فرامین ہیں، وہاں سیدنا علیؓ، سیدنا ابن عباسؓ جیسے ہاشمی ائمہ اور سیدنا ابن عمرؓ جیسے غیر جانبدار بزرگوں کے مواقف کو بھی بطور حجت پیش کیا گیا ہے، اور سیدنا ابن الزبیرؓ کو بھی اس کتاب میں وہی مقام حاصل ہے۔ جو لوگ جماعت سے وابستہ ہیں وہ نہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق کرتے ہیں، اور نہ خلفائے اسلام کی عظمت و جلالتِ قدر پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر خلافت کو خالص عربی نہ رکھا جاتا، اگر امامت کو بنو عبد مناف میں محصور نہ کیا جاتا، اگر سادات امویہ کے ہاتھ میں قیادت نہ آتی، اگر غیر عرب اقوام کے ذی اثر لوگوں کو کلیدی مناصب دیئے جاتے، اگر حکمت عملی کے بارے میں ان کی آواز کو وزن دیا جاتا، تو لازماً دعوتِ محمدیہ کی صورتِ نوعیہ بدل جاتی۔ کیونکہ یہ جتنی بدعتیں پیدا ہوئیں، غیر اسلامی نظریات، اور خلافِ دین رسوم نے اسلامی معاشرہ کو گھن لگایا ہے۔ یہ سب کچھ ان عجمی اقوام کے استیلاء کا نتیجہ ہے، جو مسلمانوں کی بے جا فراخ دلی یا سیاسی کمزوری کی وجہ سے انھیں حاصل ہو گیا۔ یہ جتنے ملحدانہ اور مشرکانہ تصورات مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے کسی کی اصل عربی نہیں۔

نومسلموں کا حق اس وقت ثابت ہوتا جب تحریک ان کے دلوں میں رچ جاتی، ان کی دو تین نسلیں اسلامی ماحول میں پرورش پالیتیں، یعنی جب اسلام ان کی طبیعت بن جاتا۔

اس کے بعد بھی افراد کو پرکھا جاتا، تب وہ حکومت کے ارکان بننے کی صلاحیت رکھتے۔ لیکن انھوں نے اسلام میں داخل ہوتے ہی پر پرزے نکال لئے، اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی طرح اس تحریک کو اپنا تابع بنالیں۔

ہمارے سامنے افراد کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے خود یا ان کی طرف انتساب کرنے والوں نے یہودی اور نصرانی بلکہ مجوسی تصورات تک دین مبین میں داخل کرنے کے لئے روایات کا ایک سوختنی پلندہ ہمارے سامنے ڈال دیا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ تفسیر کی کتابوں میں اسرائیلیات کی وہ بھرمار ہے کہ تنقیح مشکل ہوگئی۔

یہ محض اموی حکمت عملی کا ثمرہ ہے کہ دعوتِ محمدیہ اپنی اصلی شکل میں قائم رہ سکی۔ اور اس طرح مدوّن ہوگئی کہ آج ہم اطمینان سے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ فلاں تصوّر بدعت والحاد ہے، اور فلاں بات روحِ اسلامی کے منافی نہیں ہے، اور اسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اگر کتاب محفوظ نہ ہوتی جسے "غت ربود" کرنے کی انتہائی کوششیں کی گئیں، اگر تواتر کے ساتھ سنّت جاری نہ رہتی، جسے مسخ کرنے کی کسی تدبیر سے دریغ نہیں کیا گیا، اگر اصحابِ اجتہاد کو امت کی دینی تربیت کی خدمت سپرد کر کے منہاجِ نبوی کو زندہ نہ رکھا جاتا، تو امّت کے جتنے ثقافتی کارنامے خلافتِ عباسیہ کے دوران ہمارے سامنے آئے وہ ہرگز نہ آسکتے۔ کیونکہ صحابہ کرام کا منہاج ہی فنا کر دیا گیا ہوتا، اور غیر اسلامی تصورات وعقائد اس دین کو اسی طرح مسخ کر چکے ہوتے جس طرح نصرانیت کے نام سے ایک دین دنیا میں ہے، لیکن سلسلۂ نبوّت سے اس کا تعلق صرف نام کا ہے۔

اموی اور ہاشمی تصور

اموی اور ہاشمی حکمت عملی میں اصلاً کوئی فرق نہیں، لیکن عملاً ہے۔ ہاشمی تصور یہ ہے کہ آدمی نے جب اسلام کا اظہار کر دیا تو وہ مسلمان ہوگیا، اور اس کے سب حقوق وہی ہوگئے جو قدیم مسلمانوں کے ہیں، لہٰذا وہ حکومت میں بھی حصّہ لینے کا حقدار بن گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دَور میں اس طریقہ پر بے محابا عمل کیا، اور نقصان پر نقصان اٹھایا۔ افشین مسلمان ہوا، اور امیر المؤمنین المعتصم باللہؒ نے اسے سپہ سالار عساکرِ اسلامیہ بنا دیا۔ پھر اس کا ایک خط پکڑا گیا جس سے معلوم ہوا کہ دراصل وہ آتش پرستی کے قدیم دین پر قائم ہے، اور یوں اس پر مرتد کی حد جاری کی گئی۔ اسی طرح امیر المؤمنین ہارون الرشیدؒ کے زمانہ میں برامکہ نے عروج پکڑا، اور

پھر ضرورت ہوئی کہ ان پر زوال لایا جائے۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے، لیکن جعفر برمکی کے عزائم کچھ دوسرے تھے، وہ خلافتِ اسلامیہ کو عجمی بنا ڈالنے کے منصوبے بنا رہا تھا، اور اس کے لئے اس نے چند عملی اقدامات بھی کئے تھے، جن کی تفصیل کا اس جگہ موقع نہیں۔ اس سے پہلے ابو مسلم خراسانی پر اعتماد کیا گیا، اور اس نے لَاۡ لِحُبِّ عَلِیٍّ بَلْ لِبُغْضِ مُعَاوِيَةَ عرب دشمنی کے جذبات پر دل کھول کر عمل کیا، اور اسی نے سبائیہ کے ایک ایسے فرقہ کی بنا ڈالی جسے راوندیہ کہتے ہیں، اور جن کے عقائد و اعمال کا اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ سراسر دین کی دشمنی پر اس فرقہ کا مدار تھا، جس کے لئے انھوں نے چولہ یہ اختیار کیا تھا کہ ساداتِ عباسیہ کی جناب میں وہی غُلو برتا جائے جو سبائیہ کی دوسری شاخوں کے ہاں فاطمی اور علوی سادات کے ساتھ تھا۔ لیکن امام المسلمین کو بھلا اس کی کب برداشت ہوتی، چنانچہ امیر المؤمنین عبداللہ المنصورؒ نے اس فرقہ کا استیصال کیا، اور ابو مسلم خراسانی کو اس کے زندقہ و الحاد کی بنا پر ختم کر دیا۔

دین کے علمبرداروں اور ہوا پرستوں میں یہی فرق ہے۔ راوندیہ فرقہ کے لوگ خلفائے عباسیہ میں الٰہی صفات کے قائل تھے، ایسے ہی جیسے سبائیہ کے دوسرے فرقوں نے سیدنا علیؓ اور آپ کی بعض اولاد کے بارے میں مشرکانہ تصوّرات پیدا کئے۔ لیکن امام عباسی نے اس قسم کے عقائد رکھنے والوں کو... واجب القتل سمجھا۔ برخلاف اس کے جو فاطمی لوگ سبائی خیالات سے متأثر ہیں انھیں اس پر فخر ہے کہ ان کے آباء و اجداد کو لوگوں نے معبود بنایا۔

عباسی خلفاء کو اپنی حفاظتی تدابیر میں کبھی تو پوری کامیابی ہوئی اور کبھی نہ ہوسکی۔ راوندیہ اور برامکہ کے بارے میں تو کامیابی ہوگئی، لیکن آلِ بُوَیہ اور عبیدیوں کے بارے میں فوراً نہ ہوسکی۔ اگر خلافتِ عباسیہ میں غیر عرب اقوام کو تدریجاً اور احتیاط کے ساتھ حکومت میں حصہ دیا جاتا، تو اسلام اور مسلمانوں پر وہ مصائب نہ ٹوٹتے جو ٹوٹے۔

اموِیوں کو ہاشمیوں کی حکمتِ عملی سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ وہ بعض معاملات میں غیر مسلموں سے بھی کام لے لیتے تھے، لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ

جو ایک دعوت کے حاملوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

ان تمام امور پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد آدمی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا معاویہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے اپنی وفات سے پہلے دین اسلام کو اغیار کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ اور بعد کے خلفاء بھی اگر انہی کے طریقہ پر چلتے یا تدریجاً اس میں تبدیلی کرتے تو اہلِ اسلام ایک جماعت ہوتے اور دینِ اسلام اس طرح متضاد عقائد و تصورات کا مجموعہ نہ بن جاتا کہ آج ہم کلمہ کی "محرمت" کے بہانہ ہر قسم کے زندقہ و الحاد کے لئے گنجائش نکال کر داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غدر اور اپنی حالت تباہ کرنے کا سامان خود ہی پیدا کرتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام کے ہاتھوں میں امامتِ اہل عالم ہونے کی بجائے زمین پر بالادستی کفار کی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا)۔

ولایتِ عہد

مسعودی جیسے مؤرخ جنھیں اللہ سے زیادہ اپنے آقاؤں کی رضا مطلوب تھی، ابو مخنف لوط بن یحییٰ جیسے راوی جنھیں حق کے مقابلہ میں اپنے فرقہ وارانہ جذبات زیادہ عزیز تھے اور واقدی جیسے داستان گو، جنھیں افسانے تراشتے وقت یہ خیال نہیں رہتا تھا کہ ان کے بیانات کے اثرات کیا مرتب ہوں گے اور پھر سیوطی جیسے اصحابِ تصنیف جنھیں رطب ویابس سے کچھ بحث نہ تھی، محض حاطب اللیل تھے داندھیرے میں لکڑیاں جمع کرنے والے) یعنی اِدھر اُدھر کی روایتیں بغیر تنقید کے جمع کر دینے کے مرض میں مبتلا، یہ سب کے سب لوگ اس کے ذمہ دار ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ سخت ترین ذہنی اور روحانی عذاب میں گرفتار ہے۔ ان لوگوں نے قرونِ اولیٰ کی تاریخ پر قلم اٹھانا نہایت نازک کام بنا دیا ہے۔ وجہ محض یہ ہے کہ ہم نے صحابۂ کرام کا منہاج چھوڑ دیا اور اس کا خیال نہیں کیا کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے سیاسی احوال کو کس نگاہ سے دیکھا اور فتنوں کے زمانوں میں اپنا کیا موقف رکھا۔

ہماری آنکھوں پر شخص پرستی نے پٹی باندھ دی ہے، بزرگوں کی ہستیاں خیالی اور فرضی افسانوں میں گم ہیں، تعصب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ بعض کو عرش آشیاں بنا دیا گیا اور بعض کو اپنے خیال میں تحت الثریٰ تک ڈال دینے پر بھی بس نہیں کی۔ تاریخ کو امت اور جماعت کے زاویہ سے نہیں دیکھا، محض افراد پر نگاہ رکھی۔ اور انہی کی محبت یا عداوت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

لیکن جن کے پیش نظر ملّت کی بہبود ہے، جو جماعت کا شیرازہ مضبوط رکھنا چاہتے ہیں، ان کی راہ اعتدال کی ہے، وہ تمام بزرگوں کی عزّت وحرمت کو محفوظ رکھنا اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ روایات کی بجائے واقعات سے بحث کرتے ہیں، اور اگر کسی کے قول وفعل پر انھیں تنقید کی ضرورت ہوتی ہے تو ادب ومحبت کے ساتھ اس دشوار گذار وادی سے صحیح سلامت نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہلِ فکر کو اگر آخرت مطلوب ہو اور امت کی فلاح مقصود، تو انھیں بہرحال تاریخ اسلام کی تنقیح کر کے واقعات کی صحیح روئداد مرتب کرنی ہوگی۔ یہ روئداد وہ ہونی چاہئے جو عقلاً ونقلاً درست ہو۔

امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر ان تمام لوگوں نے جو اصحاب تصنیف ہیں، اپنے خود ساختہ

تصوّر کے تحت یا مجموعۂ خرافات سے متأثر ہو کر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے اپنے فرزند امیر یزید کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنا کر شخصی حکومت کی راہ کھول دی، جمہوریت کو فنا کر دیا اور شوریٰ کی اہمیت ختم کر کے کاروانِ ملت کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ یعنی جو آخری امّت ہے وہ ڈیڑھ ہزار برس سے گمراہ ہے۔ اور اُس کی گاڑی پٹڑی سے اتر چکی ہے "یعنی ابھی اچھی طرح بنی بھی نہ تھی کہ بگڑ گئی۔ اور وہ لوگ جو اصحابِ رسول اللہ کہلاتے ہیں، جنھیں "خیرامۃ" کہا گیا ہے، اور زمین پر اپنا گواہ بنایا گیا ہے، وہ سب راہِ حق چھوڑ بیٹھے اور "گاڑی کو پٹڑی سے اتر جانے دیا" انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صحابۂ کرام کے مخالف اور دشمن تو جو چاہتے کہتے، لیکن جو لوگ ان کی عظمت وجلالت اور صدق وامانت کے معترف ہیں وہ بھی اس اعتراض میں کسی سے کم نہیں۔ اس سلسلہ میں نرم ترین بات یہ کہی گئی ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے افضل طریقہ ترک کر دیا۔ انھیں چاہیئے تھا کہ اس انتخاب کو شوریٰ کے تحت کر دیتے۔ چنانچہ امام ابو بکر بن العربیؒ فرماتے ہیں (العواصم من القواصم: ص ۲۲۲)

لسنا ننکر ولا بلغت بنا الجہالۃ ولا لنا فی الحق حمیۃ جاہلیۃ ولا ننطوی علیٰ غلٍ لاحدٍ من اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بل نقول "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ"۔ الا انا نقول ان معاویۃ ترک الافضل فی ان یجعلہا شوریٰ والّا یخص بہا احداً من قرابتہ فکیف ولداً۔

ہمیں انکار نہیں اور نہ ہم جہالت میں سرشار ہیں اور نہ حق کے بارے میں جاہلی جانبداری برتتے ہیں، اور نہ ہم اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کی طرف سے کدورت رکھتے ہیں، بلکہ ہماری دعا ہے "خدایا ہماری بھی خطاپوشی فرما، اور ہمارے ان بزرگوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گذر گئے، اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا تو ہی تو ہی بڑا میں رافت ورحمت پیدا کرنے والا"..... مگر ہم (اتنا ضرور) کہتے ہیں کہ (سیدنا) معاویہؓ نے افضل بات چھوڑ دی۔ انھیں چاہیئے تھا کہ امرِ خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار کو بھی اس کے لئے خاص نہ کرتے چہ جائیکہ فرزند کو"۔

حضرت قاضی ابو بکرؒ جیسے عارف بھی جب اس طرح بات کرنے لگیں، تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسئلہ کو کس حد تک مسخ کر دیا گیا ہے۔ آدمی حق معلوم کرنا چاہتا ہے اور پریشان خیالی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بالآخر تھک کر کہہ دیتا ہے کہ انھوں نے شوریٰ کا انعقاد نہ کر کے افضل طریقہ چھوڑ دیا۔ یہ سب تصوّر اس فضا نے پیدا کیا ہے کہ گویا اس وقت سیدنا معاویہؓ کے علاوہ

اور کوئی نہ تھا، جو اپنی رائے رکھتا ہو اور اتنی حیثیت وقوت کہ فیصلہ اگر حق نہ ہو تو اسے رَد کر سکے، لہذا وہ اپنی من مانی کر گئے۔ اور یوں بقول ایک "مجددِ عصر" کے "گاڑی پٹڑی سے اتر گئی"۔

لہذا مناسب ہے کہ اوّل واقعات کی روشنی میں امام ابن العربیؒ کے بیان کی تنقیح کر لی جائے۔ کسی عمل کے افضل یا غیر افضل ہونے کا معیار مسلمانوں کے ہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ اس کے بعد ہے صحابہ کرام کا اجماع اور پھر ہے قیاس۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو امّت کا عمل متواتر ہے جو عہدِ نبوی سے بغیر انقطاع چلا آ رہا ہو۔ مسلم زاویۂ نگاہ سے گفت گو کی اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ کتاب اللہ سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ صحابہ کی بابت زیرِ عنوان "خلافتِ نبوّت" غالباً سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور شوریٰ کا جو مفہوم ہے اس پر بھی بحث ہو چکی۔ یہاں ہم نفس واقعہ سے بحث کرتے ہیں۔

شوریٰ

جہاں تک واقعات شہادت دیتے ہیں، اور صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ امیر یزیدؒ کی ولایتِ عہد کے متعلق جس طرح امت کے نمائندوں سے مشورہ لیا گیا، ایسا مشورہ ان سے پہلے کسی کے لئے نہیں ہوا تھا۔ جس زبردست اکثریت کے ساتھ اس تحریک کی پذیرائی کی گئی، اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔

تمام اہلِ تاریخ متفق ہیں کہ یہ تحریک خود حضرت امیر المومنین کی نہیں تھی، اور نہ انھوں نے کبھی ظاہراً و باطناً اس قسم کا کوئی خیال ظاہر کیا تھا۔ سب کا اتفاق ہے کہ مسئلہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا تھا۔ اس سلسلہ میں اسلام کی اس جلیل القدر شخصیت اور صحابیِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر جو فقرے کسے گئے ہیں اور سیوطی جیسے علماء نے محدّث وفقیہ ہونے کے باوجود ان پر افتراء کیا ہے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ یہ لوگ جانیں اور اللہ جانے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ یہ تحریک سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ کی تھی۔ جو جمہور صحابہ کی طرح اموی حکمت عملی کے پیرو تھے، جس کی افادیت پر ہم گفت گو کر آئے ہیں۔

اس موضوع پر آج تک جس کسی معتبر شخص نے کچھ لکھا ہے اس کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ حضرت امیر المومنین نے اس تجویز کو بطورِ خود منظور فرما لیا۔ آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ دیار وامصار کے نمائندے یہ تحریک اٹھائیں تو اس پر غور کیا جائے گا۔ لوگوں نے اس تمام کارروائی کو نمائشی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امت کو دھوکہ دینے کے لئے یہ سب کچھ ایک سیاسی چال

کے طور پر کیا گیا، یعنی سب کارروائی حکماً تھی۔ اس الزام کی صفائی کی ہمیں ضرورت نہیں، جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ ہمیں کسی ہم عصر کے دل کا بھی حال معلوم نہیں چہ جائیکہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے کسی شخص کے قلب میں جھانک سکیں، اور شخص بھی وہ جسے جرح و تعدیل سے بالا سمجھنا تمام اہلِ رجال کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ ہم تو صرف واقعات دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ایسی ہمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو صحابہ کرام سے زیادہ دین کا عالم اور وفادار باور کرانا چاہتے ہوں۔

متفق علیہ ہے کہ سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ نے کوفہ سے اور امیر زیاد نے بصرہ سے وفد بھیجے تھے۔ ان وفدوں کے ارکان عربی النسل لوگوں پر مشتمل تھے۔ یعنی پہلے وفد انہی علاقوں سے آئے جنھیں امویوں کا مخالف اور ہاشمیوں کا ہوا خواہ بتایا جاتا ہے۔ چھوٹی بڑی ہر کتاب جو تاریخ کی کہی جاتی ہے، اس میں ان تقریروں کے اقتباسات ہیں جو اس اجتماع میں ہوئیں۔ موافق و مخالف سب قسم کی باتیں نقل کی گئی ہیں۔ لیکن کوئی بات کسی مخالف نے ایسی نہیں کہی جس سے امیر یزید بن امیر المؤمنین معاویہؓ کی اہلیت اور صلاحیت پر حرف آئے۔

مسعودی کا بیان ہے [مروج الذہب: ج ۳، ص ۳۶۔۳۷]

وفی سنۃ تسع وخمسین وفد علی معاویۃ وفد من الامصار من العراق وغیرہا فکان ممن وفد من اھل العراق الاحنف بن قیس فی آخرین من وجوہ النّاس۔	اور ۵۹ھ میں معاویہؓ کے پاس مختلف شہروں کے وفد آئے یعنی عراق وغیرہ سب جگہ کے۔ اہلِ عراق کے وفد میں احنفؓ بن قیسؓ اور دوسرے بڑے بڑے لوگ تھے۔

مسعودی نے اس اجتماع کا مسئلہ غلط دیا ہے، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ بہر حال اتنا پتہ چل گیا کہ امت کے بڑے بڑے نمائندے اس اجلاس میں موجود تھے۔ مسعودی کے نزدیک حضرت احنف بن قیسؓ کی تقریر یہ تھی:۔

انّ النّاس امسوا فی منکر زمانٍ قد سلف ومعروف زمانٍ یؤتنف۔ ویزید حبیبٌ قریبٌ۔ فان تولہ عہدک فعن غیر کبر مفنٍ اومرض مضنٍ۔ وقد حلبتَ الدھور وجرّبتَ الامور۔ فاعرف من تسند الیہ	لوگ برے دور میں سے گذر چکے اور اچھے زمانہ کی امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔ یزید محبوب ہیں اور قریبی ہیں۔ آپ جو انھیں ولی عہد بنارہے ہیں تو بغیر اس بڑھاپے کے جو قویٰ کو ضائع کر دیتا ہے اور بغیر اس بیماری کے جو جسم

عہدک۔ ومن تولیہ الامر بعدک۔ واعص رای من یامرک ولا یقدر لک ویشیر علیک ولا ینظر لک۔

کو گھلا دیتی ہے۔ آپ نے وقت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور معاملات کو خوب پرکھا ہے۔ لہٰذا دیکھ بھال کر اپنا عہد سپرد کیجئے اور ولیعہد مقرر فرمائیے۔ ان لوگوں کی رائے پر مت چلئے جو بات تو کرتے ہیں لیکن آپ کی حمایت کی قدرت نہیں رکھتے، اور مشورہ دیتے ہیں لیکن انھیں آپ کی خیر خواہی مطلوب نہیں۔"

دوسرے لوگوں نے مثلاً خضری نے لکھا ہے (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲: ص ۱۱۸) کہ جب لوگوں نے کافی بحث کر لی تو سیدنا معاویہؓ نے احنفؒ سے کہا "ما تقول یا ابا بحر! (اے ابو بحر آپ کیا کہتے ہیں)" تو انھوں نے عرض کیا:

نخافکم ان صدقنا ونخاف اللہ ان کذبنا و انت یا امیر المؤمنین اعلم بیزید فی لیلہ و نہارہ وسرہ وعلانیتہ ومدخلہ ومخرجہ فان کنت تعلمہ للہ وللامۃ رضا فلا تشاور فیہ وان کنت تعلم فیہ غیر ذلک فلا تزودہ الدنیا وانت صائر الی الآخرۃ وانما علینا ان نقول سمعنا واطعنا۔

ہم سچ کہیں تو آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولیں تو اللہ کا خوف ہے۔ امیر المؤمنین! آپ خود یزید کے احوال سے بہ نسبت ہمارے زیادہ واقف ہیں ان کے رات دن کے مشاغل ان کے پوشیدہ اور علانیہ اعمال، اور ان کا اٹھنا بیٹھنا سب آپ پر روشن ہے۔ اگر آپ انھیں خدا اور امت کی منشاء کے موافق سمجھتے ہیں تو پھر کسی سے مشورہ مت کیجئے اور اگر آپ اس کے خلاف جانتے ہوں تو پھر اُن کی دنیا کے لئے اپنی آخرت مت بگاڑیئے۔ رہے ہم تو ہمارا کام تو سننا اور اطاعت کرنا ہے۔

حضرت احنفؒ جیسے باوقار شخص کی طرف ان دونوں مختلف و متضاد تقریروں کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی۔ مسعودی نے جو کچھ کہا ہے اور اپنی دانست میں اس بلیغ تقریر کے ذریعہ دو کلیے بیان کئے ہیں وہ دونوں مہمل ہیں۔ شریعت کا یہ کوئی قانون نہیں کہ آدمی ولی عہد اس وقت بنائے جب وہ بیماری سے گھل جائے یا سخت بڑھاپا اس کو بیکار کر دے۔ اور یہ قول بھی درست نہیں کہ جو لوگ اس تحریک کی حمایت میں تھے وہ اسے کارگر بنانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، یا ان کی طرف سے بے وفائی کا خطرہ تھا۔ یہ صفت تو کچھ عراقیوں ہی کے ساتھ مختص رہی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی میں ولیعہد بنایا تھا۔ بے شک اس دن کو آپ اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ رہے تھے جیسا کہ فرمانِ خلافت میں

بھی مذکور ہے۔ لیکن لاکھوں آدمیوں کا تجربہ ہے اور علم طب میں اس کے ہزار ہا شواہد ہیں کہ بظاہر ایک آدمی پر سکرات تک کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے بلکہ بسا اوقات محض سکتہ ہی میں نہیں بلکہ واقعتاً مثل مردہ کے ہو جاتا ہے اور پھر اچانک اس کی حالت سنبھلنے لگتی ہے اور پھر برسوں زندہ رہتا ہے۔ اگر حضرت صدیق رضؓ کے ساتھ بھی یہی ہوتا تو کیا حضرت فاروق اعظمؓ کی حیثیت ولیعہدِ خلافت کی نہ رہتی؟

دوسرے اس آخری دن بھی ایک خلیفہ اور اس کا ولی عہد دونوں کیا موجود نہ تھے۔ خلیفہ کے حواس درست ہیں، وہ احکام نافذ کرتا ہے، فرمان لکھواتا ہے، وصیتیں کرتا ہے، اور ولایت عہد کی بیعت ہوتی ہے، کیا یہ بیعت ایسی حالت میں نہیں ہوئی کہ جانے والا خلیفہ اپنے حکم کے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا تھا؟

پھر سوچنا چاہئے کہ مسعودی اور سیوطی جیسے مؤرخین نے جو یہ بات تعریضاً کہی ہے کہ معاویہؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحت و ثبات عقل کے ساتھ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو ولی عہد بنایا، تو اس اعتراض کی کیا قیمت ہے؟۔ کیا ولی عہد کا تقرر ایسی حالت میں کرنا چاہئے کہ نہ صحت ہو اور نہ ثباتِ عقل؟ اور اگر ایسا کیا گیا تو کیا قانوناً ایسی وصیت قابلِ تسلیم ہو گی جس کے متعلق یہ بھی نہ کہا جا سکے کہ ہوش میں کی گئی یا غفلت میں۔

پھر کیا اس کا امکان نہ تھا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۶ھ ہی میں ہو جاتی، یا ولایت عہد کی بیعت لیتے ہی وہ ختم ہو جاتے؟۔ اور کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مردِ مؤمن کو یہ نصیحت نہیں کی ہے کہ اس کی وصیت اس کے تکیہ کے نیچے رہنی چاہئے۔ کیونکہ موت کا علم کسی کو نہیں، اور کتنے آدمی ہیں جو تندرست سوتے ہیں اور پھر سوتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت احنفؒ جیسے صاحبِ عزیمت شخص کا یہ کہنا بھی نہایت مستبعد ہے کہ "جھوٹ کہوں تو اللہ سے ڈر لگتا ہے اور سچ کہوں تو آپ سے"۔ نہ حضرت احنفؒ ایسے بزدل تھے کہ حق بات کہنے سے کسی انسان کا خوف کریں اور نہ امیر المؤمنین معاویہؓ ہی ایسے ظالم و مستبد تھے اور خدا سے غافل کہ حق بات نہ سُن سکیں ان کا تو حلم ضرب المثل ہے۔

پھر یہ بات کیا ہوئی کہ "آپ کے خیال میں یزید کی بیعت اللہ اور امت کی رضا کا موجب ہو تو لیجئے، مشورہ کی ضرورت نہیں"۔ اگر بالفرض امیر یزید خلافت کے اہل نہ تھے اور امیر المؤمنین نے اپنی عقبیٰ بگاڑ کر ان کی بیعت لی تو کیا حضرت احنفؒ کے نزدیک یہ بیعت منعقد ہو گئی۔ کیا شریعت کا یہ بھی کوئی کلیہ یا جزئیہ ہے کہ خلیفہ کسی امرِ باطل میں جان بوجھ کر بیعت لینا چاہے تو وہ بیعت

کرلی جائے؟

یہ ہے ان راویوں اور مؤرخوں کا حال کہ اس وقت امت کا جو عظیم ترین مسئلہ تھا اسے ان واہی روایات میں یوں گم کر دیا گیا۔ بہر حال اتنا معلوم ہو گیا کہ موافق و مخالف سب قسم کی تقریریں ہوئی تھیں، اور جو اجتماع تھا وہ نمائندہ تھا۔ پھر اسے شوریٰ نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ سب کا اتفاق ہے کہ اس اجتماع میں اکثریت نے موافقت میں فیصلہ دیا تھا۔ چنانچہ سیدنا ضحاک رض بن قیس جیسے مخلصوں کی بڑی پرجوش تقریریں نقل کی گئی ہیں۔ اب یہ فیصلہ واقعی ہو یا مصنوعی لیکن امیر المؤمنین نے اس اکثریت کے فیصلہ کو حجت نہیں سمجھا اور فرمایا کہ جب تک اہلِ مدینہ راضی نہیں ہوں گے اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔ امیر المؤمنین کی یہ محض احتیاط تھی، اور مقصود رفعِ شر تھا، کیونکہ اب اہلِ مدینہ اربابِ حل و عقد نہیں رہے تھے کہ ان کا یہ فیصلہ ناطق ہو۔ مدینہ بھی منجملہ دیگر امصار کے ہو گیا تھا۔ امیر المؤمنین عثمان رض کی شہادت تک اہلِ مدینہ کی یہ حیثیت تھی، لیکن خلافتِ مرتضوی میں جب دار الخلافہ کوفہ ہو گیا تو اربابِ حل و عقد وہاں کے باشندے ہو گئے جو امیر المؤمنین سیدنا علی رض کے ساتھ رہتے تھے۔ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ سیدنا علی رض نے کبھی امورِ مملکت میں اہلِ مدینہ کی رائے لی ہو، یا آخری وصیت میں یہ فرمایا ہو کہ نئے خلیفہ کا انتخاب اہل مدینہ کے فیصلہ سے کرنا۔ آپ نے عیاناً یہ حق صرف اہلِ کوفہ کا سمجھا کہ ہونے والے خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اسی بنا پر سیدنا حسن رض کی خلافت کو صحیح تسلیم کیا گیا۔ اور ان کی یہ حیثیت مانی گئی کہ زیرِ نگین علاقہ میں سیدنا علی رض کے بعد وہ امام ہیں۔

امیر المؤمنین معاویہ رض پر اجماع ہونے کے بعد اربابِ حل و عقد اہلِ دمشق ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ نے حضرت ابن الزبیر رض سے بیعت نہیں کی، کیونکہ اربابِ حل و عقد نے ان کا انتخاب نہیں کیا تھا بلکہ جو اہلِ حل و عقد تھے انھوں نے امیر المؤمنین معاویہ ثانی رح کی خلافت پر بیعت کی تھی اور پھر ان کے مستعفی ہونے کے بعد امیر المؤمنین مروان اول رح کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین یزید رح کی وفات کی خبر سن کر جب امیر حصین بن نُمیر نے مکہ کا محاصرہ اٹھایا ہے تو حضرت ابن الزبیر رض سے کہا تھا کہ دمشق چلیں اور ذمہ لیا تھا کہ وہاں ایک شخص بھی ان کا مخالف نہ ہو گا۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے نہ محض یہ کہ ان کا صائب مشورہ قبول نہیں کیا بلکہ نہایت حقارت سے اُسے ٹھکرا دیا اور تہدید آمیز کلمات کہہ کر امت کا متفق علیہ امام ہونے کا بہترین موقعہ کھو دیا۔ بنو ہاشم اور اکابر صحابہ آئینی حیثیت سے شام ہی کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ چنانچہ امیر المؤمنین عبد الملک رح

سے سب نے بیعت کرلی۔

سیوطیؒ نے محض جذبات سے کام لے کر لکھا ہے (تاریخ الخلفاء، ص ۸۲، طبع مصر):

والاصح ماقال الذہبی ان مروان لایُعدّ فی امراء المؤمنین بل ہو باغ خارج علی ابن الزبیر ولاعہدہ الی ابنہ بصحیح وانما صحت خلافۃ عبدالملک من حین قتل ابن الزبیر۔

"زیادہ صحیح وہ ہے جو ذہبیؒ نے کہا ہے کہ مروانؒ کا شمار امراء المؤمنین میں نہیں ہے بلکہ وہ باغی ہیں اور ابن الزبیرؓ پر خروج کرنے والے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو جو ولیعہد مقرر کیا تھا تو وہ بھی صحیح عمل نہ ہوا۔ عبدالملکؒ کی خلافت تو ابن الزبیرؓ کے قتل ہونے کے بعد صحیح ہوتی۔"

اس زمانہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنے میں کہ کس کی خلافت صحیح تھی اور کس کی نہیں، ذہبیؒ اور سیوطیؒ کا قول نہیں لیا جاسکتا۔ یہ فیصلہ کرنے کا حق ہمعصر حضرات کا تھا۔ تمام بنوہاشم اور حضرت ابن عمر وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور امیر المؤمنین عبدالملکؒ سے کی۔ البتہ حضرت ابن الزبیرؓ کو وہ بالفعل خلیفہ سمجھتے تھے۔ اور حضرت ابن الزبیرؓ نے بھی سنتِ مرتضوی کے مطابق ان حضرات سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور ان باتوں میں کچھ جان نہیں جو سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب اور ان کے اہلِ بیت کی قید و بند اور مختار کے ہاتھوں رہائی کی بابت لوگوں نے بیان کی ہیں۔

اگر بنوہاشم وغیرہم کے نزدیک امیر المؤمنین عبدالملکؒ خارجی اور باغی ہوتے، اور حضرت ابن الزبیرؓ جائز خلیفہ، تو پھر ان سے بیعت کا کیا سوال تھا اُن سے تو قتال واجب ہوجاتا، اور حضرت ابن عباسؓ ان کی آمد کے ایسے منتظر نہ ہوتے جیسے بخاری کی مذکورۂ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے، جو اوپر "دین کی حفاظت" کے عنوان کے تحت بیان کی جاچکی۔ اتنا اور عرض ہے کہ ذہبی اور سیوطی کا فتویٰ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ پر نہیں چل سکتا۔

بہرحال امیر المؤمنین معاویہؓ نے امیرِ مدینہ سیدنا مروان بن الحکمؒ کے نام فرمان بھیجا کہ "امیر یزید کی ولایتِ عہد کا مسئلہ اہلِ حرم کے سامنے پیش کریں"۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس تفصیل کے لئے ہمیں مسعودی اور طبری دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو [صحیح بخاری: ج ۲، کتاب التفسیر (الاحقاف) ص ۷۱۵، طبع اصح المطابع]

عن یوسف بن ماہک قال کان مروان

یوسف بن ماہک سے مروی ہے کہ حجاز کے والی

علی الحجاز استعملہ معاویۃ فخطب فجعل یذکر یزید بن معاویۃ لکی یبایع لہ بعد ابیہ فقال لہ عبدالرحمان بن ابی بکر شیئاً فقال خذوہ فدخل بیت عائشۃ فلم یقدروا۔ فقال مروان انّ ہٰذا الذی انزل اللہ فیہ "وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْہِ اُفٍّ لَّکُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْ" فقالت عائشۃ من وراء الحجاب ما انزل اللہ فینا شیئاً من القرآن الا انزل اللہ عذری"۔	مروانؓ تھے۔ انھیں معاویہؓ نے مقرر کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک تقریر کی اور یزید بن معاویہؒ کا ذکر چھیڑا کہ ان کے والد کے بعد اُن سے بیعت کی جائے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے ٹوکا، تو انھوں نے کہا "پکڑ لو انھیں"۔ لیکن وہ عائشہؓ کے گھر میں چلے گئے اور لوگ انھیں پکڑ نہ سکے۔ مروانؓ نے کہا "یہی ہیں وہ جن کے بارے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی ہے" وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا افسوس ہے تم پر تم مجھے

دھمکی کیا دیتے ہو"۔ (حضرت) عائشہؓ نے پردہ کے پیچھے سے فرمایا "ہمارے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت قرآن میں نہیں اتاری، سوائے اس کے کہ اللہ نے میری برأت نازل فرمائی ہے"۔

سیدنا عبدالرحمانؓ نے جو اعتراض کیا تھا، اس کا ذکر اس حدیث میں نہیں، اور نہ وہ باتیں ہیں جو بعد کی روایات میں بیان ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے قیصریت کا طعن دیا تھا، یعنی ایک قیصر کے بعد دوسرا قیصر بنایا جارہا ہے۔ سیدنا مروانؓ نے جو آیت کا حوالہ دیا تو وہ اس اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کہ سیدنا عبدالرحمانؓ غزوۂ بدر میں کافروں کی طرف سے شریک تھے، حالانکہ اُن کے والدین شروع ہی سے مسلمان چلے آرہے تھے۔ ممکن ہے ایسا واقعہ پیش آیا ہو۔ حضرت مروانؓ کا بہرحال مقصد یہ نہیں تھا کہ واقعی یہ آیت شریفہ سیدنا عبدالرحمانؓ کے حق میں نازل ہوئی، بلکہ مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، جو اپنی رائے کے مقابلہ میں بزرگوں پر طعن کر دیتے ہیں یا اپنی اہمیت ان سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ سیدنا عبدالرحمٰنؓ نے کوئی چبھتی ہوئی بات متفق علیہ امام کے متعلق کہی، اور ان بزرگوں کی موجودگی میں جو صحیح معنی میں اہل الرائے تھے۔ مثلاً سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زید اور دوسرے اجلّہ اکابر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت ام المؤمنینؓ نے جو فرمایا تو مراد یہ تھی کہ بُرائی کی حیثیت سے اس دودمان عالی شان کی بابت کوئی آیت نہیں اُتری۔ جو آیتیں نازل ہوئی ہیں وہ توصیفاً ہیں۔ ایک تو یہی جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی، اور دوسری "ثانی اثنین" کی آیت، کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو غار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت خاصہ حاصل تھی جو پھر ہمیشہ رہی۔

غرض یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمانؓ کے اس اعتراض، امیر مروانؒ کے اس قول اور حضرت ام المؤمنینؓ کے جواب میں ان لغو اور فضول باتوں میں سے کچھ نہیں جو نیچے کے راویوں نے بڑھائی ہیں اور سیوطی صاحب نے تفسیر ابن ابی حاتم سے نقل کرکے اپنی دانست میں ایک معمہ حل کیا ہے، کہ حضرت ام المؤمنینؓ نے حضرت مروانؒ پر چوٹ کی کہ "اس کے باپ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اور یہ اس وقت ان کی پشت میں تھا۔ اس لئے اس لعنت کا کچھ حصہ اسے بھی پہنچا ہے۔" خدا ان مفسروں اور راویوں سے سمجھے گا جنھیں صحابۂ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار پر کذب وافتراء کی اتنی جرأت ہے۔ کیا اُن کے نزدیک امام بخاریؒ کا بیان کافی نہیں تھا جو زبان وقلم کو ان مکروہ الفاظ سے آلودہ کیا گیا؟

ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے سیدنا عبدالرحمانؓ کی اس بات کے جس کی تفصیل امام بخاریؒ کو نہیں پہنچی، اور کوئی بات اس مجمع میں نہیں ہوئی۔ اور نہ سیدنا عبدالرحمانؓ کی بات کو بڑھایا گیا بلکہ قضیہ رفع دفع ہوگیا۔ اگر زمانہ جور واستبداد کا ہوتا تو اس اعتراض پر بہت کچھ لے دے ہوتی، لیکن وہ عہد تھا نورانیت کا، اور مجمع تھا عظیم ترین اکابر امت کا اور اس میں وہ بزرگوار بیٹھے تھے جنھوں نے جان ومال قربان کرکے دین قائم کیا تھا، اور جن کی آواز امت میں سنی جاتی تھی۔

لیکن امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ مدینہ کی اس ایک آواز کو بھی بہت سمجھا، اور بذاتِ خود افہام وتفہیم کے لئے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ آپ کے سامنے پھر اجلاس منعقد ہوا اور مسئلہ زیر بحث آیا۔ تمام شرکاءِ اجلاس نے حالاتِ حاضرہ اور خدشاتِ آئندہ کے پیشِ نظر حضرت امیر المؤمنینؓ کی تجویز منظور کی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں اس وقت اپنا خیال آیا اور خلافت کے لئے اپنی اہلیت وموزونیت کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ اگر اس وقت یا بعد میں کسی وقت کھڑے ہوجاتے، تو امت کی سیاست میں ایک انقلاب آجاتا۔ آپ کی شخصی عظمت اور امت میں مقبولیت ایسی نہ تھی کہ ہنگامہ بپا نہ ہوتا، اور سخت حالات رُونما نہ ہوجاتے۔ آپ کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکتا۔

آپ حضرت ام المؤمنین سیدہ حفصہ صلوات اللہ علیہا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس بارے میں استصواب کیا (صحیح بخاری: جزء ۱۶، ص ۵۸۹، طبع اصح المطابع)

عن ابن عمر قال دخلت علی حفصۃ ونوساتہا	حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں (ام المؤمنین)

تنظف قلت قد کان من امر الناس ما ترین فلم یُجعَل لی من الامر شیٔ" فقالت اِلحق فانھم ینتظرونک واخشیٰ ان یکون فی احتباسک عنھم فرقۃ" فلم تدعہ حتیٰ ذھب۔

حفصہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی زلفوں سے اس وقت پانی ٹپک رہا تھا (غالباً سر دھویا تھا)۔ میں نے عرض کیا آپ لوگوں کا حال دیکھ رہی ہیں کہ اس معاملہ میں میری کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی۔

فرمایا "جاؤ، لوگ تمھارے انتظار میں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمھارے بیٹھ رہنے سے کہیں اختلاف نہ پیدا ہو جائے" اور اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑا جب تک چلے نہ گئے"۔

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ امیر یزید کی ولایتِ عہد پر اجلاس کا اجماع ہو گیا تھا، اور کسی ایک طرف سے بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھی۔ کیونکہ مسئلہ کی نوعیت اور مصلحتِ ملّیہ کو سب نے سمجھ لیا تھا۔ سیدنا عبد الرحمانؓ بھی اب متفق تھے۔ سیدنا ابن عمرؓ نے یہ واقعہ بہت بعد میں بیان کیا ہے جب آپ کے فرزند سیدنا سالمؒ روایت کے قابل ہو گئے تھے۔ حضرت ام المومنینؓ کے بالوں کی کیفیت کا ذکر محض ان کی یاد میں ہے کہ اس کے ذکر کے وقت بھائی کی نگاہوں میں وہ منظر پھر گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مسئلہ فوری توجہ کا تھا، یعنی مسجد میں اجتماع کے لئے صحابہ کرام آچکے تھے، اور غالباً صرف آپ ہی کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت امّ المومنینؓ اس وقت زندہ تھیں۔

دار المصنفین اعظم گڈھ نے سیر الصحابہ میں اس حدیث کو بے وجہ اور بے دلیل اَذرُح کے اجماع پر منطبق کرنے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اَذرُح مدینہ سے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر تھا، اور وہاں جو اجتماع ہوا اس کے لئے حضرت ابن عمرؓ کو امیدواری کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ وہ اجتماع ہوا تھا سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کے نزاعی مسئلہ کا تصفیہ کرنے کے لئے۔ اس میں حضرت ابن عمرؓ موجود تھے۔ اگر وہاں پہنچنے کے لئے آپ حضرت ام المومنینؓ سے اجازت مانگتے تو حدیث کے الفاظ یہ نہ ہوتے، فَلَمْ یُجْعَلْ لِیْ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ (اس معاملہ میں میری کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی)۔ یہ بات اَذرُح کے اجتماع کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ اس کے لئے حضرت امّ المومنینؓ فرماتیں "اِلْحَقْ فَاِنَّھُمْ یَنْتَظِرُوْنَکَ الخ (جاؤ لوگ تمھارے انتظار میں ہیں، اور تمھارے بیٹھ رہنے سے اختلاف کا ڈر ہے)"۔

یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ معاملہ جلدی کا تھا اور قریب کا، نہ کہ سیکڑوں میل کے سفر کا، اور اس موقع کا جس کا تعلق حضرت ابن عمرؓ سے بلا واسطہ کچھ بھی نہ تھا اور جس میں وہ کسی حیثیت سے فریقِ معاملہ نہ تھے۔

حدیث بالا میں اجلاس اور اتمامِ بیعت کے بعد کی بات بھی حضرت ابن عمرؓ نے بتائی ہے۔

فرماتے ہیں :۔

فلما تفرق الناس خطب معاویۃ قال من کان یرید ان یتکلم فی ھٰذا الامر فلیطلع قرنہ فلنحن احق بہ منہ ومن ابیہ۔
قال حبیب بن مسلمۃؓ فھلّا اجبتہ قال عبداللہ فحللت حبوتی وھممتُ ان اقول احق بھذا الامر منک من قاتلک و اباک علی الاسلام فخشیت ان اقول کلمۃً تفرق بین الجمع وتُسفک الدم ویُحمل عنی غیر ذٰلک۔ فذکرتُ ما اعداللہ لی فی الجنان۔
قال حبیبؓ حُفظتَ وعُصمتَ۔

جب لوگ متفرق ہو گئے (اور صرف خاص مجمع رہ گیا)، تو حضرت معاویہؓ نے تقریر کی اور فرمایا "اب بھی کوئی صاحب اس معاملہ میں بولنا چاہتے ہوں تو ہم سے آنکھ ملائیں۔ ہم ان سے اور ان کے والد دونوں سے اس امر (خلافت) کے زیادہ حقدار ہیں۔
حبیب بن مُسلمہؓ نے (یعنی جن صحابی سے یہ واقعہ بیان ہو رہا ہے) فرمایا "تو پھر آپ نے کچھ جواب بھی دیا؟" حضرت عبداللہؓ نے فرمایا "میں نے اپنا حُبوَہ کھولا اور کہنا چاہا کہ "آپ سے زیادہ اس کا حق انھیں ہے جنھوں نے آپ اور آپ کے والد سے اسلام کے لئے جنگ کی تھی" لیکن مجھے خوف ہوا کہ کہیں ایسی بات مُنہ سے نہ نکل جائے جو اجماع کے بعد افتراق کا موجب ہو، خونریزی کی نوبت آئے، اور میرا عندیہ غلط سمجھ لیا جائے۔ لہٰذا میں نے ان نعمتوں کا خیال کیا جو اللہ نے میرے لئے جنت میں مہیا کی ہیں (اس لئے چُپ رہا) سیدنا حبیبؓ نے فرمایا آپ کو اللہ نے ایک غلط بات کہنے سے محفوظ رکھا اور غلط اقدام سے بچا لیا"۔

[حُبوَہ کہتے ہیں اس کپڑے کو جو بل دے کر عمامہ کی طرح کمر اور ٹانگوں کے گرد باندھ لیا جاتا ہے اور اس طرح آدمی ٹانگیں کھڑی کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ ہاتھوں کو ٹانگوں کے گرد حلقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی]

یہ سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہؓ کے ساتھیوں میں تھے۔ غزوات روم میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ صفین کے موقع پر سیدنا علیؓ سے گفتگو میں بھی آپ سیدنا معاویہؓ کی طرف سے آئے تھے۔ اجتماعِ مدینہ میں موجود نہ تھے۔ کیونکہ رومیوں سے جہاد کے سلسلہ میں آپ کا زیادہ وقت اسی علاقہ میں گزرتا تھا۔ حدیثِ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا حبیبؓ اس وقت زندہ تھے، جب حضرت ابن عمرؓ نے آپ سے گفتگو کی۔ یعنی ولایتِ عہد کا مسئلہ طے ہو جانے کے ایک عرصہ بعد۔

ظاہر ہے کہ شخصی حیثیت سے امیر یزید کا اکابر صحابہ کے مقابلہ میں کیا درجہ ہوتا۔ وہ تو ان کے خورد اور تابع تھے۔ لیکن یہ حضرات جن کے دلوں میں خلافت کی خواہش تھی اور بالکل بجا، خود ان سے بھی

توبڑے بڑے لوگ موجود تھے جن کے سامنے اُن کی حیثیت وہی تھی جواُن کے سامنے امیر یزید کی۔

اگر سیدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا سعید بن زید کی موجودگی میں حضرت ابن عمر یا حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر وغیرہما خلافت کے امیدوار ہو سکتے تھے تو خود ان کے سامنے امیر یزید کو یہ حق کیوں نہ تھا۔ فرزندانِ صحابہ میں اس وقت خلافت کی خواہش رکھنے کے حقدار یہ حضرات ہیں:۔

(۱) حضرت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند سیدنا عبدالرحمانؓ، (۲) امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ فاروق اعظم کے فرزند سیدنا عبداللہؓ، (۳) امیرالمؤمنین عثمانؓ ذوالنورین کے فرزند حضرت سعیدؓ، (۴) امیرالمؤمنین علیؓ مرتضیٰ کے فرزند سیدنا حسینؓ، (۵) حضرت سیدنا زبیرؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ، (۶) سیدنا عباسؓ کے فرزند سیدنا عبداللہؓ۔

لیکن ان میں سے سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی خواہش کا علم، تاریخی حیثیت سے کسی معتبر شخص نے بیان نہیں کیا۔ آپ نے ابتداءً ولایتِ عہد کے بارے میں کچھ اعتراض کیا تھا، لیکن امیرالمؤمنین معاویہؓ کے سامنے آپ نے یہ اعتراض نہیں کیا، بلکہ آپ مطمئن ہو گئے تھے، اور کسی طرح یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے ولایتِ عہد کی بیعت نہیں کی تھی۔ خلافت کا زمانہ آنے سے پہلے ۵۳ھ میں وفات پاگئے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کا موقف کیا ہوتا۔ بلکہ صحیح قیاس یہ ہے کہ آپ امیرالمؤمنین یزید سے یقیناً بیعت کر لیتے، اور کبھی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا کے حکم سے سرتابی نہ کرتے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا موقف ہمیں معلوم ہے۔ ابھی بیان ہوا کہ جو خیال آپ کے دل میں پیدا ہوا تھا وہ ام المؤمنین حضرت سیدہ حفصہ صلوات اللہ علیہا کی توجہ سے نکل گیا، اور پھر کبھی نہیں آیا۔ آپ نے دونوں بیعتیں کیں، اور پوری قوت وعزیمت سے مستقیم رہے، جیسے آگے بیان ہوگا۔

حضرت سعید بن عثمانؓ نے دونوں بیعتیں کیں، اور ہمیشہ امیرالمؤمنین معاویہؓ سے وابستہ رہے۔

سیدنا حسینؓ کی بابت زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ نے ولایت عہد کی بیعت کی تھی، اگرچہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ نہیں کی۔ طبری نے امیر یزید کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جو انھوں نے حادثۂ کربلا کے بارے میں اہلِ مدینہ کو بھیجے تھے، جس میں وہ کہتے ہیں:

ابلغ قریشًا علی شحط المزار بہا ؎ بینی وبین حسین اللہ والرحم

"اے قاصد! قریش کو میری طرف سے پیغام پہنچادے۔ کیونکہ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میرا جانا مشکل ہے کہ میرے اور حسینؓ کے معاملہ میں اللہ اور رشتہ داری کا واسطہ تھا۔"

وموقف بفناء البيت انشده ٭ عهد الالٰه وما ترعیٰ به الذمم

"اور حرم شریف کے صحن میں کیا ہوا خدا کے نام کا عہد تھا جو میں نے انھیں یاد دلایا اور وہ سب باتیں یاد دلائیں جن سے ذمہ داریوں کا احساس زندہ رہتا ہے"

اس قصیدہ کی زبان بالکل اس عہد کی ہے، اور کوئی وجہ نہیں جو اسے امیر یزید کا قصیدہ نہ سمجھا جائے
بہر حال آپ نے خلافت کی بیعت سے گریز کیا، اگرچہ مؤرخ کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین معاویہ رضؓ کی وفات کی خبر سن کر آپ نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی تھی۔ اور بیعت کے لئے فرمایا تھا کہ خفیہ نہیں کریں گے بلکہ علانیہ سب کے سامنے کریں گے۔ لیکن رات ہی کو مکہ روانہ ہو گئے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن ہم یہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کا ارادہ خروج کا نہیں تھا، اور آپ نے ہرگز کوفیوں سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ متفق علیہ ہے کہ ابتداء کوفیوں نے کی تھی، اور خط پر خط اور وفد پر وفد آپ کی خدمت میں بھیجے تھے، اور یہ یقین دلایا تھا کہ عراق سب کا سب امیر یزید کی بیعت توڑ کر آپ کی بیعت پر تیار ہے۔ ان لوگوں کے غدر کا حال آپ کو کوفہ کے قریب پہنچنے پر ہوا۔ اور وہاں جب آپ نے دیکھا کہ ان خط بھیجنے والوں نے اور ان وفد لانے والوں نے سب جھوٹ کہا تھا۔ عراق پوری طرح امیر یزید کی بیعت پر قائم ہے، اور ہر طرح وہاں ان ہی کی حکومت مضبوط ہے تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا، جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضؓ نے بھی ولایتِ عہد کی بیعت کی تھی۔ اگرچہ خلافت کی بیعت سے انکار کر دیا لیکن یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا کا فیضان تھا کہ آپ نے امیر یزید کی زندگی بھر اپنی طرف دعوت نہیں دی، اور خلافت کا دعویٰ صرف اس وقت کیا جب انھیں امیر یزید کی وفات کی اطلاع مل گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے دونوں بیعتیں کیں، اور برابر اس کی تبلیغ کرتے رہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی بیعت پر استقامت چاہئے۔ ویسے بھی آپ کے دل میں امیر یزید کی علمیت اور فضیلت کی قدر تھی، اور آپ نے ان کی کمان میں جہاد کیا تھا، ایسے ہی جیسے سیدنا عبداللہ بن الزبیر اور سیدنا حسین نے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

سوال یہاں شخصیتوں کا نہیں تھا، بلکہ امت کے مستقبل کا تھا۔ ضرورت ایک ایسے امام کی تھی جس کی پشت پر طاقت ہو، جسے وفادار اور باہمت اعوان و انصار میسر ہوں، جو اتنی قابلیت رکھتا ہو کہ پیش آمدہ حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکے۔ خود سیدنا معاویہ رضؓ کی جب بیعت ہوئی تھی تو کیا

ان سے زیادہ برگزیدہ اور کار آزمودہ حضرات موجود نہ تھے؟ لیکن ان کی بیعت پر سب نے اجماع کرلیا۔ کیونکہ اس وقت کے حالات میں ان کے علاوہ کوئی نہ تھا جو امت کی گوناگوں مشکلات پر قابو پاسکے۔ اور کیا سیدنا حسنؓ کی جب بیعت ہوئی تھی تو ان سے افضل واقدم حضرات موجود نہ تھے، جو اوّل تا آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے، اور جن کے مدبرانہ اور فاتحانہ کارنامے صفحۂ دہر پر ثبت ہیں، اور جن کی شخصی عظمت وجلالت بے عدیل ہے، مثلاً سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، اور خود اہلِ بیت میں سیدنا عبداللہؓ بن عباس رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے جو ظاہراً و باطناً سیدنا حسنؓ سے بدرجہا افضل ہیں، اعلم ہیں، اقدم ہیں اور جن کے فیوض سے یہ امت اب تک مستفیض ہے۔ برکاتِ نبوت میں جتنا فیض سیدنا ابن عباسؓ کا امت کو پہنچا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی اہلِ بیت میں سے کسی دوسرے بزرگوار کا نہیں پہنچا۔ حضرت ابن عباسؓ ان چند ہستیوں میں ہیں جن سے دین لیا جاتا ہے، اور جن کا اجتہاد حجت ہے۔

جن بزرگواروں نے اس وقت امیر المؤمنین معاویہؓ سے بیعت کی تھی وہی تو تھے جنھوں نے امیر یزید کی ولایتِ عہد کے مسئلہ میں ان کی حمایت کی۔ بیشک سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، یا حضرت ابن عمرؓ، یا حضرت ابن عباسؓ کو ولی عہد بنایا جاتا تو یہ ہر طرح اس کے اہل تھے، لیکن یہ خود جب امیر یزید کی حمایت کریں اور ان کی حکومت کو مضبوط کرنے کے درپے ہوں تو پھر کسی کو بولنے کا کیا موقع رہا؟

یہ جو لوگوں نے افضل و مفضول کی بحث نکالی ہے اُن کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ امیر المؤمنین حضرت علی صلوات اللہ علیہ سے زیادہ عالم و متقی اور عارف و فقیہ کون ہوگا، اور کتنے ہوں گے جو شجاعت، سخاوت، عزیمت، زہد اور خطابت میں آپ کا مقابلہ کرسکیں۔ لیکن یہ سب ذاتی فضائل و مکارم ان کے کچھ کام نہ آئے، اس لئے کہ آپ کو مخلص اور وفادار اعوان وانصار نصیب نہ ہوسکے۔ ساتھ دینے کو کھڑے ہوئے تو کون؟ عراقی! جن کے نہ قول کا اعتبار اور نہ فعل کا جو بظاہر تو آپ کے عقیدتمند بنتے تھے لیکن بباطن ہمیشہ آپ کی حکمت عملی کو ناکام بنانے کے درپے رہے، اور جو واقعی مخلص حضرات تھے ان کی رائے نہ چلنے دی۔

اسی بنا پر یہ طے ہوگیا تھا کہ افضل و مفضول کا قصہ ختم کرکے خلافت کو بنو عبد مناف میں محصور کردیا جائے، اور بنو عبد مناف میں سے بھی امامت کی ذمہ داریاں اموی سادات پر ڈالی جائیں۔ تاکہ خلیفہ کی پشت پر ایسی طاقت ہو جو مخالف اور تباہ کن تحریکوں کو سر اُٹھانے سے روک سکے۔

عرب عموماً اور اہل شام خصوصاً بنوامیہ کے ایسے سچے حامی تھے کہ دوسروں کو کبھی میسر نہ آسکے۔ یہ تھی صاف اور سیدھی بات جسے قسم قسم کے مسائل اٹھا کر پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحابہ کرام نے یہ مسئلہ بآسانی طے کر دیا۔ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت اس پر شاہد عادل ہے۔

خاص اجتماع میں سیدنا معاویہؓ نے اپنے خاندان کی اسی مقبولیت عامہ کی بنا پر ان حضرات پر چوٹ کی تھی جن کے متعلق آثار تھے کہ وہ خلافت کے خواہشمند ہیں۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ انھیں حضرت فاروق اعظمؓ سے کتنی عقیدت تھی، اور حضرت فاروقؓ بھی ان کی کتنی قدر کرتے تھے۔ سیدنا ابن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا وہ شخصیتوں کے اعتبار سے تھا، ویسے مصلحت ملیہ کو وہ بھی سمجھتے تھے اس لئے خاموش رہے۔ ہر مسئلہ میں سیدنا ابن عمرؓ کا یہی موقف تھا، کہ جس بارے میں امت کا اجماع ہو جائے اس سے اختلاف نہ کریں۔ اور جب اختلاف ہو تو بالکل غیر جانبدار ہو جائیں، اور کسی طرف سے فریق نہ بنیں۔ اسی موقف کی آپ نے ہمیشہ تبلیغ کی۔

عن نافع ان ابن عمر اتاہ رجلان فی فتنۃ ابن الزبیر فقالا ان الناس صنعوا ما تری وانت ابن عمر وصاحب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فما یمنعک ان تخرج فقال یمنعنی ان اللّٰہ حرم علیَّ دم اخی المسلم قالا الم یقل اللّٰہ تعالیٰ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فقال ابن عمر قد قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للّٰہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللّٰہ۔ (صحیح بخاری، کتاب الفتن)

حضرت نافعؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ فتنہ ابن الزبیرؓ کے زمانہ میں دو آدمی حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں نے کیا کر رکھا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ تو حضرت عمرؓ کے فرزند ہیں، اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، تو پھر آپ کو کھڑے ہونے سے کیا چیز روک رہی ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ چیز روکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر میرے مسلم بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:

"ان سے قتال کرو تا آنکہ فتنہ مٹ جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔" وہ قتال ہم کر چکے، تا آنکہ فتنہ مٹ گیا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا، لیکن تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو تا آنکہ فتنہ پھیل جائے اور دین غیرِ خدا کے لئے ہو جائے

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی راہ میں ملت کی بہبود تھی، اور انہی کا منہاج آخر میں کامیاب ہوا۔ کہ امت ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی، اور فرقہ بازوں اور فتنہ خیزوں سے بڑی حد تک

نجات مل گئی۔ بہر حال امیر یزید کی بیعت پر بلا اکراہ اجماع ہو گیا اور صحابہ کرام اس پر ایسے ہی متفق اللسان ہو گئے جیسے خود امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ اور امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کی خلافت پر ہو گئے تھے۔

اس ذیل میں متضاد اور بے اصل روایتوں کے انبار لگا دیئے گئے ہیں، اور غالباً ہزار ہا صفحے اس موضوع پر اب تک سیاہ ہو چکے ہوں گے۔ لیکن امت کے اجماع کی علمی دلیل یہ ہے کہ امیر یزید جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو اس وقت ذی اثر اصحاب میں سے صرف دو صاحبوں نے بیعت سے گریز کیا، اور یہ دونوں صغار صحابہ میں ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دین کے لئے کسی قربانی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ اور بعد کے جہادوں میں جو اُن کی شرکت ہے تو ذیلی حیثیت رکھتی ہے۔ کمان دوسرے کمانداروں کے ہاتھ میں تھی، اور اگر یہ نہ جاتے تو پیش آمدہ مہیں سر ہونے پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

لیکن سیدنا حسینؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ دونوں نے صرف بیعت سے توقف کیا تھا۔ اپنی طرف دونوں میں سے کسی نے دعوت نہیں دی۔ دونوں کعبہ شریف میں پناہ لے کر بیٹھ گئے تھے باقی تمام عالم اسلام نے بیعت کر لی۔ یہ بیعت کرنے والے کبار صحابہ میں تھے، مثلاً حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس بن مالک، حضرت ربیعہ بن کعب اُسلمی، حضرت سہل بن سعد الساعدی، حضرت سلمہ ابن الاکوع، حضرت ابو سعید خُدری، حضرت صُہیب بن سنان، حضرت عمرو بن ابی سلمہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب اور حضرت ام المؤمنین ام سلمہ کے فرزند)، حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن ابی حَدرد اسلمی، حضرت عبداللہ بن جزء سہمی، حضرت کعب بن عمرو انصاری، حضرت عمرو بن حُریث مخزومی، حضرت عوف بن مالک اشجعی، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن نافع، حضرت رافع بن خُدیج، حضرت معاویہ بن خُدیج، حضرت قبیصہ بن ذؤیب، حضرت محمد بن حاطب قرشی جمحی، حضرت مقدام بن معدیکرب، حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت ابو امامہ انصاری، حضرت بریدہ بن حصیب، حضرت ثابت بن ضحاک، حضرت جابر بن عتیک، حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ کنانی، حضرت ابو برزہ اسلمی، حضرت عمرو بن امیہ ضمری (جو نجاشی بادشاہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر ہو کر گئے تھے)، سیدنا ابو ہریرہ، حضرت فضالہ بن عُبید انصاری، حضرت مالک بن حُویرث، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت ضحاک بن قیس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ان حضرات میں اہلِ بدر ہیں، اہلِ احد ہیں، اہلِ خیبر ہیں، اصحابِ شجرہ ہیں، اور ان میں سیدنا کعب بن عمرو بھی ہیں، جنھوں نے اسلام کی اوّلین بیعت عقبہ میں شرکت کی تھی۔ یہ چھوٹے بڑے صحابہ دو چار دس بیس نہیں تھے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔

بیعت نہ کرنے والوں میں ایک نام سیدنا مسوَر بن مخرَمہ کا بھی لیا جاتا ہے کہ انھوں نے خلافت کی بیعت سے گریز کر کے کعبہ میں پناہ لے لی تھی۔ لیکن ان کا اعتزال حقیقی تھا۔ انھوں نے قطعاً سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا، حتیٰ کہ جب ابن الزبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو اُن سے بھی بیعت نہیں کی۔ امیر المومنین عبدالملکؒ کی بیعت سے پہلے وفات پا گئے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے بیعت کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہوتا۔

یہ ہے اصل صورت حال۔ اسے جبر و زور کہا جائے یا سیاسی چال، اور مکر و فریب۔ جس کا جو چاہے اسے نام دے، لیکن قانوناً اور شرعاً اسے کہنا ہوگا اجماع اور اجماع بھی ان کا جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہترین جماعت قرار دیا ہے اور زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے، اور جنھیں اس نے فرمایا ہے " اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ (یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ اور منبعِ ہدایت)"۔

اگر کچھ لوگ ہمت کر کے یہ کہنے پر اُتر آئیں کہ ان سب نے خوف یا لالچ کے تحت حق کشی کی تو کہیں۔ کہنے والے جانیں اور ان کا پروردگار۔ لیکن اس حقیقت کو نہیں مٹایا جا سکتا کہ دین انھی بزرگوں نے قائم کیا تھا، اور چھوٹا بڑا ہر مسئلہ انھی سے لیا جاتا ہے اور انھی کی راہ کو اللہ نے سبیل المومنین بتایا ہے اور نجات کا راستہ قرار دیا ہے۔

ولایتِ عہد کے مسئلہ میں امیرالمومنین معاویہؓ کی حمایت کرنے والوں میں سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص اور سیدنا سعیدؓ بن زید ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے اس وقت بس یہی دونوں زندہ تھے۔ پھر امہات المومنینؓ تھیں جن کی برکات سے یہ امّت مستفیض تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے فرمان کے مطابق حضرت ابن الزبیرؓ نے امیر یزید کی زندگی بھر خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ نے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کو اصرار کر کے بیعت کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے دونوں فرزندوں نے بیعت کی تھی۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے سگے بھانجے اور وارث حضرت ابن عباسؓ نے دونوں بیعتیں کی تھیں، آپ ہی کو ام المومنین نے اپنا بیٹا بنایا تھا، اور ان کی وفات کے بعد انھی کے حجرہ میں آپ درس کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ ام المومنین حضرت جویریہؓ اور ام المومنین حضرت صفیہؓ بھی اس وقت زندہ تھیں، صلوات اللہ وسلامہ علیہن و علیہم اجمعین۔

گویا وہ زمانہ نور و برکت کا تھا، نہ کہ ظلم و ظلمت کا۔ بعض لوگوں نے یہ فضا قائم کرنے کی کوشش

کی ہے کہ اس وقت صحابۂ کرام سب اُٹھ گئے تھے، اور اُن کی دنیا پرست اولاد نے روپیہ کے لالچ میں یزید کی خلافت تسلیم کر لی تھی، ایسے لوگوں کا کوئی علاج نہیں جو حقائق سے اس طرح آنکھیں بند کر لیں اور جھوٹ بولنے پر اتنے جری ہوں۔

وجہِ انتخاب صحابۂ کرام کے موقف اور واقعاتِ ثابتہ کی روشنی میں جو بات صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک سوائے اس صورت کے اور کوئی طریقہ موزوں نہ تھا۔ اُن کا یہ موقف مصلحتِ ملّیہ کے علاوہ دین کی نہایت اصیل بنیاد پر قائم تھا۔ کتاب اور سنّت کی روشنی میں اُن کے اس اقدام پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اور ہم کسی درجہ میں بھی امام ابوبکر بن العربیؒ کے بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

اوّل تو اس لئے کہ معاملہ اکیلے سیدنا معاویہؓ کا نہیں تھا، بلکہ ان سب بزرگواروں کا تھا جنھوں نے دین قائم کیا، اور جن سے دین کا چھوٹا بڑا ہر مسئلہ لیا جاتا ہے۔ اور اگر بالفرض اس کی تمام ذمہ داری تنہا سیدنا معاویہؓ پر ڈال دی جائے تب بھی وہ امام مجتہد ہیں۔ اور ان کے کسی اجتہاد کو کوئی متبعِ سنت شخص غیر افضل نہیں کہہ سکتا، خصوصاً جب جمہور اہلِ اجتہاد کی بھی حمایت انھیں حاصل ہو۔ جمہورِ صحابہ کے اجماع پر حرف لانا ایسا ہی ہے جیسے ان سے پہلے کے خلفاء پر اجماع کی بے وقعتی کرنا۔

غرض یہ ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے امامِ راشد ہونے کی حیثیت سے وہ سب شرطیں پوری کیں جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس بارے میں عائد کی ہیں۔ اور ان کے اس عمل کی تائید و توثیق ان سب بزرگواروں نے کی جن سے دین لیا جاتا ہے۔ نہایت اہتمام سے شوریٰ ہوا، اور نہایت تدبر کے ساتھ اس مسئلہ پر امّت نے اجماع کیا۔

یہ انتخاب محض فرزند کی حیثیت سے نہیں ہوا تھا، بلکہ اہلیت و صلاحیت اور مصلحت کو بھی اچھی طرح ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ مستقبل کی حفاظت اس کی غایت تھی۔ امیر یزید ایسے فرزندِ جلیل تھے کہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو پوری طرح عملاً ثابت کر کے جمہور کی طرف سے "فتی العرب (عرب کے سورما)" کا خطاب حاصل کر چکے تھے۔ بنو امیہ میں ایسی شخصیت اور کسی کی نہ تھی جس کی پشت پر قاطبۃً تمام اہلِ شام ہوں اور عموماً تمام عرب۔

رہا امام ابن العربیؒ کا یہ فرمانا کہ "انھیں کسی رشتہ دار کو بھی خلیفہ نہیں بنانا چاہئے تھا، چہ جائیکہ بیٹے کو" تو اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ اول تو خلیفہ بنانے والے وہ اکیلے نہیں تھے، بلکہ

پوری امت تھی اور اگر وہ اکیلے ہوں تب بھی الحمد سے لے کر والناس تک قرآن حکیم میں اور موطا سے لے کر ابن ماجہ تک کسی حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں کہ رشتہ دار یا بیٹے کو لازماً کوئی منصب نہیں دینا چاہئے۔ اگر نظیر ملتی بھی ہے تو اس کے مخالف۔ مثلاً ملاحظہ ہو (صحیح بخاری: ج ۲، باب بعث النبیؐ اسامۃ، ص ۶۴۱، طبع اصح المطابع)

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بعثاً وامر علیہم اسامۃ بن زید فطعن الناس فی امارتہ فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان تطعنوا فی امارتہ فقد کنتم تطعنون فی امارۃ ابیہ من قبل۔ وایم اللہ ان کان لخلیقاً للامارۃ وان کان لمن احب الناس الیّ وانّ ھٰذا لمن احب الناس الیّ بعدہ۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا اور اس کی کمان اسامہ بن زیدؓ کو دی۔ لوگوں نے ان کے امیر بنائے جانے پر اعتراض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا "تمہیں آج اس کی امارت پر اعتراض ہے اور کل تم نے اس کے باپ کی امارت پر اعتراض کیا تھا۔ بخدا وہ امارت کا حقدار تھا اور وہ ان میں تھا جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بھی ان میں ہے جن سے مجھے سب سے زیادہ محبت ہے۔"

ہمارا مقصد اس حدیث سے محض اتنا بتانا ہے کہ اگر سیدنا معاویہؓ نے محض محبوب فرزند کی حیثیت سے امیر یزید کو منتخب کیا ہوتا تب بھی سنتِ نبویہ کی موجودگی میں اس پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ یہ کام ان سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ خود امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اپنے قریب ترین عزیزوں کو مناصبِ حکومت عطا فرمائے۔ اور ان سے پہلے امیر المؤمنین سیدنا عثمانؓ نے صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا خویش پروری کے تحت نہیں ہوا بلکہ احوال کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اگر سیدنا علیؓ اس وقت یہ اقدام نہ کرتے تو سبائی لوگ خلافتِ مرتضوی کو دو چار دن بھی نہ چلنے دیتے۔

لیکن یہاں تو معاملہ محض خلیفۂ وقت کی رائے کا نہیں تھا، انتخاب کی ذمہ داری ان تمام اکابرِ صحابہ پر ہے جنھوں نے اس تحریک کی تائید کی۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھیں جرأت تھی کہ وہ اپنا موقف بے رو رعایت واضح کر دیں اور پھر ثباتِ قلب کے ساتھ اس پر قائم رہیں۔ اس واقعہ سے پہلے اور اس کے بعد ان کی سیاسی اور ملّی سرگرمیاں ہمارے سامنے ہیں تو پھر کیسے باور کیا جا سکتا ہے

کہ خاص اس معاملہ میں انھوں نے مداہنت برتی اور کسی کے خوف یا لالچ سے اُن کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ سوچنا چاہئے کہ جو لوگ سیدنا علی المرتضیٰؓ سے بیعت نہیں کرتے اور پھر بعد میں حضرت ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کرتے اس وقت انھیں کوئی لالچ اور کوئی خوف نہیں ہوتا تو امیر یزید کی ایسی کیا ہیبت تھی؟ یا ان کے خزانہ میں کیا کشش تھی جو وہ پوری استقامت سے ان کے ہمنوا رہے۔

امیر یزید کوئی دو چار دس پانچ ہفتے یا مہینے ولی عہد نہیں رہے تھے۔ انھوں نے خلیفہ ہونے سے پہلے پورے دس برس تک اپنے عہدہ کے فرائض ادا کئے تھے۔ اور تمام امت جانتی تھی کہ ہونے والے خلیفہ وہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام امت نے اُن کی خلافت پر اجماع کر لیا اور ان کے خلاف اکھڑے ہونے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

تاریخ انعقاد

ولایتِ عہد کا مسئلہ کس سال طے ہوا، اس کے متعلق بھی پیچیدگیاں پیدا کردی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں جتنے بزرگواروں کے اسماء گرامی صحیح بخاری اور دوسری کتابوں سے لئے گئے ہیں ان میں سے اکثر کی وفات ۵۰ھ کے آگے پیچھے ہے۔

مثلاً (۱) سیدنا حسنؓ (المتوفی ۴۹-۵۰-۵۱ھ)، (۲) سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ (۴۹-۵۰ھ)۔ (۳) امیر زیادؒ (۴۹-۵۰ھ)۔ (۴) سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکرؓ (۵۳ھ)۔ (۵) ام المؤمنین حضرت حفصہؓ (۴۱-۴۶-۴۷ھ)۔ (۶) سیدنا حبیب بن مسلمہؓ (۴۲ھ)۔

امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ کا ۵۰ھ میں حج کے لئے آنا بلکہ خاص اسی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے، زیادہ وثوق سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہی زمانہ متعین کرنا ہوگا۔ یعنی ۵۰ھ کے اوائل میں وفود آئے ہوں اور پھر مدینہ طیبہ وہ فرمان بھیجا گیا ہو جو صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر بیان ہوچکا۔ اور پھر اسی سال کے آخر میں آپ حج کے لئے حاضر ہوئے ہوں، اور مدینہ طیبہ میں صحابہ کے اجتماع میں یہ فیصلہ ہوا ہو۔

لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کی موجودگی ثابت ہے اور اس کے عرصہ دراز کے بعد سیدنا حبیب بن مسلمہؓ کی بھی۔ لہٰذا ان دونوں کی جو تاریخ وفات بتائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح بات وہی ہے جو صحیح بخاری سے معلوم ہوئی۔ اور چونکہ کسی روایت سے سیدنا حسنؓ کی موجودگی کا اشارہ نہیں، اس لئے آپ کی وفات آخر ۴۹ھ اور اوائل ۵۰ھ کے درمیان تسلیم کرنی ہوگی۔ اور غالباً سیوطی کا یہ بیان درست ہے کہ آپ نے ۴۹ھ میں وفات پائی۔

سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ اور امیر زیادؒ نے جو وفد بھیجے تھے وہ اوائل ۵۰ھ کی بات ہو گی، اور اسی سال کے آخر میں ان دونوں بزرگواروں نے وفات پائی۔

اسی طرح مسعودی کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ یہ وفود ۵۹ھ میں آئے تھے۔ غالباً اس نے یہ سنہ اس لئے دیا ہے کہ کسی طرح اس مسئلہ کے طے ہونے اور امیر یزید کے خلیفہ ہونے کی درمیانی مدت کو کم سے کم بنا دیا جائے، تاکہ جن روایاتِ واہیہ کے ذریعہ اس مستحکم تصفیہ کو مشتبہ بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں ان کے لئے کچھ دلیل مل سکے۔

امیر المؤمنین معاویہؓ کا مدینۂ طیبہ حاضر ہونا اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حسین بن علی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے آپ کا گفتگو کرنا اور ان سب کا اپنی طرف سے بات کرنے کے لئے حضرت ابن الزبیرؓ کو مقرر کرنا اور حضرت ابن الزبیرؓ کا یہ پیش کرنا کہ یا تو کسی کو منتخب نہ کریں اور امت کو ایسے ہی چھوڑ جائیں جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے، یا حضرت صدیق اکبرؓ کی طرح کسی ایسے شخص کو منتخب کریں جو رشتہ دار نہ ہو، یا حضرت فاروق اعظمؓ کی طرح کچھ لوگوں کو نامزد کر جائیں کہ وہ آپس میں فیصلہ کر لیں، اور حضرت معاویہؓ کا جواب سن کر حضرت ابن الزبیرؓ کا آپ سے یہ کہنا کہ اگر آپ تھک گئے ہوں تو الگ ہو جائیے، ہم آپ کے بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے، ایسی لغو اور لایعنی روایتیں ہیں جن کا سر نہ پیر، اور جو کسی طرح ان بزرگواروں کے مناسب حال نہیں جو ایک دعوت کے داعی تھے اور اقوامِ عالم کی امامت کر رہے تھے۔ پھر ان بزرگواروں کا یہ اجتماع کبھی مدینہ کا بتایا جاتا ہے اور کبھی مکہ کا۔ روایت ایک ابن وہبؒ ہی کے نام سے ہے لیکن تین طرح بیان ہوئی ہے اور تینوں کا مضمون مختلف ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ان راویوں نے اپنے نقطۂ خیال سے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر یہ روایتیں تصنیف کی ہیں، اور اس کی پروا نہ کی کہ کبھی یہ روایتیں جمع بھی ہوں گی، اور لوگ دیکھیں گے کہ ایک ہی آدمی اتنی متضاد باتیں کر رہا ہے۔

ان سب میں بدتر اور مردود روایت وہ ہے کہ آخر میں سیدنا معاویہؓ نے ان سب کو دھمکی دی کہ میں تم لوگوں کے بیعت کر لینے کا اعلان کرنے والا ہوں، اگر کسی نے مخالف یا موافق کوئی بات کرنی چاہی تو منہ سے لفظ نکلنے سے پہلے اس کا سر قلم ہو جائے گا۔ اور یہ کہہ کر آپ نے حکم دیدیا کہ اجلاس میں ان سب کے سروں پر دو دو آدمی ننگی تلواریں لے کر کھڑے ہو جائیں، اور جس کے بھی ہونٹ ہلیں اس کا سر اڑا دیں۔

پھر بتایا جاتا ہے کہ آپ نے بھرے مجمع میں اُن کے بیعت کر لینے کا اعلان کیا، اور یہ سب حضرات تلوار کے خوف سے چپکے رہے، اور اسی دن سیدنا معاویہؓ کوچ کر گئے۔ اب لوگ تو کہتے تھے کہ انھوں نے بیعت کرلی، اور یہ خود کہتے تھے کہ ہم نے نہیں کی۔ یہ سب روایتیں اپنی تکذیب خود کرتی ہیں اور اس عہد کی ایسی بھیانک صورت پیش کرتی ہیں کہ اسے کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت معاویہؓ نے حرم شریف میں بیٹھ کر جھوٹ بولا۔ نہ اپنے منصب کا خیال کیا اور نہ مجمع کے تقدس کا۔ لیکن بات پھر بھی نہیں بنی۔ ننگی تلواریں سروں پر لئے ہوئے جب سپاہی کھڑے ہوں اور وہ بھی صرف چار آدمیوں کے سروں پر تو گویا خود ہی اعلان کر رہے ہیں کہ بات جبر کی ہے اور ان لوگوں نے بیعت نہیں کی۔ سیدنا معاویہؓ جیسے ذکی و فطن شخص اگر جھوٹ بولتے بھی تو تو کیا اس بھونڈے طریقہ پر کہ جسے ایک بچہ بھی سمجھ لے؟ اور یہ چاروں حضرات وہ ہیں جن کے متعلق اگر یہ خیال کیا جائے کہ وہ موت کے ڈر سے سچّی بات کہنے سے گریز کر سکتے تھے تو اس سے ان کی پوری زندگی کی تکذیب ہوتی ہے۔ کیا سیدنا حسینؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ نے اپنے عمل سے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ ان کے نزدیک موت کی کوئی حقیقت نہیں۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو العواصم من القواصم: ص ۲۱۵ - ۲۲۲ مع تعلیقات جہاں محدثانہ بحث ہے۔ مدینہ کے اجتماع کے متعلق صحیح بخاری کی جو روایت ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اس سے اس تمام خرافات کی پوری پوری تکذیب ہوتی ہے۔

سیدنا عبد الرحمانؓ کی وفات ۵۳ھ میں مسلّم ہے، اور پھر اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کہ آپ نے ولایتِ عہد کی بیعت کی تھی یا نہیں، لہٰذا سیوطی کا یہ بیان درست ہے کہ یہ واقعہ ۵۰ھ کا ہے۔ گویا امیر یزید نے خلیفہ ہونے سے پہلے واقعی دس برس تک ولیعہد المسلمین ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ اور جب وہ خلیفہ ہوئے تو تمام عالمِ اسلام میں سے صرف دو ممتاز شخصیتیں ایسی تھیں جنھوں نے تجدیدِ بیعت سے انکار کر دیا۔ ان میں مخالفانہ رویہ صرف حضرت ابن الزبیرؓ کا تھا۔ لیکن انھوں نے بھی امیر یزید کی وفات تک اپنی طرف دعوت نہیں دی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ اور جب سبائیوں نے آپ کو یہ باور کرادیا کہ عراق سب کا سب آپ کی حمایت پر متفق ہے تو تمام عزیزوں اور مخلص دوستوں کے مشورہ کے خلاف گو آپ نے خروج کیا، لیکن کوفہ پہنچ کر جب صحیح صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔

اب کس شرعی اور عقلی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر یزید کی خلافت پر تمام امت کا اجماع نہیں ہوا تھا۔ رہی وہ داستانیں جو اُن کے فسق و فجور کے متعلق وضع کی گئی ہیں، اور جن سے بڑے بڑے سمجھدار لوگ بھی متاثر ہو گئے، حتّٰی کہ ابن خلدون تک، تو مستند روایتوں سے اُن سب کی تردید ہوتی ہے، اور واقعات ثابتہ ان سب کی تکذیب کرتے ہیں۔

چونکہ موضوعِ سخن براہ راست امیر یزید کے حالات نہیں ہیں اس لئے یہاں مزید تفصیلات کی ضرورت نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک اصولی بات کہنی ہے کہ اگر واقعی وہ فاسق تھے تو ہمیں اجماعِ صحابہ کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک خلیفہ کا فسق اس کی خلافت کی حقانیت پر اثر انداز نہیں ہوتا [صحیح بخاری: ج ۲، کتاب الفتن]

عن جنادة بن ابی امیة قال دخلنا علیٰ عبادة بن الصّامت وھو مریض قلنا اصلحک اللہ حَدِّثنا بحدیث ینفعک اللہ بہ سمعتہ من النّبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دعانا النّبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایَعنا فقال فیما اخذ علینا ان بایَعنا علی السّمع والطّاعة فی منشطنا ومکرہنا وعُسرنا ویُسرنا واثرة علینا وان لاننازع الامر اھلہٗ اِلّاان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ بُرہان۔

حضرت جنادہ بن ابی امیہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں ہم (سیدنا) عبادہ بن الصامت رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت علیل تھے۔ ہم نے عرض کیا کوئی ایسی حدیث بیان فرمائے جس سے آپ کو نفع پہنچے، اور آپ نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہو فرمایا ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب کیا اور بیعت لی۔ جن چیزوں کا آپنے ہم سے عہد لیا تھا وہ یہ تھیں کہ ہم حکومت کی بات سنیں اور اطاعت کریں، ہماری خوشی کی ہو یا ناخوشی کی ہو، سختی کی ہو یا نرمی کی، اور ہم امراء کو اپنی جانوں پر ترجیح دیں اور حکومت کے معاملہ میں اہلِ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ سوائے اس کے کہ تم ان سے ایسا کفر دیکھو، جس سے خون حلال ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے تمھارے پاس اس بارے میں حجت موجود ہو۔

یعنی امّت کا کلمہ متّحد رکھنا، حکومت میں اختلال پیدا کرنے کی صورتوں سے گریز کرنا فرض ملّی ہے اور سوائے صریح کفر کے اور کوئی صورت ایسی نہیں جو حکومت کے خلاف بغاوت کے لئے حجّت ہو۔ "کُفر بَوَاح" کے معنی ہیں ارتدادِ حقیقی کے کہ دین سے بیزاری کا اعلان کیا جائے۔

اب اگر کہا جائے کہ "یزید کافر ہو گیا تھا اور اس کے خلاف خروج فرض تھا" تو پھر تسلیم کرنا ہوگا

کہ تمام صحابہ نے تعلیم اسلامیہ کو پس پشت ڈال دیا تھا اور سب مرتد ہوگئے۔ اگر یہ کہنے کی جرأت نہیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ امیر المؤمنین یزید ایسے ہی عالم و متقی اور ذی فضائل تھے جیسے صحابۂ کرام کے عہد کے ایک خلیفہ کو ہونا چاہئے، اور خلیفہ بھی وہ جسے تمام صحابہ اور جمہور امت کی حمایت حاصل تھی۔ اور وہ سب داستانیں قطعاً بے اصل ہیں اور دشمنانِ ملت کی وضع کی ہوئی، جو اُن کی شخصی عظمت کو کم کرنے کے لئے اس طرح پیش کی جاتی ہیں کہ جوں جوں وقت گذر رہا ہے اُن کے معائب کی فہرست بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تاریخِ اسلام میں دو شخصیتیں ہیں ایک امیر المؤمنین یزید کی کہ سال بسال انھیں بد سے بدتر بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور ایک منصور حلاج کی کہ اسے اس کے عہد کے مسلمانوں نے ایک ملحد و زندیق اور قرمطی کی حیثیت سے سولی دی۔ اور امیر المؤمنین المقتدر باللہؒ نے تمام فقہاء و علماء کے فتویٰ پر اسے مرتد قرار دیا، لیکن آہستہ آہستہ اس کا درجہ بڑھتے بڑھتے اکابر اولیاء اللہ کا ہم پلہ بنا دیا گیا۔ لیکن یہ سب خیال و گمان کی کارفرمائی ہے۔ حقیقت سے اس تصوّر کا کوئی علاقہ نہیں۔ اور اس کی بنا، یہ ہے کہ ہمعصر لوگوں کی رائے کو بے وقعت سمجھا گیا۔

امیر المؤمنین یزید کے متعلق ہمعصر اکابرِ ملت کی رائے نہایت قوی اور معتبر اسناد سے جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انھیں ایک جلیل القدر اور تقویٰ شعار عالمِ دین اور امامِ امت سمجھتے تھے۔ مثلاً بلاذریؒ نے انساب الاشراف میں یہ روایت کی ہے کہ امیر المؤمنین یزید کے خلیفہ ہونے پر سیدنا ابن عباس صلوات اللہ علیہ نے سیدنا معاویہؓ کے لئے دعاءِ مغفرت کی اور فرمایا

وان ابنہ یزید لمن صالحی اھلہ فالزموا مجالسکم واعطوا طاعتکم وبیعتکم۔	ان کے فرزند یزید ان کے گھر کے صالح افراد میں ہیں۔ آپ لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہیں، اور اپنی اطاعت و بیعت پر مستقیم رہیں۔

یہ مؤرخ البلاذریؒ امیر المؤمنین المتوکل علی اللہ اور دوسرے عباسی خلفاء کے ندیموں میں تھے۔ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ ارشاد اپنے ائمہ کے سامنے بیان کیا۔ اور ان کا نام اپنی کتاب میں لفظ "امیر المؤمنین" ہی کے ساتھ لکھا۔ پھر بلاذری کے انہی راوی المدائنی کی ایک روایت امام ابن کثیرؒ نے نقل کی ہے کہ سیدنا حسنؓ کی وفات کے بعد جب حضرت ابن عباسؓ دمشق تشریف لے گئے ہیں تو امیر یزیدؒ بھی تعزیت کے لئے حاضر ہوئے۔ اور جب کچھ دیر گفت گو کے بعد رخصت ہوئے تو سیدنا ابن عباسؓ نے فرمایا "اذا ذھب بنو حرب ذھب علماء النّاس"

(بنو حرب اس دنیا سے اٹھے تو گویا اہلِ عالم کے علماء اُٹھ جائیں گے)۔

یا مثلاً حضرت ابن الزبیرؓ کی شہ پر جب اہل مدینہ نے بغاوت کی تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس اقدام کی مذمت کی (صحیح بخاری، کتاب الفتن، ج ۲، جزء ۲۹، طبع اصح المطابع)

عن نافع قال لما خلع اہل المدینۃ یزید بن معاویۃ جمع ابن عمر حشمہ وولدہ فقال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یُنْصَبُ لکل غادر لواءٌ یوم القیٰمۃ وانا قد بایعنا ہذا الرجل علی بیع اللہ و رسولہ۔ وانی لا اعلم غدراً اعظم من ان نبایع رجلاً علی بیع اللہ و رسولہ ثم ننصب لہ القتال وانی لا اعلم احداً منکم خلعہ ولا تابع فی ہذا الامر الا کانت الفصیل بینی و بینہ۔

حضرت نافعؓ سے روایت ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید بن معاویہؓ کی بیعت توڑ دی تو حضرت ابن عمرؓ نے اپنے متعلقوں اور فرزندوں کو جمع کر کے فرمایا "میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُنا ہے کہ قیامت کے دن ہر غدر کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا"۔ ہم نے اس شخص سے خدا اور رسول کی بیعت کی ہے۔ اور مجھے اس سے بڑا کوئی غدر نظر نہیں آتا کہ ہم ایک شخص سے اللہ اور اس کے رسول کی بیعت کریں اور پھر اس کے خلاف لڑنے کھڑے ہو جائیں۔ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم میں سے کسی نے ان کی بیعت توڑی، یا اس ہنگامہ میں کوئی حصہ لیا تو پھر میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا"۔

ایسی ہی ایک روایت صحیح مسلم کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کے داعی حضرت ابن مطیعؓ نے فتنہ کو انگیخت کیا تو حضرت ابن عمرؓ ان کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا "ابو عبدالرحمان کے لئے مسند لاؤ" آپ نے فرمایا میں تمھارے پاس بیٹھنے نہیں آیا بلکہ وہ حدیث بیان کرنے آیا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔

من خلع یداً من طاعۃ لقی اللہ یوم القیٰمۃ لا حجۃ لہ ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاہلیۃ۔

جس نے اطاعت کا عہد کرنے کے بعد توڑ دیا۔ تو اللہ کے سامنے اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی۔ اور جو ایسی حالت میں مرگیا کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس امام پر امت کا اجماع ہوگیا ہو اس کی بیعت لازم ہے، اور اس کے خلاف خروج حرام۔ اسی طرح حافظ ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ ۸: ۲۳۲ (منقول از العواصم من القواصم)

میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کے داعی حضرت عبداللہ بن المطیعؒ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت محمد بن علیؓ بن ابی طالب (المعروف بابن الحنفیہ) کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ بیعت توڑدیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ابن المطیعؒ نے کہا "یزید شراب پیتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے اور کتاب اللہ کے احکام کی انھیں پروا نہیں"۔ سیدنا محمدؒ نے فرمایا "میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی میں ان سے ملا ہوں، ان کے ساتھ رہا ہوں، میں نے انھیں ہمیشہ نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، فقہ کا سائل اور سنّت کا متبّع پایا"۔ کہنے لگے "وہ یہ سب کچھ آپ کے دکھلانے کو کرتے ہوں گے"۔ فرمایا "انھیں مجھ سے کیا خوف اور کس قسم کا لالچ تھا جو وہ میرے سامنے بندگی کا اظہار کرتے۔ تم جو شراب کی بات کرتے ہو تو کیا انھوں نے تمھیں دکھا کر پی؟ اگر تمھارے سامنے پی تھی تو تم بھی اس گناہ میں اُن کے شریک تھے، اور اگر دکھا کر نہیں پی، تو تمھیں ایسی بات بیان کرنی جائز نہیں جس کا تمھیں ذاتی علم نہ ہو"۔ انھوں نے کہا "ہم نے اگرچہ دیکھا نہیں لیکن یہ بات ہمارے نزدیک سچی ہے"۔ فرمایا "اللہ تعالیٰ تو گواہوں کی یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔ وہ فرماتا ہے (زخرف: ۸۶) اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (سوائے اس کے کہ جو سچائی کے ساتھ گواہی دے اور وہ بھی اپنے ذاتی علم کی بناء پر)۔ میں تمھاری کسی بات میں شریک نہیں"۔

انھوں نے کہا "شاید آپ کو یہ ناگوار ہے کہ حکومت کسی اور کو ملے، تو آیئے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں"۔ فرمایا "میں تمھارے مقصد کے لئے جنگ کرنا جائز نہیں سمجھتا، نہ کسی کے ساتھ ہو کر اور نہ کسی کو ساتھ لے کر"۔ کہنے لگے "تو پھر اپنے فرزندوں ابوالقاسم اور قاسم کو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کی اجازت دیجئے"۔ فرمایا "اگر انھیں حکم دوں گا تو گویا خود لڑنے کھڑا ہو گیا"۔ کہنے لگے "تو پھر ہمارے ساتھ ہو کر دوسرے لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیجئے"۔ فرمایا "سبحان اللہ! جو کام میں خود کرنا نہیں چاہتا اور نہ اسے پسند کرتا ہوں اس کا حکم دوسروں کو کیسے دوں؟ اس طرح تو میں بندوں کو للہ نصیحت کرنے والا نہیں ہوں گا"۔ انھوں نے کہا "تو پھر ہم آپ کو مجبور کریں گے"۔ فرمایا "تو پھر میں لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم کروں گا اور اس کا کہ مخلوق کو خوش کرنے کے لئے خالق کو ناراض نہ کریں"۔ اس کے بعد آپ مکہ چلے گئے۔

ان نہایت قوی مآخذ کی موجودگی میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار نے امیر المؤمنین یزیدؒ سے وہی بیعت کی تھی جو وہ ان سے پہلے خلفاء سے کرتے چلے آرہے تھے۔ اب سوچنا چاہئے کہ سیدنا ابن عمرؓ اور سیدنا ابن عباسؓ جس شخص کی بیعت کو اللہ

اور اس کے رسول کی بیعت کہیں اور حضرت ابن الزبیرؓ کو جس کی موجودگی میں کھل کر اپنی طرف دعوت دینے کی جرأت نہ ہو، سیدنا حسینؓ جس کے خلاف اوّل تو کوفیوں کے دھوکہ میں آکر کھڑے ہو جائیں اور پھر اپنے موقف سے رجوع فرمالیں، جمہور صحابہ اور تمام امت جس کی بیعت میں ہو اور اس کے مخالفوں کی مخالف، تو وہ شخص کیسا ہوگا اور اس کی خلافت کی نوعیت کیا ہوگی۔

امیر المؤمنین یزید کے عہد میں خلافتِ اسلامیہ کے ظاہری و باطنی تمام مقاصد پورے ہوئے۔ ان کی خلافت کے کارکن بھی وہی تھے جو ان سے پہلی خلافتوں میں اپنے فرائض ادا کرتے آرہے تھے مثلاً سیدنا عقبہ بن نافعؓ انہی کے سپہ سالار تھے، جنھوں نے قیروان میں چھاؤنی قائم کی تھی اور بربروں کا علاقہ فتح کرتے ہوئے ساحلِ بحر تک پہنچ گئے تھے، اور پھر جوش میں آکر سمندر میں گھوڑا ڈال دیا تھا اور ہاتھ اٹھا کر کہا تھا "خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سمندر پار بھی تیری مخلوق رہتی ہے تو تیرا کلمہ بلند کرنے کے لئے وہاں بھی پہنچتا"۔ پھر سیدنا قبیصہ بن ذُوَیبؓ، سیدنا رافع بن خدیجؓ، ان کے قاضیوں میں تھے۔ سیدنا معاویہ بن خُدَیجؓ، سیدنا نعمان بن بشیرؓ اور سیدنا ضحاکؓ بن قیس ان کے امراء ہیں، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

امیر المؤمنین یزیدؒ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جس کے متعلق ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے احکام نہ ہوں، اور کتاب و سنت اور تعاملِ خلفائے پیشین کے نہایت محکم اور قوی دلائل سے ان کے موقف کی حقانیت نہ معلوم ہوتی ہو۔ اور ان اقدامات میں انھیں جمہور کی حمایت حاصل نہ ہو۔

سیوطی جیسے مؤرخین نے اعتراض تو کر دیا کہ انھوں نے حرمین شریفین پر فوج کشی کی، اور حدیث فہمی کے دعوے کے ساتھ اپنی دانست میں صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی پیش کر دی۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم من اخاف اہل المدینۃ اخافہ اللہ وعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے اہل مدینہ کو خوف میں مبتلا کیا اس پر اللہ بھی خوف طاری کر دے گا اور اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی"

لیکن حدیث سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہلِ مدینہ کو بے وجہ تکلیف پہنچائیں اور ان پر جینا مشکل کر دیں۔ اس کے معنی یہ کیسے نکال لئے گئے کہ اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کو بغاوت اور امن شکنی کی کھلی آزادی ہے کہ وہ جب چاہیں لاقانونی اختیار کر کے حرمین شریفین کو

مورچے بنالیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کے متعلق یہ کھلا ہوا حکم نہیں دیا ہے (البقرہ: ۱۹۱)

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ۔

اور ان سے مسجد حرام کے قرب و جوار میں جنگ مت کرنا جب تک وہ خود وہاں جنگ نہ کریں لیکن اگر وہ وہاں لڑیں تو پھر تم بھی انھیں قتل کرو۔

حرمین شریفین کا تقدس برقرار رکھنا اور انھیں امن کی جگہ سمجھنا سارے مسلمانوں پر فرض ہے۔ ان کی بے حرمتی کرنے والا تو وہ ہوگا جو شریعت اسلامیہ کے احکام ٹھکرا کر ان بستیوں کے تقدس کو ٹھیس لگائے اور انھیں جرائم کا اڈا بنا ڈالے۔ معمولی عقل کی بات ہے کہ اگر قاتل، ڈاکو، زانی اور ایسے ہی دوسرے معاصی اور جرائم کا ارتکاب کرنے والا شخص حرمین شریفین میں پناہ لے گا اور ایسے ہی لوگ وہاں جمع ہو کر اس بستی کے مکین بن جائیں گے تو کیا حکومتِ اسلامیہ اسے برداشت کرلے گی۔ اگر نہیں کرے گی اور اسے نہیں کرنا چاہئے تو باغیوں کو بدرجہ اَولیٰ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ فرماتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (فتنہ بپا کرنا قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے)۔

اِس وقت زیر بحث امیر المؤمنین یزید کی خلافت نہیں، اس لئے مبسوط طریقہ پر تجزیہ کرنا موجبِ طوالت ہوگا۔ لیکن اصولی حیثیت سے ان کی ولایتِ عہد اور خلافت کی صحت سے بحث لازمی ہے، اور اسی کے لئے یہ تمام دلیلیں بہترین اور صحیح ترین ماٰخذ سے پیش کی گئیں، اور ثابت کردیا گیا کہ ان کی ولایتِ عہد اور خلافت کے لئے جس طرح صحابہ اور امت سے استصواب ہوا تھا ایسا اور اس پیمانہ پر استصواب ان سے پہلے کسی کے لئے نہیں ہوا۔

جذبات کی رَو میں بہہ کر یا واقعات سے ناواقفیت کے سبب اس استصواب پر حرف رکھنا یا اس کی بے وقعتی کرنا کسی کے نزدیک ضروری ہو تو ہو، قانوناً اور شرعاً اسے سوائے استصوابِ رائے عامہ کے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اور یہ استصواب ان سے ہوا تھا اور یہ تائید انھوں نے کی تھی جن سے بہتر جماعت اب کبھی پیدا نہیں ہوگی، اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا گواہ بتایا ہے۔

حضرت محمد بن علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن المطیعؓ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں امیر المؤمنین یزید کا فسق مشہور ہوگیا تھا۔ یہ صحیح ہے لیکن افواہ کی حد تک۔ کوئی حتمی بات سامنے نہیں آئی اور نہ ان صحابہ کرام اور اہلِ بیت اطہار نے ان الزامات کو درست جانا جو امیر المؤمنین سے ذاتی تعلق رکھتے تھے، اور ان کی افتادِ طبع اور

چال چلن سے واقف تھے۔ سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما ہمیشہ دمشق میں رہتے تھے وہ آخر وقت تک امیر المؤمنین یزید کے مخلص دوست رہے۔ اسی طرح اور متعدد صحابہ تھے جو خاص دمشق میں مستقل طور پر رہا کرتے تھے۔ ان پر یہ باتیں کیوں نہیں کھلیں، اور کیوں ان کا ذکر اس وقت ہوا جب حضرت ابن الزبیرؓ کے داعی ان کی حمایت میں کام کرنے کھڑے ہوگئے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حادثۂ کربلا کے بعد چونکہ عالمِ اسلام میں کسی قسم کا ہیجان نہیں ہوا اور تین برس تک مکمل خاموشی طاری رہی تو لوگوں کو یہ سوجھی کہ جس طرح امیر المؤمنین عثمانؓ اور ان کے والیوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کی گئی تھیں اسی طرح امیر المؤمنین یزید کے خلاف بھی باتیں بنانی شروع کر دیں۔ اور ان کے اندر ذاتی معائب پیدا کر کے انتا اچھالیں کہ لوگوں میں نفرت پھیل جائے۔

ابن المطیعؓ کا یہ کہنا کہ "گو یہ باتیں ہم نے خود نہیں دیکھیں مگر ہم انھیں صحیح باور کرتے ہیں" اس کی دلیل ہے کہ کچھ لوگ یہ باتیں وضع کر کے انھیں وثوق کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ لیکن امت نے ان فضولیات کا کوئی اثر نہیں لیا۔ البتہ جب حضرت ابن الزبیرؓ کے داعیوں نے کام کرنا شروع کر دیا اور اہلِ مدینہ نے بغاوت کی ٹھانی تو ان مردود روایتوں کا سہارا لیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ خود حضرت ابن الزبیرؓ جیسے عالم و فقیہ و متقی صحابی اس مکروہ کام میں شریک نہ ہوں گے، اور نہ ان کے داعی حضرت ابن المطیعؓ وغیرہ۔ لیکن باتیں وثوق سے کہی گئی ہوں گی اور ممکن ہے کہ جھوٹے حلف بھی اُٹھالئے گئے ہوں اور اس طرح انھوں نے انھیں صحیح باور کر لیا ہو۔ یا ان کی اشاعت کو برداشت کر لیا ہو۔

لیکن اس عہد میں بھی زیادہ سے زیادہ جو باتیں کہی گئی تھیں وہ یہ ہیں کہ امیر المؤمنین شراب پیتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ بہت ممکن ہے کہ ان راویوں میں سے کسی شخص نے انھیں مثلّث یعنی طلاء پیتے دیکھا ہو جو فقہائے شام کے نزدیک حلال ہے۔ یعنی جب کھجور وغیرہ پانی میں بھگو دی جائے اور تخمیر ہو جائے تو دو تہائی آمیزہ آگ پر اڑا دیا جائے اور ایک تہائی باقی رکھا جائے۔ اس لئے اسے مثلّث کہتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کی حلت کا فتویٰ دیا تھا اور رعایت کی تھی کہ اہلِ شام پر اس کے بارے میں تنگی نہ کی جائے (ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ)۔ اس کو ان لوگوں نے افتراءً و کذباً شراب کہہ کر بیان کیا ہو۔ اسی طرح امیر المؤمنین چونکہ نقرس کے مریض تھے اور یہ جتنا تکلیف دہ اور موذی مرض ہے اسے سب جانتے ہیں۔ ممکن ہے اسی

عذر کی بنا پر وہ بعض اوقات مسجد میں نہ آئے ہوں اور اسے غلط رنگ دے کر کہہ دیا گیا ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھتے۔ سبائیوں کے اعتراضات اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے امیر المؤمنین عثمانؓ پر کیا کچھ طوفان نہیں باندھا۔ اور یہی ہیں جنھوں نے سیدنا سعدؓ بن ابی وقاص جیسے سید العابدین کے متعلق کہا تھا کہ انھیں نماز پڑھانی نہیں آتی۔ بات کچھ ہوتی ہے اور یہ لوگ اسے کچھ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ پوری تاریخ ان کی تلبیس و افترا ہی سے تو داغدار بنی ہے۔ افسوس ان اہلِ قلم پر ہے جو ہوائے نفس میں اتنا بہہ جاتے ہیں جیسے تاریخ الخلفاء میں علّامہ سیوطی۔ ان کی ایک روایت ہے (ص ۸۱، طبع مصر)۔ مگر اسی واقدی کے حوالہ سے جسے خود وضاع کہا کرتے تھے جیسا کہ پیش لفظ میں مذکور ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً ایسے لوگوں کی بات بیان کرنے کی ممانعت کی ہے، لیکن ہوائے نفس میں آدمی سب کچھ کر جاتا ہے۔

اخرج الواقدی من طرق ان عبداللہ بن حنظلة الغسیل قال واللہ ماخرجنا علی یزید حتی خفنا ان نرمی بالحجارة من السماء انہ رجل ینکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمر ویدع الصلوٰة۔	واقدی نے اپنی سندوں سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن حنظلہؓ (ابن الغسیل) نے کہا "بخدا ہم یزید کے خلاف اس وقت اٹھے جب ہمیں یہ خوف ہو گیا کہ ہم پر کہیں آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں یہ شخص اپنے باپ کی لونڈیوں پر اپنی بیٹیوں پر اور اپنی بہنوں پر تصرف کرتا ہے، شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔"

کوئی پوچھے کہ جو شخص یہ حرکتیں کرتا ہو اس کے نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اس روایت کا جھوٹا ہونا عیاں ہے، ممکن ہے کہ خود واقدی غریب پر بھی جھوٹ بولا گیا ہو۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے متعلق ایسی لغو اور مکروہ بات نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ ایک صحابی بن صحابی کی زبان سے یہ کلمات نکلیں جو اللہ و رسول کے حکم کے مطابق سخت سزا کا مستحق بناتے ہیں، اور پھر ساری عمر آدمی کسی عدالت میں گواہی دینے کے قابل نہیں رہتا۔

کہاں ابن کثیرؒ کی وہ روایت جو اوپر نقل ہوئی جس میں صرف شربِ خمر اور ترکِ صلوٰۃ کا ذکر تھا اور کہاں یہ مردود اضافہ۔ پھر ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد کہ وہ امیر المؤمنینؒ کے خلاف کھڑا ہونا دین کی بنیاد پر حرام سمجھتے تھے، اور کہاں بلاذریؒ کا وہ بیان جو انھوں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن جعفرؓ کے بارے میں دیا ہے کہ وہ امیر المؤمنینؒ کی کیسی عزت کرتے تھے، اور ان سے انھیں کتنی محبت تھی۔ خدا اس شخص کو غارت کرے جس نے سیدنا

عبد اللہ بن حنظلہؓ کی طرف اس مردود قول کی نسبت کی ہے۔

تعجب ہے کہ واقدی کی روایات کی حیثیت جاننے کے باوجود سیوطی نے قرآن وحدیث سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔

لَوْلَا جَاءُوْا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوْا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولٰئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ۔ (النور۔ ۱۳)	کیوں نہ اس پر وہ چار عینی گواہ لائے۔ لہٰذا جب وہ گواہ نہیں لاسکے تو خدا کے نزدیک یہی لوگ ہیں جھوٹے۔"

ایک اور روایت ہے: (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، ج ۲، ص ۱۳۰) کہ مدینہ میں جب امیر یزید کے خلاف باتیں بنائی گئیں تو امیر مدینہ عباس بن محمد نے جو امیر المؤمنین یزید کے چچا کے فرزند تھے، اہلِ مدینہ کا ایک وفد دمشق بھیجا کہ اپنی آنکھوں سے سب حال دیکھ کر آئیں اس وفد میں یہی سیدنا عبد اللہ بن الغسیلؓ بھی تھے۔

ظاہر ہے کہ امیر عباسؒ کو امیر المؤمنینؒ کے کردار کی رفعت اور سیئات سے مبرّا ہونے کا ذاتی علم نہ ہوتا تو وہ یہ وفد ہی کیوں بھیجتے۔ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے جب یہ وفد بھیجا تو خود امیر المؤمنین کو بھی اطلاع کر دی ہوگی کہ ایک ایسا وفد آرہا ہے۔ اب احمق سے احمق شخص بھی ایسے مواقع پر دو چار دن کے لئے اپنی حالت درست کر لیتا ہے، یا کم ازکم اتنا اہتمام ضرور کرتا ہے کہ "تحقیقات" کے لئے جو لوگ آرہے ہیں انھیں مطمئن کر کے بھیجے۔ یہ لوگ گئے اور واپس آئے مگر اسی رنگ میں جس میں گئے تھے۔ وہاں ان کی خوب خاطر مدارات ہوئی، اور دل کھول کر انھیں روپیہ دیا گیا۔ جو انھوں نے قبول کر لیا اور حلال وطیب جانا۔ اب ملاحظہ ہو صحیح بخاری کی وہ حدیث جو حضرت ابن عمرؓ کے متعلق اوپر نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنے حشم اور آل کو اس ہنگامہ میں حصّہ لینے سے روک دیا تھا، اور اسے خدا اور رسول کے احکام کی صریح خلاف ورزی سے تعبیر کیا تھا۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے جہاں نقل کیا ہے وہاں باب باندھا ہے:

باب اذا قال عند قوم شیئاً ثم خرج فقال بخلافہ۔	"باب، کہ جب آدمی ایک قوم کے سامنے ایک بات کہے لیکن جب وہاں سے نکلے تو اس کے مخالف بات کہنے لگے۔"

غالباً یہ اس وفد پر چوٹ ہے کہ امیر المؤمنین سے انھوں نے کچھ کہا اور مدینہ آکر کچھ اور

کہنے لگے۔ پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ حضرت عبداللہ بن الغسیل رضؓ نے وہ لغو اور مردود باتیں نہیں کہی ہوں گی جو واقدی نے ان کے متعلق نقل کی ہیں۔ اور لوگوں نے ان کا حوالہ دیتے وقت خدا کا خوف نہیں کیا۔

کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ ان باتوں کا علم صرف اہلِ مدینہ کے بعض نوجوانوں ہی کو ہوا۔ خود اہلِ دمشق اور تمام امت ان امور سے قطعاً بے خبر رہی۔ یہ زمانہ طہماسپ صفوی یا آصف الدولہ کا تھوڑا ہی تھا۔ یہ زمانہ تھا پہلی صدی ہجری کا جب کہ صحابہ کرام کثیر تعداد میں موجود تھے، اور دین اپنی پوری آب و تاب سے برپا تھا۔

وفاتِ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت امیر المؤمنین معاویہؓ نے یکم رجب ۶۰ھ کو وفات پائی (۷ ، اپریل ۶۸۰ء)۔ سیدنا ضحاک بن قیسؓ آپ کا کفن ہاتھوں پر لئے ہوئے مسجد میں آئے اور منبر پر اوّل حمد وثنا کی، اور پھر فرمایا:

"معاویہؓ عرب کے ستون تھے، عرب کے پشتیبان تھے، اور عرب کے باپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعہ فتنہ کا قلع قمع کیا، اور اپنے بندوں پر انھیں حاکم بنایا۔ ان کے ذریعہ ممالک پر فتح نصیب کی۔ دیکھو! وہ وفات پا گئے، اور یہ ان کا کفن ہے۔ ہم اسی کفن میں انھیں لپیٹیں گے اور ان کی قبر میں رکھ دیں گے۔ اب وہ ہوں گے اور ان کے اعمال۔ اس کے بعد قیامت تک فتنے ہی فتنے ہیں۔ جو شخص اُن کے جنازہ میں شرکت کرنا چاہتا ہے وہ ظہر کے وقت حاضر ہو جائے۔"

خود سیدنا ضحاکؓ ہی نے نماز پڑھائی، اور امیر یزید کو اس واقعۂ ہائلہ کی اطلاع بھیج دی۔ امیر یزید اس وقت دمشق میں نہیں تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین نے سیدنا ضحاک بن قیس اور مسلم بن عقبہ کو بلایا، اور اپنے فرزند کے لئے جو وصیت نامہ مرتب کیا تھا وہ اُن کے سپرد کر دیا [خضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، ج ۲، ص ۱۲۲] وصیت نامہ کے الفاظ یہ ہیں:

یا بُنَیَّ انی قد کفیتک الشد والترحال ووطأت لک الامور وذللت لک الاعداء، واخضعت لک رقاب العرب وجمعت لک مالم یجمعہ احدٌ فانظر اہل الحجاز فانہم اصلک واکرم من قدم علیک منہم وتعاھد من

"بیٹا! میں نے تمھیں گھر بیٹھے ہی سب کچھ دیدیا (کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ پڑی) سارے معاملات تمھارے لئے درست کر دیئے دشمنوں کو تمھاری خاطر مغلوب کیا اور سارے عرب کی گردنیں تمھارے آگے جھکا دیں اور تمھارے لئے وہ کچھ اکٹھا کر دیا جو کسی نے نہ

غاب وانظر اہل العراق فان سألوک ان تعزل عنہم کل یوم عاملاً فافعل فان عزل عامل اسہل من ان یشہر علیک مائۃ الف سیف۔ وانظر اہل الشام فلیکونوا بطانتک وعیبتک فان رابک من عدوک شئ فانتصر بہم فاذا اصبتہم فاردد اہل الشام الی بلادہم فانہم ان اقاموا بغیر بلادھم تغیرت اخلاقہم۔

وانی لست اخاف ان ینازعک فی ھذا الامر الا اربعۃ من قریش الحسین بن علی، وعبداللہ بن عمر، وعبداللہ بن الزبیر، وعبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ فاما ابن عمر فانہ رجل قد وقذتہ العبادۃ فاذا لم یبق احد غیرہ بایعک، واما الحسین بن علی فھو رجل خفیف ولن یترکہ اہل العراق حتی یخرجوہ فان خرج وظفرت بہ فاصفح عنہ فان لہ رحماً ماسۃ وحقاً عظیماً وقرابۃ من محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

واما ابن ابی بکر فان رای اصحابہ صنعوا شیئاً صنع مثلہ لیس لہ ہمۃ الا فی النساء واللہو واما الذی یجثم لک جثوم الاسد ویراوغک مراوغۃ الثعلب فذاک ابن الزبیر فان ہو فعلہا فظفرت بہ فقطعہ ارباً ارباً واحقن دماء قومک ما استطعت۔

کیا ہوگا۔

اہلِ حجاز کا خیال کرنا تمھارا نکاس وہیں سے ہے۔ ان میں سے جو شخص تمھارے پاس آئے اس کی عزت کرنا، جو غائب ہو اس کی استمالت کی فکر رکھنا۔ اہلِ عراق پر توجہ رکھنا، اگر وہ تم سے روزانہ ایک عامل کو بدل دینے کی درخواست کریں تو ایسا کر ڈالنا۔ کیونکہ ایک عامل کا بدل دینا اس سے کہیں سہل ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف بے نیام ہو جائیں۔

اہلِ شام پر نگاہ رکھنا، انہی کو اپنا ہمراز و دمساز بنانا، کسی دشمن کی طرف سے خطرہ ہو تو انہی سے مدد لینا، اور جب ان لوگوں پر (یعنی دشمنوں پر) قابو پالو تو پھر اہلِ شام کو ان کے گھروں کو واپس کر دینا، کیونکہ یہ اپنے شہروں کے علاوہ کہیں اور رہیں گے تو ان کے اخلاق بدل جائیں گے۔

حکومت کے بارے میں تم سے اختلاف کرنے کا خطرہ مجھے کسی کی طرف سے نہیں سوائے قریش کے چار آدمیوں کے، یعنی حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔

ابن عمر ایسے شخص ہیں کہ عبادت نے انھیں نیم جان کر رکھا ہے۔ اگر سوائے ان کے اور کوئی شخص بیعت سے رکا نہ رہا تو وہ

کر لیں گے۔

حسین بن علی کم سواد شخص ہیں، اہلِ عراق ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک تمہارے خلاف کھڑا نہ کر دیں۔ اگر وہ خروج کریں اور تم ان پر قابو پالو تو معاف کر دینا، کیونکہ ان سے قریبی رشتہ ہے، ان کا بڑا حق ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ عزیز ہیں۔

ابن ابی بکر ایسے شخص ہیں کہ جو اپنے ساتھیوں کو کرتے دیکھیں گے وہی کرنے لگیں گے ان کے اندر ہمت نہیں، ان کی دلچسپی عورتوں میں اور کھیل تماشوں میں ہے۔ البتہ جو شخص تمہارے سامنے شیر کی طرح ڈٹے گا اور لومڑی کی طرح تم سے چالیں چلے گا، وہ ابن الزبیر ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں اور تم ان پر قابو پالو تو ان کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالنا۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنی قوم کا خون بہانے سے گریز کرنا۔"

خضری نے یہ وصیت نقل کی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے امیر المؤمنین معاویہ رضؓ جیسے امام الصحابہ کی طرف وصیت کا یہ مضمون کس طرح منسوب کرنا قبول کر لیا۔ از اول تا آخر یہ وصیت نامہ مصنوعی ہے، اور اس کا ایک لفظ بھی سیدنا معاویہؓ کے ہاتھ کا نہیں۔ سب سے اہم چیز جسے خضری جیسے شخص کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے تھا وہ سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکرؓ کا ذکر ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا عبدالرحمانؓ ۵۳ھ میں وفات پا چکے تھے، یعنی یہ وصیت لکھنے کے وقت سے سات برس پہلے۔ تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ حضرت امیر المؤمنین ان کا ذکر فرماتے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ولایتِ عہد کی بیعت کر لی تھی جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے۔ اور وہیں اس کی بھی وضاحت ہو گئی کہ خلافت کا جو تھوڑا سا خیال آپ کے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا وہ ام المؤمنین حضرت حفصہ علیہا السّلام نے ان کے دل سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا تھا۔ سیدنا معاویہؓ جانتے تھے کہ انھوں نے سیدنا علیؓ سے بیعت نہیں کی لیکن ان سے کر لی۔ لہٰذا ان سے اس کا خطرہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ جو عہد وہ علی رؤس الاشہاد مسجد نبوی میں کر چکے تھے اسے توڑ دیں گے۔ یہ نام بھی اس وصیت میں ہر گز نہیں ہو سکتا۔

جس شخص نے یہ وصیت نامہ وضع کیا ہے، چونکہ اس کے دل میں سیدنا معاویہؓ کی عظمت نہیں تھی، اور وہ انھیں ایک دنیادار حکمران سمجھتا تھا، جو اپنے بیٹے کی محبت میں دنیا و آخرت سے

بے نیاز ہو چکے تھے اس لئے اپنی ذہنیت کے مطابق اس نے یہ وصیت نامہ مرتب کر کے سیدنا معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کر دیا اور خضری جیسے لوگ اسے قبول کر بیٹھے۔

سبائیوں نے ولایتِ عہد کے مسئلہ کو جس طرح امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی ذاتی ہوس اور خاندانی خواہش کی نمود بنا دیا ہے۔ اسی کے ثبوت میں یہ مردود وصیت نامہ بھی مرتب کر دیا گیا، اور یہ کرامت سیدنا معاویہؓ کی ہے کہ اس وصیت نامہ کے مفتری مصنّف کو سیدنا عبدالرحمانؓ کا نام لکھتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس وقت زندہ نہ تھے۔

غالباً یہ وصیت نامہ کسی سبائی کا مرتب کردہ ہے جو اس نے اہل عراق کو ایسا متحد الخیال اور طاقتور دکھایا ہے کہ ہر موقع پر وہ ایک لاکھ تلواریں سُونت کر کھڑے ہو سکتے تھے، حالانکہ انھوں نے کسی اہم موقع پر سو دو سو تلواریں بھی نہیں سونتیں، بلکہ جس کسی کو بھی ورغلا کر حکومت کے خلاف کھڑا کیا اُسے عین وقت پر بے یار و مددگار چھوڑ کر گھر جا بیٹھے۔ ایسے مکار اور بزدل لوگوں کا رعب امیر المؤمنین معاویہؓ پر کیا ہو سکتا تھا، جو اپنی آنکھوں سے ان کے سب احوال دیکھے ہوئے تھے

اس وصیت نامہ میں سیدنا حسینؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ کے نام جو ٹانک دیئے گئے ہیں تو وہ بعد کے احوال دیکھ کر، ورنہ اس وقت ان دونوں میں سے کسی سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ امیر المؤمنین معاویہؓ نے عراق کے والیوں کو عراقیوں کے مطالبہ پر جلد جلد بدلنے کی وصیت کی ہو۔ آپ کو کیا یہ معلوم نہ تھا کہ کس طرح یہ لوگ امیر المؤمنین سیدنا عثمانؓ کے زمانہ میں اپنے ہر والی کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کی تبدیلی کا مطالبہ کیا کرتے تھے، اور انھیں کس قدر پریشان رکھتے تھے، اور حضرت امیر المؤمنینؓ کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیسا متمردانہ ہوا کرتا تھا۔ امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ نے رفعِ شر کے لئے ہر دفعہ ان کی بات مانی جس کے یہ ہولناک نتائج مرتب ہوئے کہ امت کا حال و استقبال تاریک ہو گیا۔ ان کو تو ضرورت صرف امیر حجاج بن یوسف جیسے والی کی تھی جنھوں نے ان کے سب کس بل نکال دیئے۔ امیر المؤمنین معاویہؓ جیسے مدبّر اور دور بین امام ایسی لغو وصیت کر سکتے تھے جو پچیس برس کے ذاتی تجربہ کے خلاف تھی؟

لہٰذا یہ وصیت نامہ اپنے ایک ایک جزئیہ کے ساتھ بالکل وضعی ہے، اور اس کے ایک حرف کی نسبت بھی امیر المؤمنین معاویہؓ کی طرف درست نہیں۔

موقف سیدنا حُسین رضی اللہ عنہ

کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کی وفات اور امیر المؤمنین یزیدؒ کے خلیفہ ہونے پر بارگاہِ خلافت سے امیرِ مدینہ سیدنا ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے پاس فرمان آیا (خضری: محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۲، ص ۱۲۴):

اما بعد فخذ حسیناً و عبد اللہ بن عمر و ابن الزبیر اخذاً لیس فیہ رخصۃ حتٰی یبایعوا والسلام۔	حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ ہے کہ حسین کو، عبد اللہ بن عمر کو، اور ابن الزبیر کو گرفتار کر لو اس میں رعایت کی اجازت نہیں تا آنکہ وہ بیعت کر لیں۔ والسلام

اب کہتے ہیں کہ امیرِ مدینہ نے ان حضرات کو بلایا۔ سیدنا حسینؓ نے سُنا تو فرمایا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"۔ پھر سیدنا معاویہؓ کے لئے دعا کی، اور بیعت کے متعلق فرمایا "مجھ جیسا شخص خفیہ طریقہ پر بیعت نہیں کیا کرتا، اور نہ ایسی پوشیدہ بیعت مفیدِ مطلب ہوسکتی ہے۔ آپ جب مجمع میں بیعت کا مطالبہ کریں گے تو ہمیں بھی بلا لیجیے گا۔ بات ایک ہی رہے گی" امیر ولید عافیت پسند تھے، انھوں نے آپ کو واپسی کی اجازت دیدی۔ حضرت ابن الزبیرؓ رات ہی کو مدینہ سے چل دیئے اور مکہ پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا تھا "میں نے بیت اللہ میں پناہ لی ہے۔" آپ نہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور نہ ان کے ساتھ ارکانِ حج ادا کرتے تھے، بلکہ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہوجاتے تھے۔

سیدنا حسینؓ ان کے بعد مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھ اپنے فرزندوں، بھائیوں اور بھتیجوں کو بھی لیتے گئے تھے، سوائے حضرت محمدؓ بن حنفیہ کے۔ انھوں نے خروج سے انکار کر دیا تھا، اور آپ کو بھی سمجھایا تھا کہ اس اقدام سے باز رہیں۔ لیکن آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔

حضرت ابن عمرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ "جب سب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کرلوں گا۔" چنانچہ جب سب نے بیعت کرلی تو وہ بھی بیعت میں داخل ہوگئے، اور حضرت ابن عباسؓ بھی۔

یہ تو بیان ہے علامہ خضری کا، لیکن روایتیں اور بھی کئی قسم کی ہیں۔ مثلاً امام ابوبکر بن العربیؒ نے العواصم من القواصم میں ایک روایت نقل کی ہے، اور اسے یک گونہ معتبر بھی بتایا ہے کہ جب مذکورہ بالا فرمانِ خلافت آیا تو امیر ولیدؒ نے سیدنا مروانؓ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے رائے

دی کہ "سیدنا حسین رضؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ کو بلا کر بیعت پیش کی جائے اور انکار کریں تو وہیں اُن کی گردن اُڑادی جائے" امیر ولید نے کہا "سبحان اللہ! حسین اور ابن الزبیر کو کس طرح قتل کیا جاسکتا ہے؟" لیکن حضرت مروان مُصر رہے کہ کرنا اسی طرح چاہئے ورنہ فتنہ پھیلے گا۔

بہر حال امیر ولیدؓ نے ان دونوں صاحبوں کو بُلایا۔ سیدنا حسینؓ سے تو کچھ نہ کہا، لیکن حضرت ابن الزبیرؓ سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے فرمایا ہم خفیہ بیعت نہیں کرتے سب کے سامنے علانیہ کریں گے۔ یہ کہہ کر آپ چلنے لگے، تو حضرت مروان نے آواز دی" پکڑنا یہ جانے نہ پائیں" حضرت ابن الزبیرؓ پلٹ پڑے اور انھیں گالی دی، وہ بھی گالی دے کر انھیں پکڑنے دوڑے، اور دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو گالیاں بھی دیتے جاتے تھے۔ امیر ولید نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دونوں کو اپنے سامنے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ دونوں چلے گئے، اور پھر سیدنا حسینؓ بھی نکل آئے"

یہ مردود روایت جسے امام ابن العربیؒ نے ایک گونہ معتبر بتایا ہے، کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ نہ صحابہ وتابعین ایسے بے وقار تھے کہ اس قسم کا جاہلانہ اور عامیانہ رویہ اختیار کرتے، اور نہ امیر ولید ایسے تدبّر نا آشنا تھے کہ اس شورہ پشتی کے باوجود سیدنا ابن الزبیرؓ کو نکل جانے دیتے۔ ان راویوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک حاکم بااختیار کے سامنے ایسی باتوں کا امکان کہاں ہے۔ اور اگر کوئی بات ایسی ہو تو ایک اشارہ میں مجرم کیفرِ کردار کو پہنچایا جاسکتا ہے۔

رہا سیدنا حسینؓ کی بیعت کا مسئلہ تو نہ العواصم کی اس مردود روایت سے واضح ہوتا ہے، اور نہ خضری کے بیان سے۔ العواصم کی روایت کے مطابق اگر سیدنا حسینؓ پر بیعت پیش ہی نہیں کی گئی تو بلایا کیوں تھا؟ اور خضری کے بیان کے مطابق اگر بیعت پیش کی تھی اور سیدنا حسینؓ نے یہ جواب دیا تھا کہ ہم خفیہ نہیں بلکہ مجمعِ عام میں بیعت کریں گے تو گویا جھوٹ بول کر فرار کی راہ ڈھونڈھی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سیدنا حسینؓ یا سیدنا ابن الزبیرؓ جیسے حضرات یہ مکاری کی بات کریں گے؟

پھر سوال ہے کہ مکہ بھی تو امیر المؤمنین یزیدؒ ہی کی قلمرو میں تھا، اور وہاں کے والی سیدنا عمرو بن سعید بن العاصؓ اموی کے پاس بھی تو بیعت لینے کے متعلق فرمان آیا تھا۔ انہیں یقیناً معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ دونوں صاحب بیعت کئے بغیر آئے ہیں تو انھوں نے ان سے بیعت کیوں نہیں لی؟ اور اگر انھوں نے بیعت نہیں کی تھی تو ان کے خلاف کوئی کارروائی

کیوں نہیں کی ؟

سیدھی بات جو ہر شخص کے سمجھ میں آسکتی ہے یہ ہے کہ بیعت لینے کا صرف عام فرمان آیا ہوگا، اور کسی کا نام خاص طور پر ہرگز نہ لیا گیا ہوگا۔ جب عام بیعت ہو جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ فلاں اور فلاں شخص نے بیعت نہیں کی۔ سیدنا عمروؓ نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان دونوں صاحبوں سے کچھ تعرض نہ کیا جائے

رہا ان دونوں بزرگواروں کا مکہ آنا تو ضروری نہیں کہ امیر ولید کو دھوکہ دے کر ہی ان ... کا آنا ہوا ہو۔ آدمی یوں بھی تو مکہ آسکتا تھا۔ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی وفات یکم رجب ۶۰ھ کو ہوئی تھی، اور یہ مہینہ عمرہ کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اقرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگوار پہلے ہی سے غالباً بہ نیت عمرہ مکہ آگئے تھے۔ امیر عمرو بن سعیدؓ نے اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں رکھا اور چونکہ اُن کی شخصی عظمت کا احترام تھا اس لئے بیعت پر اصرار کر کے فتنہ کو ہوا دینا پسند نہ کیا۔ کسی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں صاحبوں سے یا دوسرے غیر مبایعین سے مکہ میں بیعت پر اصرار کیا گیا ہو۔ اگر امیر المومنین کے نزدیک ان دونوں بزرگواروں سے بیعت لینا ضروری ہوتا تو یہ جہاں کہیں بھی ہوتے ان سے بیعت لی جاتی، اور نہ کرتے تو کم از کم اس کا انتظام کر دیا جاتا کہ ان سے کوئی شخص نہ مل سکے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بزرگوار پوری آزادی اور عزت و احترام کے ساتھ مکہ میں رہتے تھے۔ اور اس طرح ہرگز نہیں رہ سکتے تھے اگر مدینہ میں اُن کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا ہوتا جو روایتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

ہمیں خضری کی یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں کہ سیدنا ابن الزبیرؓ باقی مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے، یا ارکانِ حج ادا کرتے وقت اپنی ٹولی لے کر الگ ہو جاتے تھے۔ سیاسی اختلاف اپنی جگہ ہے اور آداب عباداتِ الٰہیہ اپنی جگہ۔ ان جیسے فقیہ اور سید الفقہاء سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ عبادات کے سلسلہ میں احکامِ نبویہ کو پسِ پشت ڈال دیں گے۔ قاتلانِ عثمانؓ سے زیادہ مردود اور کونسا گروہ ہو سکتا ہے۔ جب آپ کی شہادت کے بعد غافقی بن حرب نے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو امامت سے الگ کر دیا، اور خود نماز پڑھانے لگا تو صحابۂ کرام اس کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا نہیں ؟ اگر غافقی جیسے شخص کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے تو امیر عمرو بن سعیدؓ جیسے بے نظیر شخص کے پیچھے کیوں نہیں ہو سکتی ؟ حضرت ابن عباسؓ جب

خارجیوں کو سمجھانے گئے ہیں تو آپ نے اُن کے امام کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ لہٰذا ہم یہ ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ سیدنا ابن الزبیرؓ نے امیرِ مکہ کے ساتھ نماز پڑھنے یا حج کرنے سے گریز کیا ہوگا۔ اس وقت حضرت ابن الزبیرؓ کا کوئی گروہ نہیں تھا بلکہ اس کے ایک عرصہ کے بعد تک نہ بن سکا لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس قسم کی حرکت کریں، اور حکومت کی نگاہ میں یہ بات نہ آئے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ علامت کھلی ہوئی بغاوت کی تھی، اور امیر عمروؓ اسے کبھی برداشت نہ کرتے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا ابن الزبیرؓ نے اپنی طرف سے اس وقت تک دعوت نہیں دی جب تک امیر المؤمنین یزیدؒ کی وفات کی انھیں اطلاع نہ مل گئی۔ پھر ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ جب خود آپ کا مکہ پر غلبہ ہوگیا تو اس وقت سب آپ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اور آپ ہی کی قیادت میں حج کرتے تھے، اگرچہ بہت سے حضرات نے آپ سے بیعت نہیں کی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے احکام کہ ہر نیک و بد کے ساتھ نماز پڑھو، اور صحابہ کرام کے شعار کی موجودگی میں ہم خضری کا یہ بیان کسی طرح قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ سیدنا ابن الزبیرؓ نے شروع ہی سے ڈیڑھ اینٹ کی الگ جمالی تھی۔

ہمیں خلافتِ اسلامیہ کی بھی وہ حکمتِ عملی نظر نہیں آتی جو لوگ بیان کرتے چلے آرہے ہیں، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر المؤمنین یزیدؒ اور ان کے عمال نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو، اور نہ حقیقتاً ان کی طرف سے کوئی فتنہ کھڑا ہوا۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسینؓ اور حضرت ابن الزبیرؓ بیعت سے انکار کرکے یا امیرِ مدینہ کو دھوکہ دے کر مکہ چلے آئے تھے کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ وہ یقیناً بطورِ خود اور شاید بہ نیت عمرہ یا اپنے عزیزوں سے ملنے مکہ آئے تھے۔ اور یہاں امیرِ مکہ سیدنا عمرو بن سعیدؓ نے ان دونوں کو امن و عافیت کے ساتھ رہنے دیا اور ان سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا۔ مکہ میں ان سے بیعت پر اصرار نہ کرنا اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ امیر المؤمنین یزیدؒ نے ان سے بیعت لینے کا کوئی حکم نہیں بھیجا تھا۔ پچھلے سیاسی احوال کا بھی تقاضہ یہی تھا کہ انھیں چھیڑا نہ جائے۔ اگر مکہ امیر المؤمنین یزید کی حکومت میں نہ ہوتا تب بھی ایک بات تھی۔ اس لئے ہمیں ان روایتوں کے اس طرح منقول ہونے پر سخت تعجب ہے۔

ابتداءً سیدنا حسینؓ اور سیدنا ابن الزبیرؓ بالکل خاموش بیٹھے تھے، اور کسی قسم کی کوئی بے چینی نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ دونوں حصولِ خلافت کے خیالات

پکار رہے ہوں لیکن اس کا عملی ثبوت کوئی نہیں۔ کم از کم سیدنا حسینؓ کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے اُن کے سیاسی عزائم ظاہر ہوں۔ کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ نے اپنے نام نہاد شیعوں سے ربط قائم کرنے کی کوئی کوشش کی ہو۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ آپ سے ربط قائم کرنے کی ابتدا، سبائیوں نے کی تھی۔ اگر یہ مفسد لوگ آپکو خاموش بیٹھا رہنے دیتے تو امت اس فتنہ سے محفوظ رہتی جس نے تیرہ سو برس سے اسے آماجگاہِ مصائب بنا رکھا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے جس کی کسی طرح تردید نہیں کی جا سکتی کہ آپ اپنے عم بزرگوار سیدنا ابن عباسؓ کے پاس بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اور حکومت کی طرف سے پوری طرح آپ کا اعزاز واکرام تھا، کہ کوفیوں کے خطوط آپ کے پاس آنے لگے۔ لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کی اس تحریک کی پذیرائی میں سبقت کی ہو۔ اس پر تو آپ کو بڑی مشکل سے پے بہ پے خط اور یکے بعد دیگرے وفد بھیج کر تیار کیا گیا۔

وہ سبائی لوگ جو اس قسم کے خط لاتے تھے انھوں نے طرح طرح آپ کو باور کرایا کہ پورا ملکِ عراق اموی خلافت کے خلاف اندرونی طور پر منظم ہے۔ اگر کسر ہے تو صرف آپ کے پہنچنے کی ہے۔ آپ کوفہ تشریف لائیں تو ہم وہاں کے والی کو نکال کر آپ کی خلافت کا اعلان کر دیں۔ ان لوگوں نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ گویا جس طرح امیر المؤمنین علیؓ کی بیعت سے ملک شام منکر تھا، اسی طرح امیر المؤمنین یزیدؒ کی بیعت توڑ دینے پر عراق متحد ہے۔

جب اُن کے بہت زیادہ خط آئے، اور کوفیوں کی طرف سے بہت الحاح ہوا تو آپ نے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو بھیجا کہ صورتِ حال کا اچھی طرح مطالعہ کر کے امر واقعی سے مطلع کریں۔ سیدنا مسلمؓ کی طرف سے جو خط موصول ہوا اس سے پتہ چلا کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ اور ہر طرح تیاری مکمل ہے۔ بس آپ فوراً تشریف لے آئیں۔ بعض روایتوں کے مطابق اس خط میں ساٹھ ہزار آدمیوں کی بیعت کی اطلاع دی گئی تھی۔

ساٹھ آدمی حج کے بہانے آپ کو لینے آئے تھے۔ انھوں نے اور بھی معاملہ پختہ کر دیا۔ یوں تمام مخلصوں، بزرگوں، ہمچشموں اور خوردوں کے مشورے کے خلاف بلکہ اجنبی لوگوں کے بھی یہ کہنے کے باوجود کہ آپ عراقیوں پر بھروسہ نہ کریں۔ اور ایک غلط اقدام سے امت کے لئے موجب فتنہ نہ بنیں، آپ نے ان مکار عراقیوں کی بات کو صحیح باور کر لیا اور حج کے بعد کوفہ کو روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۱ر ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کا ہے۔ گویا آپ کو ہموار کرنے کے لئے ان عراقیوں کو چھ مہینے

محنت کرنی پڑی۔

دوستوں اور بہی خواہوں کا مشورہ آپ نے کیوں قبول نہ کیا۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ان سبائی نمائندوں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ مکہ کے لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دور بیٹھے کا اندازہ ہے، انھیں اندرونی احوال معلوم نہیں۔ ہم جو آپ کے فدائی ہیں اصل صورتِ حال جانتے ہیں۔ پے بہ پے خط اور وفد اور آخر میں ساٹھ کوفیوں کا آپ کو لینے آنا اور اس سب پر مستزاد حضرت مسلم بن عقیلؓ کا خط، ایسی باتیں تھیں جن کے سبب آپ کو یقین ہو گیا کہ واقعی عراق آپ کی حمایت پر متفق ہے۔

اب ناسخ التواریخ کے ایرانی مؤلف کی زبانی پچھلے لوگوں اور مؤرخوں کی بیان کردہ وہ روایت ملاحظہ ہو جو انھوں نے سیدنا حسینؓ کے مکہ سے روانہ ہونے کے سلسلہ میں بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ساٹھ کوفیوں نے کس طرح آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ موجودہ حکومت کے خلاف عراق بالکل منظم ہے۔ اور آپ کے وہاں پہنچتے ہی آپ کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے گا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ خلافت آپ کو مل ہی گئی، اور آپ تمام امت کے خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ صرف کوفہ پہنچنے کی دیر ہے۔ ان لوگوں نے خلافت کا حصول ایسا یقینی اور حتمی بنا دیا تھا کہ گویا امیر المومنین یزید ختم ہو گئے اور آپ ہی اب سب کچھ ہیں۔ آپ کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہو چکا ہے۔ جس کے ثبوت میں مسلم بن عقیلؓ کا خط پہنچ چکا تھا کہ ہزارہا آدمیوں نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ عبارت یہ ہے [ناسخ التواریخ، ج ۶، کتاب دوم، طبع ایران]

چون حسین علیہ السلام از مکہ بیرون شد و چند میل طی مسافت فرمودہ بمنزل تنعیم رسید، کاروانے را نگریست کہ مبلغے برو یمانی و پارۂ وَرس و بعضے اشیاء نفیسہ حمل میداد و این جملہ را بحیرؔ بن یسار حمیریؔ کہ عامل یمن بود بنزدیک یزید انفاذ داشتہ بود۔	جب حسین علیہ السلام مکہ سے باہر نکلے، اور چند میل کی مسافت طے کر کے منزلِ تنعیم تک پہنچے تو آپ نے ایک قافلہ دیکھا جو کچھ یمنی چادریں اور خوشبوئیں اور بعض نفیس اشیاء لے جا رہا تھا۔ عامل یمن بُحَیر بن یسار حمیری نے یہ سب مال یزید کے پاس روانہ کیا تھا۔
حسین علیہ السلام کہ رتق و فتق امورِ مسلمانان از جانب خدائے خاص	حسین علیہ السلام کہ مسلمانوں کے تمام امور کی شکست و ریخت خدائے تعالیٰ

او بود، آن حمال را ما خود داشت، و شتربانان را فرمود کہ اگر خواہید با ما سفر عراق می کنید شتران خود را بہائے کری او ما بستانید و اگرنہ بہائے کری تا اینجا کہ حمل دادہ اید بگیرید و باز شوید۔ جماعتے ملازمت رکاب آنحضرت اختیار کردند و گروہے بہائے کری بگرفتند و باز شدند۔	کی طرف سے خاص انھیں تفویض ہوئی تھی، انھوں نے تمام سامان پر قبضہ کرلیا اور شتربانوں سے فرمایا چاہو تو ہمارے ساتھ عراق چلو، اور اپنے اونٹوں کا کرایہ ہم سے لو ورنہ یہاں تک لانے کا کرایہ لیکر واپس چلے جاؤ۔ ایک جماعت نے آپ کی معیت اختیار کی، اور ایک گروہ اپنا کرایہ لے کر واپس ہوگیا"۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوفیوں نے سیدنا حسینؓ کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے تھے۔ اور عراق کی صورتِ حال کا کیسا نقشہ پیش کیا تھا کہ آپ نے اتنا بڑا اقدام کرلیا جو دنیا کی کسی دینی یا لادینی حکومت کے لئے قابلِ برداشت نہیں ہوسکتا۔ اور سوائے کھلی بغاوت کے اور فساد فی الارض کے، اسے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے ہمیں اس روایت کے قبول کرنے میں تامل ہے، اگرچہ بکثرت لوگوں نے اسے نقل کیا ہے۔ ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ سیدنا حسینؓ جیسے امام الاتقیاء اپنی حیثیت عرفی کا عیاناً مشاہدہ کئے بغیر اور پھر باقاعدہ منضبط حکومت بنائے بغیر، اور پھر کھلم کھلا اعلانِ جنگ کئے بغیر اس قسم کا اقدام کر بیٹھتے۔ کسی روایت کا بکثرت منقول ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں جب تک قرائن موجود نہ ہوں۔ ایسی سیکڑوں واہی روایتیں ہیں جو پیہم و متواتر بیان ہوتی چلی آرہی ہیں لیکن تحقیق پر بے اصل ثابت ہوئیں۔ اسی قسم کی یہ روایت بھی معلوم ہوتی ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ صاحبِ ناسخ التواریخ نے اسے اپنا یہ مخصوص عقیدہ بیان کرنے کے لئے لکھا ہے کہ سیدنا حسینؓ کو خدا کی طرف سے "رتق و فتق امور مسلمانان" دیا گیا تھا۔ محض اس کی دلیل میں یہ مکروہ واقعہ نقل کردیا تاکہ اہلِ اسلام کے قلوب اہلِ بیت کی طرف سے متنفر ہوجائیں۔ اور وہ سمجھیں کہ یہ لوگ شروع ہی سے مفسدانہ اور متمردانہ کارروائیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان لوگوں کی بیان کردہ منقبتیں بھی بطرز ذم ہوتی ہیں۔ ثابت تو کرنا چاہتے ہیں کہ فاطمیوں میں سے چند لوگوں کو خدا کی طرف سے حکومت ملی تھی، اور دلیلیں لاتے ہیں ایسی۔

بہرحال جب آپ کچھ مسافت طے کرچکے تو آپ کو اطلاع ملی کہ عراق میں اموی حکومت

بدستور قائم ہے اور اس کے استحکام میں کوئی فرق نہیں۔ مسلم بن عقیلؓ کو بغاوت کے جرم میں قتل کیا جا چکا ہے، اور ان بیعت کرنے والے ہزاروں آدمیوں میں سے ان کی مدد کے لئے ایک شخص بھی سامنے نہیں آیا۔ ہانی بن عروہ مرادی جن کے ہاں حضرت مسلمؓ نے پناہ لی تھی انھوں نے عربی آداب کے تحت حضرت مسلمؓ کو حکومت کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا تھا تو انھیں بھی اعانتِ جرم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔

حضرت مسلم بن عقیلؓ کے قتل کے سلسلہ میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں ہمیں اُن کی تفصیلات سے کچھ بحث نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ تاریخی حقیقت دیکھنی ہے کہ وہ جب قتل ہوئے تھے تو تنہا تھے۔

سیدنا حسینؓ نے اس صورتِ حال سے واقف ہو کر واپس جانے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن جو عراقی آپ کو لینے آئے تھے انھوں نے پھر یقین دلایا کہ آپ کی حیثیت مسلمؓ کی سی نہیں، آپ کی تو صورت دیکھتے ہی لوگ آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ چلے چلئے۔ ادھر بنو عقیل نے کہا کہ جب تک خونِ مسلمؓ کا بدلہ نہیں لے لیں گے ہمیں چین نہیں آئے گا، اس لئے آپ نے کوفہ کا سفر جاری رکھا۔

ہمارا خیال ہے کہ کوفہ میں حضرت مسلمؓ کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار یا بقولِ بعض ساٹھ ہزار آدمیوں کا بیعت کرنا محض فرضی بات ہے۔ اور حضرت مسلمؓ کا جو خط اس بارے میں بیان کیا جاتا ہے وہ ممکن ہے مصنوعی ہو۔ سبائیہ کے لئے جعلی خط بھیجنا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کوفہ ایک سرحدی چھاؤنی تھی، اور یہ ناممکن ہے کہ وہاں کے احوال کی نگرانی میں کوئی کمی رکھی گئی ہو۔ بلادِ عجم کی دیکھ بھال کے لئے عراقیوں کی مفسدانہ ذہنیت کی موجودگی میں سبائیوں کی ریشہ دوانیوں سے حکومت غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ دارالحکومت میں اٹھارہ ہزار آدمیوں کا کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور حکومت کا اس سے بے خبر رہنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے سو دو سو آدمیوں نے ایسی بیعت کر لی ہو لیکن افشاء راز ہو گیا۔ اور امیر عبیداللہ کو حضرت مسلم بن عقیلؓ کو گرفتار کر لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

یہ جو ساٹھ کوفی سیدنا حسینؓ کو لینے آئے تھے یہ سب کارروائی ان کی اور ان کے چند ساتھیوں کی معلوم ہوتی ہے، ورنہ حقیقتِ حال جو سامنے آئی اور جو سب کے نزدیک مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا حسینؓ کے پاس جو خطوں کا انبار تھا وہ آپ نے جب اہلِ کوفہ کے سامنے

ڈالا ہے اور کاتبوں کا نام لے لے کر پکارا ہے تو سب اس سے منکر ہو گئے تھے کہ انھوں نے آپ کو اس قسم کے خط بھیجے تھے۔ ان لوگوں کا یہ انکار اگر امیر عبید اللہ کے نزدیک مسلّم نہ ہوتا تو حادثہ کربلا کے بعد ان سب کو ختم کر دیا جاتا، اور اُن کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جاتا جو بعد کے احوال کے پیشِ نظر امیر حجاج بن یوسف نے اہلِ عراق کے ساتھ روا رکھا تھا۔

سیدنا حسین رض کو بلانا اور ان کے سامنے خیالی صورتِ حال کو واقعی بنا کر پیش کرنا چند آدمیوں کا کام معلوم ہوتا ہے نہ کہ اہلِ کوفہ کی معتد بہ جماعت کا۔ علامہ خضری نے محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (ج ۲، ص ۱۲۵) میں اس سیاسی اختلال کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اگرچہ اُن کا خیال یہی ہے کہ واقعی اٹھارہ ہزار آدمیوں نے حضرت مسلم رح سے بیعت کی تھی لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ ان خط لکھنے والوں کا جب نام پکارا گیا اور انھوں نے انکار کیا تو امیر عبید اللہ نے ان مجرموں کے خلاف کیا کارروائی کی۔ کیونکہ سیدنا حسین رض کا انھیں نام لے لے کر پکارنا ان کے خلاف اہم ترین شہادت تھی۔

اب سوال ہوتا ہے کہ یہ سبائی لوگ جب مکہ آ آ کر سیدنا حسین رض کو خروج پر ابھار رہے تھے، تو حکومت نے اس کی روک تھام کیوں نہیں کی۔ یہ تو کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ امیر عمرو بن سعید رض سا یگانہ روزگار والی ان کارروائیوں سے بے خبر رہ سکتا تھا اس لئے سوائے ایک وجہ کے اور کچھ نہیں کہ سیدنا حسین رض کا شخصی احترام مدنظر تھا اور حضرت امیر سمجھتے تھے کہ آپ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جو سراسر نصوصِ شرعیہ کے خلاف ہو۔ پھر ان کا گمان ہو گا کہ ان بے ننگ و نام لوگوں کی بجائے آپ اپنے بزرگوں اور مخلصوں کی رائے کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ حضرت امیر جانتے تھے کہ سیدنا ابن عباس رض حکومت کے کس طرح وفادار اور اموی خلافت کے کیسے حامی ہیں۔ اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رض کو امیر المومنین یزید رح سے کتنی محبت ہے، اور ان کے کردار کو وہ کتنا عظیم سمجھتے ہیں۔ پھر سیدنا ابن عمر رض جیسے مخلص اور شیخ الصحابہ کا موقف بھی وہ جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ غدار عراقیوں کا جادو چل سکے گا۔ جو لوگ اس عہد کو ظلم و جبر اور بے دینی کا دَور سمجھتے ہیں کیا وہ اس کی کوئی توجیہ کر سکتے ہیں کہ امیر عمرو بن سعید رض نے سیدنا حسین رض کے ساتھ یہ مراعات کیوں برتیں؟

سیدنا حسین رض اور ان کے ساتھی روانہ اس وقت ہوئے جب حج سے واپس جانے والے ہزارہا آدمی اپنے گھروں کو جا رہے تھے، اس لئے آپ کو بھی چپکے سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔

لیکن اس اقدام پر بھی حکومت نے جبر و زور کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سیدنا عمرو الاشدقؒ کو جب سیدنا حسینؓ کے اس طرح روانہ ہو جانے کی اطلاع ملی تو سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ اور اپنے بھائی حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کے ہاتھ انھوں نے اپنا مہر شدہ امان نامہ آپ کے پاس بھیجا کہ واپس تشریف لے آئیں اور بدستور عزت و احترام سے مکہ میں مقیم رہیں۔ اور اس اقدام سے گریز فرمائیں جو امت کے لئے ہلاکت آفریں ہو گا۔ لیکن یہ سب کوششیں رائگاں گئیں، اور حضرت یحییٰؒ صرف اتنا کہہ کر واپس آگئے کہ خدا سے ڈریئے اور امت میں افتراق پیدا مت کیجئے، ایسا نہ ہو کہ پھر آپ کے حقوق کی پاسداری نہ کی جاسکے۔

اس واقعہ سے بھی یمنی قافلہ کو لوٹنے کی تغلیط ہوتی ہے۔ اگر سیدنا حسینؓ نے اس قافلہ کو لوٹا ہوتا جو بیت المال کا سامان لے کر دمشق جارہا تھا تو پھر امیر مکہ کے پاس کوئی حجت نہ رہتی اور وہ دست اندازی پر مجبور ہوتے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح واہی روایتیں شہرت پاگئی ہیں۔

بہرحال بار بار واپسی کا قصد کرنے کے بعد جب سیدنا حسینؓ کوفہ کے قریب پہنچے، اور امیر عبیداللہ کا فوجی دستہ سامنے آیا جس میں سب کے سب عراقی تھے تو آپ نے عیاناً دیکھ لیا کہ آپ کے ساتھ کیسا زبردست فریب کیا گیا تھا۔ اور بے بات کی کیسی ہوا باندھی گئی تھی۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ امت کا جو اجماع ہو چکا تھا اس میں کوئی خلل نہیں اس لئے آپ نے اپنا رُخ موڑ کر دمشق کی راہ لی۔

تمام اہلِ تاریخ متفق ہیں کہ جب کوفہ میں آپ گھیر اگیا ہے، اور آنے کا مقصد دریافت کیا گیا ہے تو آپ نے فرمایا "میں خاموش بیٹھا تھا لیکن تم لوگوں نے مجھے بلایا۔ اب اگر میرا آنا گوارا نہیں تو مجھے واپس جانے دو۔" وہ لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے اور نہ ہونا چاہئے تھا، تو آپ نے فرمایا کہ "میں دمشق جاتا ہوں کہ اپنے چچا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہاتھ دیدوں۔" یہ باتیں تاریخ کی چھوٹی بڑی ہر کتاب میں موجود ہیں اور قرینِ قیاس ہیں، اس کی عقلی دلیل موجود ہے، اور موافقِ اہلِ بیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ امیر عمر بن سعدؒ اور امیر عبیداللہ بن زیادؒ، دونوں اس آخری شرط پر راضی ہو گئے۔ کیونکہ یہی اقدام موجبِ برکت تھا اور اسی میں امت کی فلاح و صلاح تھی۔

گویا یہ پہلا موقعہ تھا کہ آپ کے سامنے بیعت کا مسئلہ رکھا گیا۔ اگر اب بھی اس پر اصرار

نہ ہوتا تو کب ہوتا۔ حکومت جتنی طرح دے سکتی تھی اتنی اس نے دی، اور استمالت کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے وہ سب امیر المؤمنین کے نمائندوں نے اختیار کیے۔ انھوں نے سیدنا حسینؓ کی عزت و حرمت برقرار رکھنے میں حد سے زیادہ تجاوز کیا، اور اس وقت تک آپ سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا جب تک آپ عیاناً مقابلہ پر نہ آگئے، اور خود اپنی زبان سے کوفیوں کی تمام ریشہ دوانیوں کا اقرار نہ کر لیا۔ علمِ سیاست کا معمولی سے معمولی طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ طرح دینا ناممکن ہے۔

اب دو باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کے نتیجہ میں سیدنا حسینؓ اور اہلِ بیت کی شہادت کا المناک حادثہ رُونما ہوا۔

ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ امیر عبیداللہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپ اپنے موقف سے رجوع کر چکے ہیں تو امیر کوفہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے دمشق تشریف لے جائیں۔ آپ نے اسے اپنی ہتکِ عزت سمجھا، اس پر راضی نہیں ہوئے، اور فرمایا "اس سے تو موت بہتر ہے" اس کے نتیجہ میں جنگ ہوئی، اور آپ شہید کر دیئے گئے۔

اگر دیکھا جائے اور امر واقعہ بھی یونہی ہو تو امیر عبیداللہ کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا۔ امیر کے ہاتھ پر بیعت اس کی ذات سے نہیں ہوتی بلکہ امام سے ہوتی ہے۔ امیر کی اطاعت امام ہی کی اطاعت ہے۔ جو شخص امام کی بیعت پر تیار ہو اسے امیر کے ہاتھ پر بیعت سے گریز کی گنجائش نہیں۔ شریعت کا یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے اور ناممکن ہے کہ سیدنا حسینؓ کی نگاہ سے پوشیدہ ہو۔ آپ اس پر خود بھی عمل کرتے تھے۔ سیدنا حسنؓ کی وفات کے بعد ان کی نمازِ جنازہ حضرت امیر مروانؓ نے پڑھائی تھی، حالانکہ رشتہ کے لحاظ سے یہ حق سیدنا حسینؓ کا تھا کہ بالغ عصبات میں اس وقت آپ ہی اقرب تھے۔ لیکن آپ نے اسے پسند کیا کہ نمازِ جنازہ امیر پڑھائیں۔ ویسے بھی تمام نمازوں میں سیدنا حسنؓ اور آپ امیرِ مدینہ ہی کی اقتدار کیا کرتے تھے۔

ہمیں امیر المؤمنین محمد الامام المہدیؒ کے عہد کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ امیرِ مدینہ نے ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پر امیر المؤمنین کے ایک عباسی عزیز کو امامت کے لئے کھڑا کر دیا تو بارگاہِ خلافت سے اس پر تنبیہ ہوئی تھی۔ کہ تم اس وقت اپنے باپ کی نیابت نہیں کر رہے تھے بلکہ میرے نائب تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من اطاع امیری فقد اطاعنی" (جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے یہ اطاعت میری کی)۔ لہٰذا یہ بات

سمجھ میں نہیں آتی کہ امیر المؤمنین یزید کی بیعت پر تیار ہو جانے کے باوجود سیدنا حسینؓ نے امیر عبیداللہ سے بیعت کو اپنی ہتکِ عزت سمجھا ہو۔ دمشق کے باہر جتنے صحابہ کرام تھے رضی اللہ عنہم سب نے اپنے اپنے امیر ہی کے ہاتھ پر تو بیعت کی تھی۔ پھر امیر عبیداللہ سے بیعت کرنے کے مقابلہ میں موت کیوں بہتر ہوتی، اور نصوص کی موجودگی میں آپ یہ بات کیوں فرماتے [صحیح بخاری: ج ۲، کتاب الاحکام]

عن ابن عباس یرویہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من رأی من امیرہ شیئاً فکرہہ فلیصبر فانہ لیس احدٌ یفارق الجماعۃ شبراً فیموت الامات میتۃ جاھلیۃ۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا کہ "اگر کوئی شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جو اُسے ناگوار ہو تو چاہئے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص ایک بالشت کی برابر بھی جماعت سے ہٹ کر مرے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔"

لہٰذا ہمیں یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ امیر عبیداللہ نے آپ کو اوّل اپنے ہاتھ پر بیعت کے لئے بلایا ہو اور آپ نے اس سے انکار کیا ہو، اور اس کے نتیجہ میں جنگ ہوئی ہو۔ ہمارے نزدیک امیر عبیداللہ نے یہ مطالبہ ہی نہیں کیا، اور اگر کرتے تو سیدنا حسینؓ ضرور بیعت کر لیتے۔ مؤرخوں نے امیر المؤمنین یزید کا فرمان نقل کیا ہے جو آپ نے سیدنا حسینؓ کے خروج کی اطلاع پا کر امیرِ کوفہ کو بھیجا تھا:

قد بلغنی ان الحسین بن علی نحو العراق فضع المناظر والمسالح واحترس ... علی الظن وخذ علی التہمۃ غیر ان لا تقتل الا من قاتلک واکتب الیّ فی کل ما یحدث من الخبر (طبری: ج ۴ ص ۲۸۶، طبع مصر ۱۳۵۸ھ)

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسین عراق کی طرف روانہ ہو چکے ہیں، تم مخبروں کو مقرر کر دو، چوکیاں قائم کر دو، اور پہرے کا انتظام کر دو، جس سے بدگمانی ہو اسے قید کر دو، کسی کی مخبری کی جائے تو اسے گرفتار کر لو۔ لیکن کسی کو قتل مت کرنا تا آنکہ کوئی تم سے لڑنے کھڑا نہ ہو جائے۔ جس قسم کی تمھیں اطلاعات پہنچیں اور واقعات رُونما ہوں مجھے مطلع کرتے رہو۔"

اس فرمان کی موجودگی میں اس کا امکان نہ تھا کہ امیر عبیداللہ کی طرف سے کوئی اقدام ایسا ہو جس کا نتیجہ جنگ نکلے۔ پھر اس وقت تک حکومت نے جس طرح پاسداری کی تھی، اور محض آپ کی شخصیت کا خیال کر کے علمی سیاست کے اصول قربان کئے تھے۔ اس عمل کا تقاضہ

بھی یہی تھا کہ امیر عبید اللہ کی طرف سے رفعِ شر کی کوشش ہو، اور جب یہ کوشش بار ور ہوگئی تھی اور آپ بیعت کے لئے دمشق جانے پر راضی ہوگئے تھے تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ پر بیعت کا شوشہ چھوڑا ہو۔ وہ تو اس پر نہایت مسرور تھے کہ آپ دمشق تشریف لے جارہے ہیں۔

لہٰذا جنگ کا ہمیں کوئی اور سبب تلاش کرنا چاہیے۔ ہمیں قرینِ قیاس یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بات اچانک ہوئی اور کسی غلط فہمی کے تحت جنگ چھڑ گئی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ (انگریزی)، کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ امیر عبید اللہ اور سیدنا عمر بن سعد نے آپ سے مطالبہ کیا کہ چونکہ آپ بہ نیت صلح و آشتی تشریف لے جارہے ہیں، اس لئے زائد ہتھیار اور فوجی سازوسامان حکومت کے سپرد کرتے جائیں۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اچانک آپ کے ساتھیوں نے سرکاری فوجی دستہ پر حملہ کردیا۔ ممکن ہے کہ یہ حرکت بنو عقیل نے اپنے جوش میں کی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے ساتھیوں نے ایسا کیا ہو۔ چونکہ یہ حملہ اچانک اور پوری قوت سے کیا گیا اس لئے لڑائی چھڑ گئی، اور سرکاری دستہ نے بھی جواب دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ستّر آدمی سیدنا حسین رضؓ کی طرف کے اور اسّی آدمی سرکاری فوجی دستہ کے کام آئے۔ یہ قضیہ نامرضیہ اور واقعہ ہائلہ گھنٹہ دو گھنٹہ میں ختم ہوگیا۔

یہ حرکت بعینہ وہ تھی جو سبائیوں نے جنگِ جمل کے موقع پر کی تھی کہ عین اس وقت جب صلح ہوگئی جنگ چھیڑ دی، اور یوں بے وجہ دونوں گروہوں میں تصادم ہوگیا۔ چونکہ جارحانہ حملہ کی ابتدا، سیدنا حسین رضؓ کے ساتھیوں کی طرف سے ہوئی تھی اس لئے حکومت نے ان کے ساتھ باغیوں کا سا سلوک کیا، اور سیدنا حسین صلوات اللہ علیہ کا سر مبارک امیر عبید اللہ کے سامنے پیش کیا گیا [صحیح بخاری: ج ۲، ص ۳۰۶، طبع مصر]۔ سر مبارک کے دمشق بھیجے جانے کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔

عن انس بن مالک رضؓ اُتِیَ عبید اللہ بنُ زیاد برأس الحسینؓ .... فجُعِلَ فی طَستٍ فجعَلَ ینکُتُ وقال فی حُسنہ شیئاً فقال انسؓ کان اشبھھم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان مخضوباً بالوسمۃ۔

"سیدنا انس بن مالک رضؓ سے مروی ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کے سامنے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا اور ایک طشت میں رکھا گیا وہ اُسے چھوتے جاتے تھے اور ان کے حُسن کی تعریف کرتے تھے۔ سیدنا انس رضؓ نے فرمایا کہ آپ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اس وقت آپ کے وسمہ کا خضاب تھا"

یہ گستاخانہ حرکت غلط فہمی کے سبب ہوئی تھی۔ اصل واقعہ جب معلوم ہوا تو کمالِ احترام

کے ساتھ اسے دفن کر دیا گیا۔ یہ جو لوگوں نے اس سلسلہ میں الم انگیز تفصیلات دی ہیں، اور جن میں برابر اضافہ کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی خیال آرائی کے ذریعہ رونے رُلانے کا انتظام کیا جاتا ہے اس قسم کی باتیں قطعاً نہیں ہوئیں ۔ ۔ ۔ ۔ بس اتنا ہی ہوا جتنا ہنگامہ میں ہو جاتا ہے۔ جو زخمی تھے ان کا علاج کیا گیا مثلاً سیدنا زید بن حسن بن علی بن ابی طالب، یا سیدنا حسن بن حسن بن علی جو حسن المثنیٰ کہلاتے ہیں۔ جو حضرات جنگ میں شامل نہیں تھے وہ محفوظ رہے مثلاً سیدنا علی زین العابدین صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

حرم محترم اور ان تمام اہلِ بیت کو عزت و احترام کے ساتھ دمشق بھیج دیا گیا جہاں امیر المؤمنین یزید نے ایک غمزدہ شفیق چچا کی طرح ان کا استقبال کیا۔ عرصۂ دراز تک اپنے پاس محبت و شفقت کے ساتھ رکھا، اور پھر ان حضرات کی خواہش کے مطابق حفاظتی دستہ کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا۔ ہر طرح ان کی دلجوئی کی، اور ان حضرات نے بھی ساری عمر ان کے ساتھ محبت اور وفاداری کا تعلق قائم رکھا، سیاسی اختلاف کا کوئی اثر ہاشمی اور اموی سادات نے باہمی محبت والفت اور قرابت کے معاملہ میں کبھی نہیں لیا۔ بعد کے واقعات اس کے شاہد ہیں اور روایات کے اس طومار سے انھیں دبایا نہیں جا سکتا، اور نہ تلبیس و افترا سے یہ باتیں کہیں چھپتی ہیں۔ ان نسلوں کو کیسے ختم کر دیں گے جن کی رگوں میں ہاشمی اور اموی خون دوڑ رہا ہے۔

بے شک حادثۂ کربلا میں جارحانہ اقدام سیدنا حسینؓ کے ساتھیوں کی طرف سے ہوا تھا لیکن یہ آپ کے منشاء کے تحت نہ تھا، آپ تو جس طرح صورتِ حال کا عینی مشاہدہ کر کے اپنے موقف سے رجوع فرما چکے تھے، اس کے مطابق زائد اسلحہ بھی حکومت کو یقیناً سپرد کر دیتے، کیونکہ آپ کا دل صاف تھا، اور سبائیوں کا سب مکر و فریب آپ پر کھل گیا تھا۔ اس لئے کربلا کے خونچکاں واقعہ کو ایک المناک حادثہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ کہنا واقعات ثابتہ کے خلاف ہوگا، کیونکہ اس تصادم کی ذمہ داری طرفین پر نہیں۔ اگر ہے تو صرف سبائیوں پر۔ صحابہ کرام اور اہلِ بیت اطہار نے نہ سیدنا حسینؓ اور امیر المؤمنین یزید کو اس کا ذمہ دار سمجھا، نہ امیر عبیداللہ کو اور نہ سیدنا عمر بن سعد کو رضی اللہ عنہم اجمعین، بلکہ سب نے اس کی ذمہ داری اہل عراق پر ڈالی (صحیح بخاری: ج ۴، کتاب الادب، ص ۵۰-۵۱، طبع مصر)

عن ابن ابی نُعم قال کنت شاہداً لابن عمر وسالہ رجل عن دم البعوض	ابن ابی نُعم سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر تھا

فقال ممن انت قال من اہل العراق۔ قال انظروا الیٰ ہذا یسألنی عن دم البعوض وقد قتلوا ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ہما ریحانتای من الدنیا۔

کہ ایک شخص نے آپ سے مچھر کے خون کا کفارہ دریافت کیا (یعنی حالتِ احرام میں)، آپنے فرمایا "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" اس نے کہا "عراق کا"۔ فرمایا "ذرا اسے دیکھو مجھ سے مچھر کے خون کا کفارہ پوچھتا ہے حالانکہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے فرزندِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کیا تھا"۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ دنیا میں میرے یہی دو پھول ہیں۔ یعنی سیدنا حسن اور سیدنا حسین علیہما التسلیمات"

یہ سیدنا ابن عمرؓ وہی ہیں جو ایک طرف تو سیدنا حسینؓ کی محبت کو تقاضۂ ایمان سمجھتے تھے، اور دوسری طرف امیر المؤمنین یزید کی بیعت میں تھے اور پوری قوت سے اس پر مستقیم رہے، کیونکہ ان کی بیعت کو اللہ و رسول کی بیعت جانا اور ان کے خلاف کھڑے ہونے والوں کو سب سے بڑا غدار کہا (صحیح بخاری: کتاب الفتن بسلسلۂ واقعہ حرّہ)۔ یہ دونوں نظریئے اسی وقت رکھے جا سکتے ہیں جب سیدنا حسینؓ کے قتل کا الزام امیر المؤمنین یزید اور ان کی حکومت پر نہ ہو، اور یہ بھی تسلیم ہو کہ سیدنا حسینؓ جب شہید ہوئے تو خلافت پر خروج کی حالت میں نہیں ہوئے بلکہ جماعت میں شمولیت کا اعلان فرما چکے تھے۔

جب اَلتَّوَّابُوْن نے اس دعوے کے ساتھ خروج کیا کہ وہ سیدنا حسینؓ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے ہیں تو سیدنا ابن عمرؓ نے ظاہراً و باطناً ان سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ نہ اُن کی پشیمانی کو پشیمانی سمجھا، اور نہ ان کی توبہ کو توبہ۔ جب مختار ثقفی نے زور پکڑا جو آپ سے نسبتی تعلق بھی رکھتا تھا، اور اس نے حقوقِ اہلِ بیت دلوانے کا دعویٰ کیا تو آپ اس سے قطعاً بے تعلق رہے۔ اگر یہ سب باتیں آپ نے تن آسانی اور عافیت پسندی کے تحت کیں، یا بزدلی دکھائی تو پھر سیدنا ابن الزبیرؓ سے بیعت کیوں نہ کر لی، حالانکہ ان کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی، اور تمام عالمِ اسلام پر ان کی تلوار کی دھاک تھی، اور خوف تھا کہ بیعت نہ کرنے کی پاداش میں کہیں وہ قتل نہ کر دیں۔

بالکل یہی موقف تمام بنو ہاشم کا تھا۔ سیدنا علی زین العابدینؒ جو سیدنا حسینؓ کے حقیقی وارث اور ولی الدم تھے، سیدنا زید بن حسنؒ، سیدنا حسن المثنیٰ بن حسنؒ جو کربلا میں موجود تھے، .... ان سب نے امیر المؤمنین یزید کو اپنا بزرگ اور مربی سمجھا، ان کی بیعت پر مستقیم رہے۔ اہلِ مدینہ کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا، اور اپنے شریک نہ ہونے کی اطلاع امیر المؤمنین کو دیدی؛

تو آبون اور مختار ثقفی سے قطعاً .... کوئی واسطہ نہیں رکھا، اور سیدنا عبداللہ بن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی اور ساری عمر اموی خلافت کے طرفدار رہے۔ جو لوگ سیدنا زین العابدینؒ کو پست ہمت سمجھتے ہیں وہ سمجھتے رہیں، لیکن اہلِ ایمان کے نزدیک آپ کا عمل بالکل اللہ و رسول کے احکام کے مطابق تھا، اور یہ آپ کی جرأت وللّٰہیت تھی کہ آپ پوری قوت سے اپنے موقف پر قائم رہے۔ باقی اہلبیت کا بھی بعینہٖ یہی موقف تھا جس پر وہ جانبازانہ قائم رہے۔

سیدنا علی زین العابدینؒ نے حادثۂ کربلا کی ایک ایک تفصیل اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کے عمل سے یہی بات ہویدا ہے کہ کربلا میں اہل بیت اطہار پر جو کچھ گذرا وہ محض ایک دلگداز حادثہ تھا، اور بالکل غیر متوقع۔ اگر کسی درجہ میں بھی آپ کے نزدیک اس خونِ ناحق کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی تو آپ کے لئے بار بار زرّیں مواقع پیدا ہوئے کہ آپ خونِ حسینؓ کا پورا پورا بدلہ لے سکتے تھے۔ لوگ باتیں تو بناتے ہیں، جوش و غضب کا اظہار کرتے ہیں مگر اتنا نہیں سوچتے کہ جس شخص کے دل پر سب سے زیادہ چوٹ لگی، جن حضرات کا بلاواسطہ تعلق سیدنا حسینؓ سے تھا، اور جن کے مقابلہ میں اگر سیدنا حسینؓ کا زیادہ وفادار ہونے کا کوئی دعویٰ کرے تو عنداللہ والناس جھوٹا قرار پائے گا، یہ سب کے سب حضرات بلا استثناء ان لوگوں کے ساتھ تھے جنھیں مجرم بتایا جاتا ہے، اور ان کے خلاف تھے جو مخلص بنتے ہیں۔ اسی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مجرم کون ہے اور مخلص کون۔

حقیقت یہ ہے کہ سبائیوں ہی کے نامۂ اعمال میں یہ خونِ ناحق بھی لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہود کی صفت بیان کی ہے یَقْتُلُوْنَ النَّبِیِّیْنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (وہ انبیاءؑ کو بے وجہ قتل کرتے تھے) اسی صفت کا مظاہرہ عبداللہ بن سبا یہودی کے متبع ہمیشہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اسی کا مظاہرہ انھوں نے میدانِ کربلا میں بھی کیا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب بعض لوگ تیرہ سو برس کے بعد ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھیں سیدنا حسینؓ کا اپنے موقف سے رجوع کرنا اور امیر المؤمنین یزید سے بیعت کرنے پر تیار ہو جانا تسلیم نہیں۔ علّامہ خضری نے بڑے زور سے قطعی فیصلہ کیا ہے [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۱۲۸]

ولیس بصحیح انہ عرض علیھم ان یضع یدہ فی ید یزید	"اور یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے ان پر یہ شرط پیش کی تھی کہ آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دیں گے"

لیکن کاش وہ اس متواتر خبر کی تردید سے پہلے جو موافقِ اہلِ بیت کے عین مطابق ہے،

اس وقت کے جغرافیہ پر بھی نگاہ ڈال لیتے۔ مکہ سے جانے والا آدمی کربلا ہو کر کوفہ نہیں جاتا تھا، بلکہ کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد جب دمشق کی طرف رُخ کر لیتا تھا تب کربلا پہنچتا تھا۔ گویا مشہدِ حسین رضی اللہ عنہ زبانِ حال سے پکار پکار کر قیامت تک یہ اعلان کرتا رہے گا کہ کوفیوں نے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور خانوادۂ نبوت کو شہید کیا تھا تو اس وقت وہ اپنے موقف سے رجوع کر کے امیر المؤمنین یزیدؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو روانہ ہو چکے تھے۔

مشہدِ شریف کے جائے وقوع پر متنبہ کرنے کے بعد ہم امت کو پھر اس امر پر متوجہ کرتے ہیں کہ تمام صورتِ حال کا صحیح علم ان بزرگواروں کو تھا جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قریب ترین اعزہ ہیں۔ انہی کے طرزِ عمل سے موقفِ حسین رضی اللہ عنہ معلوم کرنا ہوگا، کیونکہ وہ ہزارہا صفحات جو اس واقعۂ جانگداز کی تفصیلات بیان کرنے پر سیاہ کئے گئے ہیں، نہایت گمراہ کن ہیں اور ان کے مطالعہ کا نتیجہ سوائے انتشارِ طبع اور اضمحلالِ روح کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اطمینانِ قلب صرف اہلِ بیت کے عمل پر غور کرنے اور ان کے اتباع ہی میں میسر آسکتا ہے۔

اُن کے فرزند سیدنا علی زین العابدینؒ، ان کے بھائی سیدنا محمد بن علی بن ابی طالبؒ اور سیدنا عمر بن علی بن ابی طالب، ان کے بھتیجے سیدنا زید بن حسن بن علی، اور سیدنا حسن بن حسن بن علی، ان کے سگے چچا کے بیٹے اور سگے بہنوئی سیدنا عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور ان کے چچا سیدنا عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بلکہ تمام بنو ہاشم رضوان اللہ علیہم اجمعین سب کے سب امیر المؤمنین یزید کی بیعت میں تھے، ان کے مخلص احباب تھے، اور حادثۂ کربلا کے باوجود ان کی محبت و مودّت و یگانگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تمام مشکل اور سخت احوال میں وہ ان کی بیعت پر مستقیم رہے اور ان کے مخالفوں سے عدمِ تعاون کیا۔

یہ سب حضرات اُس تحریک سے بھی قطعاً الگ رہے جو حادثۂ کربلا کے تین چار برس بعد سبائیوں نے خونِ حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لئے جاری کی، اور بقولِ خود اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرنے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مختار ثقفی سے بھی برأت کا اعلان کیا، اور اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے جرم کا اعتراف تاریخِ اسلام میں صرف سبائیوں نے کیا ہے۔ لیکن ان کی توبہ نہ اہلِ بیت نے قبول کی، نہ حضرت ابن الزبیر نے اور نہ امیر المؤمنین عبدالملک نے رضی اللہ عنہم۔

التوّابون کی توبہ کا یہ عالم تھا کہ تین چار برس بالکل چپکے بیٹھے رہے، اور کھڑے ہوئے تو اس وقت جب ایک طرف حضرت ابن الزبیرؓ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور دوسری طرف امیر المؤمنین مروانؓ کی خلافت کا اعلان ہو چکا تھا۔ اگر واقعی انھوں نے توبہ کی تھی تو سب سے پہلے سیدنا علی زین العابدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بنو ہاشم کے سامنے معذرت پیش کرتے، اور ان سے رائے لیتے۔ کہ ہم اپنے گناہ کا کفارہ کس طرح ادا کریں لیکن اس کی بجائے انھوں نے اہلِ بیت کے طرز عمل اور طریقہ کار کے خلاف بطور خود حکومتِ شام پر خروج کیا، اور امیر عبید اللہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

مختار ثقفی بھی اہلِ بیت ہی کے نام سے کھڑا ہوا تھا، اور سیدنا محمد بن علیؒ بن ابی طالب پر افتراء کر کے اپنے آپ کو ان کا نمائندہ بتایا تھا۔ لیکن کھڑا ہو سیدنا عبد اللہ بن الزبیرؓ سے لڑنے، اور سیدنا مصعب بن الزبیرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب کوئی پوچھے کہ سیدنا حسینؓ کے شہید کرنے میں حضرت ابن الزبیرؓ کا کیا ہاتھ تھا جو اُن سے لڑنے کھڑا ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سبائیہ کو نہ اہلِ بیت کی دوستی مطلوب تھی اور نہ امویوں کی دشمنی سے کچھ غرض تھی، ان کا مقصد تھا امت میں فساد۔ حادثۂ کربلا کے بعد تین برس تک تمام عالمِ اسلام میں مکمل خاموشی اس کی بیّن دلیل ہے کہ امت نے اسے محض ایک افسوسناک اور دلدوز حادثہ سمجھا، اور اس کی تمام ذمہ داری کوفیوں پر ڈالی۔ امیر المؤمنین یزید، امیر عبید اللہ بن زیاد، عمر بن سعد کو اس خونِ ناحق سے بری الذمہ سمجھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام عموماً اور اہلِ بیتِ اطہار خصوصاً سب امیر المؤمنین یزید کے ساتھ تھے اور سبائیوں سے بیزار۔ سبائیوں کو بھی سب سے زیادہ عداوت اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ بلکہ اہلِ بیتِ اطہار سے بھی۔ بظاہر تو انھیں اتنی محبت معلوم ہوتی ہے کہ اپنے خود ساختہ ائمہ کی جناب میں اس حد تک غلو کرتے ہیں کہ نصرانیوں کو بھی مات کر دیا۔ مگر مقصد یہ ہے کہ ساداتِ ہاشمیہ کو آپس میں اس طرح بانٹ کر کہ اگر ایک گروہ اپنے ائمہ کے ساتھ غلو کی حد تک محبت کا دعویٰ کرے تو دوسرا گروہ اپنے ائمہ کو چھوڑ کر باقی سب کو کذاب و دجال کہے۔ اس طرح انھوں نے تمام اہلِ بیت پر لعنت کا انتظام کر دیا ہے۔

لیکن تاریخ یہ کہتی ہے اور آثارِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہاشمی سادات اپنے اپنے ائمہ کی بیعت میں تھے، جماعت سے وابستہ تھے، کتاب و سنت کے حامل تھے، اور مدارجِ روحانیہ میں

ایک دوسرے پر فائق تھے، اور اتنی نورانیت رکھتے تھے کہ یہ امت ان کے فیوض سے برابر بہرہ ور چلی آرہی ہے اوران کی برکات سے متمتع۔

بیشک چند لوگوں نے اپنے ائمہ پر خروج کیا، لیکن یہ گنے چنے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے سبائیوں نے ابھار کر کھڑا نہ کیا ہو، اور پھر عین موقع پر بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ نہ گئے ہوں، مثلاً زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب اور ان کے فرزند یحیٰی کو اور ایسے ہی اوروں کے بارے میں تاریخی یادداشتیں ہیں جن پر بحث فی الوقت موضوع سے خارج ہے۔

مفسدوں اور گمراہوں کا موقف

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا جو فرضی اور خیالی موقف لوگوں نے قائم کر رکھا ہے، اور مصر ہیں کہ آپ کے رجوع کا انکار کریں، یعنی یہ باور کرانے پر تُلے ہوئے ہیں کہ آپ نے اسی موقف پر جان دی جو مکہ سے چلتے وقت تھا، اس کی غایت محض یہ ہے کہ امت میں افتراق کو ہوا دیں، اور ہر برپاشدہ منظم حکومت کے خلاف کھڑے ہو کر اختلال و بدامنی پیدا کرنے کا نام جہاد رکھیں۔ اگر ان لوگوں کی نیت تعمیری ہوتی تو اہلِ بیت کا موقف ان کے لئے کافی تھا، لیکن چونکہ عزائم تخریبی اور مفسدانہ ہیں اس لئے خدا کے آخری رسول کے محترم و محبوب نواسہ کا نام اپنے تباہ کن عزائم کے لئے کام میں لاتے ہیں۔

گویا کذب و افتراء کا دفتر محض امیر المؤمنین یزیدؒ ہی کے خلاف وضع نہیں کیا گیا، بلکہ تیر و نشتر مستقلاً جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چل رہے ہیں۔ اور پیہم آپ کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ نعوذ باللہ من ذٰلک آپ نے اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات پس پشت ڈال کر، کتاب و سنت سے مُنہ موڑ کر، اور جمہور صحابہ و اہلِ بیت کے موقف کی تحقیر و تکذیب کر کے عالمِ اسلام کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو چھ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد خروج پر تیار کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی آپ مطمئن نہ تھے، اور بار بار لوٹ آنے کا قصد فرماتے تھے، تا آنکہ آپ کوفہ کے قریب پہنچ گئے، اور سب صورتِ حال عیاناً دیکھ لی، اور محسوس کر لیا کہ آپ کے پاس کوئی حجت نہیں، اس لئے پوری قوت سے رجوع کا اعلان کر دیا۔

اگر آپ کا موقف آخر تک وہی رہا ہوتا جو بیان کیا جاتا ہے، اور جس کے ثبوت میں کبھی دیدہ دلیری سے کہہ دیا جاتا ہے کہ "سیدنا علیؓ کے بعد امت کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی"۔

اور کبھی بتایا جاتا ہے کہ "گاڑی پٹڑی سے اُترگئی تھی اسے بحال کرنے کے لئے سیدنا حسین رضؓ نے اپنے آپ کو قربان کردیا"۔ تو سوال ہے کہ اگر صورتِ حال یہ تھی تو آپ نے کوفہ کے سفر میں بار بار لوٹ جانے کا ارادہ کیوں کیا اور موقع پر پہنچ کر اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کیوں فرمایا۔ انھیں نہایت سکون سے "حق" پر جان دینی چاہئے تھی۔ امیرالمؤمنین کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کی پیشکش کیوں کی، اور اس کے لئے عملی قدم یہ کیوں اٹھایا کہ دمشق کی طرف باگ موڑ دیں۔ اگر اس پیشکش کی روایت متواترہ بقول علامہ خضری کے غلط ہے، تب بھی کیا واپس جانے دینے کی درخواست سے یہ الم نشرح نہیں کہ آپ اپنے موقف سے رجوع فرما چکے تھے، بلکہ اس بارے میں تذبذب راہ ہی میں پیدا ہوچکا تھا۔ آپ نے رجوع محض اس لئے کیا کہ صورتِ حال آپ پر واضح ہوگئی تھی کہ سبائیوں نے سب جھوٹی باتیں بیان کی تھیں، نہ عراق آپ کی حمایت میں منظم تھا، اور نہ امت کے اجماع میں کوئی اختلال تھا۔ یعنی نہ گاڑی پٹڑی سے اتری تھی اور نہ زمامِ کار جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔

اگر پھر بھی لوگ مُصر ہوں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ واقعی اپنے ابتدائی موقف پر قائم رہے تو اس کے دو ہی مآل ہوسکتے ہیں، یا تو یہ کہ تمام امت میں صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ہی کی ایک ذات منبعِ رشد و ہدایت تھی اور باقی تمام صحابہ و اہلِ بیت اور علماء و فقہائے امت بلکہ ساری دنیا کے مسلمان باطل پر تھے، کیونکہ کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور سب نے اُن کے اقدام کو غلط بتایا حتیٰ کہ خود ان کے اپنے فرزند نے اسی شخص سے بیعت کرلی جس کے خلاف کھڑے ہونے کو یہ مفتری لوگ غزوۂ بدر کے مماثل بتاتے ہیں۔

اگر اہلِ ایمان ایسی بات نہیں کہہ سکتے تو ماننا پڑے گا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا موقف باطل تھا۔ وہ محض خارجی باغی اور واجب القتل تھے، اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق تھا، اور تمام نصوصِ صریحہ کے موافق۔ اس طرح اُن کے جتنے فضائل و مکارم صحاح سے ثابت ہوتے ہیں وہ غلط ہیں۔ انھیں قطعاً احکامِ کتاب و سنّت کا پاس نہ تھا۔

اگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے، اور کسی صاحبِ ایمان کے دل میں یہ بات پیدا نہیں ہوسکتی، اور نہ منہ سے نکل سکتی ہے تو پھر سوائے ایک بات کے کسی دوسری بات کے سوچنے اور سمجھنے کا امکان نہیں کہ سبائیوں کی غداری، مکاری، افتراء پردازی سے سیدنا حسین رضؓ نے صورتِ حال کا غلط اندازہ لگا کر اجتہادی غلطی کی، اور پھر جب صحیح صورتِ حال آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو کمالِ ایمان اور پختگیٔ علم و عرفان کے سبب نہایت جرأت کے ساتھ اپنے موقف سے رجوع کا اعلان کردیا

سبائیوں کو چونکہ یہ امر ناگوار تھا اس لئے انھوں نے جنگ چھیڑ کر صورتِ حال بگاڑ دی تاکہ جمل وصفین کی طرح امت اس بارے میں بھی ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے۔ کہ سبائی تحریک کا یہی اصل منشاء ہے۔ سیدنا زین العابدینؓ جنگ میں شریک نہیں تھے اس لئے امیر عمر بن سعد کی کوشش سے وہ بچ گئے اور سیدنا زید بن حسن المجتبیٰ اور سیدنا حسن المثنیٰ زخمی ہو کر مردہ سمجھ لئے گئے تھے اس لئے وہ بھی امیر عمر بن سعد کی سعی بلیغ سے بچ گئے۔ ورنہ سبائیہ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ اہلِ بیت میں سے کوئی زندہ بچ کر جائے۔ انھوں نے جس کسی شخص کو بھی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے پر ابھارا اسے عین موقع پر قتل ہونے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔

یہی وجہ ہے کہ سیدنا علی زین العابدین، سیدنا زید بن حسن اور سیدنا حسن المثنیٰؒ بلکہ تمام علما اہلِ بیت ہمیشہ سبائیوں سے بیزار رہے اور اموی خلافت کے بہی خواہ۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے (۴: ۱۶۵، منقول از العواصم من القواصم حاشیہ ص ۱۸۵) یہ روایت بیان کی ہے:

ان الحسن المثنیٰ بن الحسن السبط بن علی بن ابی طالب قال لرجل من الرافضۃ "واللہ لئن امکننا اللہ منکم لنقطعن ایدیکم وارجلکم ثم لا نقبل منکم توبۃ" الخ	"سیدنا حسن المثنیٰ بن سید نا حسن المجتبیٰ بن سیدنا علی بن ابی طالب نے ایک رافضی شخص سے فرمایا بخدا اگر اللہ نے ہمیں تم پر قابو کا موقع دیا تو ہم تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے اور تمھاری توبہ قبول نہیں کریں گے۔"

یہ ہے حال ان بزرگ کا جو خود حادثۂ کربلا میں شریک تھے اور زخموں سے چُور چُور ہو گئے تھے۔ انھیں سبائیہ سے اتنی نفرت تھی۔

اگر واقعی "زمامِ کار جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی تھی"۔ یا حقیقتاً "گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی تھی" اور یہ سبائی لوگ یا اہلِ عراق پھر "نورانیت" کا دور واپس لانا چاہتے تھے اور اس وقت گہوارۂ اسلام صرف عراق تھا اور باقی تمام عالمِ اسلام مہدِ کفر، تو ان عراقیوں کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ کوفہ میں فاطمی خلافت کا اعلان کر دیں۔ اس وقت کی سیاسی تنظیم ایسی تھی کہ ہر علاقہ خود کفیل تھا۔ اور ہر بالغ شخص ماہرِ حرب وضرب۔ نہ وہاں شامیوں کی فوج تھی، اور نہ امیرِ کوفہ کے پاس عراقیوں کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے۔ راتوں رات سب کام ہو سکتا تھا۔ اور عراق کی آزادی وخود مختاری کا اسی طرح اعلان کیا جا سکتا تھا جس طرح عہدِ مرتضوی میں شام نے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ مگر یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ اہلِ عراق من حیث القوم حکومت کے ساتھ تھے۔ صرف چند شریر النفس سبائیوں کی کارروائی سے یہ اندوہناک حادثہ رُونما ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسہ نے اپنے موقف سے رجوع کرکے اپنی دانست میں تو فتنہ کا سدّباب کر دیا تھا، اور اہلِ بیت اطہار نے آپ کے اسی آخری موقف پر زندگی بسر کرکے اموی خلافت کی ہمیشہ حمایت کی۔ مگر پھر بھی لوگوں نے فتنہ کا یہ دروازہ کھلا رکھا، اور سلفِ صالحین پر کذب وافترار کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

اللّٰھم ارنا الحقّ حقًا واجعلنا من اھلہ وارنا الباطل باطلاً ونعوذ بک ان نکون منھم۔

یزیدی فرقہ

ابھی حال میں ایک نیا انکشاف ہوا ہے جسے چودھویں صدی کا "تحقیقی" کارنامہ کہنا چاہیے۔ ابھی تک معاملہ بعض روزناموں تک ہے، لیکن پھر یہ کتابوں میں بھی آجائے گا۔ اس پر مقالے لکھے جائیں گے، اور ممکن ہے کہ اس کے لئے سندیں بھی تلاش کرلی جائیں، اور کچھ عجب نہیں کہ کسی قدیم مخطوطہ میں کچھ عبارت بڑھا دی جائے۔ یہ امر معمولات میں ہے کہ خود ہی ایک بات وضع کی۔ پھر خود ہی اس سے استشہاد کیا، کتابوں میں لکھا، اس پر قصیدے کہے، رباعیاں کہیں، مثنویاں لکھیں، پھبتیاں اور مقولے بنائے تاآنکہ وہ خود ساختہ بات مسلمات میں بنا ڈالی۔

کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یزید کے حکم سے سیدنا حسینؓ کے مقابلہ پر "فوجیں" بھیجنے کا جب حکم ہوا اور امیر عبید اللہ بن زیاد نے "یہ مہم" سر کرنے کے لئے عام بھرتی کا اعلان کیا تو اہلِ عراق نے اس حکم کی پذیرائی نہیں کی، اور جب لڑنے کے لئے کوئی بھی نہ نکلا تو امیر المؤمنین کے حکم سے یزیدی فرقہ کے لوگوں کو بلایا گیا، اور انھوں نے خلافت کی یہ "خدمت" انجام دی! گویا ان محقق صاحب کے نزدیک یزیدی نام کا کوئی فرقہ اس وقت بھی موجود تھا، اور عراقی لوگ سیدنا حسینؓ کی حمایت میں ایسے منظم تھے کہ آپ کے خلاف نہ کھڑے ہونے پر متحد ہو گئے۔ کاش یہ محقق صاحب اتنا اور بتا دیتے کہ جب اہلِ عراق میں ایسی یک جہتی تھی اور اہلِ بیت کے وہ ایسے وفادار تھے تو سیدنا حسینؓ پر جان قربان کرنے کے لئے کیوں متحد نہ ہوسکے۔ یا عقیدت محض زبانی ہے؟

واقعہ صرف اتنا ہے کہ کردوں کے جاہل طبقہ میں ایک مردود فرقہ یزیدی نام کا پایا جاتا ہے جو امیر المؤمنین یزید کی جناب میں غلو کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایسے ہی جاہل اور دین سے بے بہرہ ہیں کہ عملاً اسلام اور امتِ محمدیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک صاحب تھے عدیؒ بن مسافر (۴۶۷-۵۵۷ھ) اچھے عالم باعمل شخص تھے۔ انھوں نے جو اپنے قرب وجوار کے سبائیوں کی باتیں سنیں اور امیر المؤمنین یزید پر لعن وطعن سن سن کر ان کے کان پک گئے تو انھوں نے یہ سیدھی بات کہہ دی کہ وہ مسلمانوں کے ایک امام اور امت کے خلیفہ ہیں، ان کی جناب میں سوءِ ادب کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔ ان کے دلائل و براہین سے لوگ متاثر ہوئے، اور اپنے خیالات

میں تبدیلی کر لی۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے شیخ عدی کے احوال مطالعہ فرمائے تو رائے ظاہر کی کہ وہ معتدل خیالات کے شخص تھے، اور ان کا طریقہ مطابق کتاب وسنت درست تھا۔ ان کے خلفاء میں ایک صاحب تھے شیخ حسنؒ، انھیں سبائی لوگوں نے شہید کر دیا، اور بڑا ہنگامہ ہوا۔ اس طرح ان لوگوں میں شیخ حسنؒ اور شیخ عدیؒ کی بابت غالیانہ باتیں پیدا ہو گئیں اور امیر المومنین یزید کے بارے میں بھی غلو کرنے لگے، حتیٰ کہ بعض نے انھیں نبی تک کہہ دیا۔ یہ سب نتیجہ تعصب، جہالت اور غلو کا ہے۔ اس غلو کی راہ بھی ان کردوں کو سبائیوں ہی نے دکھائی تھی۔ جس طرح سبائی لوگ سیدنا علیؓ اور ان کی اولاد میں سے بعض کے ساتھ انتہائی بلکہ بے انتہا غلو کرتے ہیں، ایسا ہی غلو امیر المؤمنین یزید کے متعلق ان کردوں نے بھی شروع کر دیا تا آنکہ یہ لوگ خود دین اسلام سے ہٹ گئے، اور ان میں وہ باتیں آگئیں جن کا ادنیٰ تصور بھی امتِ محمدیہ کے ہاں نہیں۔

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ان کے متعلق ایک "رسالۃ العدویۃ" لکھا ہے، اور اس میں بتایا ہے کہ اگر حضرت شیخ عدیؒ زندہ ہوتے تو ان لوگوں سے بیزاری کا اعلان فرماتے۔ ہندوستان میں بھی اس کی نظیر سکھوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جن بزرگوں نے اُن کی اصلاح کی اور اسلام کی طرف انھیں چلایا ان کے مرنے کے بعد یہ لوگ ایک مستقل دین کے حامل بن گئے، اور اب کفار کا ایک فرقہ ہیں نہ کہ مسلمانوں کا۔ یہی حال اُن جاہل اور غالی کردوں کا ہوا۔

شمالی عراق وغیرہ علاقوں میں یہ لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اُن کی تاریخ پانچویں چھٹی صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے نہ کہ پہلی صدی سے۔ مگر ہمیں وہ وقت قریب نظر آرہا ہے جب یزیدی فرقہ کا وجود ۶۰ھ سے بھی پہلے ثابت کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں گی۔ یزیدی فرقہ کے بارے میں یہ تصریحات ہم نے المنتقیٰ سے لی ہیں۔ (ص ۲۷۹۔ ۲۸۰، تعلیقہ ۲، طبع مصر)

ایک بے سروپا افسانہ

امیر المؤمنین یزید اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے مابین ذاتی اور خاندانی بغض وعداوت ثابت کرنے کے لئے جہاں اور بہت سی روایتیں وضع کی گئی ہیں وہاں ایک افسانہ کو خاص فروغ حاصل ہے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ ان دونوں بزرگواروں کے درمیان عناد کی اصل وجہ یہی تھی۔ اس کی تفصیلات کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں غالباً پہلی مرتبہ بیان ہوئی ہیں۔ اور پھر تو اس کی اشاعت اس طرح کی گئی کہ گویا ایک حقیقتِ مسلّمہ ہے۔ اس قسم کی روایتوں کا اس کتاب میں بار بار پانا اس کی قطعی اور حتمی دلیل ہے کہ امام ابن قتیبہؒ جیسے فقیہ شخص کی طرف اس کی نسبت افترار محض ہے، اور تلبیس خالص۔ راقم الحروف نے یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے ہوئے سُنا ہے، اور اور افسانوں کے مجموعات میں "علامہ" احمد شبیلی جیسوں نے اسے نقل کر کے "سرزمینِ عرب کا ایک دلچسپ ترین واقعہ" بتایا ہے۔ حالانکہ از اوّل تا آخر اس کی کوئی تفصیل قابلِ اعتنا نہیں، کیونکہ سراسر کذبِ محض ہے اور بہتانِ شنیع۔ کہتے ہیں کہ:۔

"امیر یزیدؒ اپنی ولایتِ عہد کے زمانہ میں جب حج کے لئے آئے تو "ایک پری چہرہ حسین دوشیزہ" کو دیکھ کر عقل وہوش کھو بیٹھے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ اُن کا نام اُرَینب بنت اسحٰق ہے۔ اور وہ اپنے ابن عم عبد اللہ بن سلام کے نکاح میں ہیں جو ایک قرشی نوجوان تھے اور عراق کے والی۔

امیر یزید اس "عشق" کے ہاتھوں ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے باپ سے بھی کبیدہ خاطر ہو گئے کہ ہر طرح کی دلداری کے باوجود انھوں نے اپنے فرزند کو اُرَینب جیسی فقید المثال خاتون کی زوجیت سے محروم رکھا۔

حضرت امیر المؤمنین کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنے فرزند کے لئے ترکیبیں لڑانی شروع کر دیں۔ والیِ عراق عبداللہ بن سلام کو اپنے پاس دمشق بلایا، اور تزک واحتشام کے ساتھ ان کا استقبال کر کے اپنا مہمان رکھا۔ سیدنا ابوالدرداء اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بھی اس وقت دمشق میں موجود تھے،

انھیں طلب فرماکر عبداللہ کو اپنا داماد بنانے کے بارے میں مشورہ لیا۔ دونوں نے اس رائے سے موافقت کی، بلکہ امیر المؤمنین رضؓ کے اشارہ پر یہ بات عبداللہ بن سلام تک بھی پہنچادی۔

ادھر امیر المؤمنین نے اپنی دختر سے فرمایا کہ ابو الدرداءؓ اور ابو ہریرہؓ تمھارے پاس عبداللہ بن سلام کا پیغام لائیں گے تم کہنا کہ اول اُرَینب کو طلاق دیں، اس کے بعد میں نکاح پر تیار ہوسکتی ہوں۔ عبداللہ اس جال میں پھنس گئے اور اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ بنتِ امیر المؤمنین نے کچھ دن ٹال مٹول کی اور بالآخر نکاح کرنے سے انکار کردیا۔

اُرَینب کی جب عدّت پوری ہوئی تو امیر المؤمنین نے ان کے پاس اپنے ولی عہد کا پیغام لے کر انھی سیدنا ابو الدرداءؓ کو بھیجا۔ اتفاق سے اس وقت سیدنا حسین رضؓ بھی عراق میں موجود تھے۔ سیدنا ابو الدّرداءؓ نے سوچا کہ اوّل نواسۂ رسولؐ سے ملاقات کریں۔ دورانِ گفتگو میں سیدنا ابو الدّرداءؓ نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی تو سیدنا حسینؓ نے فرمایا میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آپ جیسے بزرگ کے ذریعہ اُرَینب کو اپنا پیغام بھیجوں۔ لہٰذا آپ میرا پیغام بھی پہنچا دیجئے گا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ارینب نے پوچھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں، آپ ہی مشورہ دیجئے کہ میں دونوں میں سے کسے قبول کروں، سیدنا ابو الدرداءؓ نے فرمایا کہ تم حسین بن علیؓ کو قبول کرلو تاکہ اُن ہونٹوں پر ہونٹ رکھ سکو جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چوما کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نکاح ہوگیا۔

سیدنا معاویہؓ اس پر بہت خفا ہوئے کہ کیا کرنے بھیجا تھا اور کیا کردیا۔ دونوں بزرگوں سے اپنی نگاہیں پھیرلیں اور وظیفہ بھی بند کردیا۔ تا آنکہ سیدنا ابو الدرداءؓ اور سیدنا ابو ہریرہؓ بددل ہوکر مدینہ چلے آئے اور وہیں مقیم رہے۔

ادھر عبداللہ بن سلام مبہوت تھے کہ بیٹھے بٹھائے کس آفت میں پھنس گئے۔ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بیوی الگ چھٹی، اور امیر المؤمنین کی دامادی کا خواب جو دیکھا تھا وہ بھی "عنقا بود" ہوا۔ رنج اور کوفت کا ان پر اتنا غلبہ ہوا کہ بیمار پڑگئے۔ کچھ عرصہ بعد خیال آیا کہ جواہرات کا ایک تھیلہ ارینب کے پاس ہے کم از کم اسے ہی حاصل

کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ سیدنا حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مال تمہارا ہے اپنے آپ جا کر لو۔ پردہ کرادیا گیا اور دونوں اس کے پاس ملول و غمزدہ بیٹھ گئے۔ اُرینب نے تھیلہ نکال کر دے دیا اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ یہی حال عبداللہ کا تھا۔ سیدنا حسینؓ نے فرمایا "میں نے یہ سب کارروائی اس مکر کے جواب میں کی تھی جس کا تم شکار ہو گئے۔ میں اُرینب کو طلاق دیتا ہوں۔ میں نے یہ نکاح ہی اس لئے کیا تھا کہ تم دونوں کو پھر یکجا کر دوں۔"

آل انڈیا ریڈیو سے جو جاہل شخص یہ افسانہ نشر کر رہا تھا وہ آل انڈیا ریڈیو ہی کی نگاہ میں نہیں بلکہ اپنے گروہ خاص اور اپنی پارٹی میں بڑا معتبر ہو گا جو قوم تک یہ معلومات بہم پہنچانے کے لئے منتخب کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے مسائل سے یہ شخص اس درجہ بے خبر تھا کہ اپنی دانست میں سیدنا حسینؓ کے کردار کی رفعت اور طینت کی طہارت ثابت کرنے کے لئے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ "اب تک میں نے اُرینب کو مثل اپنی بہن کے رکھا ہے، تم نکاح سے کچھ اور خیال نہ کرنا۔"

اب ملاحظہ ہوں اس روایت کے ظاہری اور باطنی پہلو:۔

(۱) امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں عبداللہ بن سلام نام کا کوئی قرشی امیر عراق کا حاکم نہیں رہا۔ محض عراق ہی کا نہیں بلکہ کسی دوسری جگہ کے امراء میں بھی یہ نام نہیں ملتا۔

(۲) عرب کی جو خواتین حسن و جمال میں مشہور تھیں ان کے احوال محفوظ ہیں، لیکن ان میں ارینب بنت اسحٰق نام کی کسی خاتون کا تذکرہ کم از کم راقم الحروف کی نگاہ سے نہیں گذرا۔

(۳) سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ عہدِ عثمانی میں دمشق کے قاضی تھے۔ اور ۳۱-۳۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت نہ سیدنا معاویہؓ امیر المؤمنین تھے، اور نہ امیر المؤمنین یزید کی ولایتِ عہد کا فیصلہ ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ ان کی عمر اس وقت بمشکل ایک یا دو برس کی تھی۔ کیونکہ تحقیق کے مطابق ان کی پیدائش ۳۰ھ کی ہے۔

(۴) کسی مطلّقہ سے کوئی شخص اس لئے نکاح کرے کہ اسے طلاق دے کر زوجِ اوّل کے لئے حلال کرے، تو یہ شخص خدا و رسول اور تمام فقہاء و ائمہ کے نزدیک ملعون ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جیسے اعلم و اتقیٰ سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو۔ اور پھر بہن کی طرح رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اس جاہل شخص کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نکاح کے لغوی

معنی ہی جماع کے ہیں۔ جب تک خلوتِ صحیحہ نہ ہو نکاح کی غایت پوری نہیں ہوتی۔ اگر یہ ناکح ثانی محض اپنی مرضی سے اور پہلے سے سوچے ہوئے کسی منصوبہ کے بغیر طلاق دے دے تب البتہ زوج اوّل کو اپنا پیغام بھیجنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صاف حکم ہے "حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ" (یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے)۔

امام ابن القیمؒ رحمہ اللہ نے اغاثۃ اللّہفان فی مکائد الشیطان میں اس موضوع پر مبسوط تبصرہ فرمایا ہے، اور متعدد ارشاداتِ نبویہ کے علاوہ اکابرِ صحابہ و تابعین اور جمہور اہلِ علم کا مذہب یہی بتایا ہے۔ منجملہ ازاں یہ حدیث ہے:

عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم انہ لعن المحلِّل والمحلَّل لہٗ رواہ احمد و اہل السنن کلہم غیر النسائی۔	سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا کہ آپ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو کسی کی مطلقہ بیوی کو اس کے لئے حلال

کرے، اور اس پر بھی لعنت کی ہے جس کے لئے حلال کی گئی۔ (اسے امام احمدؒ اور تمام اہل سنن نے روایت کیا سوائے نسائیؒ کے)"

سنن نسائی اور مسند احمدؒ میں یہ حکم ایک دوسرے سلسلہ میں مروی ہے:-

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الواشمۃ والموتشمۃ والواصلۃ والموصولۃ والمحِلّل والمحلَّل لہ وآکل الرّبا۔ ومؤکلہ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے (۱) جو عورت بدن گودے یا جس عورت کا بدن گودا جائے (۲) انسانی

بال کسی کے بالوں میں گوندھ کر اس کی چوٹی بڑھانے والی عورت اور وہ عورت جس کی اس طرح چوٹی بڑھائی گئی ہو۔ (۳) وہ شخص جو دوسرے کی بیوی کو اس کے لئے حلال کرنے کی نیت سے ایک مطلقہ سے نکاح کرے، اور وہ شخص جس کی مطلقہ کو اس پر حلال کرنے کے لئے یہ نکاح کیا گیا (۴) سود کھانے والا اور سود کھلانے والا"

مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو اغاثۃ اللّہفان فی مکائد الشیطان جس میں امام ابن القیمؒ رحمہ اللہ نے بہت شافی بحث کی ہے۔ خدا اس شخص کا منہ کالا کرے جس نے سیدنا حسینؓ، سیدنا ابوالدرداءؓ، سیدنا ابوہریرہؓ اور سیدنا معاویہؓ جیسے ائمہ ھدیٰ پر یہ مکروہ جھوٹ بولے ہیں، اور خدا ان لوگوں کو ہدایت دے جو اس قسم کی رکیک اور بے سروپا روایتیں نمک مرچ لگاکر بیان

کرتے ہیں، اور شیطان کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور حکایت

عوفی نے منتخب الحکایات میں ایک اور مضحکانہ روایت لکھی ہے، کہتا ہے کہ:

"سیدنا معاویہؓ کا جب آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے فرزند کو وصیت کی کہ جب میرا جنازہ قبر پر رکھا جائے تو تم (سیدنا) عمروؓ بن العاص سے استدعا کرنا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ ہی نمازِ جنازہ پڑھائیں، پھر عرض کرنا کہ برکت کے لئے قبر میں بھی آپ ہی اُتاریں۔ جب وہ قبر میں اُتر جائیں اور میری نعش رکھ دی جائے تو تُو تلوار سونت کر کھڑے ہو جانا کہ اب قبر میں سے اس وقت تک نہیں نکل سکتے جب تک میری خلافت کی بیعت نہ کرلو۔"

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ امیر یزید نے جب تلوار سُونت لی تو (سیدنا) عمروؓ نے (حضرت) معاویہؓ کی طرف مُنہ کرکے کہا "کیوں صاحب! یہ مرتے مرتے بھی چالاکی سے باز نہ آئے۔" اور پھر بیعت کرلی۔"

لکھنے والے نے یہ مردود روایت نقل تو کردی، اور اپنی دانست میں ایک لطیفہ بھی کہہ دیا لیکن اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کی وفات کے وقت سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ زندہ بھی تھے یا نہیں۔ آپ کی وفات مصر میں ہوئی تھی۔ امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی طرف سے آپ وہاں کے والی تھے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت امیر المؤمنین نے آپ کے فرزندِ گرامی سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو وہاں کا والی بنادیا۔ انھوں نے بھی مصر ہی میں وفات پائی۔ ان کا مزار قاہرہ میں موجود ہے، اور زیارتگاہِ خلائق چلا آرہا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی، اور امیر المؤمنین یزیدؒ اس وقت دمشق میں نہیں تھے۔ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے۔ کئی روز کے بعد اپنے والدِ ماجد صلوات اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہوسکے۔

غرض یہ ہے کہ افتراء و بہتان کی کوئی حد نہیں۔ لطائف و ظرائف و حکایات و روایات اور اشعار کے ذریعہ قسم قسم کے خیالات و تصورات کی اشاعت کی گئی ہے تاکہ قرنِ اول

کی صحیح تاریخ امّت کے سامنے نہ آسکے، اور عمومیت کے ساتھ لوگوں کے قلوب صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی طرف سے مکدّر رہیں اور ان کی عظمت دلوں میں قائم نہ رہے۔

نعوذ باللہ من شر الوسواس الخناس الذی
یوسوس فی صدور الناس من الجنّۃ
والناس؛

موقفِ سیّدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما بہت پہلے سے امت کی عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ جنگِ جمل میں آپ نے کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ سیدنا زبیرؓ کے فرزند تھے، سیدنا ابوبکرؓ کے نواسے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سگے بھانجے اور مثلِ فرزند۔ آپ ہی کے نام پر ان کی کنیت اُمّ عبداللہ تھی۔ اور یہ کنیت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ آپ کی نسبی حیثیت اور ذاتی فضائل کے بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشادات صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر نقل ہوچکے اُن سے تمام صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ ان احوال نے قدرتی طور پر آپ کے دل میں خلافت کے حصول کا جذبہ پیدا کردیا تھا۔

امیر یزید کی ولایتِ عہد کی بیعت غالباً آپ نے محض رائے عامہ کے دباؤ سے کی تھی اسی لئے امیر المؤمنین کی خلافت کی بیعت سے آپ نے گریز کیا، اور مکہ میں پناہ لے کر بیٹھ گئے۔ بظاہر سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگئے تھے، لیکن درپردہ اپنے لئے راہ ہموار کرنے کی تدبیروں میں مشغول تھے۔ ویسے بالفعل خلیفۂ وقت امیر المؤمنین ہی کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ طبری نے نقل کیا ہے اور متفق علیہ ہے کہ جب امیر مدینہ عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہما نے آپ کی نگرانی شروع کی، اور آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کے مقاصد میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو امیر المؤمنین کو ایک خط لکھا کہ کسی نرم خو شخص کو مکہ کا والی بنا کر بھیجیں۔ اور حضرت امیر المؤمنین نے محض رفعِ شر کے لئے ایک ناتجربہ کار نوعمر صاحب کو بھیج دیا۔ اور یوں سیدنا ابن الزبیرؓ کو اپنی خفیہ کارروائیاں جاری رکھنے کا موقع نصیب ہوگیا۔ لیکن یہ سب تیاریاں آئندہ کسی وقت کے لئے تھیں۔ بالفعل پوری طرح حکومت کے تابع تھے اور رعایا کی حیثیت سے رہتے تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی خلافت کی بیعت سے گریز کرکے مکہ ہی چلے آئے تھے، اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس مقیم تھے۔ سیدنا حسینؓ خاموش بیٹھے تھے جیسا کہ مذکور ہوا۔ پھر آپ عراقیوں کی غلط بیانیوں سے متأثر ہوکر کوفہ چلے گئے، مؤرخوں کا بیان ہے کہ جب تک

سیدنا حسینؓ چلے نہ گئے حضرت ابن الزبیرؓ کو چین نہ آیا۔ ممکن ہے ان لوگوں کا یہ خیال درست ہو کہ دونوں اس طرح اپنی اپنی خلافت کے لئے کوشاں تھے، اس لئے یک گونہ ایک دوسرے کو حریفانہ دیکھتے تھے۔

ہمیں یہاں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر واقعی ان دونوں صاحبوں کے نزدیک نظامِ خلافت میں تبدیلی کی ضرورت تھی، اور یہ دونوں اس کے لئے باقاعدہ تحریک چلانا چاہتے تھے تو انھیں چاہئے تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں۔ اگر حضرت ابن الزبیرؓ کو بھی عراقیوں کے بیانات پر اطمینان ہو گیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اہلِ عراق واقعی حکومتِ وقت کے خلاف منظم ہو چکے ہیں تب بھی مفاد اسی میں تھا کہ سیدنا حسینؓ مکہ ہی میں رہیں، اور آپ کے نمائندے عراق کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس سے حضرت ابن الزبیرؓ اپنی کارروائیاں تیز تر کر سکتے تھے، اور کم مدت میں فضا ہموار ہونے کا امکان تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں نے اپنی جد و جہد جداگانہ رکھنی پسند کی۔ سیدنا حسینؓ کوفیوں کی غداری سے ناکام رہے، اور حضرت ابن الزبیرؓ کو فضا اپنے حق میں بنانے کا موقع مل گیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں کے بیان کے بالکل خلاف سیدنا ابن الزبیرؓ کی دعوت میں حادثۂ کربلا کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف امیر المؤمنین کی ذات کے خلاف پروپگنڈا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا حسینؓ کی شہادت کا محض حادثہ ہونا امت کے نزدیک اتنا مسلّم تھا کہ ہمعصر لوگوں کو اس کی ذمہ داری حکومت پر ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی اور اگر سیدنا ابن الزبیرؓ کے داعی یہ ذکر چھیڑتے تو اپنا موقف کمزور کر لیتے۔ اس لئے ان کے لئے چارۂ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ امیر المؤمنین کے ذاتی معائب بیان کریں اور حضرت ابن الزبیرؓ کے ذاتی فضائل۔

لیکن پھر بھی تین برس تک انھیں حضرت ابن الزبیرؓ کا نام علانیہ لینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ صرف امیر المؤمنین کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی جو روایت ہم اوپر بیان کر چکے جس میں حضرت ابن المطیعؓ اور سیدنا محمد بن علیؓ بن ابی طالب کے مابین اس موضوع پر گفتگو مذکور ہے۔ اس میں حضرت ابن المطیعؓ کا یہ بیان موجود ہے کہ "شاید آپ دوسرے کا امیر بننا پسند نہیں کرتے، تو آیئے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں"۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ کھل کر حضرت ابن الزبیرؓ کی طرف دعوت نہیں دی جا رہی تھی،

بلکہ صرف امیر المؤمنین کے خلاف مدینہ میں محاذ قائم کیا جا رہا تھا۔

واقعہ حرّہ

افسوس کہ اس بارے میں بھی نہایت درجہ ناتجربہ کاری کا ثبوت دیا گیا، اور شہر کی اکثریت کو ہموار کئے بغیر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ امیرِ مدینہ عباس بن محمدؓ کو نکال دیا گیا، اور بنو امیہ کو گرفتار کر کے بعد میں اس شرط پر چھوڑ دیا گیا کہ شہر کے حالات سے باہر کے لوگوں کو مطلع نہ کریں۔ کیا اسے سیاست یا دور اندیشی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ایک شہر تین چوتھائی دنیا کے حکمران کا مقابلہ کر سکتا تھا؟ اس بغاوت میں مہاجرین اور ان کی اولاد میں سے آلِ ابی بکرؓ، آلِ عمرؓ، آلِ علیؓ، آلِ عباسؓ، آلِ جعفرؓ قطعاً شریک نہ تھے۔ انصار میں بنو عبد الاشہل بھی شریک نہ تھے جو انصار کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔

مدینہ کے تین طرف خندق کھودی گئی، اور چوتھی طرف انصار کے اسی محلہ کو حصار سمجھ لیا گیا جو اُن کے ساتھ شامل نہ تھا۔ ادھر امیر المؤمنین کو جب اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو آپ نے امیر مسلم بن عقبہ کی کمان میں ایک فوج بھیجی کہ اوّل ان لوگوں پر امان پیش کریں اور نہ مانیں تو جنگ کی جائے۔ مؤرخوں نے اس فرمان میں یہ حکم بھی نقل کیا ہے کہ اگر جنگ ہو تو پھر تین دن تک شہر کو لوٹا جائے اور وہ سب مال فوج کا ہو۔ لیکن فرمان کا یہ فقرہ ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ نہ اس سے پہلے مسلمانوں نے کبھی یہ حرکت کی اور نہ اس کے بعد۔ جب مدینہ کے بڑے بڑے اور ذی اثر گھرانے اس بغاوت سے بیزار تھے، اور خود شہر والوں کی مدد سے شہر پر قبضہ ہوا تھا، تو ان مجرمانہ حرکتوں کی گنجائش اور ضرورت ہی کہاں تھی جو بیان کی گئی ہیں۔ چوتھی طرف جو انصار کے سب سے بڑے گھرانے بنو عبد الاشہل کا محلّہ تھا، انھوں نے ہی امیر مسلم بن عقبہ کی فوج کو شہر میں داخل کیا۔ اور یوں گنتی کے چند گھنٹوں میں شہر پر قبضہ ہو گیا۔

لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لئے حادثۂ حرّہ کی یہ تفصیلات مرتّب کی ہیں۔ اور مسعودی و سیوطی جیسے لوگ اس کے ذمّہ دار ہیں کہ انھوں نے قرونِ اُولیٰ کے مجاہد مسلمانوں کے کردار کا ایسا بھیانک نقشہ پیش کر کے بعد کے مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے بیزار کرنے کا سامان پیدا کر دیا۔ سیوطی صاحب فرماتے ہیں (تاریخ الخلفاء: ص ۸۱، طبع مصر):

قتل فیہا خلق من الصّحابۃ رضی اللہ عنہم	"اس میں بہت سے صحابہ شہید ہوئے رضی اللہ عنہم
ومن غیرہم ونہبت المدینۃ وافتض	مدینہ کو لوٹ لیا گیا، اور ایک ہزار کنواریوں کی
بہا الف عذراء، فانا للہ وانا الیہ راجعون	عصمت دری کی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

ہم یہ انا للہ وانا الیہ راجعون سیوطی کے اس بیان پر پڑھتے ہیں کہ عقل و خرد اور غیرت و حمیت سب کو خیر باد کہہ کر انھوں نے یہ ناشائستہ اور مردود کلمات لکھے۔ اگر واقعی امیر مسلم کی فوجوں سے حرم شریف میں ان حرکتوں کا ہزارواں حصہ بھی صادر ہوتا تو تمام عالمِ اسلام میں آگ لگ جاتی۔ اور امویوں کے خلاف عام نفرت پھیل جاتی۔ اور تمام امت سیدنا عبداللہ بن الزبیرؓ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتی، اور ناممکن ہو جاتا کہ اموی خلفاء ایسے کامیاب ہوں کہ سو برس تک انہی کا پھریرا عالمِ اسلام پر لہرائے۔ معلوم نہیں اس وقت کے مسلمانوں کو ان "مؤرخوں" نے کیا سمجھ رکھا ہے۔

امویوں کی مقبولیت کا روز بروز بڑھنا اس کی دلیل ہے کہ ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہوئی جسے دین کی بنیاد پر ہمعصر امت نے نفرت سے دیکھا ہو۔ کیونکہ یہی وہ امت تھی جس نے اموی خلفاء کی قیادت میں مشرق و مغرب کو اسلام کے لئے فتح کیا۔ مدینہ طیبہ کوئی پہلا شہر نہیں تھا جسے شامی فوج نے فتح کیا ہو۔ سیکڑوں شہر اس سے پہلے اور ہزاروں اس کے بعد اس فوج نے فتح کئے تھے، تو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جو فوجیں کفار کے شہروں کے لئے ہر جگہ رحمت ثابت ہوئی ہوں وہ خاص حرمِ نبوی میں بربریت کے اعتبار سے چنگیز و ہلاکو کو بھی مات کر دیں۔ خصوصاً جب شہر کی بڑی آبادی اس فتنہ سے الگ ہو۔ اور ذی اثر حضرات اس ہنگامہ کو اللہ و رسول کے کھلے احکام کے خلاف ہونے اعلان کر چکے ہوں۔

اگر اموی سادات اور اموی خلفاء کرام، اسلام کے ضائع کرنے والے ہوتے، تو کیا ان کے ساتھ امت کی شیفتگی کا یہی عالم ہوتا جو ہم قرونِ اولیٰ میں دیکھتے ہیں، کہ امت اگر حمایت کرتی تھی تو ان کی، اور مخالف رہتی تھی تو ان کے مخالفوں کی۔ ان کی تاریخ مدوّن ہوئی ہے ان کے دشمنوں کے زمانہ میں، اور مخالفینِ دعوتِ محمدیہ کے ہاتھوں۔ آلِ بُویہ کا عالمِ اسلام پر تسلط، اور مسعودی جیسے مؤرخوں کا یوں اوراق سیاہ کرنا، اس کا سبب ہے کہ تاریخِ اسلام کا جو سب سے سنہری دَور تھا وہ ہمیں ایسا خسیس اور مایوس کن اور اندوہناک نظر آتا ہے۔

اگر یہ تاریخ اب بھی قرآن حکیم اور صحاح کی روشنی میں سمجھ کے ساتھ مدوّن ہو تو پھر اس دَور کی حقیقی صورتِ حال معلوم ہو سکتی ہے، اور یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ عالمِ اسلام پر جو مصائب نازل ہوئے، اور دین کے مسخ ہونے کی جو صورتیں پیدا ہوئیں اس کا سبب مسلمانوں کا ذہنی

اور رُوحانی انحطاط نہیں تھا، جیسا کہ احمق اور متعصّب لوگ ثابت کرنے کے درپے ہیں، بلکہ تخریبی عناصر کام کر رہے تھے۔ اور یہ عناصر جماعت اور اس کے ائمہ سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ اس کے باہر تھے اور اس کے دشمن۔ اگر مسلمان سمجھ لیں کہ یہ تخریبی عناصر کیا ہیں تو پھر وہ اس بحرِ ظلمات سے نکل کر آفتابِ ہدایت کے نور سے منوّر ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انھیں اپنے خود ساختہ تصوّرات چھوڑنے پڑیں گے، اور صحابۂ کرام کے زاویۂ نگاہ سے تمام امور کو دیکھنا ہوگا۔

حضرت ابن الزبیرؓ نے جو تحریک شروع کی تھی اس کا مقصد سوائے اپنی خلافت قائم کرنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ لوگوں نے یہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حادثۂ کربلا سے برافروختہ ہو کر آپ نے اپنے خروج کا اعلان کیا تھا، لیکن یہ محض خیالی بات ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو بنو ہاشم آپ کا ساتھ دیتے اور اکابر اصحاب ہمنوائی کرتے۔ لیکن بنو ہاشم سے تو آپ کی چلی ہوئی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک بیان ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ وہی مضمون ایک دوسری طرح ملاحظہ ہو [صحیح بخاری، کتاب التفسیر]

عن عمر بن سعید قال اخبرنی ابن ابی ملیکة قال دخلنا علی ابن عباس فقال الا تعجبون لابن الزبیر قام فی امرہ ھٰذا فقلت لاحاسبنّ نفسی لہ ما حاسبتہا لابی بکر ولا لعمر ولہما کانا اولی بکل خیر منہ وقلت ابن عمة النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابن الزبیر وابن ابی بکر وابن اخی خدیجة وابن اخت عائشة فاذا ھو یتعلّی عنّی ولا یرید ذٰلک فقلت ما کنت اظنّ انی اعرض ھٰذا من نفسی فیدعہ وما اراہ یرید خیراً وان کان لابدّ لان یربّنی بنو عمی احب الیّ من ان یربّنی غیرہم

عمر بن سعید سے مروی ہے وہ کہتے ہیں مجھے ابن ابی ملیکہ نے اطلاع دی اور کہا کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا تمھیں ابن الزبیرؓ کی اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ وہ (اپنی خلافت کی) یہ تحریک لے کر اٹھے تو میں نے کہا میں اپنے آپ کو ان کا ایسا پابند بناؤں گا کہ نہ ایسی پابندی میں نے (حضرت) ابو بکرؓ کی کی اور نہ (حضرت) عمرؓ کی، حالانکہ وہ ہر طرح اور ہر بھلائی کے ان سے زیادہ مستحق تھے میں نے سوچا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے فرزند ہیں، (حضرت) زبیرؓ کے فرزند ہیں، (حضرت) ابو بکرؓ کے فرزند ہیں، (حضرت) خدیجہؓ کے بھتیجے ہیں (حضرت) عائشہؓ کے بھانجے ہیں لیکن وہ تو میرے مقابلہ میں

اکڑے ہی چلے گئے، اور وہ نہیں چاہتے کہ میرا ان سے تعلق ہو۔ میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنے آپ کو ان کے سامنے اس طرح پیش کروں گا اور وہ ٹھکرا دیں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں اُن کے پیشِ نظر بھلائی نہیں۔ اور اگر یونہی ہونا ہے تو پھر بہتر ہے کہ میرے چچا کی اولاد میری پرورش کرے، یہ چیز مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے کہ میری پرورش دوسرے کریں۔"

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنو ہاشم کے ساتھ حضرت ابن الزبیرؓ کا رویہ حریفانہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا حسینؓ کے چلے جانے سے انھیں اطمینان ہوا۔ اور ان کی تحریک میں ہم حادثۂ کربلا کا ذکر نہیں پاتے۔ پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مقصد واقعی امت کی خیر خواہی کے لئے نظامتِ خلافت میں کوئی تبدیلی کرنا تھا۔ پھر یہ کہ انھوں نے جس طرح حکومت کی اس میں بھی تاریخ کے کسی طالبِ علم کو اموی خلافت سے کچھ تغائر نظر نہیں آتا۔ مسلم حکومت کا جو طریقہ صدیوں بعد تک رہا وہی ان کا بھی تھا۔ اس لئے باوجود ان کے زور پکڑ جانے کے حتیٰ کہ خود دمشق میں بھی ان کی بیعت ہوگئی، اور عالمِ اسلام کا بہت بڑا علاقہ بلکہ تقریباً سب عالمِ اسلام اُن کے قبضہ میں آگیا تھا، ان کی تحریک کو ہمعصر اکابر صحابہ اور بنو ہاشم نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، اور ان سے خلافت کی بیعت نہیں کی۔ محدثینِ کرام کے ہاں بھی ان کے زمانہ کا ذکر "فتنۂ ابن الزبیر" کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی پچھلی حدیث میں مذکور ہے۔ لیکن سیدنا ابن الزبیرؓ اور بنو ہاشم میں حریفانہ چشمک مختار ثقفی کی تحریک کی بناء پر نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے تھی کہ بنو ہاشم ہی کی وجہ سے دوسرے حضرات بھی ان کی بیعت سے گریزاں تھے، اور ان سب کی ہمدردیاں امویوں کے ساتھ تھیں۔

اکابر صحابۂ کرام نے اُن کے دعوئ خلافت اور سیاسی حرکت کو جس نگاہ سے دیکھا وہ حضرت ابن عمرؓ کے اس واقعہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ [صحیح مسلم: ج ۲، ص ۴۱۶، طبع مصر]

عن ابی نوفل رأیت عبد اللہ بن الزبیرؓ علی عقبۃ المدینۃ قال فجعلت قریش تمرّ علیہ والناس حتی مرّ علیہ عبد اللہ بن عمر فوقف علیہ، فقال السلام علیک یا ابا خُبیب السلام علیک یا ابا خبیب السلام علیک

ابو نوفل سے روایت ہے کہ میں نے (سیدنا) عبد اللہ بن زبیرؓ کو شہر کی گھاٹی میں سُولی پر لٹکا ہوا دیکھا۔ قریش ان کے پاس سے گذرتے جاتے تھے اور دوسرے لوگ بھی تا آنکہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ادھر سے گذرے، تو آپ کھڑے

اباخبیب اما واللہ لقد کنت انہاک عن ھٰذا اما واللہ لقد کنت انہاک عن ھٰذا اما واللہ لقد کنت انہاک عن ہٰذا۔ اما واللہ لقد کنت ما علمت صواماً قواماً وصولا للرحم اما واللہ لامۃ انت اشرھا لامۃ خیر، ثم نفذ عبداللہ بن عمر۔

ہو گئے اور فرمایا "ابو خبیب تم پر سلام ہو، ابو خبیب تم پر سلام ہو، ابو خبیب تم پر سلام ہو، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا، خدارا دیکھو میں نے تمھیں اس کام سے روکا تھا۔ بخدا میں جانتا ہوں کہ تم بہت روزے رکھنے والے، راتوں کو نماز پڑھنے والے اور رشتہ داری کا حق ادا کرنے والے تھے۔ بخدا اگر تم اس قوم میں سب سے بُرے ہو تو پھر تو یہ قوم بہت ہی اچھی ہے۔" یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔"

آگے قصہ ہے کہ کس طرح امیر حجاج بن یوسف کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور انھیں یہود کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی ذکر ہے کہ انھوں نے حضرت سیدہ اسماء بنتِ ابی بکرؓ کو طلب کیا، لیکن وہ نہ آئیں، تو انھوں نے گستاخانہ یہ بات کہی کہ اگر نہ آئیں تو انھیں گھسیٹ کر بلائیں گے، اور جب انھوں نے کہا کہ اگر اس طرح بُلانے کی ہمت ہو تو اسے بھی کر ڈالو، اس پر وہ خود جوتیاں گھسیٹتے ہوئے پہنچے، اور حضرت سیدہ اسماءؓ نے فرمایا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ ثقیف میں ایک کذاب ہوگا اور ایک بے محابا خون بہانے والا۔ کذاب کو ہم نے دیکھ لیا (یعنی مختار ثقفی کو)، اور مبیر تم ہو۔"

اس حدیث کی تفصیلات میں کئی باتیں آگئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض راویوں نے مضمون میں تصرف کیا ہے۔ مثلاً اس میں "عقبۃ المدینۃ" ہے جس کے معنی ہم نے شہر کی گھاٹی کئے ہیں۔ لیکن "المدینۃ" عموماً مدینۂ طیبہ کو کہا جاتا ہے۔ اور شاید راوی کا مطلب بھی وہی ہو۔ پھر اس میں یہود کے قبرستان کا ذکر ہے جو یقیناً مکہ میں نہیں تھا، اور سیدنا ابن الزبیرؓ کی شہادت مکۂ معظمہ میں ہوئی تھی۔ ان دو غلطیوں کی موجودگی میں یہ روایت قابلِ استناد نہیں رہی، اور نہیں کہا جا سکتا کہ باقی تفصیلات کس حد تک درست ہیں اور تعصب کو اس میں کتنا دخل ہے۔

بہرحال یہ اندازہ ضرور لگتا ہے کہ سیدنا ابن الزبیرؓ کی تحریک بالکل شخصی تھی۔ مفادِ امت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جہاں تک ذاتی خوبیوں اور علمی و عملی مکارم و فضائل کا تعلق ہے تو یقیناً سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کا اونچا معیار ہے۔ اور آپ

بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور قابلِ فخر ہستی ہیں، اور ان کی کافی اہم خدمات ہیں۔ لیکن امورِ جہانبانی میں محض ذاتی فضائل کام نہیں آتے، اور نہ محض شخصیت کی بناء پر آدمی مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی بھی یہی کیفیت تھی کہ ہزارہا لوگ عملاً آپ کی رعایا تھے لیکن آئینی حیثیت سے انھوں نے آپ سے بیعت نہیں کی تھی، اور نہ یہ جانتے تھے کہ ان کی تحریک اُمت کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ امامِ جماعت سے روگردانی کر کے امتِ مسلمہ میں آدمی کو پائدار مقبولیت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، اگرچہ شخصی حیثیت سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ تمام وہ تحریکیں ظاہراً و باطناً قطعاً ناکام رہیں جو اموی خلافت کو مٹانے کے لئے جاری کی گئیں، اور ان سے سوائے داخلی انتشار اور فتنہ و فساد کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ عباسیوں کو کامیابی اس وقت ہوئی جب خود امویوں میں باہمی نزاع کھڑا ہو گیا اور امت کا کوئی متفق علیہ امام نہ رہا۔ لیکن دعوتِ عباسیہ کے متعلق بھی یہ امر قطعی اور حتمی ہے کہ امت میں جو اختلال رونما ہوا اس میں عباسیوں کے داعیوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا، اور نہ انھوں نے کسی متفق علیہ امام کے خلاف خروج کیا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ جو اختلال رونما ہو چکا تھا، اور جا بجا اموی حکمتِ عملی کو بخوبی نہ چلانے سے ہنگامے بپا ہو رہے تھے جنھیں فرو کرنے میں آخری اموی خلفاء ناکام رہے تو اس وقت آل البیت نے امت کی خیر خواہی میں یہ تحریک چلائی، اور سب نے متفق ہو کر زمامِ کار بنو عباس کے ہاتھ میں دیدی۔ اور انھوں نے کامیابی حاصل کر کے دکھا بھی دی۔

بہرحال ایک بات قطعی اور حتمی ہے کہ سیدنا ابن الزبیرؓ نے اپنی طرف دعوت نہیں دی اگرچہ جمعیت بنالی تھی، اور امیر یزید کی بیعت سے گریز تھا۔ اسی لئے مدینہ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد امیر مسلم نے مکہ کا رُخ کیا۔ راہ میں وفات پائی اور حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ خضری نے لکھا ہے (محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۱۳۲) کہ اہلِ حجاز نے سیدنا عبداللہ بن الزبیرؓ سے خلافت کی بیعت کر لی تھی، لیکن یہ بالکل غلط ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ہو گئے تھے انھوں نے آپ کو اپنا امیر بنایا تھا نہ کہ امیر المؤمنین۔ آپ نے خلافت کی بیعت تو امیر المؤمنین یزید کی وفات کے بعد لی تھی۔

ان دونوں بغاوتوں کے سلسلہ میں عجیب و غریب قسم کی باتیں لوگوں نے وضع کی ہیں کہ کسی طرح اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ کے خروج کو باقاعدہ صلحائے امت کی کوئی تحریک ثابت کریں، اور امیر المؤمنین یزید کو جاہلیت کا امام بتائیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے تفصیلات بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ جتنا ہم پیچھے ہٹتے ہیں تو ماٰخذ سے یہ سادہ بغاوت معلوم ہوتی ہے، لیکن جتنا آگے آتے ہیں اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے علمبرداروں نے کفر کے خلاف جہاد کیا تھا، یہ اور بات ہے کہ ناکام رہے اور امت کی قیادت بالکلیہ جاہلیت کے ہاتھ میں چلی گئی"

واقعہ حرہ کے بارے میں ایک بیان تو صحیح بخاری کا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت محمد بن علی بن ابی طالبؒ نے اس بغاوت کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غدر سے تعبیر کیا تھا، اور ایک بیان ہے چھٹی صدی ہجری میں روض الانف کا، جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک شامی ایک انصاری کے گھر میں گیا اور روپیہ کا مطالبہ کیا۔ اس وقت ایک خاتون اپنے بچے کو (چھاتی سے) دودھ پلا رہی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ تم سے پہلے جو لوگ آئے تھے وہ سب مال و متاع لے گئے۔ شامی نے ان کا بچہ گود سے چھین لیا، اور روپیہ کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا اس بچہ کے باپ صحابیِ رسولؐ ابو کبشہؓ ہیں، اور میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ شامی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور روپیہ نہ ملنے پر بچہ کو دیوار سے دے مارا۔ جس سے اس کا دماغ پھٹ گیا۔ اس خاتون نے بچہ کا نام لے کر کہا "افسوس ہمارے پاس روپیہ ہوتا تو ہم تمھیں بچا لیتے"۔ مصنف نے یہ روایت تو لکھ دی۔ لیکن خود ہی خیال آیا کہ ۶۳ھ کے آخر میں ایسی خاتون کونسی ہو سکتی تھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہو اور پھر ان کا اتنا چھوٹا بچہ ہو کہ اُسے دودھ پلائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "غالباً وہ بچہ کی نانی یا دادی ہوں گی"۔ لیکن اتنی سمجھ سے پھر بھی کام نہ لیا کہ دادی یا نانی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے؟ چونکہ جذبات سے مغلوب تھے اس لئے اس روایت کو دیوار پر مارنے کی بجائے اس خیالی انصاری کے خیالی بچہ کو دیوار پر مار دیا۔ گویا یہ شامی مجاہد بھی ۱۹۴۷ء کا کوئی سکھ تھا جو دودھ پیتے بچہ کو دیوار سے مار دے۔ اسی صفحہ پر یہ بھی روایت ہے کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے جب بتایا کہ وہ اس ہنگامہ سے الگ رہے ہیں تو ان کے گھر پر چڑھ آنے والے شامیوں نے کہا کہ یہ تو آپ نے اچھا کیا۔ مگر روپیہ دلوائیے۔ آپ نے عذر کیا تو آپ کی داڑھی نوچ ڈالی۔

پھر شہداءِ حرہ کے فضائل میں ایک حدیث بھی لکھی ہے کہ "وہ حضرات روئے زمین کے بہترین لوگ ہیں جو اس معرکہ میں کام آئے" کوئی شک نہیں کہ ان میں جو صحابہ تھے اور غلط اندیشی کے سبب اس بغاوت میں شریک ہو گئے تھے وہ بہترین حضرات تھے، مگر اس بغاوت کے سبب نہیں، بلکہ اپنی شخصیتوں کے اعتبار سے۔ اور اپنے پہلے اعمال صالحہ اور کفار سے جہاد کے سبب۔ یہ ان حضرات کی اجتہادی غلطی تھی کہ دوسروں کے بہکائے میں آگئے۔ نہ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے جیساکہ سیوطی نے لکھا ہے اور نہ یہ اُن کا جہاد تھا۔ اسے جہاد اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب تمام نصوص کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔

اب صحیح مسلم کی ایک روایت ہے (ج ۱، ص ۶۹۹، طبع مصر):

عن جابر رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبلال اعطہ اوقیۃ من ذہب وزدہ قال فاعطانی اوقیۃ من ذہب وزادنی قیراطاً قال فقلت لاتفارقنی زیادۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فکان فی کیس لی فاخذہ اہل الشام یوم الحرّۃ۔	حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ خرید اتھا اور اس کی قیمت ایک اوقیہ سونا طے کی تھی تو آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دو۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے ایک اوقیہ سونا دیا اور ایک قیراط کا اضافہ

کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں میں نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو زیادہ سونا دیا ہے اسے میں کبھی اپنے سے جدا نہ کروں گا وہ میری ایک تھیلی میں تھا۔ اسے حرہ کے دن اہل شام نے لے لیا۔"

اہلِ شام کا اس طرح مال لے لینے کا ذکر صرف سالم بن ابی الجعد کی روایت میں ہے۔ باقی حضرات جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان میں سے کسی نے یہ اضافہ نہیں کیا۔ یعنی عامر، ابو نضرہ، ابو الزبیر، ابو المتوکل الناجی، محارب اور عطار سب نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے مگر کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ایک قیراط سونا سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے محفوظ کر رکھا تھا اور اسے اہلِ شام نے ان سے چھین لیا۔ وقائع سیاسی میں اس قسم کے اضافات لوگوں نے اپنے مطلب کے لئے کر دیئے ہیں۔

آخر وہ بھی تو حدیث ہے کہ مکہ میں ایک آدمی بغاوت کرے گا اور مقتول و مصلوب ہو گا اسے نصف امت کا عذاب دیا جائے گا۔ اسے بھی لوگ احادیث کی کتابوں میں پڑھتے ہی ہیں صراحتاً یہ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہ پر طعن ہے اور ان کے کسی مخالف نے وضع کی ہوگی۔

ایک لغو روایت

علامہ خضری نے تاریخ محاضرات الامم الاسلامیہ (ج ۱، ص ۱۶۴، طبع مصر) میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے، جس کی غرابت کا انھیں خود اعتراف ہے۔ محمد بن جبیر فرماتے ہیں کہ:-

"۶۸ھ میں حج کے موقع پر چار پرچم بلند تھے۔ ایک حضرت محمدؒ بن حنفیہ کا، ایک نَجْدَہ حروری (خارجی) کا، ایک حضرت ابن الزبیرؓ کا اور ایک بنو امیہ کا۔ مجھے فتنہ کا خوف ہوا تو میں پہلے حضرت محمدؒ بن حنفیہ کے پاس گیا، اور انھیں حرم میں فساد انگیزی سے ڈرایا۔ انھوں نے کہا میں لڑنے نہیں آیا ہوں البتہ جو لڑے گا اس سے لڑوں گا، تم اس بارے میں ابن الزبیرؓ اور نجدہ سے بات کرلو۔ پھر میں ابن الزبیرؓ کے پاس گیا! انھوں نے فرمایا میرے ہاتھ پر بیعت ہو چکی ہے اور یہ لوگ سب کے سب باغی ہیں۔ میں نے کہا، بہرحال ہاتھ روکے رکھنے ہی میں بہتری ہے۔ پھر میں نَجْدَہ کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ اپنی طرف سے تو میں قتال نہیں کروں گا لیکن اگر کوئی لڑا تو اس سے لڑوں گا۔ میں نے کہا وہ دونوں تو تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ پھر میں بنو امیہ کے ہوا خواہوں کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا ہم لڑنے نہیں آئے ہیں مگر جو لڑے گا اس سے لڑیں گے۔

بہرحال سب سے پہلے ابن الحنفیہؒ کا جھنڈا لپیٹا گیا، پھر نجدہ کا، پھر بنو امیہ کا اور پھر حضرت ابن الزبیرؓ کا۔ لوگوں نے (مناسکِ حج) سب ابن الزبیرؓ کی اقتدا میں ادا کئے"

یہ روایت وضع کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ ۶۸ھ کے حج میں اختلافِ امت کے باوجود کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور امت کے سب گروہوں نے بخیر و خوبی اپنا فرضِ عبدیت ادا کیا۔ اس روایت کے بے اصل ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نہ کوئی شیعہ تھے اور نہ آپ کا کوئی سیاسی موقف تھا سوائے

اس کے کہ باقی بنو ہاشم کی طرح آپ کی ہمدردیاں اموی خلافت کے ساتھ تھیں۔ اور آپ نے بھی حضرت ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی تھی۔ بلکہ ان کے برافروختہ ہونے کے بعد آپ چاہتے تھے کہ شام چلے جائیں۔ رہا مختار ثقفی تو وہ دور دور ہی سے اپنے آپ کو آپ کا فرستادہ کہتا تھا۔ دوبدو سامنے آنے کی اس نے کبھی ہمت نہیں کی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کے ادعاء کے بطلان کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کی تخریبی کارروائیوں کی ذمہ داری نہ سیدنا ابن الزبیرؓ نے بنو ہاشم پر رکھی۔ اور نہ امیر المؤمنین حضرت عبدالملکؒ نے۔ لہٰذا آپ کا کوئی جھنڈا ہونا یا اس جھنڈے کے نیچے کسی گروہ کا اجتماع محض خیالی اور فرضی بات ہے۔ ہم اس کا ثبوت دے چکے ہیں کہ قاطبۃً تمام بنو ہاشم کی ہمدردیاں بنو امیہ کے ساتھ تھیں تو پھر اگر وہ مجتمع ہوتے تو اموی جھنڈے کے نیچے ہوتے۔

حقیقت یہ ہے جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سبائی گروہ کی مختلف ٹولیوں نے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر آل البیت کو باہمی تقسیم کر رکھا تھا۔ کوئی کسی کی امامت کا مدعی تھا اور کوئی کسی کی۔ خود بنو ہاشم ان لغویات سے مبرا تھے، اور اس سے قطعاً ناواقف کہ ان میں سے کوئی صاحب کسی قسم کی امامت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے وقت کے خلفاء سے بیعت کی، اور اس گروہ سے کوئی تعلق نہ رکھا جو اپنے آپ کو آل البیت میں سے کسی کا شیعہ کہتا تھا۔ اگر کوئی ہاشمی ان میں سے کسی ٹولی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا وہی حشر ہوا جو حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات کا ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے ہم یہ باور کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتے کہ اس حج کے موقع پر بنو ہاشم نے کوئی جھنڈا بلند کیا تھا، یا اپنا گروہ بنا کر الگ کھڑے ہوئے تھے۔

پھر دریافت طلب یہ بات ہے کہ اگر سیدنا محمد بن علیؓ کا کوئی جھنڈا اور گروہ تھا تو باقی بنو ہاشم کس جھنڈے کے نیچے تھے؟ کیا انھوں نے سب نے حضرت محمدؒ کی امامت قبول کر لی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو کسی دوسرے ہاشمی جھنڈے کا ذکر کیوں نہیں؟

سیدھی اور صاف بات ہے کہ جو شخص بھی اس وقت حج کے لئے حاضر ہوا تھا وہ احرام کی حالت میں تھا، اور اس جگہ تھا جہاں ہر حال میں امن رکھنا فرض عین ہے۔ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا {جو بھی وہاں (بہ نیت عبدیت) حاضر ہوگا امن پائے گا}۔ پھر موقع تھا حج کا، فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (حج کے موقع پر نہ شہوت رانی ہے، نہ کجروی ہے اور نہ کسی قسم کا کوئی جھگڑا ہے)۔

خود یہ روایت بھی اس کی گواہی دیتی ہے کہ اختلاف کے باوجود اس موقع پر تمام حجاج پرامن رہے۔ اور سب نے سیدنا ابن الزبیرؓ کی اقتدا میں مناسکِ حج ادا کئے۔

اب ہم سوال کرتے ہیں کہ جب لوگ مسلح ہو کر آئے ہوں، اپنے اپنے جھنڈے بلند کئے ہوئے ہوں اور گروہ بندی میں مبتلا ہوں، یعنی خدا کے بندے بن کر نہ آئے ہوں بلکہ سیاسی اکھاڑہ جمانے کے درپے ہوں، اور قتال و جدال تک پر تیار ہوں، تو ایسی ذہنیت کے لوگوں کو پرامن رکھنے کے لئے بڑی طاقت کی ضرورت ہو گی۔ کیا امت کی سیاست میں محمد بن جبیرؒ کی یہ حیثیت تھی کہ لوگ ان کا فرمان بجا لانے پر مجبور ہوں؟ کبھی تاریخ میں ان صاحب کی عالمگیر مقبولیت اور دبدبہ کا کوئی ذکر کیا گیا ہے؟ جو لوگ اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے صاف و صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے فوجی پرے بنائے کھڑے ہوں اور آدابِ صالحین کو چھوڑ کر احرام کی حالت میں بھی خطرات انگیز کرنے کے درپے ہوں، ان کی اصلاح کے لئے یا تو ان کی مجموعی طاقت سے بھی بدرجہا زیادہ مضبوط فوجی طاقت کی ضرورت ہے، یا پھر نبی کا تصرف چاہئے۔ محمد بن جبیرؒ دونوں صفتوں سے عاری تھے۔

لہٰذا صرف یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس وقت جتنے مسلمان حج کے لئے آئے تھے وہ انہی آداب کے مطابق آئے تھے جو اللہ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں۔ اور انھیں یہ فقہی جزئیہ معلوم تھا کہ حرم شریف جس کی تولیت میں ہے اس کی امامت و قیادت میں مناسکِ حج ادا کئے جائیں۔ آخر وہ بنو ہاشم اور تمام مسلمان جنھوں نے سیدنا ابن الزبیرؓ سے بیعت نہیں کی تھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ پھر حج کے موقع پر فوجی پریڈ کی ضرورت کیوں ہوئی؟

نماز ہر نیک و بد کے پیچھے ہے، اور امت کا اس پر عمل متواتر ہے۔ اسی طرح سب لوگ جانتے تھے کہ اپنی شخصی حیثیت میں سیدنا ابن الزبیرؓ کا یہ مرتبہ ہے کہ حج کے اجتماع میں آپ قیادت فرمائیں۔ پہلے اس روایت کی لغویت پر روشنی ڈالی جا چکی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ سیدنا ابن الزبیرؓ اپنی جماعت الگ کرایا کرتے تھے اور اموی امیر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ایسی ہی لغو یہ روایت ہے۔ اور اس قِسم کی فضول داستانیں لوگوں نے محض یہ دکھانے کے لئے وضع کی ہیں کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اپنے سیاسی

اختلاف اور اجتہادی موقف کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے تھے، اور ہر موقع پر... دھڑے بندی کی لعنت ان کی گردن میں رہتی تھی۔ اور ان میں آدابِ دینیہ کی پاسداری کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ کاش ایسی باتیں بیان کرتے وقت لوگ خدا کا خوف کریں، اور بزرگوں سے حیار کا کوئی جذبہ لے کر لکھنے بیٹھا کریں۔ مسلمانوں کو یہ باور کرنا چاہیے کہ ۶۸ھ کے اجتماعِ حج میں نہ کوئی جھنڈا نصب کیا گیا نہ کوئی جھگڑا اور فساد ہوا، اور نہ مسلمانوں نے سوائے بندگی کے کوئی مظاہرہ کیا۔

بعض شبہات کا ازالہ

وفات سیدنا حسن رضی اللہ عنہ

سیدنا حسن صلوات اللہ علیہ امت مسلمہ کے محسنِ عظیم ہیں، اور آپ کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی آیت ہے۔ مسلمانوں نے اس نورِ چشم مصطفویٰ کو ہمیشہ بغایت عزت و احترام و محبت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ہمعصر امت نے انھیں مایۂ افتخار جانا ایک طرف تو آپ کی یہ حیثیت ہے، اور دوسری طرف آپ کے بارے میں کذب و افترا، کا ایک دفتر ہے۔ جس کا کچھ اندازہ ان اوراق میں وقائع صلح کے تحت نظر آ گیا ہوگا صحابۂ کرام اور اہل بیت اطہار کی راہ سے ہٹ کر چلنے والوں نے جہاں اور قسم قسم کی باتیں سلف صالحین کے متعلق وضع کی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے اشارہ سے زہر دیا گیا تھا جس سے آپ نے وفات پائی۔ بعض لوگ اس کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے (ص ۴۷، طبع مصر) :-

توفی الحسن رضی اللہ عنہ بالمدینۃ مسموماً سمتہ زوجتہ جعدۃ بنت الاشعث بن قیس دس الیہا یزید بن معاویۃ ان تسمہ فیتزوجہا ففعلت فلما مات الحسن بعثت الی یزید تسألہ الوفاء بما وعدہا فقال لم نرضک للحسن افنرضاک لانفسنا۔

حسن رضی اللہ عنہ کی وفات مدینہ میں زہر سے ہوئی۔ یہ زہر انھیں ان کی بیوی جُعدہ بنت اَشعث بن قیس نے دیا تھا۔ یزید بن معاویہ نے انھیں ورغلایا کہ اگر وہ انھیں زہر دیدیں تو وہ خود ان سے نکاح کرلیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب (سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو یزید کو انھوں نے پیغام بھیجا کہ اب اپنا وعدہ پورا کریں انھوں نے کہا "ہم نے جب تمھیں حسن رضی اللہ عنہ کے لئے پسند نہیں کیا تو کیا اپنے لئے کرلیں گے"؟

اب ان صاحب سے پوچھا چاہیئے کہ اتنی تفصیلات جب انھیں معلوم ہیں تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم ہوں گی، بلکہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھی، اور سب اہلِ بیت اور صحابۂ کرام اس سے واقف ہوں گے کہ آپ کو زہر دیا گیا، فلاں شخص نے دیا ہے اور فلاں مقصد سے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کو یہ باتیں معلوم تھیں اور قاتل کو معاف

کر دیا تو پھر اس کا تذکرہ کیوں؟ اور اگر معلوم نہیں تھیں تو بعد کے لوگوں پر یہ راز کس طرح کھل گیا۔

تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ بات معلوم تھی اور معاف نہیں کیا تو پھر قاتل کے خلاف کارروائی کیا کی گئی؟ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اور ضعیف سے ضعیف بلکہ کوئی موضوع روایت بھی ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ سیدنا حسینؓ نے زہر خورانی کا مقدمہ امیر مروانؒ کی عدالت میں پیش کیا تھا اور اس سلسلہ میں یہ کارروائی ہوئی تھی۔ یعنی سیدنا مروانؒ اور اموی خلفاء اہل بیت کے ازلی دشمن تھے اس لئے یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا اور قاتل سے قصاص نہیں لیا گیا۔

اگر ایسی کوئی بات نہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب بعد کی وضع کی ہوئی باتیں ہیں، اہلِ بیت کو ان میں سے کسی بات کا علم نہیں تھا۔ اور انھوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کو طبعی سمجھا، اسی لئے قطعاً کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور نہ کسی پر زہر خورانی کا انھوں نے شبہ کیا۔

دائرۂ معارف اسلامیہ اردو کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات مرضِ سل میں ہوئی تھی۔ یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا حسنؓ کے متعلق محقق ہے کہ آپ خوشبو کا استعمال بہت کرتے تھے حتیٰ کہ جدھر سے گذر جاتے تھے مدینہ کی گلیاں مہک اٹھتی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو نزلہ ہوا ہو اور احتیاط نہ کرنے سے بگڑ گیا ہو۔ یہ جو روایتوں میں مُنہ سے خون آنے کا ذکر ہے اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔

پھر ہمیں دیکھنا چاہئے امیر المؤمنین یزید کے ساتھ اہلِ بیت کا برتاؤ۔ اگر اس قِسم کا کوئی شبہ ان حضرات کو ہوتا تو انھیں سیدنا حسنؓ کی وفات کا قصہ یاد آتا اور اِن کی ہمدردیاں ان سے اُٹھ جاتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات بغاوتِ اہلِ مدینہ سے محض الگ ہی نہیں رہے، بلکہ امیر المؤمنین کی طرف سے مدافعت کی، اور ان کے کردار پر حرف رکھنے والوں کو جھٹلایا انھیں ملازمِ سنت اور متلاشیِ خیر باور کرایا۔ اور دین کی بنیاد پر ان کے خلاف خروج کو حرام جانا۔ پھر اُن کی وفات کے بعد نہ ان لوگوں سے کوئی واسطہ رکھا جو خونِ حسینؓ کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے، اور نہ حضرت ابن الزبیرؓ کا ساتھ دیا جو اموی خلافت کے طاقتور مخالف تھے۔

پھر ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ جو لوگ خونِ حسینؓ کا "بدلہ لینے" کھڑے ہوئے تھے انھوں نے امیر المؤمنین یزید کے "جرائم" میں سیدنا حسنؓ کو زہر دینا بھی شامل کیا ہو، اور اپنے پروپگنڈہ میں کسی جگہ اشارتاً بھی اس جرم کو بیان کیا ہو۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ بعد کے مؤرخوں کو

اس زہر خورانی کے تمام واقعات اور تفصیلات کا علم ہے، لیکن نہ ہمعصر لوگ اس سے واقف تھے اور نہ اُن کے بعد فوراً آنے والے۔

تدفین

سیوطی نے سیدنا حسن رضؓ کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ بنو امیہ کی دشمنی ثابت کی ہے کہ امیر مروانؒ نے انھیں روضۂ شریف میں دفن نہیں ہونے دیا۔ اور سیدنا حسین رضؓ جب ہتھیار لگا کر آئے کہ بزورِ شمشیر وہاں تدفین عمل میں لائیں تو سیدنا ابو ہریرہؓ نے انھیں سمجھا بجھا کر اس سے باز رکھا۔ اور یوں قبۂ اہلِ بیت میں سیدنا عباسؓ کے پاس انھیں دفن کیا گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ امیر مروانؒ نے یہ کہا تھا کہ "جب عثمانؓ وہاں دفن نہیں ہوئے تو حسنؓ بھی نہیں ہو سکتے"۔

یہ سب افسانے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سب سے پہلے حق تھا حضرت سیدۂ فاطمہ صلوات اللہ علیہا کا۔ لیکن خود سیدنا علیؓ نے انھیں وہاں دفن کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جنت البقیع ہی میں دفن کیا۔ حالانکہ اس وقت اس کے امکانات قوی تھے، اور اگر ایسی کوئی کوشش کی جاتی تو کوئی حارج نہ ہوتا۔ ان کے بعد یہ حق تھا سیدنا عباسؓ کا اور ان کے ساتھ خلفائے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور امت کو جو عقیدت تھی وہ ظاہر ہے کہ کس طرح حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ انھیں دیکھ کر سواری سے اُتر جاتے تھے۔ اور مخالف سمت بھی جا رہے ہوں تو انھیں ان کی جائے مقصود تک پہنچا کر واپس ہوتے تھے۔ صحاح کی یہ روایت سب جانتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے وسیلہ سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ بھی ہر دفعہ ان کی برکت سے یہ دعائیں سنتا تھا۔ جب صحابۂ کرام کو ان سے اتنی عقیدت و محبت تھی اور وہ ان کے نزدیک اس درجہ معزز و محترم تھے، اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تنہا وارث تھے تو ان کا حق تھا کہ وہ آپ کے پہلو میں دفن ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر یہ حق تھا سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور صحابۂ کرام خالِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں۔ اور جن سے صحابۂ کرام اور اہلِ اسلام کو اتنی عقیدت تھی کہ وادیٔ عقیق سے جہاں آپ کا قصر تھا آپ کے جسدِ اطہر کو ہاتھوں پر مدینۂ طیبہ لائے تھے، کیونکہ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ آپ کو اٹھانے کی سعادت حاصل کرے، اور یوں کئی میل کی مسافت طے کی گئی مسجد شریف میں نمازِ جنازہ ہوئی لیکن دفن کیا گیا بقیع میں۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس عمل سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ روضۂ شریف میں دفن ہونے کا حق صرف حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کو تھا، کہ دعوتِ محمدیہ کے یہی تین ستون تھے۔ اس کے بعد جو کوئی بھی دفن ہوتا وہ ترجیح بلا مرجح ہوتی، یا پھر روضۂ شریف خود قبرستان بن جاتا۔ امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمانؓ سے آپ کی تدفین کے بارے میں وصیت معلوم کرنے کا موقع ہی کہاں تھا۔ لیکن اگر آپ ایسی وصیت کرتے تو یقیناً اس کی تعمیل ہوتی، اور باغی کیسے ہی سرکش کیوں نہ ہوتے وہ حجرۂ شریف کی بے حرمتی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، اور نا ممکن تھا کہ وہ اس تدفین میں حارج ہو سکیں۔ ویسے ہم یقین رکھتے ہیں کہ سیدنا عثمانؓ اگر وصیت کر سکتے تو یقیناً یہ وصیت نہ کرتے کہ آپ کو روضۂ شریف میں دفن کیا جائے آپ شہید ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھے، حتیٰ کہ ازار اُتار کر پاجامہ بھی پہن لیا تھا کہ ستر رہے۔ آپ فرما سکتے تھے کہ مجھے روضۂ شریف میں دفن کیا جائے، مگر یہ وصیت نہیں کی۔

اس کے بعد سب سے زیادہ حق وہاں دفن ہونے کا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا کا تھا کہ حجرۂ شریف تھا ہی آپ کا، اور آپ کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب کوئی فتنہ نہ تھا۔ لیکن آپ نے وصیت فرمائی کہ باقی ازواج مطہرات کے ساتھ ہی آپ کو دفن کیا جائے۔

اس تمام طرزِ عمل سے صحابۂ کرام کا اجماع ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں اور وزیروں کے ساتھ کوئی اور شخص دفن نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کا امکان نہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے وہاں دفن ہونے کی کوئی وصیت فرمائی ہو اور اس ذیل میں کوئی ہنگامہ ہوا ہو۔ باقی جو خرافات سیوطی صاحب نے سیدنا مروانؒ کے بارے میں لکھی ہیں ان پر محاکمہ کی ضرورت نہیں۔ جب یہ طے کر لیا جائے کہ امویوں کی بابت اچھی بات کہی نہیں جائے گی اور بُری باتیں چھانٹ چھانٹ کر بیان کی جائیں گی تو آدمی کہاں تک ان روایتوں کے پیچھے پڑے۔ ان کی تکذیب کے لئے موطّا کافی ہے اور اس سے اہلِ ایمان معلوم کر سکتے ہیں کہ سیدنا مروانؒ کس کردار اور کس مرتبہ کے شخص تھے۔ اور صحیح روایتوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ بیت کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے۔ وہ سیدنا علی زین العابدینؒ کے بہترین دوست تھے، اور ان سے تعلقاتِ یگانگت ایسے تھے کہ کسی دوسرے غیر ہاشمی کے ساتھ نہ تھے۔ ان کا وہ خط موجود ہے جو انھوں نے سیدنا حسینؓ کے خروج کے بعد امیر عبید اللہ بن زیاد کو بھیجا تھا [البدایۃ والنہایۃ: ج ۸، ص ۱۶۵،

[تاسخ التواریخ: مطبوعہ ایران، کتاب دوم: ج ٦، ص ١٦٥]

اما بعد! فان الحسین بن علی قد توجہ الیک وہو الحسین بن فاطمۃ، وفاطمۃ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتاللہ ما احدٌ یسلمہ اللہ، احب الینا من الحسین فایاک ان تہیّج علیٰ نفسک مالایسدہ شئیٌ ولاتنساہ العامۃ ولاتدع ذکرہ آخر الدھر۔

"اما بعد! حسین بن علیؓ تمھاری طرف چل پڑے ہیں۔ یاد رکھو وہ حسین بن فاطمہؓ ہیں۔ اور فاطمہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں خدا کی قسم خدا انھیں سلامت رکھے، ہمیں کوئی شخص بھی حسینؓ سے زیادہ محبوب نہیں۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ تم نفس کے ہیجان میں ایسی کوئی بات کر بیٹھو جس کے (بُرے نتائج کی) روک تھام نہ ہو سکے، عوام اُسے بھول نہ سکیں اور قیامت تک اس کا تذکرہ ہوتا رہے۔"

ناسخ التواریخ کے غالی مؤلف کی اس شہادت کے بعد کہ سید نا مروانؒ کو اہل بیتِ رسالت سے کیسی محبت و مودت تھی، مسلمان سیوطی کی تحریر پر جتنی بھی ندامت محسوس کریں کم ہے۔ سید نا حسینؓ نے ابتدائے خروج کیا تھا، جب ان کے بارے میں سید نا مروانؒ کے یہ جذبات ہیں تو سید نا حسنؓ کے متعلق اُن کے جذبات کیسے ہوں گے جو سید نا معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے اور سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار فرما کر قطعی خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس خط کی موجودگی میں سیوطی کے تمام بیانات ہباءً منثورا ہو جاتے ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہو گا کہ جو شخص برضاء و رغبت خلافت سے دستبردار ہو کر امیر المومنین معاویہؓ سے بیعت کر چکا ہو اور اس پر مستقیم ہو، جو ہر فتنہ و فساد سے لوگوں کو روکتا ہو، جو مرنجان مرنج زندگی بسر کر رہا ہو اسے خفیہ زہر دے کر شہید کر دیا گیا ہو گا۔ امیر یزید کو عورتوں کی کیا کمی تھی جو وہ دوسرے کی بیوی پر نگاہ ڈالتے اور وہ بھی غائبانہ۔ سیدہ جعدہؒ کیا اس حقیقت سے ناآشنا تھیں کہ سید نا حسن رضی اللہ عنہ متعدد خواتین کو طلاق دے چکے تھے، اس لئے انھیں اگر سید نا حسنؓ سے "چھٹکارہ" کی خواہش ہوتی تو بآسانی طلاق لے سکتی تھیں۔ اور اگر سید نا حسنؓ کو زہر دے کر ختم کرنا ہی مقصود ہوتا تو یہ کام بیوی سے کیوں لیا جاتا، ایسے لوگ بھی مل سکتے تھے جو کام کر جائیں اور کسی کو شبہ بھی نہ ہو۔ لیکن علمِ غیب ان راویوں اور مصنفوں کو ہے جن حضرات کی آنکھوں کے سامنے ان واقعات کا ہونا بیان کیا جاتا ہے، ان کی نہ آنکھیں تھیں اور نہ دل نہ محبت تھی اور نہ غیرت و حمیت۔ اہلِ بیت کی تمام محبت و عقیدت صرف سبائیہ کے حصہ میں آئی ہے۔

غلمۃ من قریش

صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے [کتاب الفتن: ج ۴، ص ۲۲۲ طبع مصر] جس کی بڑی دلچسپ تعبیر کی گئی ہے:-

قال ابو ھریرۃ رض........ سمعت الصادق المصدوق یقول ھلکۃ امتی علی ایدی غلمۃ من قریش فقال مروان لعنۃ اللہ علیھم غلمۃ؟ فقال ابوہریرۃ لو شئت ان اقول بنی فلان وبنی فلان، لفعلت۔

حضرت ابوہریرۃ رض فرماتے ہیں میں نے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے "میری امت کی ہلاکت کم عمر قریشی لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی"۔ مروانؒ نے کہا خدا کی لعنت ہو ان پر، لڑکے؟ حضرت ابوہریرۃ رض نے فرمایا "اگر یہ کہنا چاہوں کہ فلاں خاندان کے اور فلاں خاندان کے تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں"۔

ایک صاحب نے اپنی خیالی نسلی برتری کے جذبہ کے تحت "غلمۃ" کا ترجمہ کیا ہے "چھوکرے"۔ مقصد توہین ہے۔ کیونکہ یہ صاحب بزعم خود سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد صرف اموی نوجوان ہیں۔

ظاہر ہے کہ قریشی لڑکوں سے مراد وہی لوگ ہوں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کم عمر تھے۔ قیامت تک پیدا ہونے والے بچّے تو مراد نہیں ہو سکتے۔ یا پھر وہ ہوں گے کہ جنھوں نے چھوٹی عمر میں امت کی سیاست میں حصہ لیا۔ اب کیسی دلچسپ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں "قریشی لڑکے" سیدنا ابوھریرہ رض فرمائیں "فلاں خاندان کے اور فلاں خاندان کے"۔ لیکن لفظ قریش کو مختص کر دیا جائے، بنوامیہ سے اور کہہ دیا جائے کہ یہ پیشگوئی اموی نوجوانوں کے ہاتھوں امت کی تباہی کی ہے۔

پھر جب قریش کے بارہ خلفاء کی حدیث مذکور ہو تو اس وقت اس فہرست سے امویوں کا نام نکال دیا جائے اور مراد لئے جائیں محض تیمی، عدوی، ہاشمی اور اسدی، یا عنایت فرما کر صرف ایک نام سیدنا عثمان رض کا لیا جائے۔ گویا تمام خوبیاں قریش کے دوسرے خاندانوں میں تھیں، اور تمام برائیاں بنوامیہ میں۔ انصاف اور عقل کو خیرباد کہہ کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں ان لوگوں کی خیالی توصیف میں جو باہمی فساد کے ذمہ دار ہیں، اور سوائے داخلی فتنوں کے ان کے نامۂ اعمال میں اور کچھ نہیں، لیکن جنھوں نے ایشیا، افریقہ اور یورپ میں دعوت محمدیہ کو برپا کیا، تین چوتھائی متمدن دنیا کو حلقہ بگوش اسلام کیا، اور ایسا نظام عدل دنیا میں برپا کیا کہ اقوام عالم اس کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرتی چلی جا رہی ہیں، ان کی قسمت میں یہ ہو کہ

جب خلافت کا ذکر آئے تو شر الملوک کہلائیں اور جب امت کی ہلاکت کا ذکر ہو تو تمام ذمہ داری انہی کے سر ڈال دی جائے۔ اگر تاریخ اور حقائق سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں اور دورِ فتن پر تبصرہ کرتے وقت محض شخصیتوں کی پوجا مقصود ہو تب البتہ یہ لغو باتیں کہی جا سکتی ہیں جو نسلی تعصب میں مبتلا لوگ کرتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے "اموی چھوکرے" فرمایا تھا یا "قریشی لڑکے"؟ اور خلفاء کے ذکر میں آپ نے کہیں یہ تشریح کی کہ یہ بشارت امویوں کے علاوہ باقی قرشی خلفاء کے لئے ہے۔ لیکن ان لوگوں کا کیا علاج ہے جو خلافت پر بحث کرتے وقت "الاحادیث المنذرۃ من خلافۃ بنی امیۃ" (بنو امیہ کی خلافت سے ڈرانے والی حدیثیں) جمع کریں اور خود ہی کہتے بھی جائیں کہ فلاں راوی وضاع ہے اور فلاں کذاب، پھر جمع کریں "الاحادیث المبشرۃ بخلافۃ بنی العباس" (بنو عباس کی خلافت کی بشارت دینے والی حدیثیں) اور یہاں بھی تصریح کرتے جائیں کہ فلاں راوی وضاع ہے اور فلاں ضعیف۔

سیوطی صاحب کو علمِ حدیث پر عبور کا دعویٰ ہے لیکن اس کا خوف نہیں کہ وضاعوں اور کذابوں کی روایات کو سند بنا کر بطور حجت پیش کرنا عند اللہ کتنا موجب توبیخ ہے۔ تاریخ الخلفاء حدیث کی کتاب نہیں ہے جو علمائے حدیث اسے پرکھیں۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے جو خاص و عام ہر شخص کے ہاتھ میں جائے گی، اور چونکہ اس کے نام کے ساتھ علامہ جلال الدین سیوطی کا نام لکھا ہوا ہے اس لئے وہ اس کے اندر مندرج شدہ تمام باتوں کو مستند سمجھے گا۔

یہ جو چار دانگِ عالم میں جدھر رُخ کرو اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کی آواز سنو اسے امت کی ہلاکت سے تعبیر کیا جائے گا، یا اسے کہ آج بغداد تباہ ہو رہا ہے اور کل ملکِ مصر، پرسوں میسور، اور پھر دہلی اور آخر میں دکن۔ آخر حیاء اور ایمان بھی کوئی چیز ہے "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہیم"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین امت کے داخلی فتنوں کو جس طرح دیکھتے تھے وہ صحیح بخاری میں دیکھیے (صحیح بخاری: کتاب الفتن، ص ٢٣٠، طبع مصر):

عن ابی المنھال قال لما کان ابن زیاد ومروان بالشام ووثب ابن الزبیر بمکۃ ووثب القراء بالبصرۃ فانطلقت مع ابی الی ابی برزۃ الاسلمی حتیٰ دخلنا علیہ	حضرت ابو منہالؒ سے روایت ہے کہ جب ابن زیاد اور مروانؒ شام میں تھے، ادھر ابن الزبیرؓ مکہ میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور خارجیوں نے بصرہ پر قبضہ کر رکھا تھا تو میں

فی دارہ وہو جالس فی ظل عُلّیۃٍ لہ من قصب فجلسنا الیہ فانشاء ابی یستطعمہ الحدیث فقال یا ابا برزۃ الاتری ما وقع فیہ الناس فاوّل شیٔ سمعتہ تکلم بہ انی احتسبت عند اللہ انی اصبحت ساخطاً علیٰ احیاء قریش انکم یا معشر العرب کنتم علی الحال الذی علمتم من الذلۃ و القلۃ والضلالۃ وان اللہ انقذکم بالاسلام وبمحمد صلی اللہ علیہ وسلم حتّیٰ بلغ بکم ما ترون وھٰذہ الدنیا التی افسدت بینکم - ان ذاک بالشام واللہ ان یقاتل الاعلی الدنیا وان ہٰؤلاء الذین بین اظہرکم واللہ ان یقاتلون الاعلی الدنیا وان ذاک الذی بمکۃ واللہ ان یقاتل الاعلی الدنیا۔

اپنے والد کے ساتھ سیدنا ابو برزہ اسلمیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم آپ کے گھر میں جب پہنچے ہیں تو آپ بینٹوں کے ایک سائبان کے نیچے تشریف رکھتے تھے۔ ہم آپ کے پاس جا بیٹھے، اور میرے والد نے سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کے لئے کہا "اے ابو برزہ آپ دیکھتے نہیں کہ لوگوں نے کیا کر رکھا ہے"؟ تو پہلی بات جو میں نے آپ کے منہ سے سنی وہ یہ تھی "میں خدا لگتی کہتا ہوں کہ میں قریش کے گھرانوں سے ناراض ہوں"۔ عرب کے باشندو! تم جانتے ہو کہ تم ذلت، قلت اور ضلالت کے کس عالم میں تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نجات دی، تاآنکہ تم اس مرتبہ تک پہنچ گئے جو تمھارے سامنے ہے۔ اب یہ دنیا ہے جس نے تمھیں تباہ کر رکھا ہے۔ یہ صاحب جو شام میں ہیں بخدا محض دنیا کے لئے شمشیر بکف ہیں، اور یہ لوگ جو تمھارے درمیان ہیں (یعنی خارجی) بخدا یہ بھی محض دنیا کے لئے لڑ رہے ہیں، اور یہ صاحب جو مکہ میں ہیں بخدا ان کے لڑنے کی غرض بھی محض دنیا ہے"۔

یہ تھا صحابۂ کرام کا نظریہ تمام اندرونی فسادات کے متعلق۔ ان کے نزدیک حق و صداقت کے یہ معنی تھے کہ آپس میں امن ہو اور کفار سے جنگ۔ اسی لئے وہ عموماً ان فسادات سے الگ رہتے تھے۔ رہے وہ حضرات جو خانہ جنگی میں مبتلا ہوتے تو ان کے متعلق سیدنا ابو برزہؓ جیسے بزرگ وہ کہہ سکتے تھے جو انھوں نے کہا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنی دانست میں یہ حضرات بھی خدا کے لئے لڑے، اور امت کی بھلائی کو پیش نظر رکھا، اگرچہ نتیجہ کچھ اور نکلا۔ اگر انھوں نے یہ اقدامات محض ذاتی ترفع کے لئے کئے تب بھی چونکہ ان کے نفوس پاک تھے، اس لئے اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو بہر حال کام وہی کرتے جو اللہ و رسول کی تعلیمات کے مطابق کرنے چاہئیں، اور ہر مسلم حکمران

کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا اس سے ان امور کی توقع کی جاتی ہے۔

بہر حال سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے "غلمۃ" "من قریش" سے مراد محض اموی نوجوانوں کو نہیں لیا، بلکہ ان سب کو لیا جو کفار سے جہاد کی بجائے آپس میں بر سر پیکار تھے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جونہی وہ ان فتنوں سے نکلے انھوں نے داخلی امن اور خارجی ترقیوں کی راہیں کھولنے کی کوشش سے دریغ نہیں کیا، اور اسی طرف لگ گئے جدھر اللہ و رسول نے لگایا تھا۔

ہمارا مقصد یہاں اس بحث میں اُلجھنا نہیں کہ قوانینِ شریعت کے مطابق کون حق پر تھا اور کس نے خطا کی، ہم تو محض اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ امت کے باہمی فساد میں محض بنو امیہ ہی مبتلا نہیں ہوئے اور نہ سبب بنے، بلکہ دوسرے بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ اور اگر ایمان و دیانت سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بنو امیہ نے خود یہ جھگڑے نہیں اُٹھائے بلکہ اُنہیں ان فسادات میں گھسیٹا گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور فرق ہے اور وہ بہت بڑا ہے کہ دوسرے لوگ تو باہم اُلجھ کرنا کام رہے، اور سوائے فساد کے ان کی تحریکوں سے امت کو ظاہری یا باطنی کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن ساداتِ امویہ نے ان مفاسد کا قلع قمع کر کے اپنے عزائم کا رُخ ان امور کی طرف کر دیا جس کے نتیجہ میں تین چوتھائی دنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی، اور چار دانگِ عالم میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ اور یوں دنیا نے اپنی آنکھوں سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دیکھ لیا کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے، اور ایک سے ایک بڑا امام پیدا ہوا۔ ان اموی خلفاء نے صحابۂ کرام کی موجودگی ہی میں اسلام کو دنیا میں سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے چشم پوشی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے یا کسی قسم کے نسلی یا مذہبی تعصب نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔

لوگ وقت پر فخر سے کہا کرتے ہیں "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا"۔ لیکن بوالعجبی یہ ہے کہ جن ائمۂ ھُدیٰ کی سرکردگی میں اس سیل نے تندی اور ہمہ گیری پیدا کی انہی پر لعنت کی بوچھاڑ ہے۔ اور ان کے لئے ایسے ایسے خطاب تجویز کئے جاتے ہیں کہ گویا دنیا نے ان سے بدتر حکمران کبھی نہیں دیکھے۔

کوئی شک نہیں کہ جن حضرات نے حکومت کے لئے امویوں سے جنگ کی وہ اگر غالب رہتے تو ان کے ہاتھوں بھی ایسے ہی کچھ کام انجام پاتے جو اللہ تعالیٰ نے اموی خلفاء رضی اللہ

عنہم اجمعین کے ذریعہ پورے کئے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو عربوں کی وہ حمایت حاصل نہ ہوتی جو امویوں کو ہوئی۔ اور یہی ہے امویوں کی کامیابی کا اصل راز۔

اگر اس وقت اموی خلافت کی بجائے ہاشمی خلافت قائم ہوجاتی تب البتہ صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ اس خلافت کو غداران ملت اسی طرح گھیرے رہتے جیسے سیدنا علی مرتضیٰ رض کی خلافت کو گھیر رکھا تھا۔ روز ایک فساد کھڑا ہوتا اور ہر شب ایک فتنہ جگایا جاتا۔ اسی حقیقت کو سیدنا حسن المجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا تھا۔ اگر آپ کو ذرا بھی اطمینان ہوتا کہ ان لوگوں سے یکسوئی حاصل ہوجائے گی تو ممکن ہے آپ خلافت سے دستبردار نہ ہوتے اور اجماع بھی آپ ہی پر ہوجاتا لیکن ان لوگوں سے نجات کی صرف ایک ہی راہ تھی، کہ زمام کار سیدنا معاویہ رض کے ہاتھ میں چلی جائے کیونکہ اس تحریک کو کچلنے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے انہی کو ودیعت فرمائی تھی۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اس نفسیاتی کیفیت کو جانتے تھے کہ جب تک زمام کار اہل بیت کے ہاتھ میں رہے گی یہ لوگ اپنی نمائشی عقیدت کی بناء پر انھیں گھیرے رہیں گے۔ اور وہ فطرت بشریہ سے مغلوب ہوکر ان عقیدتمندوں کی باتوں سے چشم پوشی کیا کریں گے، جس کا نتیجہ امت کے لئے ہلاکت آفریں ہوگا۔ اسی صورتِ حال کا نمونہ ہمیں آلِ بُویہ کے اقتدار میں ملتا ہے۔ اور یہی بات ہمیں ان دوسرے علاقوں میں نظر آتی ہے جہاں ہاشمیوں کی کبھی حکومت قائم ہوئی۔

دَیلمی لوگ حسن بن زید اور حسن بن علی الاطروش فاطمی (المتوفی ۳۰۴ھ) کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ انہی کی امامت کو اپنے لئے سرمایۂ نجات سمجھتے۔ یہ حسنی اور حسینی خاندان جن کے ہاتھ پر یہ لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور تعلیم و تلقین انھوں نے کی تھی۔ یہی حسن بن زید بن محمد بن اسمٰعیل بن الحسن بن زید رض بن سیدنا الحسن رض بن سیدنا علی رض جنھیں یہ اپنا مقتدا کہتے تھے، ان کا محض دین ہی صفحۂ ہستی سے نہیں مٹا دیا گیا بلکہ ان کی نسل بھی گمنام کردی گئی۔ یہ حضرات سب کتاب و سنت کے پیرو تھے اور منہاج صحابۂ کرام سے وابستہ۔ سوائے چند حقیر فقہی مسائل کے اور کسی بارے میں عامۃ المسلمین سے ان کا اختلاف نہ تھا، صرف اپنے خاندان کی حکومت انھوں نے قائم کی تھی، اور خلافتِ عباسیہ کے بھی کچھ ایسے حریف نہ تھے جس سے اندازہ ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تحریک چلا رہے ہیں، بلکہ محض خاندانی رقابت تھی۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ اردو میں الاطروش کے احوال ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں، اور پتہ لگ سکتا ہے کہ سوائے خاندانی سیاست کے اور ان کا مطمح نظر کچھ نہ تھا۔ اپنے عقائد و اعمال و نظریات میں وہ جماعت ہی سے وابستہ تھے۔

اگرچہ ان سے ملتِ اسلامیہ کو سوائے نقصان کے اور کچھ نہ ہوا۔ لیکن آلِ بُوَیہ جس دین کے پابند تھے اس کا اہلِ بیت کے دین سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اور ان کی یہ کیسی سیاسی چال تھی کہ جنھیں اپنا امام کہتے تھے انھی کو نسیاً منسیا کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ پھر جب ان لوگوں نے عروج پکڑا تو خلافتِ عباسیہ کو بھی فنا کرنے کی کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ بظاہر تو خلیفہ کے دربار میں کرسی پر اس وقت بیٹھتے جب باصرار حکم دیا جاتا ورنہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے، اور جب امتثالِ امر کے لئے بیٹھتے تو اوّل کرسی کو تعظیماً چومتے۔ لیکن یہ سب دکھانے کی باتیں تھیں۔ حقیقی صورتِ حال یہ تھی کہ ادنیٰ ترین امور میں بھی خلیفۂ وقت فلان الدولہ اور فلان الدولہ کے احکام کا منتظر رہتا تھا، اور یہ ہمت نہیں رکھتا تھا کہ ان کی خلاف ورزی کر سکے۔ اگر غیرتِ ملّیہ کے تحت کچھ کرنا بھی چاہا تو اس کی چلنے نہ دی گئی۔

ایک معمولی سا واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ ۳۵۸ھ میں شاہِ روم نے شام پر حملہ کیا اور شہر کے شہر تباہ کر دیئے، امیر المؤمنین المطیع للہ کا زمانہ تھا، جو ضعیف ترین اور مجبور ترین خلیفہ گذرے ہیں۔ آپ نے جہاد کا حکم دیا۔ بغداد کے شہریوں میں سخت جوش تھا۔ امام ابوبکر القفال رحمہ اللہ نے ہزاروں کی تعداد میں رضاکاروں کی فوج تیار کی۔ معز الدولہ احمد بن بُوَیہ کا بیٹا عز الدولہ بختیار اس وقت امورِ خلافت پر حاوی تھا اور اس عالم میں شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ مسلمانوں کو اس کی اس حرکت پر سخت طیش تھا۔ ایک وفد نے جا کر اسے ملامت بھی کی کہ مسلمانوں پر یہ مصائب ٹوٹ رہے ہیں اور آپ شکار کھیل رہے ہیں۔ اس وفد کو اس نے اطمینان دلایا کہ جہاد کیا جائے گا۔ پھر اس نے قرب و جوار کے امراء کو لکھا، انھوں نے بہت سی امداد بھیجی، پھر اس نے امیر المؤمنین کے پاس پیغام بھیجا کہ جہاد کے لئے روپیہ مہیا کریں۔ انھوں نے فرمایا ان امور پر خرچ کرنا میرے اوپر اس وقت تھا جب خزانہ میرے پاس ہوتا، اور مسلمانوں کے امور کی نگرانی میرے ذمہ ہوتی۔ موجودہ صورت میں یہ ذمہ داری میری نہیں بلکہ اس کی ہے جس کے قبضہ میں ملک ہے۔ میرے نام کا صرف خطبہ ہے، یہ بھی گوارا نہ ہو تو مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانا۔ بہر حال نتیجہ میں امیر المؤمنین نے اپنا مکان اور زیور اور کپڑے تک بیچ کر چار لاکھ درہم اس کو دیئے۔ لیکن وہ یہ سب روپیہ لے کر ہضم کر گیا، اور جہاد کا قضیہ ختم کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی، اور مسلمانوں پر ان کا اتنا رعب چھایا، کہ اس کا تصور ہی تکلیف دہ ہے۔ کفار سے جنگ کرنے کے بجائے اس نے بنو حمدان پر حملہ کر دیا۔

بنو حمدان ہی میں امیر سیف الدولہ تھے جنھوں نے روم سے قتال کیا تھا، اور پوری قوت سے اُن کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اور فتوحات بھی کی تھیں۔ لیکن اب ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس لئے بنو بُوَیہ کے لئے نصرانیوں سے جنگ کرنے کے بجائے آلِ حمدان سے جنگ کرنا زیادہ ضروری تھا۔

معزّ الدولہ احمد بن بُوَیہ وہ شخص ہے جس کے متعلق علّامہ خضری لکھتے ہیں [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: الدولۃ العباسیۃ: ص ۳۸۰]

هو احمد بن بُوَيه فاتح العراق وكان اصغر اخوته وكان سلطان معز الدّولة بالعراق مبدأ خرابه بعد ان كان جنة الدنيا۔

"یہ احمد بن بویہ فاتح عراق ہے۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ عراق میں معزّ الدولہ کی حکومت ہی سے تباہی آنی شروع ہوئی۔ (اور علاقہ ویران ہو گیا) حالانکہ یہ دنیا کی جنّت تھا"

یہی شخص ہے جو چاہتا تھا کہ عباسیوں کی رسمی خلافت بھی ختم کر دے اور کسی فاطمی کو خلیفہ بنا دے۔ اس میں یہ طاقت تھی، اور ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا، لیکن اس کے ندیموں میں سے کسی نے کہا کہ "ایسا نہ کرے۔ کیونکہ اس وقت جو خلیفہ ہے اسے آپ اور آپ کے ساتھی جائز خلیفہ نہیں سمجھتے، اگر آپ اس کے قتل کا بھی حکم دیں تو آپ کے آدمی اسے قتل کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ نے کسی علوی کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیا تو وہ ایسا شخص ہو گا جس کی خلافت کی صحت آپ کو بھی تسلیم ہو گی اور آپ کے ساتھیوں کو بھی، حتّٰی کہ وہ اگر آپ کے قتل کا حکم دے گا تو آپ ہی کے ساتھی اس کی تعمیل کو تیار ہو جائیں گے۔" لہٰذا وہ اس ارادہ سے باز آگیا، اور صرف اتنا کیا کہ خلیفۂ عباسی کے ہاتھ میں کسی قسم کی طاقت نہ رہنے پائے۔

اہلِ فکر اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک نہ ایمان کوئی چیز تھا اور نہ عقیدہ وعقیدت۔ یہی وجہ ہے کہ جن فاطمیوں کے ہاتھ پر یہ مسلمان ہوئے تھے ان کا بیج باقی نہ چھوڑا، اور عباسی خلافت کو مٹا کر فاطمی خلافت بھی اسی لئے قائم نہیں کی کہ پھر اپنی حکومت ذیلی ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ مقصد نہ فاطمیوں کا "حق" دلوانا تھا اور نہ "غاصبوں" سے حکومت لینا، بلکہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی تخریب سے مطلب تھا۔ حالانکہ یہی معزّ الدولہ ہے جس نے ماتمِ حسین جاری کیا، عید غدیر منانے کی ابتدا کی، اور بغداد کی مساجد پر صحابۂ کرام کے ناموں کے ساتھ لعنت کے الفاظ لکھوائے۔

یہ ہے ان کا اصل طریقۂ کار کہ مسلمانوں کی نام نہاد فراخ دلی کے نتیجہ میں اول یہ لوگ حکومت کے اعلیٰ مناصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور پھر ہر ممکن طریقہ پر حکومت کو تباہ اور اسلام و ملت کو بدحالی کا آماجگاہ بنا دیتے ہیں۔ مشرق و مغرب میں تیرہ سو برس کی تاریخ ہر چھوٹی بڑی مسلم حکومت کا یہی انجام ان کے ہاتھوں دکھاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اگر امیر المؤمنین معاویہؓ کے ہاتھ میں زمام کار نہ آتی اور سادات امویہ پر ملت اسلامیہ کی قیادت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نہ ڈالتا تو پہلی ہی صدی ہجری میں اسلام اور مسلمانوں پر فاتحہ پڑھی جا چکی ہوتی۔

سیوطی نے بنو امیہ کی خلافت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ناپسندیدہ ثابت کرنے کے لئے وہ وضعی احادیث تو لکھ دیں جن کے وضعی ہونے کا خود انھیں بھی اعتراف ہے لیکن تعجب ہے کہ ان کی نگاہ سے یہ صحیح احادیث نہیں گذریں جو درایۃً درست اور روایۃً قابل قبول ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ (۸ : ۲۰) میں حافظ عبد الرزاق بن ہمام صنعانی کی روایت نقل کی ہے کہ صفین کے موقع پر ایک شخص نے کہا "اللّٰھم العن اھل الشام" (خدایا اہل شام پر لعنت کر) تو امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:

لاتسب اھل الشام فان بھا الابدال فان بھا الابدال فان بھا الابدال۔

"اہل شام کو برا مت کہنا۔ ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں، ان میں ابدال ہیں۔"

ایسی ہی ایک مرفوع حدیث ہے۔ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینا انا نائم رأیت الکتاب احتمل من تحت رأسی فظننت انہ مذھوب بہ۔ فاتبعتہ بصری فعمد بہ الی الشام وان الایمان حین تقع الفتنۃ بالشام۔

[العواصم من القواصم: ص ۱۸۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں سوتے میں دیکھتا کیا ہوں کہ میرے سر کے نیچے سے کتاب اٹھائی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کسی جگہ لے جایا جائے گا۔ چنانچہ اسی سمت دیکھتا رہا اس کا رخ شام کی طرف تھا۔ جب فتنہ بپا ہوگا تو اس وقت ایمان شام میں ہوگا (العواصم من القواصم ص ۱۸۳)

ایسی ہی حدیث صحیح بخاری کی ہے [ج ۴، کتاب الفتن، ص ۲۲۷، طبع مصر]

عن ابن عمر قال ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم بارک لنا فی شامنا اللّٰھم بارک

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا "خدایا ہمارے شام

لنا فی یمننا قالوا و فی نجدنا یا رسول اللہ	میں برکت دے، خدایا ہمارے یمن میں برکت دے"
قال اللّٰھم بارک لنا فی شامنا اللّٰھم بارک	لوگوں نے عرض کیا "اور ہمارے نجد میں یارسول اللہ!"
لنا فی یمننا قالوا یا رسول اللہ و فی نجدنا	آپنے فرمایا "خدایا ہمارے شام میں برکت دے
فاظنہ قال فی الثالثۃ ھناک الزلازل	خدایا ہمارے یمن میں برکت دے" لوگوں نے عرض کیا
والفتن وبہا یطلع قرن الشیطان۔	"یارسول اللہ اور ہمارے نجد میں" آپ فرماتے

ہیں میرے خیال میں تیسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ادھر تو زلزلے اور فتنے ہیں اور وہیں شیطان سر اٹھائے گا"!

ایسی ہی اور بھی احادیث ہیں۔ اہل بیت اطہار اور صحابہ کرام کے طرز عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شام کو مہبط ایمان سمجھتے تھے، اور ان کی نگاہیں اسی طرف مدد کے لئے اٹھتی تھیں۔ ہر فتنہ میں انھوں نے دمشق ہی کی طرف دیکھا جو سادات امویہ کی خلافت کا مرکز تھا۔

رضوان اللہ علیہم اجمعین

امیر زیادؒ

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہایت دیدہ دلیری سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ناجائز طور پر شریعت کے بالکل خلاف ایک غیر شخص (یعنی زیاد) کو اپنے باپ کی اولاد بنا لیا۔ مسعودی کا بیان ہے (مروج الذہب: ج ۳، ص ۱۵):

ان علیاً کان ولاہ فارس حین اخرج منہا سہل بن حُنَیف فضرب زیاد ببعضہم بعضاً حتیٰ غلب علیہا ومازال ینتقل فی کورہا حتی صلح امر فارس۔ ثم ولاہ علی الاصطخر وکان معاویۃ یہددہ۔

ثم اخذ بُسر بن ارطاۃ عبید اللہ وسالماً ولدیہ وکتب الیہ یقسم لیقتلنہما ان لم یراجع ویدخل فی طاعۃ معاویۃ۔

وکتب معاویۃ الی بُسر اَن لا یعرض لابنی زیاد وکتب الی زیاد ان یدخل فی طاعتہ ویردہ الی عملہ۔

فقدم زیاد علی معاویۃ فصالحہ علی مال وحلی ودعاہ معاویۃ الی ان یستخلفہ فابیٰ زیاد ذالک۔

"سیدنا علیؓ نے انھیں فارس کی حکومت اس وقت دی جب وہاں کے لوگوں نے سیدنا سہلؓ بن حُنَیف کو نکال دیا تھا۔ زیاد نے وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کو لڑا دیا تا آنکہ خود غالب آ گئے۔ اور پھر برابر ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کا دورہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ فارس کے احوال درست ہو گئے۔ پھر سیدنا علیؓ نے انھیں اصطخر کی بھی حکومت دیدی۔ معاویہؓ البتہ انھیں دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔

پھر بُسرؓ بن اَرطَاۃ نے ان کے دونوں بیٹوں عبید اللہ اور سالم کو پکڑ لیا۔ اور انھیں خط لکھا جس میں قسمیہ بیان کیا تھا کہ اگر انھوں نے اپنا سیاسی موقف نہ بدلا اور حضرت معاویہؓ کی اطاعت اختیار نہ کی تو انھیں قتل کر دیں گے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت بُسرؓ کو لکھا کہ زیاد کے دونوں بیٹوں سے کچھ سروکار نہ رکھیں اور زیاد کو خط بھیجا کہ وہ ان کی اطاعت کر لیں گے تو اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔ چنانچہ زیاد اس پر معاویہؓ کے پاس چلے گئے اور ان سے کچھ مال اور زیور پر صلح کر لی۔ معاویہؓ نے انھیں اپنا خویش بنانا چاہا تو زیاد نے اس سے انکار کر دیا۔"

مولوی محمد اسلم جیراجپوری نے تاریخ الامت میں فرمایا ہے کہ "زیاد چونکہ شیعانِ علیؓ میں نہایت طاقتور تھے، اس لئے معاویہؓ نے انھیں اپنا بھائی بنا لیا۔ یہ ان کی سیاسی چال تھی، ورنہ حقیقتاً زیاد ابوسفیانؓ کے بیٹے نہیں تھے۔"

علامہ خضری فرماتے ہیں [محاضرات الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۱۰۲]

وفی سنۃ ٤٤ استلحق معاویۃ زیاداً الحقہ بابی سفیان لاعتراف کان من ابی سفیان بذلک شہد بہ جمع۔ وکان معاویۃ قد کتب الی زیاد فی حیاۃ علیؓ یعرض لہ بولادۃ ابی سفیان ایاہ فلما علم بذلک علیؓ کتب الی زیاد یقول لہ "انی ولیتک ما ولیتک، وانا اراک لہ اھلاً وقد کانت من ابی سفیان فلتۃ من امانی الباطل وکذب النفس لاتوجب لہ میراثاً ولاتحل لہ نسباً وان معاویۃ یاتی الانسان من بین یدیہ ومن خلفہ وعن یمینہ وعن شمالہ فاحذر ثم احذر والسلام۔"

فلما قتل علیؓ رأی معاویۃ ان یستمیل زیاداً واستصفی مودتہ باستلحاقہ۔

اور ۴۴ھ میں معاویہؓ نے زیاد کو اپنا بھائی بنا لیا اور ان کا نسب ابوسفیانؓ سے ملا دیا۔ کیونکہ اس بارے میں ابوسفیانؓ کے اعتراف کا انھیں علم ہوا تھا، اور بہت سے لوگوں نے اس کی گواہی دی تھی۔

(سیدنا) علیؓ کی زندگی ہی میں (سیدنا) معاویہؓ نے زیاد کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ابوسفیانؓ کے بیٹے ہیں۔

جب (حضرت) علیؓ کو اس کا علم ہوا، تو آپ نے زیاد کو خط لکھا:۔

"میں نے تمھیں جہاں کی حکومت دینی تھی دیدی اور میں تمھیں اس کا اھل سمجھتا ہوں۔ ابوسفیان کے منہ سے اچانک ایک بات نکل گئی تھی، باطل آرزو تھی، اور نفس کا دھوکہ تھا۔ نہ اس سے میراث ثابت ہوتی ہے اور نہ اس طرح نسب صحیح ہوتا ہے معاویہ وہ شخص ہیں جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے گھیرا کرتے ہیں۔ لہٰذا خبردار رہنا خبردار رہنا والسّلام۔"

اس کے بعد جب (حضرت) علیؓ شہید ہوگئے تو (حضرت) معاویہؓ نے مناسب سمجھا کہ زیاد کو اپنی طرف مائل کریں، اور ان کا تعلق قلبی استوار کرنے کے لئے انھیں اپنے نسب میں شامل کر لیا۔"

اب غور طلب امر یہ ہے کہ متفق علیہ قول کے مطابق امیر زیادؓ کے نسب کا اعلان ۴۴ھ

یں کیا گیا۔ یعنی اس وقت جب امیر المؤمنین حسنؓ کو بیعت کئے ہوئے چار برس کے قریب ہو چکے تھے۔ تمام عالمِ اسلام امیر المؤمنین معاویہؓ کی بیعت میں آچکا تھا، اور امتِ مسلمہ کی تمام طاقت ان کی ذات میں مرکوز تھی۔ پھر تمام "مؤرخوں" کو اس سے بھی اتفاق ہے کہ نسب کے اعلان سے پہلے ہی امیر زیادؒ نے سیدنا معاویہؓ سے بیعت کر لی تھی، اور اپنے منصب پر واپس چلے گئے تھے، تو پھر وہ کونسا داعیہ تھا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا جس کے لئے یہ "سیاسی چال" کھیلی گئی کہ انھیں سیدنا ابو سفیانؓ کا فرزند بنا لیا گیا۔ اور جب نسب میں شامل کر لیا تو وہ کون سے اعلیٰ مراتب اور دنیوی فوائد تھے جو امیر زیادؒ کو ان کی پہلی حالت سے زیادہ مل گئے۔ اور امیر المؤمنین معاویہؓ کی وہ کونسی پریشانیاں تھیں جو اُن کے بھائی بنا لینے سے رفع ہو گئیں، اور اس کے بغیر رفع ہی نہ ہو سکتی تھیں۔ مسعودی کا یہ بیان البتہ دلچسپ ہے کہ بُسرؓ کے ہاتھ میں لوگوں کو زیر کرنے کا ایک ہی کامیاب نسخہ تھا کہ معتوب کی اولاد کو قتل کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کو ایسی معتبر شہادتیں ملیں جن سے معلوم ہوا کہ وہ سیدنا ابو سفیانؓ کی اولاد ہیں، اور جاہلیت کے زمانہ میں اس طریقہ پر پیدا ہوئے تھے جو عرب میں صحتِ نسب کے لئے اس وقت مقبول تھا۔ شریعتِ اسلامیہ میں ایک آدمی کا نسب اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک وہ نکاح ابراہیمی سے پیدا نہ ہو۔ اس نکاح کے علاوہ باقی تمام صورتیں حرام ہیں اور آدمی کا نسب کسی دوسرے طریقہ سے درست نہیں ہوتا۔ لیکن یہ احکام ہیں اسلام کے۔ انھیں جاہلیت پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا میں اس وقت بھی کروڑوں لوگ موجود ہیں جو اپنے رواج یا قانون کے مطابق ایسی عورتوں سے نکاح کرتے ہیں جن سے نکاح کا شریعتِ اسلامیہ میں کوئی تصور نہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ہاں بیک وقت ایک عورت کے کئی کئی خاوند ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ اسلام لائیں گے تو کیا ان کی اولاد کو حرام کی اولاد کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں! ان کا نسب درست ہوگا۔ اگرچہ نکاح باطل کر دیا جائے، اور ناجائز ازدواج کو توڑ دیا جائے۔ یہ بالکل سیدھا اور صاف مسئلہ ہے۔

سیدنا زیادؒ ایسے ہی ایک جاہلی دستور کے تحت عہد نبوی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور سیدنا ابو سفیانؓ کا اس بارے میں اعتراف ثابت ہے۔ الحاق سے پہلے سیدنا زیادؒ کا انتساب اُن کی والدہ سُمَیّہ کی طرف ہوتا تھا، اور وہ ابن سُمَیّہ کہلاتے تھے۔ کسی مرد کی طرف ان کا انتساب

کبھی نہیں کیا گیا۔

حارثؓ بن کلدہ جن کی لونڈی یہ سُمیّہ تھیں، اور اُن کے غلام عُبَید جن کے ساتھ انھوں نے سُمیّہ کا نکاح کر دیا تھا، ان دونوں نے کبھی زیادؒ کو اپنا بیٹا نہیں کہا۔ لہٰذا یہ تصور خود بخود باطل ہوگیا کہ سیدنا معاویہؓ نے کسی دوسرے شخص کے بیٹے کو اپنے باپ کا بیٹا بنالیا۔ نہ انھیں اس کی ضرورت تھی اور نہ وہ ایسے بے حیا۔ اور بے غیرت تھے کہ محض "سیاسی چال" سے ایک شخص کو اپنا بھائی بناکر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے لائیں۔ اور نہ کسی کی اس وقت یہ حیثیت تھی کہ وہ سیدنا معاویہؓ کے حکم سے سرتابی کرکے اپنی آزادانہ حکومت قائم رکھ سکے۔ نہ وہ اتنے کمزور تھے کہ فارس کو بزور شمشیر فتح نہ کرسکیں۔ نہ وہ فارس میں غیر مقبول تھے اور نہ زیادؒ اتنے مقبول کہ سیدنا معاویہؓ کو انھیں زیر کرلینا مشکل ہوتا۔ یہ کوئی آل بُوَیہ کا زمانہ تھا کہ امام المسلمین بے دست و پا ہو؟ یہ زمانہ تھا دنیا کے عظیم ترین حکمران کا جس کی ٹکر کا ایک بھی حکمران دنیا میں نہ تھا۔ لہٰذا یہ سب خرافات ولغویات اور مراسلہ بازی کی داستانیں محض برائے طعن وضع کی گئی ہیں۔ نہ ۴۲ھ سے پہلے امیر المؤمنین معاویہؓ نے حضرت زیادؒ کے نسب کے بارے میں کوئی تحریک کی، اور نہ ۴۴ھ سے پہلے اس قسم کا کوئی اقدام کیا۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی طرف جو خط منسوب ہے اس کی کچھ اصل نہیں، اور اگر کچھ اصل ہے تو انھوں نے خود ہی گواہی دیدی کہ سیدنا ابوسفیانؓ نے ان کے سامنے بھی اعتراف کیا تھا۔

نسب کا تعلق اہلِ خاندان سے ہے، اور اس بارے میں صرف انہی کی رائے مانی جاسکتی ہے۔ سیدنا زیادؒ کا نسب امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ نے ان شہادتوں کی بنا پر قبول کیا جن کی واقعیت اور صداقت آپ پر کُھل گئی تھی۔

ان میں سب سے اہم شہادت سیدہ جُوَیریہؓ بنت ابی سفیانؓ کی ہے۔ انھوں نے اپنے والد ماجد کے اعتراف کی توثیق کی تھی۔ پھر وہ لوگ ہیں جن کا ذکر المدائنی نے کیا ہے۔ یعنی حضرت مُنذر بن الزبیرؓ، حضرت مِسوَرؓ بن قدامہ باہلی وغیرہما۔

سیدنا معاویہؓ نے عرب کے قاعدہ کے مطابق ان شہادتوں کی بناء پر اس نسب کا اعلان کردیا اور پھر زندگی بھر انھوں نے بلکہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے خاندان نے ان کے بارے میں اپنا ہی موقف قائم رکھا۔ حضرت زیادؒ کی اولاد کو اموی سادات نے اپنی بیٹیاں دیں اور خود امیر المؤمنین معاویہؓ نے اپنے ایک فرزند کا نکاح ان کی بیٹی سے کیا۔

امیر زیاد کا نسب محض امویوں ہی نے تسلیم نہیں کیا، بلکہ تمام بنو عبدِ مناف نے اُسے مانا، اور اسی نسبت سے انھیں یاد کیا۔ مشہور مورخ البلاذری جو امیرالمؤمنین المتوکل علی اللہؒ کے ندیم تھے انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب انساب الاشراف میں امیر زیاد کی اولاد کا تذکرہ اسی طرح کیا ہے جس طرح باقی اموی سادات کا، اور انھیں "ابن ابی سفیان" ہی لکھا ہے۔ اگر ان کا نسب بنو ہاشم کے نزدیک مسلّم نہ ہوتا تو خلفاء اس انتساب کی اجازت نہ دیتے۔

اسی طرح موطأ امام مالک میں ان کا نام "زیاد بن ابی سفیان" ہی مرقوم ہے۔ فقہ اسلامی کی یہ عظیم ترین کتاب امیرالمؤمنین عبداللہ المنصورؒ کے فرمان کے تحت مرتب ہوئی، اور محض اس کی سماعت کے لئے امیرالمؤمنین ہارون الرشیدؒ نے خلیفہ ہونے کے بعد مدینہ کا سفر کیا۔ تمام عالمِ اسلام میں دستورِ اساسی یہی موطأ شریف ہے۔ ہسپانیہ میں بھی اسی پر مدار تھا۔ گویا بنو ہاشم اور بنو امیہ سب اس پر متفق ہیں کہ امیر زیاد واقعی سیدنا ابو سفیانؓ کے فرزند تھے۔ اگر سیدنا زیاد کا نسب بنو ہاشم اور اکابرِ امت کے نزدیک مسلّم نہ ہوتا تو کیا حضرت امام مالکؒ اسے لکھتے؟ اگر یہ الحاق درست نہ ہوتا تو کیا اسلام کے عظیم ترین خلفاء اس بدعت والحاق کو قبول کر لیتے جو شریعتِ اسلامیہ میں موجبِ لعن ہے؟

بڑی حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں نے اموی اور ہاشمی سادات کو اتنا بے غیرت کیوں سمجھ لیا ہے کہ وہ اس معمولی حمیت سے بھی عاری ہوں جو ہر شریف آدمی میں ہوتی ہے۔ اور مزید حیرت یہ ہے کہ ہر کس و ناکس فتویٰ دینے کو موجود ہے، اور جن کے گھر کا معاملہ ہے اُن کے موقف کی کوئی حرمت ہی نہیں۔ گویا امویوں اور ہاشمیوں سے اپنے نسب پر بات کرنے کا حق بھی چھین لیا گیا۔ یہ سب ہاشمی اور اموی جب امیر زیاد کو ابو سفیانؓ کا بیٹا کہتے ہیں، اور ان سے رشتہ میں عار نہیں سمجھتے تو اُن کی بات نہیں مانی جاتی۔ آلِ عبد مناف تو کہتے ہیں "زیاد بن ابی سفیان" لیکن جنھیں سادات کے نسب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ان میں سے کسی کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ انھیں "زیاد بن ابیہ" کہے۔ اور کوئی کہتا ہے زیاد بن سُمَیَّہ۔

پھر جب یہی ہاشمی اور اموی سادات بالاتفاق مصر کے عبیدیوں کی فاطمیت کا انکار کرتے ہیں اور انھیں مجہول النسب بتاتے ہیں تب بھی اُن کی بات نہیں مانی جاتی۔ گویا ان کا نسب بھی ان کا نہ رہنے دیا گیا۔ کہ ہر کس و ناکس کو تو اس بارے میں بولنے کا حق ہے، لیکن نہیں ہے تو انھیں جن کے گھر کا معاملہ ہے۔

علامہ ابوبکر بن العربیؒ نے اس موضوع پر العواصم من القواصم میں فقہی حیثیت سے بحث کی ہے، لیکن ہمارے نزدیک امیر زیاد کے نسب کے معاملہ میں اس بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاریخی حیثیت سے ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ بنو عبد مناف نے انھیں سیدنا ابوسفیان کا فرزند تسلیم کیا۔ اور ان سے وہی روابط رکھے جو ہمنسبوں میں ہوتے ہیں۔ امیرالمومنین معاویہؓ جیسا امام مجتہد جو فیصلہ فرمائے اس پر بولنے کا کیا موقع ہے۔ خصوصاً جب یہ فیصلہ اموی اور ہاشمی سادات کو تسلیم ہو، اور بعد کے خلفاء اس کی توثیق کریں، اور حضرت امام مالکؒ اس کی تائید میں ہوں۔

ـــــــــــ ببببببببببب ـــــــــــ

لعنت

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ہماری ہی طرح آدمی تھے، اور ایسے ہی جذبات رکھتے تھے جیسے دوسرے سب انسان۔ ان سے غلطیاں ہوتی تھیں، خواہشاتِ نفسانی کا بھی زور ہوتا تھا، غصہ آتا تھا، رنج ہوتا تھا اور دلوں میں نفرت پیدا ہوتی تھی۔ غرض یہ ہے کہ سب اعراضِ نفسانیہ ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے بعد کے لوگوں کے۔

لیکن بعد کے لوگوں میں اور ان میں مرتبہ کا فرق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر ان کا مرتبہ بیان کیا ہے، اس لئے ان کی انسانی کمزوریوں میں وہ پستی نہ تھی جو عام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر حاوی تھیں۔ وہ اپنی غلط اندیشیوں میں بھی زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور تہذیب نفس کے داعیات کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کے سامنے اُن کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں۔ ان کی غلط روی بھی تاویلات کی بناء پر اجتہادی ہوتی تھی۔

ہر جگہ، ہر قوم اور ہر عصر کا یہ مشاہدہ ہے کہ مہذب اور غیر مہذب لوگوں میں خسیس اور پست جذبات کی نمود یکساں نہیں ہوتی، بلکہ وہی فرق ہوتا ہے جو اُن کی ذہنی رفعت اور پستی کے تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہونا چاہیئے۔ ہاں بعض اوقات نہایت مہذب شخص نہایت بد تہذیب ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پستی کے عمیق ترین گڑھے میں گر گیا۔ لیکن پھر اس پر انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ ہے اس کی ذہنی رفعت کی اصل نمود۔ مہذب شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ جو غلطی اس سے ایک دفعہ ہو گئی ہے وہ دوبارہ سرزد نہ ہو۔

جب یہ حال ان تمام لوگوں کا ہے جن کی تربیت اچھے ماحول میں ہوتی ہے تو اندازہ لگانا چاہیئے کہ جن بزرگواروں کی تربیت سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے کی، اور قرآنِ حکیم کے انوار ان کے سینوں میں اُتارے ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند ہو گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (تم اخلاقی حیثیت سے بلند ترین درجہ پر ہو) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری بعثت کی

غایت یہ ہے کہ میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کردوں" یہ تربیت آپؐ نے بدرجۂ اتم کی اور اپنے اصحاب کو اس بلند مقام تک پہنچا دیا کہ اللہ تعالیٰ بطورِ امرِ واقعہ خود انہی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: (الحجرات: ۷-۸)

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔	لیکن اللہ نے تمھارے نزدیک ایمان کو محبوب کیا ہے، اور اسی سے تمھارے قلوب کو آراستہ فرمایا اور تمھارے دلوں میں کفر سے، بے راہ روی سے، اور نافرمانی سے نفرت ڈالدی، یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ۔ یہ اللہ

کا فضل اور نعمت ہے۔ اور اللہ ہی تمام امور کا جاننے والا اور حکمت کے ساتھ بروئے کار لانے والا"

یہ تو ہے اللہ کی بیان کی ہوئی صفت، لیکن دشمنانِ دین وملت نے جہاں صحابۂ کرام پر اور بہت سے بہتان رکھے ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ وہ بطورِ شعار ایک دوسرے پر لعنت کیا کرتے تھے، اور اسے اپنی زندگی کا اصول بنالیا تھا۔ دراصل یہ خود ان افترا پردازوں کی اپنی ذہنیت ہے۔ یعنی صحابۂ کرام کی سیرت کے آئینہ میں انھیں بس اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کی روایت ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے سیدنا معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں پر (رضی اللہ عنہم اجمعین) لعنت شروع کی تھی، اور نماز میں ان کے لئے بد دعا کیا کرتے تھے۔ سیدنا معاویہؓ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے بھی لعنت کا یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے خطبہ میں یہ نیک کام ہوا کرتا تھا۔

لوگوں نے ان کذابوں اور افترا پردازوں کی جیسے اور بہت سی باتیں قبول کر کے انھیں تاریخی مسلمات بنا دیا ہے ایسی ہی یہ لعنت کی بات بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین عمر ثانی رضی اللہ عنہ نے جہاں باقی "اموی بدعتیں" مٹائیں وہاں اس بدعت کو بھی ختم کر کے حکم دیا کہ خطبوں میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جایا کرے (النحل: ۹۰):

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔	"اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، قرابت والوں کے حقوق ادا کرنے کا۔ اور روکتا ہے بے حیائی سے بدمعاشی سے اور

سرکشی سے۔ وہ یہ نصیحت اس لئے کرتا ہے کہ تم سبق لو۔"

ممکن ہے یہ آیت امیر المؤمنین حضرت عمر ثانیؒ ہی نے خطبہ میں داخل کی ہو، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ پسِ منظر یہی تھا جو بیان کیا جاتا ہے۔ اسے عام اخلاقی سبب کیوں نہ سمجھا جائے جس کی ضرورت ہر عہد اور ہر طبقہ کے لئے ہے۔ شریف رضی اور شریف مرتضیٰ وغیرہما کے ہفوات سے قطع نظر اور ابن ابی الحدید کے جذبات وخیالات سے بھی جنھوں نے ان دونوں کی تصنیف نہج البلاغہ کو امیر المؤمنین اور سید المتقین سیدنا علیؓ کی طرف نسبت کر کے شرح کرنے کی تکلیف کی، ہمارے پاس سیدنا علیؓ کا کردار دیکھنے کے اور ذرائع بھی تو ہیں جن کا قابلِ اعتبار ہونا معلوم ہے۔ ہم کیسے کہہ دیں کہ آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی رہتی تھی جو ایک معمولی مہذب آدمی سے بھی نہیں ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد میں جو ظاہری اور باطنی صدمے اٹھائے تھے کہ پوری دعوت خطرہ میں پڑ گئی تھی، اس کی وجہ سے آپ نے کفار حربی کے لئے بد دعا کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی (۳: ۱۲۸) لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (تمھیں اس معاملہ میں بولنے کا حق نہیں)۔ یہ واقعہ سیدنا علیؓ کی آنکھوں دیکھا تھا۔ تو سوچنا چاہئے کہ سیدنا معاویہؓ جیسے مؤمن اور مقبولِ بارگاہِ مصطفوی پر نمازیں بد دعا یا خطبوں میں لعنت کرتے وقت یہ فرمانِ الٰہی آپ کی آنکھوں سے کیسے اوجھل ہو سکتا تھا؟ اللہ فرماتا ہے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے)، تو پھر جو شخص ایمان کے بلند ترین درجہ پر ہے وہ کیا معمولی امتیوں سے بھی گیا گذرا ہو گیا؟

جنگِ صفین کے علاوہ سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی تلخ بات نہیں ہوئی، اور سب جانتے ہیں کہ یہ جنگ کیسی چھڑی اور کس طرح ختم ہوئی۔ عین جنگ کے زمانہ میں بھی آپ نے ایک شخص کو اہلِ شام پر لعنت کرنے سے روک دیا، اور پھر جنگ بند کر کے صلح کی شرائط کی پوری پاسداری کی۔ تو اب یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ جنگ تو بند کر دی جائے لیکن لعنت کا سلسلہ جاری رہے۔

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اہلِ شام اور ان کے امام کے کردار کی رفعت کا اپنے گروہ کی بدکرداری سے مقابلہ کر کے آپ نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ غلبہ اہلِ شام کو ہوگا، تو کس طرح ممکن ہے کہ جس منبر سے آپ اہلِ شام کی ثناء کریں، اسی منبر سے ان کے لئے بد دعا بھی کرتے رہیں۔ سیدنا علیؓ کے نزدیک اگر سیدنا معاویہؓ ملعون تھے تو اس لعنت کی سب سے زیادہ زد خود اُن کے

فرزند جگر گوشۂ مصطفےٰ سیدنا حسن صلوات اللہ علیہ پر پڑتی ہے، جنھوں نے ایک "ملعون" شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے جدِ امجد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی زمام اسے سپرد کر دی۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

صِفّین میں جو قتال ہوا، ویسا ہی قتال جمل میں بھی ہوا تھا۔ جو فعل سیدنا معاویہؓ کا تھا وہی فعل بعینہٖ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ان کی جماعت کا تھا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ کوئی نہیں کہتا کہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے اصحابِ جمل پر لعنت کی تو پھر سیدنا معاویہؓ کا ایسا کیا قصور تھا کہ انھیں لعنت کے لئے خاص کر دیا جائے، اور کیسے سمجھ لیں کہ جس شخص کے ہاتھ میں سیدنا حسنؓ نے اپنا ہاتھ دیا تھا وہ ان کے والدِ ماجد کے نزدیک ملعون تھا۔ نعوذ باللہ من شر الشیاطین۔

ہم جانتے ہیں کہ باہمی نزاع کے دوران سیدنا عقیل بن ابی طالب شام چلے گئے تھے۔ انھیں اپنے سگے چھوٹے بھائی کی سیاست سے اختلاف تھا، اور امت کی فلاح وہ سیدنا معاویہؓ کی حکمتِ عملی میں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی اختلاف سے ان کے برادرانہ جذبات تو سرد نہیں پڑ گئے تھے۔ کیا کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ سیدنا معاویہؓ کے ہاں سیدنا علیؓ پر لعنت ہو اور نمازوں میں ان پر بددعاء کو شعار بنا لیا جائے، اور سیدنا عقیلؓ اسے برداشت کر لیں۔ اگر روکنے کی طاقت نہ تھی تو وہاں سے چلے تو آسکتے تھے۔ جو لوگ جاہلیت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانا برداشت نہ کر سکتے تھے تو وہ اسلام میں کیسے برداشت کر لیتے کہ محبوبِ خدا ورسول پر لعنت کی جائے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا معاویہؓ کے خلیفہ ہو چکنے کے بعد سیدنا حسینؓ، سیدنا عبداللہ بن جعفرؓ، سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا محمد بن علی بن ابی طالب اور اجلّۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم برابر دمشق جاتے رہتے تھے، اور مہینوں وہاں قیام رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نمازیں امیر المؤمنین ہی کے ساتھ پڑھتے ہوں گے۔ پھر اس کا امکان کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ حضرات سامنے بیٹھے ہوں اور منبر پر سے درود و سلام کے بجائے سیدنا علیؓ کو گالیاں دی جا رہی ہوں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ نمازیں تو کہیں اللّٰھم صلّ علیٰ محمد و علیٰ آل محمد اور منبر پر لعنت کریں۔ اور وہ بھی اس پر جو سرخیلِ آلِ محمدؐ ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی ایسا ہوا ہوتا تو ان میں سے پھر کوئی بھی دمشق کا رُخ نہ کرتا اور نہ بنو ہاشم کی طرف سے بنو امیہ کی اس طرح حمایت ہوتی جیسے ہوئی۔ کہ بنو ہاشم ہر اُس شخص کے خلاف رہے جو اموی خلافت کے خلاف ہوا۔

بیشک صحاح میں دو ایک روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا معاویہؓ نے چاہا

کہ سیدنا علیؓ کو برا کہا جائے اور صحابہ نے اس پر انھیں ٹوک دیا۔ لیکن روایتاً و درایتاً یہ احادیث ناقابلِ قبول ہیں۔ جو حضرات ان روایات کو قبول کرتے ہیں اور صحیح مسلم میں ہونے کی بنا پر انھیں رد کرنے کی جرأت نہیں، وہ بھی توجیہ و تاویل کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہوا ہو۔

بات یہ ہے کہ عملی سیاست میں جذبات بھڑک جایا کرتے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء میں اختلاف تھا۔ اس زمانہ میں مولانا آزاد، مولانا حسین احمد اور قائداعظم رحمہم اللہ کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ موجودہ نسل کے لوگ سب باتیں جانتے ہیں۔ تقریروں کی یادداشتیں اور اخبارات کے اداریئے مخالف گروہ پر سب دشتم سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سب نیچے درجہ کے لوگوں کی باتیں ہیں۔ ویسے اب بھی جب تحریک پر بحث ہوتی ہے تو چوٹیں ہو جاتی ہیں، لیکن کیا اس حرکت کو مذہب اور شعار بنا لیا گیا ہے کہ بزرگانِ پیشین کا نام عزت سے نہ لیا جائے؟

جب ہمارا یہ حال ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد دونوں ملکوں میں بزرگوں کی حرمت بحال ہو رہی ہے تو ہم کیسے سمجھ لیں کہ بہترین زمانہ کے لوگ اخلاقاً ہم سے بھی پست تھے۔

ہوا ہو گا کچھ تو صلح کے بعد ختم ہو گیا ہو گا اور ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسے شعار بنا لیا گیا ہو۔ ان کے پہلے اور بعد کے تعلقات کی روشنی میں یہ کبھی نہیں مانا جا سکتا کہ ساٹھ روز کی بات دلوں میں ایسی بیٹھ گئی کہ نکل ہی نہ سکی۔ اور طرفین یوں تو باہم بغل گیر ہوتے تھے لیکن نماز پڑھتے میں ایک دوسرے پر لعنت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جمل و صفین پر طرفین کو ہمیشہ ندامت رہی اور ان کے دلوں میں بار بار ہوک اُٹھتی تھی کہ کاش یہ جنگیں نہ ہوتیں جو محض اشرار کی ریشہ دوانیوں سے بپا ہوئیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ، رسول اللہؐ، دعوتِ محمدیہ اور صحابۂ کرام کے دشمنوں کو اپنا ایک شعار زندہ رکھنا تھا کہ دل سے یہ بات محو نہ ہو سکے کہ ہمارا اصل کام ہے مسلمانوں کا دین مسخ کرنا، ان میں افتراق قائم رکھنا، ان کی حکومتوں کو مٹانا، اُن کے ممالک کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی پریشانیوں میں مبتلا رکھنا، ان کے نوجوانوں کی زندگیوں کو سلفِ صالحین سے بدظن کر کے بے روح بنانا، اور ان کے عوام کے دلوں میں ہمیشہ یہ کھرچن پیدا کرتے رہنا کہ جس دین کے داعی ایسے پست تھے وہ دین قابلِ اتباع کب ہے۔ اسی لئے انھیں تاریخِ اسلام میں کربلا، صفین

کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور ان کے نزدیک سوائے علی و معاویہ اور حسین و یزید کے کوئی آدمی ہی نہیں گذرا جس کا ذکر کیا جائے۔

بزرگوں نے تو آپس میں صلح کر لی، تلخیوں کا کفارہ ادا کیا، مگر جو ناخلف ہیں وہ برابر فتنوں کو ہوا دیتے جا رہے ہیں۔ سبائیوں کے ہاں لعنت کرنا ویسے تو بارہ مہینے کا وظیفہ ہے اور پانچوں نمازوں کا بلکہ پانی پیتے وقت کا بھی۔ لیکن شعبان کی پندرہویں شب اس کارِ ثواب کے لئے مخصوص ہے۔ اس شب کی عبادت کی برکت و نورانیت کا ظہور ہی نہیں ہوتا جب تک صحابہ پر عموماً اور آلِ ابی سفیان اور آلِ مروان پر خصوصیت کے ساتھ لعنت نہ کر لی جائے۔

لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ ان کی تدبیریں وقتی رہتی ہیں، اور ہر ٹھوکر کے بعد مسلمان پھر سنبھل جاتے ہیں اور ملت کی کشتی بہرحال بھنور سے نکل ہی جاتی ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

خدایا ہماری بھی خطا پوشی فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گذر گئے اور ہمارے دلوں میں کسی صاحبِ ایمان کی طرف سے کدورت مت رہنے دے۔ خدایا تو ہی ہے دلوں میں رافت و رحمت پیدا کرنے والا۔"

امت کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ ایک عصر میں اگر تلخی پیدا ہوئی، جذبات میں ہیجان ہوا تو بعد کے لوگ اس اختلاف کو ہوا نہیں دیتے اور ایسی صورتیں پیدا کرتے ہیں کہ وحدتِ امت فنا نہ ہونے پائے اور اخلاف کے دل اسلاف سے صاف رہیں۔ لیکن جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ توڑ لیا اور جماعت سے کٹ کر اپنی ٹولی الگ بنانے پر مصر رہے اُن کی گفت گو ہمیشہ اختلاف ہی پر ہوتی ہے۔

سادات اموی ہوں یا ہاشمی اور ہاشمیوں میں عباسی ہوں یا فاطمی وہ ہمیشہ جماعت سے وابستہ رہے اور ہر آن ملت کی بہبود کو پیش نظر رکھا۔ ان کے مابین نہ دین کا کوئی اختلاف کبھی رہا اور نہ عوائم ملیہ کا۔ ضروریاتِ دین اور تقاضہائے ملت پر سب ہمیشہ متفق رہے۔ آپس میں کچھ سیاسی اختلاف ہوا حکومت کے لئے باہمی نزاع ہوا، لیکن یہ محض ذاتی معاملات رہے، جس طرح غیر سیاسی لوگوں کے باہمی زر زمین کے نزاعات ہوتے ہیں ایسے ہی ان کے سیاسی تنازعات تھے۔ امویوں اور ہاشمیوں میں نیز عباسیوں اور فاطمیوں میں جن سیاسی چپقلشوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے، ایسے ہی جھگڑے خود امویوں امویوں میں، ہاشمیوں ہاشمیوں میں، عباسیوں عباسیوں میں، اور فاطمیوں فاطمیوں میں بھی ہوتے رہے۔ لیکن یہ محض ذاتی معاملات تھے، ان کا تعلق نہ دینی اختلاف سے تھا، نہ نظام سیاسی میں تبدیلی سے

اور نہ ملتِ اسلامیہ کے مقاصد بدلنے ۓ۔ سب کتاب وسنت ہی کی بات کرتے تھے، اور ثابت کرنے کے درپے ہوتے تھے کہ زمام کار ہمارے ہاتھ میں آئے گی تو ہم ان مقاصد کو زیادہ مؤثر بنا سکیں گے۔ حالانکہ ہوا کچھ بھی نہیں جو حکومت امویوں کی تھی وہی عباسیوں کی رہی، اور جو عباسیوں کی تھی وہی فاطمیوں کی بھی رہی۔ نہ احکام بدلے اور نہ ان احکام کو بروئے کار لانے میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ امویوں کی، عباسیوں کی، اور فاطمیوں کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں سب ہمارے سامنے ہیں، اور جس طرح ان حکومتوں کو چلایا گیا وہ بھی۔ اعتراض کی جو بات جہاں نظر آتی ہے اسی کو ہر جگہ قابلِ اعتراض کہا گیا، جو خوبی ایک جگہ دکھائی دی اسی کو ہر جگہ خوبی کہا گیا۔ جب مدار کتاب وسنت پر ہو اور معیار اخلاقِ نبوی ہو تو اس سے باہر آدمی کیسے جا سکتا ہے۔ لیکن یہ باتیں صحیح النسب سادات کی ہیں۔ مدعیوں اور کذابوں کا منہاج دوسرا رہا۔

خلیفہ اموی ہو یا ہاشمی ہمیشہ ان کے فرامین ہوتے تھے "من عبد اللہ عبد الملک امیر المؤمنین الیٰ فلان" (اللہ کے بندے عبد الملک امیر المؤمنین کی طرف سے فلاں شخص کے نام) "من عبد اللہ ھارون امیر المؤمنین الیٰ فلان (اللہ کے بندے ہارون امیر المؤمنین کی طرف سے فلاں شخص کے نام) اور ہر فرمان کا مقصد ہوتا تھا کسی بُرائی کو روکنا، کسی اچھائی پر زور دینا، اور تقویٰ کی تلقین کرنا۔ فرمان کا یہ منہاج فاروقی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ اسی طرح لکھا کرتے تھے "من عبد اللہ عمر امیر المؤمنین"۔

لیکن جو لوگ کسی نسب کا ادّعا کر کے اپنے تخریبی مقاصد کے لئے کھڑے ہوئے ان کا وہ عالم ہوتا تھا جو عبیدیوں کا مصر میں تھا، کہ اپنے آپ کو الٰہی صفات کا حامل ثابت کرنے کے درپے ہوئے۔ جیسے الحاکم کہ جہاں کہیں اس کا نام لیا جائے لوگوں کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اسی طرح ایک صاحب امیر المؤمنین المکتفی باللہؒ کے زمانہ میں فاطمی بن کر سامنے آئے اور اپنے گال پر ایک تل دکھایا کہ یہ علامت ہے خدا کی طرف سے مقرر ہونے کی۔ اور اس طرح ذو شامہ کہلائے۔ عوام کو اپنی مصنوعی فاطمیت کے جال میں پھنسا کر بڑی قوت حاصل کر لی۔ یہاں مناسب ہے کہ آپ کا بھی ایک فرمان نقل کیا جائے جو آپ نے اپنے ایک والی کے نام بھیجا تھا۔ [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: الدولۃ العباسیہ، ص ۲۳۱]

من عبد اللہ احمد بن عبد اللہ المھدی المنصور باللہ الناصر لدین اللہ القائم بامر اللہ الحاکم بحکم اللہ الداعی الی کتاب اللہ۔	منجانب بندۂ خدا احمد بن عبد اللہ مہدی، خدا کی مدد سے کامیاب ہونے والا، اللہ کے دین کا مددگار، اللہ کے حکم کا پیرو، اللہ کے حکم

الذاب عن حرم اللہ، المختار من ولد رسول اللہؐ امیر المؤمنین وامام المسلمین ومذل المنافقین خلیفۃ اللہ علی العالمین وحاصد الظالمین و قاصم المعتدین ومبید الملحدین وقاتل القاسطین ومہلک المفسدین وسراج المبصرین وضیاء المستضیئین ومشتت المخالفین والقیم بسنۃ سید المرسلین وولد خیر الوصیین صلی اللہ علیہ وسلم وعلی اہل بیتہ الطیبین کثیرًا الیٰ جعفر بن حمید الکردی سلام علیک۔

سے حکومت کرنے والا، اللہ کی طرف بلانے والا، اللہ کے حرم کی حرمت قائم کرنے والا، رسول اللہؐ کی اولاد میں سے منتخب شدہ، اہلِ ایمان کا امیر اور اہلِ اسلام کا امام، منافقوں کو ذلیل کرنے والا، تمام جہانوں پر خدا کا نائب، ظالموں کا قلع قمع کرنے والا ظلم کرنے والوں کی کمر توڑنے والا، ملحدوں کو فنا کرنے والا، انصاف دشمنوں سے لڑنے والا۔ مفسدوں کو تباہ کرنے والا، دیکھنے والوں کے لئے چراغِ (ہدایت)، اور نور حاصل کرنے والوں کے لئے روشنی، مخالفوں کو پراگندہ کرنے والا، سید المرسلینؐ کی سنت کو قائم کرنیوالا اور اس کا بیٹا جو سب وصیوں سے بہتر ہے (یعنی سیدنا علیؓ)، اللہ تعالیٰ اُن پر اور ان کی اولاد پر بہت بہت درود و سلام بھیجے، بجعفر بن حمید کردی سلام علیک۔

اپنے قلم سے اتنے بہت سے القاب اپنے لئے لکھنے والے ان صاحب کے کارنامے یہ ہیں کہ حاجیوں کے قافلے لُوٹا کرتے تھے اور دو دفعہ جب اس طرح خدا کے اس نائبِ حقیقی نے سنتِ رسول اللہؐ یوں قائم کرلی تو گرفتار ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچے اور ان کے ساتھی بھی فی النار والسقر کر دیئے گئے۔ یہی حال ان بنے ہوئے فاطمیوں کا ہے جو سبائیہ کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے سے۔

رہے صحیح النسب ساداتِ فاطمیہ تو وہ کوئی یہی پچیس تیس آدمی نہیں تھے جنھوں نے وقتاً فوقتاً امامِ جماعت کے خلاف خروج کر کے اپنی خلافت کی ڈول ڈالنی چاہی، اور کبھی کچھ کامیابی حاصل کرلی اور کبھی ناکام رہے۔ یہ سادات سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ سب جماعت سے وابستہ رہے اور خروج کرنے والوں کی حرکتوں سے بیزار۔ یہ خروج کرنے والے بھی جب کہیں کامیاب ہوگئے، تو اسی کتاب اور اسی سنت کو انھوں نے اپنا دستورِ حیات بنایا۔ جو لوگ کھڑے ہوئے اور ناکام رہے تو ان کی اپنی طرف سے دین پر کوئی زد نہیں پڑی۔ اور سوائے سیاسی اختلال کے امت کو ان کی ذات سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس لئے نہ ان کے ہاں لعنت کا کبھی دستور رہا، اور نہ بغض و عداوت جاری رکھنے کا۔ سیدنا علیؓ کے بعد سیدنا حسنؓ، امیر المؤمنین یزیدؒ کے بعد امیر المؤمنین معاویہؒ ثانی، سیدنا حسینؓ کے بعد سیدنا علی زین العابدین وغیرہ رضوان اللہ علیہم ایسی ہستیاں ہیں

جنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ انھیں نہ مخالف سے کوئی دینی اختلاف تھا اور نہ خاندانی رقابت
اور نہ باہمی بغض و نفرت، تو پھر کیسے باور کر لیا جائے کہ یہ ایک دوسرے پر لعنت کو اپنا شعار
جانتے تھے، کہ بغیر اس کے جذباتِ دلی کا اظہار ہی نہ ہو سکے۔ اس قسم کی تمام مکروہات کو ان لوگوں
نے اپنا شعار بنایا جن کا ان بزرگواروں سے نہ دین کا تعلق ہے اور نہ نسب کا۔ یہ ملّتِ اسلامیہ
کے باہر کے لوگوں کی حرکتیں ہیں جو جماعت سے الگ ہو گئے اور اسلافِ کرام کا منہاج
چھوڑ چکے۔ لہٰذا یہ جو چاہیں بکواس کرتے پھریں مسلمانوں کو ان سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ اور
جو صحیح النسب سادات اس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تو انھیں بھی سوچنا چاہئے کہ ان پر سب سے
زیادہ وفاداری کی ذمہ داری سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے ہے، اور آپ
کی بنائی ہوئی جماعت سے۔

———— ✻✻✻✻✻✻✻✻ ————

اسلام کا دستورِ اساسی

سیاسیاتِ اسلامیہ اور نظامِ خلافت پر جب بحث ہوتی ہے تو خود بخود دستورِ اسلامی کا ذکر ہوتا ہے موجودہ دَور میں تو یہ مسئلہ بہت ہی معرکۃ الآرا بن گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ دستور، قانون اور شعائر کے فرق پر غور نہیں کرتے۔

دستور نام ہے اجتماعی سیاسی نظام کا۔ مملکت کی تشکیل کس طرح ہو، اربابِ حل وعقد کیسے برسرِ اقتدار آئیں، سربراہِ حکومت کیونکر اور کن اختیارات کے ساتھ زمامِ کار سنبھالے، نظام کے کتنے شعبے ہوں، اور ان کے تحت کن کن امور کا کس طرح انصرام ہو۔ فرد اور جماعت کے حقوق کی تعیین اور پھر اُن کے تحفظ کے وسائل کس طرح مؤثر بنائے جائیں، یہ اور اسی قسم کے امور دستور میں بیان ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ہیں قوانین، جن کے تحت جرائم کا سدِ باب کیا جاتا ہے۔ آمد و خرچ کی جائز و ناجائز صورتیں مقرر کی جاتی ہیں۔ وراثت کی تعیین اور تقسیم کے اصول وحدود مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی طہارت اور ترقی کے اسباب متعین کئے جاتے ہیں۔ یہ اور ایسی ہی باتیں قوانین کے تحت آتی ہیں۔

اجتماعی نظام کی ایک رُوح ہوتی ہے جو ظاہراً و باطناً تمام اصول و قواعد اور مقاصد میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اس رُوح کے مظاہر کو شعائر کہا جاتا ہے۔ اور بجائے خود اگرچہ ان شعائر کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی، لیکن چونکہ ان میں نمود ہوتی ہے روح کی اس لئے شعائر کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ شعائر ہی ہیں جو ایک دعوت کے علمبرداروں کو دوسری دعوتوں کے اتباع سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان شعائر کے تحت آتے ہیں لباس کے، وضع قطع کے، کھانے پینے کے، رنج و خوشی منانے کے، آپس میں ملنے جلنے اور ملاقاتوں کے آداب، اور جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے ایک مشترک زبان کو اختیار کرنا، اور ایسے امور کی پابندی کرنا جو اپنی وحدت اور دوسروں سے مغائرت کا سبب بنے۔

آجکل مغرب زدہ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام کوئی داڑھی اور کپڑوں میں ہے،

لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے، کہ دعوتِ محمدیہ کے پیرو اگر اپنے امتیازات قائم نہ رکھیں گے تو نصاریٰ اور ہنود سے کیسے پہچانے جائیں گے اور جب ان کا ظاہر روحِ اسلامی سے مطابقت نہیں رکھے گا تو ان کے نفس پر وہ روح طاری کیسے ہوگی۔ اور وہ کیسے اس چیز کو ہر وقت اپنے اوپر مسلط رکھ سکیں گے کہ ہماری زندگی کے کچھ مقاصد ہیں، اور وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔ ہم ایک عالمگیر برادری ہیں جس کا مقصد ہے دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنا نہ کہ خود دوسروں میں جذب ہو کر اپنی.... حیثیت کھو دینا۔

ہم یہاں صرف دستور کے متعلق بحث کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ان تمام مآخذ کو دیکھنا جن کی روشنی میں دعوتِ محمدیہ کے کل مسائل طے کئے جاتے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، اجماعِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، قیاس اور امت کا عمل متواتر جو بغیر انقطاع عہدِ نبوی سے اب تک چلا آرہا ہے۔

کتابُ اللہ

قرآنِ حکیم آخری کتاب ہے۔ اب انسان کو خدائے عزّوجل کی طرف سے کوئی اور ہدایت نامہ نہیں دیا جائے گا۔ اس کتاب میں زندگی کے نظریات اور اصول بیان کئے گئے ہیں۔ کسی مسئلہ کا کوئی جزئیہ بھی بیان ہوا ہے تو نظری اعتبار سے۔ کسی عمل کی بات ہے تو وہ محض علمی اور نظری حیثیت سے ہے۔ جن اصحاب کو قرآنِ حکیم کے صحیح مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہوگی تو انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں عملی امور کا ذکر اس طرح ہے جیسے جانی پہچانی چیزوں کا ہوتا ہے۔ بر خلاف اس کے عقائد و نظریات خوب کھول کھول کر تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن حکیم کو "کتاباً مفصّلاً" اور "کتاب مبین" فرمایا ہے (یعنی ہر چیز کو تفصیلی طور پر کھول کھول کر بیان کرنے والی کتاب) جس کی صفت ہے "تبیاناً لکل شئیٍ" (ہر چیز کو بیان کرنے والی)، تو وہ اسی اعتبار سے ہے کہ علمی اور نظری حیثیت سے اس میں کوئی مسئلہ تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ نماز، زکوٰۃ، حج، طہارت، وراثت، نکاح، محاصل وغیرہ وغیرہ امور کی ایسی تفصیل قرآنِ مجید میں نہیں کہ آدمی محض قرآن سے یہ سب عملی باتیں معلوم کر سکے۔ اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو سوائے گمراہی اور خبط کے اسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا منشاء محض انسان کی ذہنی تربیت ہے۔ عمل کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس سے اس لئے تفصیلی بحث نہیں کرتا کہ یہ تفصیلات بیان کرنے کی ذمّہ داری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ یوں دینِ محمدی کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھی گئی۔ آپ ایک بے اختیار پیغامبر ہی نہیں ہیں جیسا کہ بعض احمق اور جاہل لوگ سمجھتے ہیں بلکہ آپ آمر ہیں، شارع ہیں، معلّم ہیں، مفسّر ہیں، امام ہیں اور منشاءِ الٰہی سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (الجمعۃ: ۲-۳)

وہی ہے جس نے ایک بے پڑھی لکھی قوم کے لئے انہی کے اندر سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، انھیں پاک کرتا ہے، اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، اور ان سب لوگوں کے لئے بھی جو فی الحال ان میں شامل نہیں ہوئے (یعنی آئندہ ہوتے رہیں گے)۔ واقعی وہی ہے غالب آنے والا اور اپنے مقاصد کو حکمت کے ساتھ بروئے کار لانے والا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ تھی کہ تمام جہانوں کا آخری رسولؑ اس نے عربوں میں پیدا کیا جن کا کوئی ثقافتی سرمایہ نہ تھا، اور جو دنیا سے الگ تھلگ اپنی خودی میں مخمور زندگی بسر کر رہے تھے، تاکہ جو نقش ان کے دل پر بیٹھے وہ اتنا گہرا ہو کہ جب قوموں کی ثقافتوں سے ٹکرلیں تو اپنا کچھ نہ کھوئیں، بلکہ دوسروں کو اپنی برکات سے مستفیض کریں۔ اور الحق کہ ایسا ہی ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی جماعت ہی ہے جو اقوامِ عالم کے ذہنی ارتقار کا اصل سبب بنی۔ اور تنگنائے قومیت سے انھیں نکال کر بین الاقوامی زندگی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ اور اس طرح کہ تمام دنیا کی مہذب و متمدّن قومیں چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں محمدی زاویۂ نگاہ سے اپنی اصلاح کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ سب کچھ ہرگز نہ ہو سکتا اگر اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت اور امامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کی ہوتی۔ اگر آپ محض قرآن پڑھ کر سنا دیتے تو اس کا کچھ بھی نتیجہ نہ ہوتا۔ یہ چھپا ہوا قرآن اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے پڑھ کر جس طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں اس کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ہے۔

گویا صاف ہو گیا اور صحابۂ کرام نے یونہی سمجھا تھا کہ قرآن نظر ہے اور سنت عمل۔ اس قرآن مجید میں جا بجا "اولوالامر" کا ذکر ہے، ان کی اطاعت کا حکم ہے، خلافت و حکومت کا تذکرہ ہے، مگر از اوّل تا آخر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ حکام کس طرح برسرِ اقتدار آئیں گے، کس طبقہ

اور کس معیار کے لوگ ہوں گے، اس بارے میں ایک بھی آیت بطورِ حکم پیش نہیں کی جاسکتی۔ کسی آیت سے اگر کوئی شخص کچھ استدلال کرے گا بھی تو نظری ہوگا، اجتہادی ہوگا اور یہ حیثیت نہیں رکھے گا کہ اس کا انکار کفر ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ رہے۔

اگر قرآنِ حکیم میں دستورِ اساسی دیا جاتا تو پھر اس سے ہٹنے کی سبیل نہ رہتی۔ اللہ تعالیٰ اس آخری امت پر یہ تنگی نہیں کرسکتا تھا کہ بنائے تو اسے زمان و مکان کی حدود سے بالا، اور پابند کردے ایسے دَور کے ایک ماحول کا جو عہدِ جدید کا ابتدائی دور تھا، اور جسے قدم بقدم ارتقائی منازل طے کرنے تھے۔ لہٰذا اس نے حیاتِ ارضی کے مجمل اصول بتائے ہیں تاکہ ہر عہد کے لوگ ایک ہی اصل کے تحت اپنے ماحول کے مطابق اپنا سیاسی نظام مرتب کرسکیں۔ قرآن کی تعریف ہے، فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (اس میں صرف باقی رہنے والے احکام ہیں)

جن امور میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی ہے، اور جن میں اگر ترمیم و تنسیخ نہ ہو تو پھر انسان ارتقائے ذہنی و عملی سے محروم ہو جاتا ہے، ایسے امور کا تذکرہ اس آخری کتاب میں کیسے ہو سکتا تھا۔

انسان کی زندگی کی رفتار زمانہ کے تابع ہے، اور آسمانی و زمینی اثرات کے تحت ڈھلتی ہے۔ اگر کتاب اللہ میں عمل کے جزئیات ہوتے تو امتِ مسلمہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو یہود کا ہوا "اسرائیل" نام کی ایک حکومت زبردستی قائم کردی گئی ہے جو سراسر فطرت سے جنگ کے مرادف ہے۔ اسی لئے کھلا ہوا نتیجہ سامنے ہے کہ ان لوگوں پر توراۃ کے مطابق اپنی سیاسی زندگی ڈھالنا ممکن نہیں۔ کتنی ہی کوشش کرلیں اور کیسی ہی تاویلات کریں وہ اپنے سیاسی نظام کی تشکیل توراۃ کے مطابق نہیں کرسکتے۔ وہ احکام جس قوم اور جس زمانہ کے لئے نازل ہوئے تھے، اب نہ وہ قوم ہے اور نہ وہ زمانہ، اس لئے ان پر عمل کی بھی کوئی سبیل نہیں رہی۔

یہی حال دنیا کی تمام قوموں کا ہے۔ ہندو ہوں یا نصرانی، مجوسی ہوں یا صابئ وہ اپنی نامنہاد قومی حکومت تو قائم کرسکتے ہیں لیکن دینی حکومت اور اس دین کے احکام کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کے دروازے اُن پر بند ہو چکے۔ اس لئے وہ مجبور ہیں کہ چرچ اور اسٹیٹ یعنی کلیسا اور مملکت کو الگ کردیں۔ انھوں نے رفتارِ زمانہ سے مجبور ہو کر اپنی دینی زندگی کو انفرادی بنادیا ہے، کیونکہ وہ اپنے اجتماعی عمل اور دینی احکام میں ہم آہنگی پیدا نہیں کرسکے۔

انسانی معاشرہ کی اس حقیقت کو اللہ عزّ وجل سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس لئے اس نے اپنی آخری کتاب کو اس عظیم ترین سقم سے محفوظ رکھا۔ صرف دائمی اصولِ زندگی بتادیئے

جن میں اتنی لچک ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ماحول میں یہ کتاب یکساں مشعلِ ہدایت ہے۔ اس کے عجائبات کبھی کم نہیں ہوتے، اور اس کی کارگری میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اس کی تازگی کا یہ عالم ہے کہ زمانہ کے ہر دَور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص آج کے مسائل حل کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

لوگ مغربی جمہوریت سے متاثر ہو کر قطعیت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہٹلر کے غالب آجانے پر مصر ہوتے کہ اسلام کا سیاسی نظام آمرانہ ہے۔ حالانکہ اسلام کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ لوگ شخصی حکومت کے قائل ہیں یا آمرانہ نظام کے، یا جمہوریت کے یا کسی اور طریقہ کے۔

مَا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (یوسف: ۴۰)	"اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اُتاری حکم صرف اس کا ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ تم سوائے بس ایک کے اور کسی کو نہ پوجو۔ بس یہی ہے ثبات بخش دین لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔"

یہ وطن اور یہ نسل، یا حکمران خاندان، یا زبان، یا اور جتنے معبود لوگوں نے بنا رکھے ہیں، یہ سب اصنام ہیں، اور ان سے ایسی وابستگی کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقِ عبدیت پر زد پڑے شرک ہے۔ اور عند اللہ مردود۔ امتِ مسلمہ کی تشکیل محض اس لئے ہوئی ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند رکھے اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی گواہ بنے۔ گویا قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیاد پر اپنے دنیوی مسائل حل کرنے کے لئے اپنی حکومت قائم کریں، اور سوائے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتے کے اور کسی چیز کو اپنے عقائد میں جگہ نہ دیں۔ جس قوم میں ہجرت اور جہاد ہو اسے نسل اور جغرافیہ سے کیا غرض؟

حکومت ایک ظاہری چیز ہے اور وہ ہمیشہ ایسی ہی ہو گی جیسے دنیا کی اور حکومتیں ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بس فرق ایک ہو گا کہ دوسری حکومتیں جب دستور بناتی ہیں تو وہاں قانون سازی کا حق بھی اُن کا ہوتا ہے اور مقاصدِ حکومت بھی خود ہی متعین کرتی ہیں۔ یعنی ان کا جو بھی حاکم ہو، وہ شخصِ واحد ہو، یا کسی طبقہ کا یا جمہور کا نمائندہ ہو وہ اس کا مجاز گردانا جاتا ہے کہ جو قانون چاہے بنائے، اور جس طرح اُسے بروئے کار لانا چاہے لائے۔

امریکہ کا صدر روزویلٹ جب انتخاب کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا اگر اسے صدر بنا دیا گیا تو وہ شراب پر سے پابندیاں اٹھا دے گا۔ چنانچہ اس کی کامیابی

کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا، جرمنی کا ایک سائنسدان تھا اس نے کوشش کر کے وہاں لواطت کو قانونی طور پر جائز کروالیا تھا۔

لیکن مسلمانوں کا بادشاہ ہو یا آمر، صدرِ جمہوریہ ہو یا سربراہِ شوریٰ، مجلسِ قانون ساز میں امراء و عوام کے سے دو دیوان ہوں یا صرف ایک، اور قوم کے یہ نمائندے عام رائے شماری سے آئیں یا محدود انتخاب کے ذریعہ، جس طرح مناسب سمجھیں کام کریں، لیکن انھیں قانون اور شعار اور رُوحِ اجتماعی وہی رکھنی ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ سرمو اس سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک حدود اللہ قائم نہیں ہوں گی، اور ان کی پاسداری نہیں کی جائے گی، اس وقت تک نہ حکومت اسلامی ہوگی اور نہ مسلمان بارگاہِ خداوندی میں سُرخ رو ہوسکیں گے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں)۔

لہٰذا ہر وہ حکومت اسلامی ہوگی جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر قائم کی جائے گی، اگرچہ اس کا قالب شخصی حکومت کا ہو، آمرانہ ہو، جمہوری ہو اور جمہوریت شورَوی ہو یا محدود نمائندگی کی، کوئی پرانا طریقہ اختیار کیا گیا ہو یا بالکل نیا اور اپنا ایجاد کردہ قرآنِ حکیم اس کی کھلی آزادی عطا فرماتا ہے اور کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا۔ وہ پابند صرف اس کا بناتا ہے کہ ہم مسلمان رہیں، حدودِ الٰہی جاری رکھیں اور اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ہی کو اپنی زندگی کا اصلِ اصول بنائیں۔

آیتِ استخلاف (النور ۵۵) میں اس نے جو حکومت دینے کا وعدہ کیا ہے وہ ایسی ہی حکومت ہے جیسے اہلِ عالم کی ہوا کرتی ہے۔ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (جیسی حکومتیں ان سے پہلے لوگوں کو دی تھیں)۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ حکومت دین کی بنیاد پر ہوگی اور ان احکام کے مطابق جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پسند کئے ہیں۔ اس حکومت میں کسی جاہل فوجی آمر کو یہ حق نہیں ہوگا کہ خدا کے اس حکم کو تبدیل کر سکے جو اس نے وراثت کے متعلق نازل فرمایا ہے لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (مرد کو عورتوں سے دوگنا حصہ دیا جائے گا)۔ اس حکم کی حکمت اگر کسی پر نہ کھلے تو اُسے چاہئے کہ اپنی عقل پر ماتم کرے۔ خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں۔

سنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب اللہ کی عملی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ کار ہے۔ آپ نے بھی اس کا اہتمام رکھا کہ چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں عمل کی کئی صورتیں ہوسکیں تاکہ ایک ہی اصل کے

تحت متعدد طریقوں پر کام کیا جائے۔ امت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نماز سے زیادہ اہم کوئی عمل نہیں۔ لیکن عہدِ نبوی سے آج تک اس بارے میں امت برابر متعدد طریقوں پر اپنے فقہی اجتہاد کے مطابق عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ سوائے اس شخص کے جو تعصب اور جہل میں مبتلا ہو اور مقامِ نبوت سے ناآشناء اور کوئی شخص ان مسنون طریقوں میں سے کسی پر طعن نہیں کرتا۔ اس کا نام ہے توسّع کہ یوں بھی روا ہے اور یوں بھی۔ یہ محض اس لئے ہے کہ آپ آخری رسول ہیں، اور اب کوئی شارع نہیں آئے گا۔ اگر آپ کوئی تنگی کرتے تو امت کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے، اور اجتہاد کے مواقع جاتے رہتے، جس کے بغیر ارتقاء ناممکن ہے۔

ہمارے زمانہ میں ایک شخص نے اپنی جہالت اور حمق سے کچھ دن پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ نماز کا صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا جائے۔ گویا جو سنتیں جاری ہیں انھیں ہم منسوخ کر دیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حکمت کے تحت اس تنوع کو پسند فرمایا تھا اسے پسِ پشت ڈال کر تنگی پیدا کر دیں۔ اور یوں کچھ دن بعد چاروں فقہی مکاتب میں سے تین سے یہ امت اجنبی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (اس نے تمھارے دین میں کوئی تنگی پیدا نہیں کی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل بھی آخری اجتماع میں یہی تھا۔ یعنی حجۃ الوداع میں آپؐ نے اس دین لاحرج کو اچھی طرح نمایاں کر دیا۔ جس نے جو بات کی کہ یارسول اللہؐ مجھے یوں کرنا تھا اور میں نے یوں کر لیا، تو آپ کا ایک ہی جواب ہوتا تھا "لاحرج" کوئی حرج نہیں۔ جب رُوح قائم اور فعال ہے تو عمل کے تنوع سے کوئی حرج پیدا نہیں ہو سکتا [صحیح بخاری: ج ۴، ص ۱۵۴، باب اذا حنث ناسیا: طبع مصر]

آپؐ نے کوئی بات ایسی نہیں کی جو بعد کے لوگوں کو جینا مشکل کر دے اور قرآن کے لچکدار عالمگیر دائمی اصولِ زندگی پر توسع کے ساتھ عمل کر کے بتا دیا کہ اب تم ہی تم ہو۔ تمھارے سامنے لامحدود ترقیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اور تم اس مقام پر ہو جہاں اب کسی دوسرے ہادی کی ضرورت نہیں، امامتِ عالم تمھارے سپرد ہے۔ تم قوموں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹو گے، اور تم دنیا میں میزانِ عدل قائم کرو گے، قومیں تمھاری روشن کی ہوئی مشعل کی روشنی میں چلیں گی۔ تم دنیا کو حقیقی آزادی سے روشناس کراؤ گے۔ علمی اور مالی اجارہ ختم کرو گے۔ تمھاری وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوں گی۔ نسل اور وطن، اور زبان ورنگ سے تمھارا معاشرہ بالا ہوگا اور اخوت کی لڑی میں تم منسلک ہو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی صفت پہلی کتابوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ الاعراف: ۱۵۷

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

ان پاک چیزوں کو حلال قرار دیں گے جن کی پاکی عیاں ہے، ان بُری باتوں سے روکیں گے جن کی بُرائی ہر ایک پر ظاہر ہوگی۔ ان پر سے بوجھ اتار دیں گے اور وہ طوق بھی جو اُن کی گردنوں میں پڑے ہوں گے اب جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اُن کی تعظیم کریں گے ان کی امداد پر کمربستہ رہیں گے اور اس نور کی پیروی کریں گے جو اُن کے ساتھ نازل ہوا ہوگا تو یہی لوگ ہوں گے کامران و کامیاب۔"

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے کوئی مخصوص دستورِ اساسی چھوڑ جاتے، یا اپنے بعد کسی کو خلیفہ کر دیتے تو امت کے لئے عمل کی ایک ہی صورت رہتی اور اس سے ہٹنے کا نام کفر وارتداد قرار پاتا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستقل ہے۔ کسی وقت ایک مسلم فرد یا مسلم معاشرہ اس سے سرتابی نہیں کر سکتا، لیکن "اولوالامر" کی اطاعت بالواسطہ ہے۔ اگر ان سے اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم اور منشاء کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، افضل کونسی بات ہے اور غیر افضل کونسی۔

کوئی ایک حدیث بھی پیش نہیں کی جا سکتی جسے خلافتِ نبوت کی تشکیل کے سلسلے میں بطور حکم سمجھا جا سکے، اور جس سے روگردانی کا امکان نہ ہو۔ علمائے حدیث و سیر کا اتفاق ہے اور جمہور صحابہ کا اجماع کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنی امت کے لئے نظامِ سیاسی چلانے کے لئے کوئی دستور نہیں چھوڑا۔ آپ کی اُمت اس بارے میں بالکل آزاد ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق جو راہِ عمل چاہے اختیار کرے۔ نہ کچھ افضل ہے اور نہ ادنیٰ، نہ کچھ جائز ہے اور نہ ناجائز۔ ایک دستور العمل کے متعلق اپنے لئے مناسب و نامناسب، مفید و غیر مفید، موزوں اور ناموزوں کی حیثیت سے تو بحث کی جا سکتی ہے لیکن شرعاً جائز و ناجائز یا افضل و غیر افضل نہیں کہا جا سکتا۔

ایک عصر کے لوگ جس دستور پر متفق ہو جائیں اس عصر کے لئے وہی حق وصواب ہے اور جب بعد کے لوگ اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کریں تو وہ بھی اُن کے حق میں صواب ہوگا۔

بشرطیکہ اس پر اجماع ہو جائے، یعنی غالب اکثریت اس سے متفق ہو اور دین کے تقاضے اس سے پورے ہوتے ہوں۔

گویا اصل ہے امت کا اجماع۔ صحاح سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ کے لئے فرمان لکھوانا چاہتے تھے کہ اپنے بعد انھیں خلیفہ بنائیں، لیکن پھر آپؐ نے اسے ملتوی کر دیا اور فرمایا "یابی اللہ والمومنون الا ابا بکر (اللہ اور اہل ایمان سوائے ابوبکر کے اور کسی کو قبول نہیں کریں گے)۔ یہ ہے اصل۔ مقصود نہ ابوبکر و عمر ہیں، نہ عباس و علی اور نہ حسن و معاویہ، رضوان اللہ علیہم۔ مقصود ہے امت کا اجماع جس پر بھی ہو اور جیسے بھی ہو۔ اور مقصود یہ ہے کہ جو حکومت بنے وہ دین کی بنیاد پر اور دعوت کے مقاصد پورے کرنے کے لئے بنے۔ یہ تقاضے وہ ہیں جو سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں بیان کئے گئے، اور خلافتِ نبوت کے عنوان کے تحت مذکور ہوئے۔

یہ تصور بعد کی پیداوار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں شخص کے حق میں وصیت کی تھی اس بارے میں تین نام لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگوں کی اپنی خام خیالی اور گمانِ باطل ہے۔ اور اس کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی فرد کے حق میں وصیت کر گئے ہوتے تو پھر انصار کا اجتماع ارتداد کے مرادف ہوتا۔ اور ان کے بعد سب سے بڑا مرتد وہ ٹھیرتا جس کے لئے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی اور وہ اسے بروئے کار لانے کے لئے کھڑا نہیں ہوا۔

تمام اربابِ سیر متفق ہیں کہ سقیفہ کے اجتماع میں حضرت صدیقِ اکبرؓ نے حضرت فاروق اعظمؓ اور امین الامت حضرت ابو عبیدہؓ کا نام لیا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لو۔ اگر خود آپ کے حق میں وصیت ہوتی تو اسے بیان کرتے اور دوسرے کا نام نہ لیتے۔ سیدنا عباسؓ اور سیدنا علیؓ دونوں نے حضرت صدیق اکبرؓ سے بیعت کی تھی۔ اگر ان کے حق میں وصیت ہوتی تو ان کا فرض تھا کہ نبیؐ کی بات رکھنے کے لئے اپنی جان دیدیں۔ تمام بنوہاشم میں سب سے پہلے سیدنا عباسؓ نے بڑھ کر بیعت کی تھی کہ آپ ہی خاندانِ نبوت کے بزرگ ترین فرد تھے۔ صحاح کی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوہاشم نے کچھ عرصہ توقف کیا تھا لیکن یہ متفق علیہ ہے کہ سب نے بیعت کر لی۔ ان احادیث پر نقد و تبصرہ سے قطع نظر، کیا ان سے بداہتہً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکماً کسی کی تعیین نہیں کی تھی، اور نہ سرکاری طور پر کسی

کے لئے وصیت کر گئے تھے۔ قریش کی امامت پر بحث پیچھے گذر چکی، اور خلافتِ نبوت کے عنوان کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

عملِ صحابۂ کرام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر واقعی آخری نبی ہیں، اور آپؐ کے بعد کوئی ہادی نہیں آئے گا۔ اگر قرآنِ مجید واقعی آخری کتاب ہے اور اب کوئی ہدایت نامہ خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوگا۔ اگر خدا کا وعدہ سچا ہے کہ غلبہ اسے اور اس کے رسولوں کو ہوگا۔ اگر اس کا یہ فرمان درست ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ امت بہترین جماعت ہے، اور تمام عالمِ انسانیت کے لئے نمونہ، تو ہمیں یہ بھی یقین رکھنا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی متعیّن دستور چھوڑا ہوتا، یا کسی شخص کو اپنے بعد نامزد کیا ہوتا، یا کسی اعتبار سے امت کو حدودِ الٰہی کے علاوہ پابند کر گئے ہوتے، تو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنھوں نے جان و مال قربان کر کے دین قائم کیا تھا، اور سخت سے سخت آزمائش میں سے گذر کر اسے برپا رکھا تھا، وہ ہرگز اس راہ سے نہ ہٹتے، بلکہ سوائے اس ایک طریقۂ کار کے کوئی دوسرا طریقہ برداشت نہ کرتے، اور نہ کسی بدعت پر راضی ہوتے۔ ان کی تمام زندگی قربانیوں میں گذری۔ بڑھاپے میں بھی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ آسمان و زمین نے یہ منظر دیکھا ہے کہ بیٹا اپنے جانے پر مصر ہے اور باپ اپنے جانے پر۔ باپ کی رائے غالب رہتی ہے۔ خود گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بیٹھ سکتے دوسرے سوار کراتے ہیں، اور یوں میدانِ کارزار میں جا کودتے ہیں۔ ایسے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اور آپ کی منشاء سے کیسے ہٹ سکتے تھے۔ انھیں کیسے برداشت ہوتی کہ امت کی "زمامِ قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں چلی جائے"۔ یا "گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ تک پانچ خلفاء کو زمامِ قیادت سپرد کی، اور ہر خلیفہ کے برسرِ اقتدار آنے کا طریقہ مختلف رہا۔ گویا صحابہ کے نزدیک اگر کسی چیز پر اتفاق اور اجماع تھا تو اس پر کہ تبدیلی ہو اور احوال کے مطابق سیاست کی تشکیل کی جائے۔ اور ان کا اجماع اس پر تھا کہ اسلام کا سیاسی نظام متعین نہیں ہے بلکہ امت کی منشاء پر اس کے قیام کا انحصار ہے۔

حضرت خلیفۂ رسول اللہ

حضرت صدیقِ اکبر خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت ایک محدود حلقہ میں ہوئی تھی جو تین

مہاجروں کے علاوہ انصار کے ایک غیر نمائندہ اجلاس پر مشتمل تھا۔ امت سے قطعاً استصواب نہیں کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بیعت ہوئی تھی ایسے شخص سے جو اگر خلیفہ نہ ہوتا تب بھی صدیق اکبر اور ثانی اثنین (دو کا دوسرا) ہی رہتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا شخص سمجھا جاتا۔ آپ کی بیعت مکمل ہوگئی، کیونکہ طبعاً سب کی نگاہیں آپ ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔

امیر المؤمنین عمر اولؓ

حضرت فاروق اعظم رضوان اللہ علیہ کا تو قطعاً انتخاب ہی نہیں ہوا، بلکہ حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اپنی مرضی سے اور صرف اپنی صوابدید کے مطابق انھیں نامزد کیا۔ روایتیں ہیں کہ آپ نے فلاں صاحب اور فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ لیکن سرکاری طور پر اس مشورہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اول تو آپ کا فرمان صراحت کر رہا ہے کہ وہ تقرر محض آپ کی اپنی منشا سے ہوا۔ اور اس میں ادنیٰ ترین اشارہ بھی ان مشوروں کے متعلق نہیں جو مروی ہیں۔ پھر یہ ہے کہ روایتوں میں جو مشورے بیان کئے گئے ہیں ان میں یہ ہرگز مذکور نہیں کہ تم فلاں اور فلاں میں کسے موزوں سمجھتے ہو بلکہ صرف یہ فرمایا کہ "عمر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"۔ گویا مشوروں کی ان روایتوں کے مطابق بھی آپ حضرت فاروق اعظمؓ کی خلافت کا فیصلہ کر چکے تھے۔

لوگوں نے خلافت نبوت کے بارے میں شوریٰ کے جو فرضی تصوّرات بطور خود قائم کر لئے ہیں انہی کے تحت وہ واقعات کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ تلبیس سے عوام متاثر ہوں تو ہوں طالبانِ علم متاثر نہیں ہو سکتے، اور نہ خیالی باتوں سے واقعات بدل جایا کرتے ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تقرر استصوابِ رائے عامہ سے ہرگز نہیں ہوا، بلکہ اربابِ حل وعقد کے سامنے بھی دو چار نام نہیں رکھے گئے تھے۔ سوائے حضرت خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر اس تقرر کی ذمہ داری نہیں ہے۔

البتہ آپ کے متعلق جو فیصلہ ہوا وہ بالکل قدرتی تھا۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے بعد سوائے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اور کسی پر نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ فرمانِ صدیقی کے الفاظ ہیں:

"..... انی استخلفت علیکم بعدی عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطیعوا وانی لم آل الله ورسوله ودینه ونفسی وایاکم خیراً ....."

"..... میں نے اپنے بعد تمہارے اوپر عمر بن خطاب کو خلیفہ بنایا ہے۔ ان کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے اللہ، اس کے رسولؐ، اس کے دین، اپنی جان اور خود تمہاری خیر خواہی کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ....."

اس پورے فرمان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے اندازہ ہو کہ اس انتخاب و تقرر کی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہے۔

امیر المؤمنین عثمان رضؓ

امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمان رضوان اللہ علیہ کا انتخاب ایک بالکل ہی دوسری طرح ہوا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضؓ نے اپنے بعد چھ بزرگواروں کو نامزد کیا کہ ان میں سے کسی کا انتخاب ہو جائے۔ آپ نے یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ یہ چھ حضرات امیدوار ہیں، انھیں امت کے سامنے پیش کر کے استصواب کرنا تاکہ ایک صاحب منتخب ہو جائیں۔ بلکہ شوریٰ محض ان چھ حضرات کے مابین تھا، کہ آپس میں کسی ایک پر اتفاق کر لیں۔ لوگوں نے جو اضافے کئے ہیں کہ اگر ایک صاحب ایک طرف ہوں اور پانچ دوسری طرف، تو ان ایک صاحب کو قتل کر دیا جائے، اور دو ایک طرف ہوں تو ان دو کو، یہ سب بے اصل باتیں ہیں اور بعد کے لوگوں کی بنائی ہوئی۔ حضرت فاروقِ اعظم رضؓ جیسے حکمت مآب امام ایسی مہلک بات کیسے کہہ سکتے تھے۔ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ ان میں سے ہر صاحب امت کے مقتداء ہیں، ان کی پشت پر طاقت ہے، اور ان کے عقیدتمند کبھی اس ظلم و تعدّی کو برداشت نہیں کریں گے۔ یہ شوریٰ قیامِ امن اور اصلاحِ حال کے لئے کیا گیا تھا نہ کہ فساد اور افتراق کے لئے۔ کسی کو جرأت ہو سکتی تھی کہ سیدنا عثمان رضؓ یا سیدنا علی رضؓ پر ہاتھ ڈلے اور ان کے خاندان والے اسے پی جائیں؟

یہ بزرگوار علم و تقویٰ اور مدارجِ روحانیہ کے بلند ترین درجہ پر تھے، اور دعوتِ محمدیہ کے وفادار ترین افراد تھے۔ ان کے متعلق حضرت فاروقِ اعظم رضؓ کو یہ بدگمانی کیسے ہو سکتی تھی کہ اپنی شخصیتوں کی خاطر یہ امت میں موجبِ فتنہ ہوں گے۔ بلکہ آپ سمجھتے تھے کہ چونکہ پیش آمدہ حالات میں آپ کو موقع نہیں کہ اطمینان سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر دیں، اس لئے امت کا معاملہ انہی کے سپرد کر دیا۔ اس پر آپ کو اطمینانِ راسخ تھا کہ یہ کوئی خوش آئند فیصلہ کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

بغایت دور اندیشی اور نہایت بے نفسی سے چار حضرات الگ ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ سیدنا عثمان رضؓ اور سیدنا علی رضؓ میں سے کسی کو منتخب کیا جائے۔ یہ دونوں اس پر متفق تھے کہ اگر خود خلیفہ نہ ہوں تو دوسرے صاحب ہو جائیں۔ یعنی سیدنا عثمان رضؓ نے فرمایا کہ "میں نہ ہوں تو علی ہوں"۔ اور سیدنا علی رضؓ نے فرمایا کہ "میں نہ ہوں تو عثمان ہوں"۔ اصحابِ شوریٰ کا یہ طرزِ عمل

نہایت اصیل بنیاد پر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خلیفہ آلِ عبدِ مناف میں سے نہ ہوا تو اس کی پشت پر وہ طاقت نہ ہوگی جو متفق علیہ امام کی پشت پر ہونی چاہیے۔ یہ سب جانتے تھے کہ خلافتِ خاصہ ختم ہوگئی جو بالکل ایسی ہی تھی کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے درمیان موجود ہیں۔ جو مقام حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کا تھا وہ مقام کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے لازماً خلافت کے لئے دوسرے امور پر توجہ کرنی ہوگی۔ چنانچہ امت کی خیر خواہی اور نظامِ خلافت کی مضبوطی کے لئے انھوں نے مناسب سمجھا کہ خود دستبردار ہو جائیں۔

سیدنا عبد الرحمٰن بن عوف رضوان اللہ علیہ نے ان دونوں کے متعلق مدینہ طیبہ کے ایک ایک گھر جا کر رائے لی اور اکثریت کے فیصلہ کے مطابق سیدنا عثمانؓ کا انتخاب ہوگیا۔ مگر یہ اجتہاد خود سیدنا عبد الرحمانؓ کا تھا۔ اس بارے میں نہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کی کچھ ہدایت تھی اور نہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے متعلق کوئی حکم تھا۔ سیدنا عبد الرحمٰنؓ نے تین دن تک تن تنہا استصواب کی یہ خدمت انجام دی، کیونکہ اصحابِ شوریٰ نے یہ ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی۔ ان کا یہ غایت تقویٰ تھا کہ انھوں نے خلیفہ نامزد کرنے کی ذمہ داری تنہا اپنے اوپر نہیں لی بلکہ اہلِ مدینہ کو اس میں شریک کیا، تاکہ ان کے اقدام پر کسی طرف سے شبہ نہ ہو، لیکن پھر بھی ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو سیدنا عبد الرحمٰنؓ جیسے بے نفس اور امت کے وفادار ترین شخص پر طعن کرتے ہیں۔ صحابۂ کرام نے ان کے طریقۂ کار کو سراہا اور ان کے اجتہاد کا احترام کیا۔ اہلِ مدینہ کی رائے کا اعلان کرنے کے لئے جب آپ منبر پر گئے ہیں تو زیبِ سر وہ عمامہ تھا جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ آپ کے اعلان کو امت نے قبول کیا اور سب نے اس مقدس ماحول میں بطیبِ خاطر بیعت کرلی۔ گویا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مدینۂ طیبہ کے باشندوں سے صحیح معنی میں استصواب کیا گیا اور اس اقدام کا سہرا سیدنا عبد الرحمٰنؓ بن عوف کے سر ہے۔

امیر المؤمنین علیؓ

امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کی بیعت ہنگامی حالات میں ہوئی، اور چونکہ اس کے سب کرتا دھرتا وہی باغی لوگ تھے، جن کے ہاتھوں سے خونِ عثمانؓ ٹپک رہا تھا۔ اور پہلا بیعت کرنے والا شخص اشتر نخعی تھا، اس لئے آخر وقت تک آپ کی خلافت کی آئینی حیثیت زیرِ بحث رہی، حتیٰ کہ خود آپ نے اپنی خلافت کا مسئلہ ثالثوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ ثالثوں نے آخری تصفیہ کرنے کا مجاز امت کے

نمائندوں کو قرار دیا۔ لیکن ابھی یہ اجتماع نہیں ہوا تھا کہ آپ ہی کے ایک باغی گروہ کے فرد نے آپ کو شہید کر دیا ورنہ معلوم نہیں فیصلہ کیا ہوتا۔

بہرحال چونکہ سوائے آپ کے اور کسی کو خلیفہ نہیں کہا جاتا تھا، اور نہ کسی نے آپ کے مقابلہ میں خلافت کا دعویٰ کیا تھا اور نہ کوئی شخص حریفانہ آپ کے مقابلہ پر آیا تھا، اس لئے چوتھے خلیفہ آپ ہی ہیں۔ آپ کے ہمعصروں کو آپ کے خلیفہ ہونے پر اعتراض نہیں تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ آئینی حیثیت سے امت کے صحیح نمائندے اس کی توثیق کر دیں۔ کیونکہ یہ خلافت برپا کی تھی باغیوں نے۔ جن صحابۂ کرام نے آپ سے بیعت کی تھی، انھیں امید تھی کہ امت کے معاملات رُو باصلاح آجائیں گے۔ چنانچہ جنگِ جمل کے موقع پر اس کے مواقع پوری طرح پیدا بھی ہو گئے تھے، اور امیرالمؤمنین علیؓ نے اصحابِ جمل کی امداد و تعاون پر اعتماد کر کے قاتلانِ عثمانؓ کو اپنی فوج سے نکال دیا تھا، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور رہا۔ اگر یہ جنگ نہ چھڑتی تو آپ کی خلافت پر لازماً اجماع ہو جاتا، اور سیدنا معاویہؓ بھی بیعت سے گریز نہ کرتے۔ کیونکہ توقف کا جو سبب تھا وہ رفع ہو جاتا۔ لیکن دشمنانِ دین و ملّت نے یہ جنگ چھیڑ کر حالات بگاڑ دیئے، جس سے تلخیاں پیدا ہوئیں۔

بہرحال ہمیں ان تمام فسادات اور خانہ جنگیوں کے باوجود اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ بیعت سے رُکنے والے یا بیعت سے انکار کر کے مقابلہ پر آنے والے، سیدنا علیؓ کے حریف اور مدّمقابل ہونے کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔ اگر حریف ہوتے یا آپ کو مدعی متغلّب اور غاصب و باغی سمجھتے تو پھر نہ مطالبات پیش کرتے اور نہ صلح و صفائی کی کوششیں ہوتیں۔ اسی طرح اگر امیرالمؤمنین حضرت علیؓ نے اپنے مقابلہ پر آنے والوں کو باغی جانا ہوتا یا امت کا کلمہ متفرق کرنے والا سمجھا ہوتا تو ہرگز التوائے جنگ نہ کرتے، ثالثی پر راضی نہ ہوتے، اور نہ ثالثوں کے فیصلہ کی پذیرائی کرتے۔

یہ محض اجتہادی اختلاف تھا، جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، کہ اگر امام سے اختلاف ہو تو مسئلہ کو اللہ و رسول کے حکم کی طرف لوٹا دو۔ چنانچہ حضرت امیرالمؤمنین نے اور اصحابِ جمل و صفین نے اسی فرمانِ الٰہی پر عمل کیا۔ اس کی راہ میں جو لوگ حائل ہوئے وہ دشمنانِ دین و ملّت تھے۔ فریقین نہ تھے۔ گویا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمعصر صحابہ کے نزدیک چوتھے خلیفہ بالفعل سیدنا علی ہی تھے کرم اللہ وجہہ۔ اور انہی کی یہ حیثیت مانی جاتی تھی کہ نزاعی مسائل

کو خاطر خواہ طے کر کے امت کا کلمہ متحد کر دیں۔ اموی خلافت میں جو آپ کو خلیفہ نہیں کہا گیا تو آئینی حیثیت سے ورنہ بالفعل وہ بھی آپ ہی کو خلیفہ سمجھتے تھے، اور یہ جانتے تھے کہ بغیر آپ کے مسائل کا تصفیہ نہیں ہوگا۔ وقائع تاریخی سے قطع نظر اس بارے میں سب سے اہم دلیل موطا امام مالک ہے جس میں امیر المؤمنین علیؓ کے فیصلے بطور نظائر و حجت مرقوم ہیں اور اموی امراء اور خلفاء کے ہاں مغرب میں اسی کو دستور بنایا گیا۔ ہسپانیہ کے امراء اور امیر المؤمنین عبدالرحمان الناصر رضی اللہ عنہم اس کتاب کو دستور کیسے بناتے۔ اگر امیر المؤمنین حضرت علیؓ کی خلافت بالفعل ان کے نزدیک مسلّم نہ ہوتی اور ان کے بزرگوں کا یہی موقف نہ ہوتا۔

علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ (ص ۱۵۰، طبع مصر المطبعۃ البہیہ) میں جس طرح صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے وہ بڑی حد تک درست ہے، فرماتے ہیں:

فاما وقعة علي فان الناس كانوا عند مقتل عثمان متفرقين في الامصار فلم يشهدوا بيعة علي والذين شهدوا فمنهم من بايع ومنهم من توقف حتى يجتمع الناس ويتفقوا على امام كسعد وسعيد وابن عمر واسامة بن زيد والمغيرة بن شعبة وعبدالله بن سلام وقدامة بن مظعون وابي سعيد الخدري وكعب بن عجرة وكعب بن مالك والنعمان بن بشير وحسان بن ثابت ومسلمة بن مخلد وفضالة بن عبيد وامثالهم من اكابر الصحابة والذين كانوا في الامصار عدلوا عن بيعته ايضا الى الطلب بدم عثمان وتركوا الامر فوضى حتى يكون شورى بين المسلمين لمن يولونه وظنوا بعلي هوادة في السكوت عن نصر عثمان من

رہا (سیدنا) علیؓ کا واقعہ تو لوگ (یعنی کبار صحابہ) (سیدنا) عثمانؓ کی شہادت کے وقت مختلف شہروں میں تھے، اور (سیدنا) علیؓ کی بیعت کے وقت موجود نہ تھے۔ جو موجود تھے ان میں سے بعض نے بیعت کر لی اور بعض نے توقف کیا۔ تا آنکہ جمہور کا اجماع ہو جائے اور وہ کسی امام پر متفق ہو جائیں۔ ان میں ایسے حضرات ہیں جیسے (سیدنا) سعد، (سیدنا) سعید، (سیدنا) ابن عمر، (سیدنا) اسامہ بن زید، (سیدنا) مغیرہ بن شعبہ، (سیدنا) عبداللہ بن سلام، (سیدنا) قدامہ بن مظعون، (سیدنا) ابوسعید خدری، (سیدنا) کعب بن عجرہ، (سیدنا) کعب بن مالک، (سیدنا) نعمان بن بشیر، (سیدنا) حسان بن ثابت، (سیدنا) مسلمہ بن مخلد، (سیدنا) فضالہ بن عبید اور ایسے دوسرے بڑے بڑے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین۔

قاتليه لأن المالأة عليه فحاش لله من ذلك۔ ولقد كان معاوية وإذا صرّح بملامته انما يوجهها عليه في سكوته فقط۔

ثم اختلفوا بعد ذلك فرأى عليؓ ان بيعته قد انعقدت ولزمت من تأخر عنها باجتماع من اجتمع عليها بالمدينة دار النبي صلی اللہ علیہ وسلم وموطن الصحابة وارجأ الامر في المطالبة بدم عثمان الى اجتماع الناس واتفاق الكلمة فيتمكن حينئذٍ من ذلك۔

ورأى الآخرون ان بيعته لم تنعقد لافتراق الصحابة اهل الحل والعقد بالآفاق ولم يحضر الا قليل ولا تكون البيعة الا باتفاق اهل الحل والعقد ولا تلزم بعقد من تولاها من غيرهم او من قليل منهم وان المسلمين حينئذ فوضى فيطالبون اولا بدم عثمان ثم يجتمعون على امام و ذهب الى هذا معاوية وعمرو بن العاص وام المؤمنين عائشة والزبير وابنه عبد الله وطلحة وابنه محمد وسعد وسعيد والنعمان بن بشير ومعاوية بن خديج و من كان على رأيهم من الصحابة الذين تخلفوا عن بيعة علي بالمدينة كما ذكرنا۔

الا ان اهل العصر الثاني من بعدهم اتفقوا على انعقاد بيعة علي ولزومها

پھر جو حضرات دوسرے شہروں میں تھے وہ بھی قصاص عثمان کے مطالبہ کے سبب بیعت سے رُکے رہے۔ حکومت کو بغیر سر حکومت کے سمجھا تا آنکہ مسلمانوں کے عام مشورہ سے طے ہو کہ کسے خلیفہ بنائیں۔ انھوں نے اسے سیدنا علیؓ کی سستی سمجھا کہ وہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لے کر ان کی حمایت نہیں کرتے۔ نہ کہ خدانخواستہ اس لئے کہ وہ انھیں اس خون میں ملوّث سمجھتے تھے۔ سیدنا معاویہؓ بھی جب صراحتاً ان پر ملامت کرتے تھے تو ان کا مقصد بھی محض ان کے سکوت کا سبب تھا۔

پھر ہے ان کا دوسرا اختلاف۔ سیدنا علیؓ کا نظریہ تھا کہ ان کی بیعت ہو چکی اور مدینہ طیبہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مرکز ہے اور صحابہ کا وطن، جب اس میں اس بیعت پر مجتمع ہونے والے مجتمع ہو گئے تو جو لوگ بیعت سے رُکے ہوئے ہیں اُن پر بھی بیعت کرنا لازم ہو گیا۔ آپ نے سیدنا عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ اس وقت تک ملتوی رکھا جب تک آپ پر امت مجتمع نہ ہو اور کلمہ متحد نہ ہو جائے۔ کیونکہ اسی وقت آپ کے لئے قابو پانے کا امکان ہوتا۔

دوسرے حضرات کی رائے تھی کہ ان کی بیعت منعقد نہیں ہوئی اس لئے کہ

للمسلمين اجمعين وتصويب رأيه فيما ذهب اليه وتعيين الخطاء من جهة معاوية و من كان على رأيه وخصوصاً طلحة والزبير لانتقاضهما على علي بعد البيعة فيما نقل مع دفع التاثيم عن كل من الفريقين كالشان فى المجتهدين وصار ذلك اجماعاً من اهل العصر الثانى على احد قولى اهل العصر الاول كما هو معروف۔

جو صحابہ اہل حل و عقد تھے وہ دور دور بکھرے ہوئے تھے اور بہت تھوڑے حضرات موقع پر موجود تھے بیعت اس وقت منعقد ہوتی ہے جب اہلِ حل و عقد متفق ہو جائیں۔ دوسروں کے بیعت کر لینے سے اس کا انعقاد نہیں ہوتا اور نہ تھوڑے سے لوگوں کے متفق ہو جانے سے۔ یعنی اس وقت لوگ بغیر امام کے ہیں اور ان کا پہلا مطالبہ ہے کہ عثمانؓ کا قصاص لیا جائے پھر وہ کسی امام پر مجتمع ہوں گے۔ یہ موقف جن حضرات کا تھا وہ یہ ہیں: سیدنا معاویہ، سیدنا عمرو بن العاص، ام المومنین حضرت عائشہ، سیدنا زبیر اور ان کے فرزند سیدنا عبداللہ، سیدنا طلحہ اور ان کے فرزند سیدنا محمد، سیدنا سعد، سیدنا سعید، سیدنا نعمان بن بشیر، سیدنا معاویہ بن خدیج اور مدینہ کے وہ سب صحابۂ کرام جو اُن کے ہمنوا تھے اور انھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے۔

مگر ان کے بعد کی صدی کے لوگوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ سیدنا علیؓ کی بیعت ہو گئی تھی، اور تمام مسلمانوں پر اس کی پاسداری لازمی تھی۔ اور یہ کہ رائے سیدنا علیؓ ہی کی درست تھی۔ نیز یہ کہ سیدنا معاویہؓ اور ان کے ہمنوا خطا پر تھے۔ خصوصاً سیدنا طلحہؓ اور سیدنا زبیرؓ، کیونکہ انھوں نے بقول راویوں کے حضرت علیؓ کی بیعت کر کے توڑ دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجتہدین کی جو شان ہے اس کے مطابق وہ دونوں فریقوں میں سے گنہگار کسی کو نہیں کہتے۔ اور اس طرح پہلی صدی کے دو قولوں میں سے ایک پر دوسری صدی سے اجماع چلا آتا ہے جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔"

علامہ ابن خلدونؒ کا یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے اگرچہ بالکلیہ نہیں۔ اس میں بعض باتیں محلِ نظر ہیں۔ مثلاً سیدنا طلحہؓ اور سیدنا زبیرؓ کا بیعت کر کے توڑنا۔ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے بیعت نہیں کی تھی جیسا کہ صفحاتِ گذشتہ سے ثابت ہو گیا۔ اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ جماعت نے پہلی صدی میں اُن پر طعن کیا اور نہ بعد کی کسی صدی میں۔ سبائیہ کی مفتریات سے متاثر ہو کر اگر کسی شخص نے کچھ کہا ہو تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے نہ کہ جماعت۔ خود علامہ ابن خلدونؒ کو بھی اہلِ تلبیس و افتراء کی رائے سے اتفاق نہیں، ورنہ جزماً ان کا بیعت کرنا اور توڑنا بیان کرتے۔ انھوں نے اپنی تحقیق بھی یہی بیان کی ہے کہ ان دونوں نے بیعت نہیں کی تھی۔

دوسری بات ہے عصر ثانی میں کوئی فیصلہ ہونا، عقلاً و نقلاً ایسے فیصلہ کی کوئی قیمت نہیں۔ امامت و خلافت حسّی اور واقعی چیز ہے۔ تصورات و نظریات سے اس کا کیا علاقہ؟ ہمعصر لوگ اگر ایک شخص کو اپنا حاکم تسلیم کر لیں تو وہ ہے ورنہ نہیں۔ بعد کے لوگ اپنی خواہشات و رجحانات کے تحت دلائل و براہین کا کتنا ہی انبار کیوں نہ لگا دیں جو واقعہ ہے اس کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ عصرِ ثانی کے مسلمانوں نے سیدنا علیؓ کی خلافت اس لئے تسلیم کی کہ وہ واقعی خلیفہ تھے اور بالفعل ان کی خلافت کو تمام ہمعصر حضرات نے تسلیم کیا تھا۔ ان کی مملکت میں جتنے صحابۂ کرام اور مخلص مسلمان رہتے تھے انھوں نے صرف آئینی بیعت سے گریز کیا تھا، ورنہ تمام فرائضِ دینیہ وہ امیر المومنین علیؓ ہی کی امامت میں ادا کرتے تھے۔ کیا کوئی شخص ثابت کر سکتا ہے کہ چار برس تک ان حضرات نے زکوٰۃ کا روپیہ امیر المومنین علیؓ کے گماشتوں کو نہیں دیا یا ان کے مقرر کردہ امیر حج کی امارت میں ارکانِ حج ادا نہیں کئے، یا ان کے والیوں کے انتظامی احکام کی پابندی ضروری نہیں سمجھی؟ جب ایسا نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ غیر مبایعین بالفعل اور عملاً سیدنا علیؓ ہی کو خلیفہ جانتے تھے اگرچہ آئینی اور متفق علیہ خلیفہ نہ سمجھتے ہوں۔

اسی طرح شام و مصر کے مسلمان سیدنا معاویہؓ کے ہمنوا ہونے کے باوجود کیا قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ حضرت علیؓ ہی سے نہیں کرتے تھے، اور کیا اُن کے گریز کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ خلافتِ مرتضوی پر قاتلانِ عثمان حاوی تھے۔ اگر سیدنا علیؓ کی حیثیت ان کے نزدیک محض مدعی کی ہوتی تو پھر نہ مطالبہ کا سوال تھا اور نہ شرائطِ بیعت پیش کرنے کا۔ لہٰذا عصر ثانی سے جو اجماع چلا آ رہا ہے وہ عصرِ اول کے مسلمانوں کے موقف ہی کی بنیاد پر ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ امّت کا ایک قلیل حصہ سیدنا علیؓ کی امامت کو حق سمجھتا تھا اور اسے آئینی جانتا تھا اور ایک قلیل حصہ ان کی امامت کو تسلیم کرنے کے لئے چند شرائط پیش کرتا تھا اور یہ شرطیں پوری کئے بغیر وہ اُن کی خلافت کو حق سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن یہ دونوں طبقے اقلیت میں تھے امت کے سوادِ اعظم نے نہ ایک کے نظریہ کی تائید کی اور نہ دوسرے کے، نہ ایک کو حق کہا اور نہ دوسرے کو باطل۔ نہ دونوں کو حق کہا اور نہ دونوں کو باطل۔ بلکہ اپنی رائے محفوظ رکھی۔ اس سوادِ اعظم کے نزدیک دونوں کی بعض باتیں صحیح تھیں اور بعض غلط، لہٰذا وہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ کس موقف کا اعلان کریں۔ صِفّین کے بعد ثالثوں کا تقرر ہو گیا اور انھوں نے بھی صورتِ حال برقرار رکھ کر آخری فیصلہ کا حق اسی سوادِ اعظم کے نمائندوں کو دیا جس کا موقع نہیں آیا، کیونکہ سیدنا علیؓ کو شہید کر دیا گیا۔

ثالث اور تمام غیر جانبدار طبقے سیدنا معاویہؓ کے اس مطالبہ میں ہمنوا تھے کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ خود امیر المومنین علیؓ بھی اس مطالبہ سے متفق تھے۔ سیدنا معاویہؓ اور ان کے ساتھی سیدنا علیؓ سے بیعت کر لینے پر تیار تھے بشرطیکہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے کی عملی تدبیریں اختیار کرنے پر راضی ہو جائیں

اور مسئلہ کو التواء میں ڈالیں۔ سیدنا علیؓ کا یہ مطالبہ کہ اول ان کی بیعت کی جائے پھر قصاص کا مسئلہ پیش ہو انہیں منظور نہیں تھا۔

گویا جو نزاع تھا وہ امام وقت سے تھا اور اجتہادی تھا۔ امت کی خیر خواہی کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ سیدنا علیؓ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے کی بیعت لیں وہی بیعت ان کی خلافت کی بھی خود بخود ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کا شروع سے جو موقف چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریق حق پر تھے البتہ اولیٰ بالحق سیدنا علیؓ ہیں۔ اور یہ فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اکابر علماء و فقہاء کے جو نظریات اس بارے میں بیان کئے ہیں وہ بھی اوپر گذر چکے اور وہیں صحابہ کرام کا موقف بھی بیان ہو چکا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بیعت کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ اس سے بالفعل اور آئینی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

امیر المؤمنین معاویہؓ

امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت قریب قریب اسی طرح ہوئی جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ کی ہوئی تھی۔ نہ عام اجتماع میں انتخاب کی ضرورت تھی اور نہ امت کی نگاہ میں کوئی دوسرا شخص تھا۔ ان کی خلافت طبعی اور قدرتی تھی البتہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت معاویہؓ کی بیعت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت صدیقؓ کے ہاتھ پر اول محدود ترین حلقہ میں بیعت ہوئی اور پھر تمام امت نے اس کی توثیق کر دی لیکن حضرت معاویہؓ سے اول بیعت جس شخص نے کی اس کی خلافت کا اعلان کیا جا چکا تھا یعنی سیدنا حسن صلوات اللہ علیہ۔ اس اعتبار سے سیدنا معاویہؓ کی بیعت زیادہ اہم ہے۔ بیعت صدیقی سے پہلے سیدنا سعد بن عبادہ کا صرف نام تجویز ہوا تھا اور ان کی بیعت سے پہلے ہی حضرت خلیفۂ رسول اللہؐ پر حاضرین کا اجماع ہو گیا۔ لیکن سیدنا حسنؓ کی خلافت کا اعلان باقاعدہ کیا جا چکا تھا، اور آپ نے تمام امورِ خلافت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، پھر برضاء و رغبت سیدنا معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے اور ان کی بیعت کر لی۔ کسی جنگ میں مغلوب ہو کر نہیں بلکہ اپنے دیرینہ نظریات کے تحت اور امت کی خیر خواہی میں۔

بعض لوگ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مستبدانہ تسلط باور کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ وہی لوگ ہیں جن کا نظریہ نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی بجبر و زور امت پر مسلط ہو گئے تھے اس قسم کے خیالات صرف ایسے ہی لوگ رکھ سکتے ہیں جو حقائق سے آنکھیں بند کر لیں اور بات کرتے وقت یہ نہ سوچیں کہ معاملہ قرنِ اول کے مسلمانوں کا ہے اور اس امت کے اسلاف کرام کا جو جبر کے سامنے آج بھی نہیں جھکتی۔

ان پانچوں خلفاء کے بعد امت نے یہ تجویز کر لیا کہ خلافت بنو عبد مناف میں محصور رہے گی اور اسے بنو امیہ سے مختص کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اب خلیفہ کا انتخاب یا تو جانے والا کر جاتا تھا، یا ارباب حل و عقد کسی رکن خاندان کو منتخب کر کے اس کی خلافت کا اعلان کر دیا کرتے تھے اور پھر تمام امت بیعت کر لیتی تھی۔

سقوطِ بغداد تک پچاس کے قریب خلیفہ ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو باپ کی

وصیت کے تحت خلیفہ ہوئے ہوں، اور بہت کم خلفاء ایسے ہیں جنھوں نے اپنے بعد اپنے بیٹے یا بیٹوں کو نامزد کیا ہو۔ اکثر بیٹے وہ ہیں جنھیں ارباب حل وعقد نے منتخب کیا، ورنہ عموماً صرف رکنِ خاندان کی اہلیت کے مطابق خلیفہ منتخب کر لیا جاتا تھا۔ یعنی امر خلافت میں مسلمانوں نے آخر وقت تک قانونِ وراثت کی پیروی نہیں کی۔ اور نہ استحقاقِ خلافت کے لئے وارثِ حقیقی ہونے کی شرط رکھی۔ چونکہ اجماع صرف خاندان پر تھا اس لئے شرط بھی رکنِ خاندان ہونے کی تھی۔ فرزندِ صلبی اور حقیقی بھائی، عم زاد بھائی، بلکہ چچا اور بھتیجے کا بھی انتخاب ہوا ہے۔ کبھی جانے والے خلیفہ کی وصیت سے اور کبھی اربابِ حل وعقد کے اپنے مشورہ سے۔ یہاں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان سے بحث نہیں۔ بحث صرف عمل سے ہے۔

آخر عہدِ عثمانی تک اربابِ شوریٰ صرف اہلِ مدینہ تھے۔ خلافتِ مرتضوی میں یہ مقام اہلِ کوفہ کا ہو گیا، اہلِ مدینہ سے قطعاً استصواب نہیں کیا جاتا تھا جب مستقرِ خلافت دمشق ہوا، تو اربابِ حل وعقد وہی لوگ ہوئے جو دمشق میں رہتے تھے، اور خلیفہ کی معیت انھیں حاصل تھی۔ اس کے بعد جب دار الخلافہ بغداد ہوا تو خلفائے عباسیہ کے امراء و ارکانِ دولت کو حل وعقد کا اختیار مل گیا۔

خلافت کو خاندان میں محصور کر دینے کا مسئلہ چونکہ دستورِ اساسی میں ایک اہم ترمیم تھی اس لئے امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد کی امت سے بہت بڑے پیمانہ پر استصواب کیا تھا۔ ایسے وسیع معیار پر اس سے پہلے کسی مسئلہ کے متعلق امت سے رائے نہیں لی گئی تھی۔ اور چونکہ مصلحتِ ملیہ اسی حصر میں تھی، اس لئے بعد کے مسلمانوں نے بھی اسے اپنا شعار بنا لیا۔ اس تصور کی بنیاد وہ یہ چھ بزرگوار رکھ گئے تھے جنھیں حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے بعد نامزد کیا تھا۔ علامہ خضری فرماتے ہیں [محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ: ج ۲، ص ۲۳-۲۴]

وبذلک صار الامر فی عنق عبد الرحمٰن بن عوف فدار لیالیہ یلقی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن وافی المدینۃ من امراء الاجناد واشراف الناس یشاورہم ولا یخلو برجلٍ الا امرہ بعثمان حتی اذا کانت اللیلۃ التی یستکمل فی صبیحتہا الاجل اتی منزل المسور بن مخرمۃ وامرہ ان یدعوا الیہ الزبیر وسعداً فدعاہما فبدأ بالزبیر فی

اس طرح سب ذمہ داری سیدنا عبد الرحمانؓ بن عوف کے سر پڑ گئی، اور تمام راتیں انھوں نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقاتوں میں گذاریں اور ان کمانداروں اور ذی اثر لوگوں سے مشورے کئے جو اس وقت مدینہ آئے ہوئے تھے۔ جس سے بھی آپ نے بات کی اس نے (سیدنا) عثمانؓ ہی کا نام لیا، یہاں تک کہ وہ رات آگئی جس پر مدت ختم ہونی تھی۔ تب آپ (سیدنا)

مؤخر المسجد فی الصُفّة التی تلی دار مروان فقال لہٗ خلّ ابنی عبد مناف وہذا الامر فقال الزبیر نصیبی لعلی وقال لسعد انا وانت کلالۃ فاجعل نصیبک لی فاختار قال ان اخترت نفسک فنعم وان اخترت عثمان فعلیٌ احب الیّ۔ ایہا الرجل بایع نفسک وارحنا قال یا ابا اسحاق انی خلعت نفسی منہا علی ان اختار ...“

مسور بن مخرمہ کے گھر آئے اور انھیں (سیدنا) زبیرؓ اور (سیدنا) سعدؓ کو بلانے بھیجا جب وہ بلالائے تو آپ نے پہلے (سیدنا) زبیرؓ سے اس چبوترہ پر بات کی جو مسجد کے آخر میں (سیدنا) مروانؓ کے گھر سے ملحق تھا اور فرمایا ”خلافت کے مسئلہ کو عبدمناف کے ان دونوں فرزندوں کے حق میں چھوڑ دو“ (سیدنا) زبیرؓ نے فرمایا ”میں علی کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں“ پھر آپ نے (سیدنا) سعدؓ سے کہا ”میری اور آپ کی حالت کلالہ کی سی ہے (یعنی اس یتیم کی سی جس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ ہو۔ یعنی جس کی پشت پر اخوان و انصار کی طاقت نہ ہو) لہٰذا آپ اپنا حق مجھے دیدیجئے کہ میں انتخاب کرسکوں“۔ انھوں نے جواب دیا ”اگر آپ خود اپنے آپ کو منتخب کریں تو میں تیار ہوں اور اگر عثمان کو اختیار کرنے کا خیال ہو تو پھر علی کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں اور بھلے آدمی اپنی بیعت لو اور ہمارا بوجھ اُتارو“۔ انھوں نے کہا ”ابو اسحٰق! میں تو پہلے دستبردار ہوچکا ہوں“ اور صرف (دوسرے) کو منتخب کرنے کا ذمہ دار ہوں ....“

تقریباً یہی مضمون صحیح بخاری کا بھی ہے [صحیح بخاری: ج ۴، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الناس الامام، ص ۲۴۵، ۲۴۶، طبع مصر] اگرچہ اس میں بنو عبد مناف کی تخصیص کا ذکر نہیں۔ مگر مآل وہی ہے۔

اگر شخصیتیں اور حقوق دیکھے جائیں یا رشتہ داریاں تلاش ہوں تو سوائے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے اور کوئی شخص نہ تھا جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کا خلیفہ ہوتا۔ نہ کسی مرد کو بلاواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت پہنچتی تھی اور نہ رشتہ کے اعتبار سے کسی کی یہ حیثیت تھی کہ سیدنا عباسؓ کے مقابلہ پر کھڑا ہو سکے۔ البتہ جگر گوشۂ رسولؐ ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہما زندہ ہوتے تو وہ حقیقی وارث تھے۔ لیکن چونکہ خلافت کے لئے وراثت شرط نہیں اس لئے ممکن ہے کہ وہ بھی حضرت صدیق اکبرؓ ہی سے بیعت کرتے جیسے سیدنا عباسؓ نے کی تھی، یا جیسے سیدنا حسنؓ نے سیدنا معاویہؓ کو امام تسلیم کرلیا تھا۔

امت کی سیاست کے بارے میں لوگوں نے بہت سی فضول و لایعنی باتیں کہی ہیں کہ کیا افضل کی موجودگی میں مفضول کی خلافت جائز ہے یا اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو نامزد کیا جاسکتا ہے؟ ان باتوں کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ افضلیت اور اقربیت شخصیت کی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ جو کام سپرد ہوا ہے اس کی صلاحیت و موزونیت پر مدار ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ شخص مفوضہ خدمت کو

بخوبی سرانجام دے سکتا ہے یا نہیں، اور اسے اپنے فرائض کی ادائیگی میں اعوان و انصار میسر آئیں گے اور امت کی تائید حاصل ہو سکے گی یا نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا پایہ علم میں اتنا تھا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انھیں کُنَیفۃٌ اَلعِلم کہا کرتے تھے (علم کی پوٹلی)۔ تین چوتھائی امت ان کی فقہ پر عمل کرتی ہے۔ ہَدْیًا وَ دَلًّا وَ سَمْتًا یعنی ذہنی، قولی اور عملی اعتبار سے ان کے احوال ایسے تھے کہ جس نے انھیں دیکھا اس نے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، لیکن خود بقول حضرت فاروق اعظم رض کے انھیں ایک گاؤں کا انتظام بھی سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا چہ جائیکہ ایک مملکت کا۔ یہی حال سیدنا ابوذر رض اور سیدنا عمار رض کا تھا۔

سیدنا عمار رض کو کوفہ کی حکومت دی گئی نتیجہ سامنے ہے۔ جو لوگ علمی زندگی بسر کرتے ہیں اور عملی سیاست کا انھیں تجربہ نہیں ہوتا، وہ کیسے ہی اعلیٰ درجہ کے معلّم، مقرر، مصنّف، محقق اور نقاد کیوں نہ ہوں اگر سیاست میں پڑ جائیں تو ناکام ہی رہتے ہیں۔ پاکستان کا تصور علامہ اقبال رح نے پیش کیا، اور اسی کو مسلمانانِ ہند کا نصب العین بنایا، لیکن ساتھ ہی فرمادیا کہ اگر میں اس تحریک کی عملی رہنمائی کے لئے بڑھوں تو یہ حد سے تجاوز ہوگا۔ آپ چونکہ علمی آدمی تھے اور نظریات پر بحث ہی آپ کا موضوعِ سخن تھا اس لئے عملی سیاست میں آنے سے گریز کیا۔ اس کے لئے دوسری قسم کے آدمی درکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس بطلِ عظیم کو امت کی عملی سیاست کی قیادت کا ملکہ تھا اس نے علامہ اقبال رح کے علم و نظر کو عملی اور حسی بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ علیہما الرحمۃ والرضوان۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور صحابہ کرام نے امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت پر اجماع کرلیا۔ حالانکہ علمی اور روحانی عظمت کے اعتبار سے بکثرت حضرات ان سے مرتبہ میں بلند تھے۔ وہ خود بھی اپنا مقام ان بزرگواروں کے مقابلہ میں کم ہی سمجھتے تھے۔ لیکن جو کام ان کے سپرد ہوا تھا اس میں وہ ان سب سے افضل و اقدم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا سعد رض بن ابی وقاص اور سیدنا ابن عمر رض جیسی ہستیوں نے امیر المؤمنین معاویہ رض کو اپنا امام تسلیم کرلیا، اور ظاہراً و باطناً ان کے ہر اجتہاد میں ان کی ہمنوائی کی۔

پھر وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خلافت اس وقت صحیح ہوگی جب اپنے بعد کسی رشتہ دار کے سپرد نہ کی جائے۔ یہ وہ بات ہے جس کی شرعاً کوئی قیمت نہیں جیسا کہ ثابت ہو چکا۔ کتاب و سنت سے ادنیٰ ترین دلیل بھی اس بارے میں پیش نہیں کی جا سکتی، اور نہ کوئی محکم دلیل دی جا سکتی ہے۔ ارشاد نبوی بالکل صاف ہے "یابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر" (اللہ اور اہلِ ایمان سوائے ابوبکر

کے اور کسی پر راضی نہیں ہوں گے)۔ یہی ہے اصل۔ اگر امت اس بات پر راضی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ ہو تو یقیناً ہو سکتا ہے۔ دو چار آدمیوں کی رائے اکثریت کے اس فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جب ان مخالفوں سے بھی بڑے لوگ موجود ہوں، اور امت ان مخالفوں کی حمایت پر تیار نہ ہو۔

گویا اسلامی نظامِ سیاسی کی بابت کتاب و سنت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی حکومت بنے وہ عند اللہ مقبول ہوگی بشرطیکہ اس کی بنیاد قوانینِ شرعیہ پر ہو اور اس سے وہ مقاصد پورے ہوتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حکومتِ اسلامیہ کے مقرر فرمائے ہیں، یعنی مساجد کی تنظیم، زکوٰۃ کی باقاعدہ تحصیل، اخلاقی اقدار کی حفاظت اور تبلیغِ دینِ مبین۔ پھر ہے مملکت کی حفاظت کی قدرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی طاقت، حکومت کا قالب کسی قسم کا ہو، ایک عصر کے لوگ اسے قبول کرلیں تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دستور پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ روحِ قرآنی کے مطابق دستور میں مناسب تبدیلی برابر ہوتی رہنی چاہئے جیسا کہ صحابہ کرام نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔

یہاں ہمارا مقصد صرف اس اصل کا بیان کرنا تھا ورنہ اس کی بھی گنجائش ہے کہ امت کی تاریخ سے ہم اس پر تبصرہ کرتے کہ مسلمانوں کی سیاست نے قرونِ ماضیہ میں کیا ارتقائی مدارج طے کئے۔ ہمارے نزدیک سیاسیاتِ اسلامیہ میں تنزل نہیں ہوا بلکہ ارتقاء ہوا ہے، اگرچہ بظاہر کبھی کمزوری نظر آئے، یا اختلال رُونما ہو۔ اگر مسلمان زندہ رہے تو یہ ارتقاء بھی جاری رہے گا اور وہ حکومت کے نئے نئے طرز ایجاد کریں گے، جیسے آج پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ ہو رہا ہے اور تمام عالم کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو جائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اب سے پہلے لوگ جاہل تھے یا ان میں دینی تقاضے پورے کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ یا "ان کی قیادت جاہلیت کے ہاتھ میں تھی" یا "گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی تھی"۔ اسی طرح ہمارے بعد آنے والے لوگ جب اور کوئی بہتر اور مفید تر طریقہ ایجاد کریں گے تو وہ اس کے مجاز نہیں ہوں گے کہ موجودہ اربابِ بست و کشاد کو نالائق کہیں یا دشمنِ ملت سمجھیں۔ استثناء صرف ادوارِ فتن کا ہے کہ ان گھڑیوں میں جو مصائب ٹوٹیں وہ قابلِ اعتبار نہیں اور نہ نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دنیا کا نہ کوئی دستور کامل بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔ جب خود انسان کامل نہیں تو اس کی تخلیق کیسے کامل ہو سکتی ہے۔ پھر اس کے احوال بدلتے رہتے ہیں، نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں، پھر کسی لگی بندھی چیز پر مدار کیسے ہو سکتا ہے۔ ابتداءِ آفرینش سے آج تک کوئی سیاسی نظام ایسا مرتب نہیں ہوا جسے کامل کہا جا سکے، اور جس میں کوئی بنیادی خامی نہ ہو۔ البتہ کارکن

اچھے ہوں اور اخلاص سے کام کریں تو ہر نظام کے تحت زندگی کی راحتیں میسر آسکتی ہیں۔

پھر ایک انسانی فطرت ہے نکتہ چینی۔ بعض لوگ قدرت کی طرف سے یہی ذہنیت لے کر آتے ہیں کہ ہر بات میں خامی تلاش کریں، ہر آدمی کے عیب ڈھونڈیں، ہر حکومت کو بدخواہِ ملت بتائیں اور ہر حکمران پر ناانصافی جانبداری خویش پروری کا الزام لگائیں، ایسے لوگوں کا کوئی علاج نہیں۔ آج تک دنیا میں کوئی حاکم ایسا نہیں گذرا جس پر اعتراضات کی بوچھاڑ نہ ہوئی ہو۔ حتیٰ کہ سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں چھوڑا گیا جو عدلِ مجسم تھے، اور آپؐ کے منہ پر بھی یہ کہنے والے لوگ پیدا ہوگئے "اِتَّقِ اللّٰہَ یَا مُحَمَّدُ" (محمدؐ اللہ سے ڈرو) صحیحین کی یہ حدیث پیچھے مذکور ہو چکی۔ کوئی دینی حکومت ہو یا لادینی، نبوی ہو یا جاہلی کسی حکومت اور کسی حاکم پر اطمینان نہ کرنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام بھی ہدفِ ملامت ہیں۔ واقعی قابلِ اعتراض بات نہ ہو تو وضع کر کے چسپاں کر دینا کیا مشکل ہے، اور صورتِ حال کو غلط رنگ میں پیش کر دینے سے زیادہ آسان کیا کام ہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

اسلامی زاویۂ نگاہ سے حکومت کا منہاج ایسا ہونا چاہئے کہ شریعتِ اسلامیہ کی حدود میں رہ کر انسان کو زندگی بسر کرنے کے وسائل پر پوری طرح دسترس ہو اور اس کے ذاتی معاملات میں حکومت کی طرف سے کم سے کم مداخلت کی جائے، تاکہ شخصی آزادی کا احساس ہر شخص کا سر بلند رکھے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری ہر حکومت میں یہ بات حاصل رہی۔

دوسری ضروری بات ہے کہ عدلیہ پر انتظامیہ کا مطلقاً کوئی دباؤ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سعادت بھی ہمیں ہمیشہ حاصل رہی۔ حاکمِ علاقہ ہی نہیں امیر المومنین تک کو عدالت میں طلب کرنے اور اس کے خلاف فیصلہ سنا دینے اور پھر شرعی فیصلہ کے سامنے ان کی گردنیں جھک جانے کے واقعات اگر ابتداءِ اسلام سے لے کر بیسویں صدی مسیحی تک کی یادداشتوں سے جمع کئے جائیں تو ایک مبسوط اور ضخیم کتاب ہو جائے۔

قرآن مجید کے مطابق جمہوریت اور آزادی کا یہی مفہوم ہے اگرچہ وہ کسی بھی نظام کے تحت میسر آئے۔ فرد کے عمرانی حقوق کا پورا تحفظ اور جماعت کے موقف کا کامل احترام جس حکومت میں ہو اور حدود اللہ وہاں قائم ہوں، وہ حکومت اسلامی زاویۂ نگاہ سے معیاری ہے، اگرچہ دستورِ حکومت شاہی ہو، آمرانہ ہو، صدارتی ہو جمہوری ہو، شورویٰ ہو یا کسی اور قسم کا ہو۔ قرآن حکیم نے یہ مضمون پوری وضاحت کے ساتھ (النساء، ۵۹) میں بیان کر دیا ہے۔ گویا دریا

کوزہ میں بند ہے :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔

"اے اہل ایمان اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن حاکموں کی جو تم ہی میں سے ہوں۔ اب اگر کسی مسئلہ میں تمھیں اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہو تو پھر یہی ہے بہتر طریقہ اور نتیجہ کے لحاظ سے بہتر صورت۔"

یعنی مسلمانوں میں یہ طاقت اور حریت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے حکام سے اختلاف کی جرأت کر سکیں، اور عدلیہ کو اتنی آزادی ہونی چاہئے کہ حکومت کے مختلف فیہ اقدام پر وہاں سے اللہ اور رسولؐ کا حکم حاصل کیا جا سکے، جس کے سامنے حکومت اور عوام سب کی گردنیں خم ہوں۔ لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا یا حکومت کے خلاف بغاوت کرنا یا جماعت سے روگردانی کر کے فرقہ بازی میں مبتلا ہونا اور امت کا کلمہ متفرق کرنے کے درپے ہونا کسی درجہ میں جائز نہیں۔ "من فارق الجماعۃ شبراً فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الاان یراجع" جو جماعت سے بالشت برابر بھی باہر ہوا اس نے اسلام کا جُوا اپنی گردن سے اتار پھینکا تا آنکہ پھر لوٹ آئے (رواہ احمد)

عن عبداللہ بن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کیا کہ ہر مسلم شخص پر امیر کی بات سننی اور اطاعت کرنی واجب ہے، حکم اسے پسند ہو یا ناپسند، بشرطیکہ معصیت کا حکم نہ ہو۔ اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا۔"

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کو کسی امر پر احتجاج کرنا ہو تو اس کا احتجاج آئینی اور قانونی ہونا چاہئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم حاصل کرے۔ رائے عامہ کی قوت سے ہر حکم منسوخ کرایا جا سکتا ہے اور کرایا جاتا رہا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونا چاہئے جماعت کے شیرازہ میں پراگندگی پیدا کئے بغیر۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰت والتسلیمات علیٰ سید المرسلین محمد خاتم النبیین و علیٰ آلہ الطیبین الطاہرین واصحابہ الاکرمین وخلفائہ اجمعین ٭



مرتبہ: بشیر محمد

اسمائِ رجال

الف

پ - ت

ث

ج

چ

ح

خ

د ـ ڈ

ذ

ر

ز

س

ش

ص

ض

ط

ع

ک۔گ

م

ن

ہ

اسمائے قبائل و جماعات

۲

اسمائے اماکن



ایّام و وقائع

اسمارِ کتُب

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۵	۹	تعبیر	تعمیر
۳۸	۸	رجولیت	رجولت
۴۰	۲۳	میں بھی یہ	میں یہ
۴۸	۲۲	ص ۲۷۴	ص ۲۵۴
۵۶	۱۳	التمنّی	الاعتصام
۷۰	۷	حکومت کی بحریہ	حکومت کے بحریہ
۷۴	۲۰	آلا	اِلّا
۱۲۰	۲۰	ٹھیک ہے	اگرچہ ٹھیک ہے
۱۷۸	۱۸	قَتلَہٗ	قَتَلَہٗ
۱۸۲	۷	اَبُہتِ	اُبُہِتَ
۱۸۹	۱۱	کو	کا
۱۹۰	۳	مملکت تمام	مملکت کی تمام
۲۲۶	۵	یا کہ	یا یہ کہ
۲۲۷	۲۰	شغلتنی	اَشْغَلَتْنِیْ
۲۲۸	۱۶	ابو بکر ہیں پھر عثمان	ابو بکر ہیں پھر عمر پھر عثمان
۲۳۳	۲	حبشی مثلاً	مثلاً حبشی
۲۳۶	۱۸	علیؓ	سیدنا علیؓ
۲۴۰	۱۶	اب ان	ان
۲۵۲	۱۹	سبب	باوجود
۲۷۷	۱۸	مسئلہ	سنہ
۲۸۹	۲۵	خیزوں	خیزیوں
۲۹۶	۱۲	حقیقت نہیں	حقیقت نہیں تھی
۲۹۷	۲	رہی	رہیں
۳۰۹	۱	کرلیں	بیعت کرلیں
۳۱۳	۱۸	قابل قبول	قبول
۳۱۵	۱۵	منکرِ	منکر
۳۲۲	۱۶	علی نحو	علی قد توجّہ نحو
۳۲۴	۱	کردیا گیا	کردیا گیا ہوگا
۳۲۷	۳	کہ فیوں	کوفیوں
۳۳۹	۸	تو تُو	تو تم
۳۴۴	۱۵	ہونے	ہونے کا
۳۵۳	۱۵	اس کی	اسی کی
۳۵۹	۱۵	منتورا	منثورا
۳۷۷	۲	سبب	سبق

Mashhoor Press, Karachi